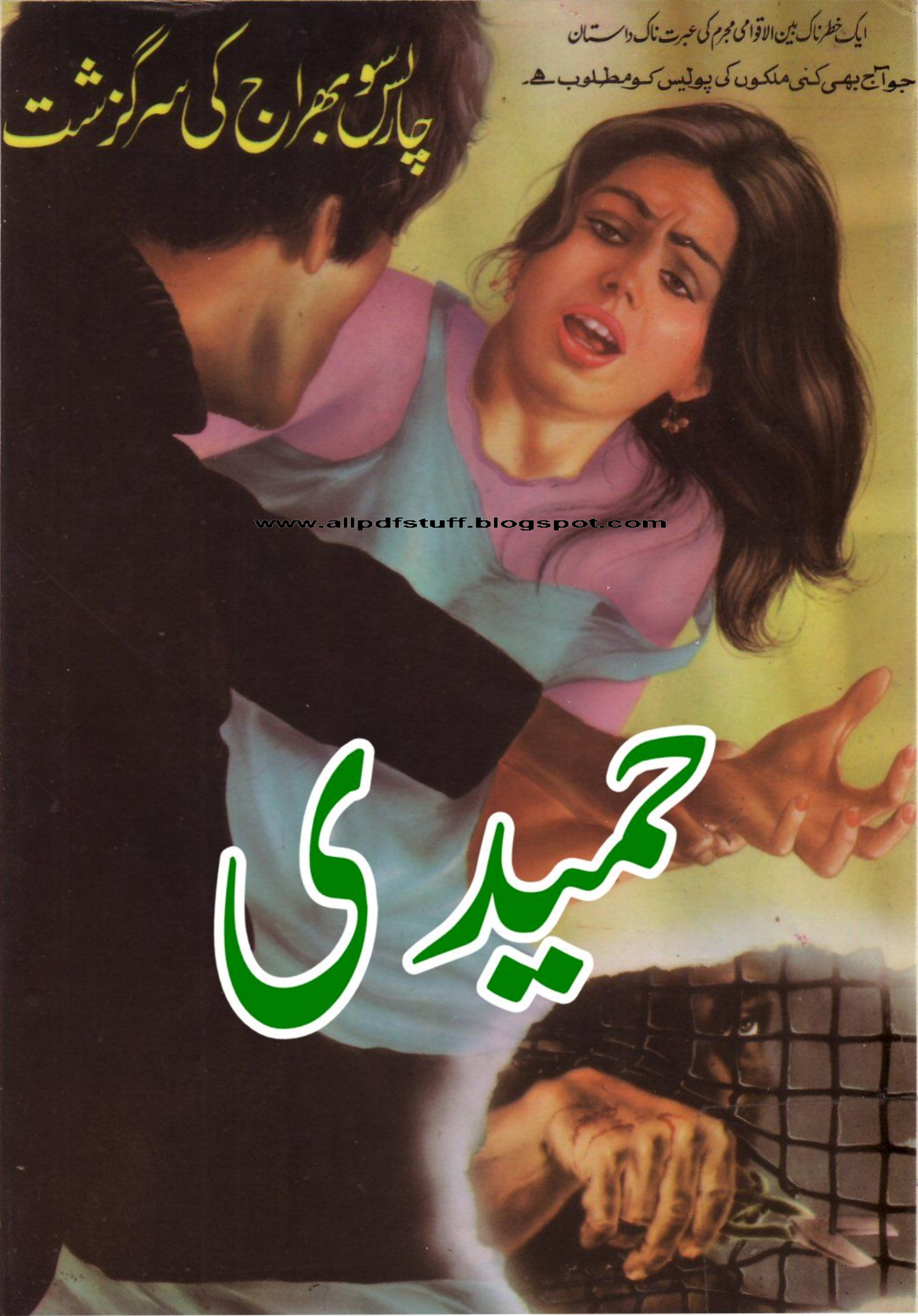
ایک خطرناک بین الاقوامی مجرم کی عبرت ناک داستان
جو آج بھی کئی ملکوں کی پولیس کو مطلوب ہے۔
چارلس سوبھراج کی سرگزشت
www.allpdfstuff.blogspot.com
حمیدی

بدنام ترین مُجرم چارلس سوبھراج کے جرائم کی مکمّل تفصیل

ایک خطرناک بین الاقوامی مجرم کی عبرت ناک داستان

جو آج بھی کئی ملکوں کی پولیس کو مطلوب ہے۔

www.allpdfstuff.blogspot.com

چارلس سوبھراج کی سرگزشت

www.allpdfstuff.blogspot.com

حمیدی

کتابیات پبلی کیشنز ◎ پوسٹ بکس ۲۳ کراچی ۱

www.allpdfstuff.blogspot.com

چارلس سوبھراج کی سرگزشت ایک ایسے بدقسمت نوجوان کی کہانی ہے جو باپ کی شفقت، ماں کی ممتا اور وطن کی مٹی کو ترستا رہا۔ ماں باپ کے ساتھ ساتھ کوئی ملک بھی اس بدنصیب کو پناہ دینے اور اپنانے کو تیار نہ ہوا تب وہ بدقسمت ایک ایسے تاریک سفر پر نکل گیا جس کی منزل تباہی اور بربادی کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتی تھی۔

چارلس سوبھراج کی یہ داستان ۱۹۸۵ء میں سسپنس ڈائجسٹ میں "تاریک سفر" کے نام سے قسط وار شائع ہو چکی ہے۔ اس کہانی کی دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ہمارے جانے پہچانے ماحول یعنی پاکستان بھارت ایران اور افغانستان میں گھومتی ہے۔

یہ داستان پڑھتے ہوئے ہم دلچسپی اور تجسس میں گم ہو جاتے ہیں جہاں یہ کہانی ہمیں فرضی لگتی ہے لیکن یہ ایک داستان ہے جس کا ایک ایک لفظ حقیقت پر مبنی ہے اور اس طرح ہم اس کہانی کو سچی کہانیوں میں دلچسپ ترین کہانی کہہ سکتے ہیں۔

www.allpdfstuff.blogspot.com

www.allpdfstuff.blogspot.com

سائیگون کے کیتھولک ہسپتال میں چیریٹی وارڈ کے ایک بستر پر دراز پندرہ سالہ حسین و جمیل ویتنامی لڑکی سونگ آنے والے لمحات کے تصور ہی سے سہمی جارہی تھی، وہ ماں بننے والی تھی اور دو دن پہلے اس ہسپتال میں لائی گئی تھی، یہ اپریل ۱۹۴۴ء کا وہ دور تھا جب پوری دنیا جنگ کے مہیب بادلوں کی لپیٹ میں تھی۔ چار سال قبل ۱۹۴۰ء میں انڈوچائنا پر جاپانی قابض ہوچکے تھے، سائیگون کی سڑکیں دن رات ان کے بھاری قدموں سے گونجتی رہتیں۔ اس زرد طاعون نے ہر شخص کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، کوئی گھر ان کی دخل اندازی سے محفوظ نہیں تھا، مقامی باشندے روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے محتاج تھے، عزت و آبرو اور جان و مال کا تحفظ ایک قصہ پارینہ بن چکا تھا ویت نامی عزت سرِعام جاپانیوں کی ہوس کا نشانہ بن رہی تھی۔ کسی میں مدافعت کی جرأت نہ تھی۔

یکایک سونگ بری طرح تڑپنے لگی، تکلیف کی شدت سے اس کے حلق سے نکلنے والی چیخیں آسمان کی خبر لارہی تھیں، قریب سے گزرتی ہوئی ایک عیسائی نرس نے رک کر سونگ کی طرف دیکھا اور پھر اسے فوراً لیبر روم پہنچا دیا گیا، جہاں ڈاکٹر دوسری مریضہ کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"بس چند لمحوں کی بات ہے۔" عیسائی نرس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تم بہت جلد ماں بن جاؤ گی، مجھے یقین ہے کہ بچہ تمہاری طرح بہت خوبصورت ہوگا، اس کے باپ کا نام کیا ہے؟"

سونگ کوئی جواب نہ دے سکی، اس کی خاموشی پر عیسائی نرس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے، سونگ نے منہ پھیر کر آنکھیں بند کرلیں اس کا ذہن ماضی کی طرف پرواز کرنے لگا۔

وہ ایک کاشتکار کی بیٹی تھی، ماں باپ کے ساتھ کھیتی باڑی میں ان کا ہاتھ بٹاتی تھی، لیکن جب سے جاپانی اس سرزمین پر قابض ہوئے تھے، کھیت اجڑنا شروع ہوگئے تھے، جاپانی سپاہی نہ صرف کھڑی فصلیں کاٹ

کرلے جاتے بلکہ ان کے گھروں کا بھی صفایا کر جاتے۔ ایک سال قبل سونگ ایک نیا عزم لے کر گاؤں سے نکلی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شہر میں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھرنے کے علاوہ بوڑھے ماں باپ کو بھی تھوڑی بہت رقم بھیج سکے گی۔ ایک سو میل کا فاصلہ پیدل طے کر کے وہ تقریباً ایک ہفتے بعد سائیگون پہنچی۔ جہاں سبزی منڈی میں اسے مزدوری مل گئی لیکن معاوضہ اتنا کم تھا کہ وہ اپنا پیٹ بھی بمشکل بھر پاتی۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ مردوں کی بُری بُری نظریں اس کا گھیراؤ کیے رہتی ہیں اسے اپنی طرف مائل کرنے کے لیے طرح طرح کے لالچ دیے جاتے مگر سونگ نے اپنا دامن بچائے رکھا۔ چند روز بعد اسے ایک گھٹیا سے ریسٹورنٹ میں ویٹرس کی ملازمت مل گئی۔ یہ جگہ بہرحال، سبزی منڈی سے بہتر تھی جہاں پیٹ بھرنے کے علاوہ رات کو سونے کے لیے چھت کا سایہ بھی میسر تھا۔ یہاں اُس کی ملاقات ایک ہندو بھوانی سوبھراج سے ہوئی جو دوپہر اور رات کا کھانے کے لیے ریسٹورنٹ میں آیا کرتا تھا۔

بمبئی کے ایک نواحی گاؤں میں رہنے والا بھوانی سوبھراج چند ماہ قبل تلاشِ معاش کے سلسلے میں سائیگون آیا تھا۔ وہ درزی تھا۔ اس نے ایک پرانی سی سلائی مشین خریدلی اور ایک مختصر سا کمرہ کرائے پر لے کر سلائی کا کام شروع کر دیا۔ اس کی رہائش بھی اسی کمرے میں تھی۔ اسے دن بھر میں اتنی آمدنی ہو جاتی کہ دو وقت کی روٹی سہولت سے کھا لیتا۔ ریسٹورنٹ میں سونگ سے چند ملاقاتوں ہی میں وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔ وہ دونوں فارغ اوقات میں اکثر دریائے ڈونگ نائے کی سیر کو نکل جاتے۔ سونگ اس کی شرافت کی قائل ہو چکی تھی اور جب بھوانی سوبھراج نے اسے رہائش کی پیش کش کی تو وہ انکار نہ کر سکی۔

کچھ ہی عرصہ بعد جب سونگ کو احساس ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو وہ دہل اٹھی۔ اس نے جب بھوانی سوبھراج کے سامنے یہ انکشاف کیا تو وہ بپھر گیا۔

"تم جھوٹ بکتی ہو۔ بکواس کرتی ہو۔ میرا اس بچے سے کوئی تعلق نہیں۔" سونگ روئی گڑگڑائی ہاتھ پاؤں جوڑے قسمیں کھائیں لیکن سوبھراج پر کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سونگ سے پیچھا چھڑانے کے لیے موقع کا منتظر تھا۔

بھوانی سوبھراج کا یہ فیصلہ سن کر سونگ سناٹے میں آگئی اور اب ہسپتال کے لیبر روم میں پڑی، دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ کاش، اس کا بچہ دنیا میں آنے سے پہلے اپنی زندگی کی مہلت پوری کر چکا ہو تاکہ اسے اذیت کی بیرپوٹ نہ اٹھانی پڑے۔ لیکن اس کی یہ دعا قبول نہ ہوئی اور آدھی رات کے وقت بموں کے دھماکوں کی لرزا دینے والی آوازوں کے شور میں اس نے بیٹے کو جنم دیا۔ ہوش میں آنے کے بعد جب نرس بچہ اس کی گود میں ڈال کر چلی گئی تو سونگ کے ہاتھ بچے کے نازک گلے پر پہنچ گئے۔ وہ اسے گلا گھونٹ کر ختم کر دینا چاہتی تھی لیکن دفعتاً اس کی نظریں بچے کے معصوم چہرے پر جم گئیں۔ مامتا نے اس کی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی کر دی اور اس نے تڑپ کر بچے کو سینے سے لگا لیا۔

پیغام بھجوانے کے باوجود بھوانی سوبھراج اسے یا بچے کو دیکھنے کے لیے ہسپتال نہیں آیا۔ چند دن بعد جب وہ بچے کو لے کر بھوانی سوبھراج کے گھر پہنچی تو اس کی سرد مہری دیکھ کر سونگ کا دل پارہ پارہ ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ بیٹے کو دیکھ کر بھوانی کا دل پسیج جائے گا مگر وہ انتہائی سنگدل ثابت ہوا۔ وہ معصوم عورت ہندو ذہنیت کو سمجھ ہی نہیں سکتی تھی اس نے سونگ پر واضح کر دیا کہ اگر وہ یہاں رہنا چاہتی ہے تو اسے کوئی اعتراض نہیں لیکن بچے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ بچے کی سرپرستی یا اس کی کسی قسم کی نفقے داری قبول کرنے کو تیار ہوگا۔ سونگ ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔ پتھر میں جونک لگانے کی کوشش کو حماقت سمجھتے ہوئے اس نے ہونٹ سی لیے۔

اگست ۱۹۴۵ء میں جب جاپانی اس سرزمین سے رخصت ہوئے تو ملک کے شمالی حصے پر ہوچی منہ نے کنٹرول حاصل کر لیا اور اس طرح شمالی اور جنوبی ویت نام کے درمیان ایک نئی جنگ شروع ہو گئی۔ شہر کی حالت پہلے سے بھی زیادہ مخدوش ہو گئی۔ روزانہ کوئی نہ کوئی عمارت دھماکے سے اڑا دی جاتی۔ اغوا اور قتل و غارت روزمرہ کا معمول بن گیا لیکن بھوانی سوبھراج کو غالباً ان واقعات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی سونگ کو سیاست سے کوئی لگاؤ تھا۔ وہ کپڑوں کی سلائی میں بھوانی کی مدد کرتی۔ اور جو وقت ملتا اس میں اپنے بچے کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ بھوانی نے اس بچے میں صرف اس حد تک دلچسپی لی تھی کہ اس کا نام رکھ دیا تھا۔ گورمکھ، سونگ نے اپنے طور پر اس نام میں سوبھراج کا اضافہ کر دیا تھا۔ جنگ کے دوران ہسپتال کا ریکارڈ تباہ ہو چکا تھا اور جب فرانسیسی حکمرانوں نے اس علاقے کا کنٹرول سنبھالا تو گورمکھ سوبھراج کا نام اس وقت بھی سرکاری کاغذات میں موجود نہیں تھا۔

ایک رات سونگ اپنے بیٹے کے ساتھ بازار سے لوٹ رہی تھی کہ ایک گلی کے سنسان موڑ پر چند ویت نامی گوریلوں نے ماں بیٹے کو اغوا کر لیا۔ ان دنوں سائیگون میں عورتوں اور بچوں کے اغوا کی وارداتیں عام تھیں۔ اغوا کرنے والے ان کے لواحقین سے بھاری معاوضہ طلب کرتے۔ مطالبہ پورا ہونے کے بعد ہی انہیں رہائی نصیب ہوتی بصورتِ دیگر چند روز بعد شہر کے کسی نہ کسی حصے میں ان کی لاشیں مل جاتیں۔ بھوانی سوبھراج کو بھی ایک دھمکی آمیز خط ملا جس میں سونگ اور گورمکھ کی رہائی کے لیے دس ہزار ڈالر کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ہندو بنیا ایک پائی بھی خرچ کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے اپنے ایک گاہک سے، جو فرانسیسی فوج کا آفیسر تھا، اس واقعہ کا تذکرہ کیا۔ فرانسیسی فوجیوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے ایک مکان پر چھاپہ مار کر سونگ اور گورمکھ کو برآمد کر لیا۔

وہ دونوں ماں بیٹے تین دن تک ویت نامی گوریلوں کی قید میں

رہے تھے۔ بھوانی سوبھراج کو شبہ ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ خوبصورت سونگ ۔۔۔۔۔۔ محفوظ نہیں رہی ہوگی۔ اس نے انہیں گھر کی فالتو چیزوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ سونگ دن رات دکان اور گھر کے کاموں میں مصروف رہتی۔ فرصت کے لمحات میں وہ بازار میں بھی گھوم پھر آتی۔ اس دوران ایک خط سے سونگ پر انکشاف ہوا کہ ہندوستان میں بھی سوبھراج کی ایک بیوی موجود ہے اور وہ کاروبار کا بہانہ کر کے سال میں کم از کم دو مرتبہ اس سے ملنے ضرور جاتا ہے۔ سونگ نے اس سلسلے میں جب سوبھراج سے پوچھا تو وہ اس پر برس پڑا۔

"وہ میری دھرمی بیوی ہے۔ تمہاری طرح وہ نہیں ہے ـــــ اگر میں اس سے ملنے جاتا ہوں تو یہ کوئی جرم نہیں ہے۔"

"تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو سوبھراج!" سونگ چیخی۔

"الزام نہیں، حقیقت کہو۔" بھوانی سوبھراج دہاڑا۔ "تم سمجھتی ہو کہ میں بیوقوف ہوں جو سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی نہ سمجھ سکوں۔" اس نے حسبِ عادت بہت سے الزامات سونگ پر لگائے۔

یہ الزامات اگرچہ قطعی بے بنیاد تھے لیکن سونگ جانتی تھی کہ سوبھراج جیسے کم ظرف اور گھٹیا خصلت آدمی کے سامنے وہ اپنی بے گناہی ثابت نہیں کر سکتی۔ اس روز جب سوبھراج پوجا پاٹ کے لیے مندر گیا ہوا تھا، سونگ اپنے کپڑوں کے چند جوڑے لے کر گھر سے نکل گئی ـــ اس کے پاس تھوڑی سی پونجی تھی ـــ اسی سے اس نے شہر کے زیریں علاقے میں ایک چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ وہ اپنا درزی خانہ کھولنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس اتنا سرمایہ بھی نہیں تھا کہ ایک سلائی مشین خرید سکتی۔ وہ کوئی ایسا کام ڈھونڈنا چاہتی تھی جس سے معقول آمدنی کے ساتھ گورمکھ کے لیے بھی وقت نکال سکے جو اب دو برس کا ہو چکا تھا۔ اسی دوران اس کی ایک سہیلی کائی لان نے اسے نائٹ کلب میں 'ہوسٹس' بننے کا مشورہ دیا۔ سونگ اس وقت صرف اٹھارہ برس ہی کی تو تھی۔ حسن و رعنائی میں بھی پورے علاقے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ کائی لان کا خیال تھا کہ وہ بہت جلد مقبولیت حاصل کر لے گی لیکن سونگ کسی گھناؤنے پیشے کو اپنانا نہیں چاہتی تھی۔ کائی لان گھنٹوں اس کے پاس بیٹھی ویشیا اور نائٹ کلب کی ہوسٹس کا فرق سمجھاتی رہی۔ ویشیا جسم فروشی کرتی ہے جبکہ ہوسٹس کی ذمہ داریاں کلب میں آنے والے گاہکوں سے بات چیت تک محدود رہتی ہیں۔ مجبوریوں نے یہ بات سونگ کی سمجھ میں بٹھا دی اور کائی لان کی سفارش پر اسے سائیگون کے پیراڈائز کلب میں ہوسٹس کی حیثیت سے کام مل گیا۔

کلب میں آنے والا ہر گاہک اس کا گرویدہ تھا۔ ہر شخص اسے اپنانا چاہتا تھا مگر سونگ اس مرتبہ ساتھی کے انتخاب میں کسی عجلت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ بڑی خوبصورتی سے ۔۔۔۔۔۔ سب کو ٹالتی رہی۔ اسے اپنے بیٹے کا مستقبل بھی عزیز تھا جو اب تین سال کا ہو چکا تھا۔ گورمکھ اب اس کے لیے نت نئے مسائل پیدا کرنے لگا تھا۔ دن کو وہ گھر میں رہتی تو گورمکھ کھیلتا رہتا لیکن شام کو جب تیار ہو کر نائٹ کلب جانے لگتی تو وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر بلبلانے لگتا۔ سونگ اسے جھٹک کر نکل جاتی۔ اس نے نہایت معمولی سے معاوضے پر اپنی بوڑھی پڑوسن کو آمادہ کر لیا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں وہ گورمکھ کا خیال رکھا کرے گی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ رات گئے جب وہ گھر لوٹتی تو گورمکھ جاگتا ہوا ملتا۔ رات بھر روتے رہنے سے اس کی آنکھیں سرخ ہوتیں۔

سونگ پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہی تھی۔ ایک برطانوی فوجی اس کی طرف مائل تھا۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن جب سونگ نے اپنے بیٹے کا تذکرہ کیا تو برطانوی فوجی نے کلب ہی میں آنا چھوڑ دیا۔ اس کے چند دن بعد سونگ کی ملاقات ایک فرانسیسی لیفٹیننٹ سے ہوئی۔ الفانسو طویل قامت اور خوبرو نوجوان تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سونگ ایک تین سالہ بیٹے کی ماں ہے، وہ اس سے شادی کرنے کو تیار تھا۔ اس طرح ۱۵ ستمبر ۱۹۴۸ء کو وہ رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ جس کے ایک سال بعد سونگ نے ایک خوبصورت بچی این میری کو جنم دیا۔ الفانسو اگرچہ گورمکھ کی پرورش کے تمام تر اخراجات اٹھا رہا تھا لیکن اس نے گورمکھ کا نام اپنے نام سے منسوب کرنے سے انکار کر دیا۔ گورمکھ اب چار سال کا ہو چکا تھا۔ اس ننھی سی عمر میں ہی وہ اپنے سوتیلے باپ سے شدید نفرت کرنے لگا جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً مختلف طریقوں سے کرتا رہتا۔ دن بھر گلی کے بچوں کے ساتھ کھیلتے رہنے سے اس کا لہجہ بھی بازاری پن اختیار کر گیا تھا۔

وہ لوگ اب فرانسیسی افسروں کی کالونی میں واقع ایک کشادہ مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔ الفانسو اکثر اپنے دوستوں کو گھر پر مدعو کرتا رہتا۔ اس کا حکم تھا کہ گورمکھ اس کے دوستوں کے سامنے نہ آنے پائے۔ ایسے موقعوں پر سونگ اپنے بیٹے کو مکان کے پچھلے حصے میں واقع ایک کمرے میں بند کر دیتی جہاں وہ روتا بلبلاتا رہتا۔ وہ الفانسو کے سامنے اکثر اپنے باپ سوبھراج کا نام لے کر اسے چڑاتا رہتا۔ ایک روز الفانسو نے اسے تھپڑ رسید کر دیا تو گورمکھ نے اس کی وردی پھاڑ ڈالی اور روتے ہوئے اسے دھمکی دی کہ ایک نہ ایک دن اس کا حقیقی باپ اسے آکر لے جائے گا۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ جب سے وہ لوگ بھوانی سوبھراج کے گھر سے نکلے تھے، سوبھراج نے کبھی پلٹ کر ان کی خبر نہ لی تھی۔

گورمکھ اب چھ سال کا ہو چکا تھا۔ سونگ اکثر اپنے دوسرے بچوں کی دیکھ بھال یا شوہر کی خوشنودی میں مصروف رہتی۔ گورمکھ کے لیے وہ بہت کم وقت نکال پاتی۔ گورمکھ ماں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بعض اوقات کوئی ایسی حرکت کر گزرتا جو سونگ کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی۔ جس کے نتیجہ میں وہ اسے بری طرح دھنک کر رکھ دیتی۔ ایک روز ایک پولیس والا گورمکھ کو پکڑ کر لے آیا۔ اس نے ایک سائیکل چوری کی تھی۔ جو اس کے قبضے سے برآمد ہونے کے بعد اسے وارننگ دے کر چھوڑ دیا

جارہا تھا۔ سونگ نے بیٹے کو بری طرح پیٹ ڈالا اور مزید سزا دینے کے لیے اسے ایک کمرے میں بند کر کے تالا لگا دیا۔ رات کو اپنے شوہر کی خدمت اور بچوں کو سلانے کے بعد جب وہ کمرے کا تالا کھول کر اندر داخل ہوئی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کمرہ خالی تھا۔ گورمکھ عقبی کھڑکی سے فرار ہو چکا تھا۔

دو دن تک گورمکھ کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ تیسرے دن بھوانی سوبھراج کا فون ملا کہ گورمکھ اس کے پاس ہے اور وہ اسے لے کر سونگ کے پاس آ رہا ہے۔ گورمکھ رات کے وقت اس کی عدم موجودگی میں دکان کا تالا توڑ کر اندر داخل ہو گیا تھا جہاں وہ دو دن تک کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے چھپا رہا۔ تیسرے روز کسی کپڑے کی تلاش میں اس نے ڈھیر ہٹایا تو گورمکھ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سوبھراج نے کئی برسوں سے اپنے بیٹے کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے پہچان نہیں سکا اور جب گورمکھ نے بتایا کہ وہ اس کا بیٹا ہے تو وہ ایکدم پریشان ہو گیا۔ گورمکھ باپ کی ٹانگوں سے لپٹا رو رو کر کہہ رہا تھا۔

"مجھے اپنے پاس رکھ لو پاپا! میں تمہارے پاس رہنا چاہتا ہوں میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ وہاں میرے لیے نفرت کے سوا کچھ نہیں۔ الفانسو مجھے پسند نہیں کرتا اور ماں اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مجھے پیٹتی رہتی ہے۔ مجھے اپنے پاس رکھ لو پاپا۔ میں تمہارا بیٹا ہوں۔"

مگر بھوانی سوبھراج پر اس آہ و فغاں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ گورمکھ کو بیدردی سے گھسیٹتا ہوا سونگ کے دروازے پر چھوڑ آیا اور وارننگ دی کہ وہ آئندہ اس طرف رخ نہ کرے۔ سونگ کو اس روز معلوم ہوا کہ سوبھراج ایک اور ویت نامی لڑکی سے شادی کر چکا ہے جو اب ماں بننے والی ہے۔

سوبھراج کے جاتے ہی سونگ نے پہلے تو گورمکھ کی خوب دھنائی کی پھر اسے کتے کی طرح چارپائی کے آہنی پائے سے باندھ دیا اور کئی روز بعد اسے اس شرط پر کھولا گیا کہ آئندہ وہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

۱۹۴۹ء میں لیفٹیننٹ الفانسو کے دوبارہ فرانس تبادلے کے احکامات آ گئے۔ دو ہفتے بعد ایک فوجی ٹرانسپورٹ طیارہ فرانس جانے والا تھا اور اسے اپنے بیوی بچوں سمیت اس طیارے سے روانہ ہونا تھا۔ گورمکھ کو جب یہ اطلاع ملی تو اس نے ہنگامہ مچا دیا کہ وہ سائیگون سے نہیں جائے گا جہاں اس کا باپ رہتا ہے۔ سونگ نے بھی اسے وارننگ دے دی کہ اگر گورمکھ نے شرافت کا ثبوت نہ دیا تو اسے ہاتھ پیر باندھ کر جہاز میں لاد دیا جائے گا۔ اور پھر تیاری کے دوران ایک روز لیفٹیننٹ الفانسو نے یہ انکشاف کیا کہ مقامی حکام گورمکھ کے نام پاسپورٹ جاری کرنے کو تیار نہیں تھے کیونکہ اس کے پاس نہ تو پیدائش کا سرٹیفکیٹ موجود تھا اور نہ ہی شناختی کاغذات جن سے اس کا اس ملک سے تعلق ظاہر ہوتا۔ الفانسو کے کہنے کے مطابق گورمکھ کے شناختی کاغذات کے حصول کے لیے قانونی چارہ جوئی کرنا پڑے گی جس میں کئی ہفتے لگ سکتے تھے۔

"سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس لڑکے کا قانونی طور پر کوئی وجود ہی نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس ملک سے باہر جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی سرے سے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔" لیفٹیننٹ الفانسو نے بتایا۔

یہ تازہ صورتحال سونگ کے لیے واقعی اندوہناک تھی۔ اس کے سامنے اب صرف ایک ہی راستہ تھا۔ وہ اسی روز تیار ہو کر بھوانی سوبھراج کی دکان پر پہنچ گئی۔ گورمکھ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ سوبھراج سے قطع تعلق کرنے کے بعد سونگ پہلی مرتبہ یہاں آئی تھی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ پڑوس کی دو اور دکانیں بھی سوبھراج نے اپنی دکان میں شامل کر لی تھیں چار کاریگر لڑکیاں بجلی سے چلنے والی مشینوں پر کام کر رہی تھیں اور دکان پر گاہکوں کی آمد و رفت بھی خوب تھی۔ چاروں طرف الماریوں میں تیار ملبوسات آراستہ تھے۔ سوبھراج فوراً ہی اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سوبھراج سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی انگلی میں ہیرے کی طلائی انگوٹھی دیکھ کر سونگ حیرت زدہ سی رہ گئی۔ اس نے سوبھراج کو گورمکھ سے متعلق تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں چاہتی کہ تمہارے ہوتے ہوئے تمہارا بیٹا اس شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا پھرے۔ تم اس کے باپ ہو تمہیں کچھ تو سوچنا چاہیے۔ تم اسے صرف چند ماہ کے لیے اپنے پاس رکھ لو۔ الفانسو کا وکیل اس کے کاغذات بنوانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کاغذات ملتے ہی ہم فرانس سے رقم بھیج دیں گے تو اسے فرانس روانہ کر دینا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" سوبھراج نے کرخت لہجے میں کہا۔ "میں اس بدمعاش پر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی کسی قسم کی ذمہ داری لینے کو تیار ہوں۔ یہ جہاں بھی رہے گا نت نئے مسائل کو جنم دے گا۔ میں اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔"

"تم شاید نہیں جانتے کہ یہ دنیا میں سب سے زیادہ صرف اور صرف تم ہی کو چاہتا ہے۔ تم اس کے لیے سب کچھ ہو۔ یہ تمہیں اپنی کائنات کا محور سمجھتا ہے۔ یہ جب بھی گھر سے بھاگا ہے سیدھا تمہارے پاس آیا ہے۔ اس سے تم اپنے لیے اس کی محبت کا اندازہ لگا سکتے ہو۔" سونگ کا لہجہ متاثرکن تھا۔

بھوانی سوبھراج کے چہرے پر الجھن کے آثار ابھر آئے۔ اسی لمحہ گورمکھ آگے بڑھ کر اپنے باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"پاپا! مجھے اپنے پاس رکھ لو پاپا! مجھے اپنے قریب رہنے دو۔" وہ روتے ہوئے گڑگڑایا۔

بھوانی سوبھراج کا دماغ بہت تیزی سے کچھ اور سوچ رہا تھا۔ دکان کے بڑھتے ہوئے کام کے پیش نظر اسے ایک ایسے ملازم کی ضرورت تھی جو دکان کی صفائی وغیرہ کے ساتھ اوپر کا کام بھی کر سکے۔ یہ لڑکا اس مقصد کے لیے برا نہیں تھا۔ وہ بے اختیار گورمکھ کا سر سہلانے لگا۔

یہ دیکھتے ہی سونگ کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ وہ مزید کچھ

کہے بغیر تیزی سے دکان سے باہر نکل گئی۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں سوبھراج اپنا فیصلہ تبدیل نہ کر دے۔

۱۹۴۹ء میں چین پر کمیونسٹوں کے تسلط کے ساتھ ہی انڈوچائنا میں ہوچی منہ کی انقلابی سرگرمیاں بھی ایکدم بڑھ گئیں۔ چین کی نئی حکومت ویتنامی گوریلوں کو بھرپور امداد فراہم کر رہی تھی۔ گوریلوں کے بڑھتے ہوئے دباؤ سے فرانسیسی فوجی دستے چین کی سرحد سے دور ہٹنے لگے۔ اس صورتحال کے پیش نظر ۱۹۵۲ء میں جب لیفٹیننٹ الفانسو کو دوبارہ سائیگون جانے کا حکم ملا تو سونگ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ اس دوران اگرچہ وہ تین بچوں کی ماں بن چکی تھی لیکن گورمکھ کی یاد ایک لمحہ کو بھی اس کے دل سے نہیں نکلی تھی۔ ان تین برسوں میں بھی سائیگون میں گورمکھ کے کاغذات نہیں بن سکے تھے۔ البتہ کبھی کبھار اسے سوبھراج کا کوئی مختصر خط مل جاتا جس سے گورمکھ کی خیریت کا پتا چل جاتا۔ سونگ کے حساب سے گورمکھ اب نو سال کا ہو چکا تھا اور اسے یقین تھا کہ اپنے باپ کے پاس رہتے ہوئے اس میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی ہوں گی اور جب وہ گورمکھ سے ملے گی تو اسے مطیع و فرمانبردار پائے گی۔ لیکن سائیگون کی صورتحال اس کے تصورات سے بہت مختلف تھی۔

بھوانی سوبھراج کی دوسری بیوی ساؤ بھی اب تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ گھر میں گورمکھ کی موجودگی کو وہ اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھتی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ گورمکھ کی موجودگی سوبھراج کو بھی سونگ کی یاد دلاتی رہے گی۔ اس کے خیال میں عین ممکن تھا کہ بیٹے کے حوالے سے سوبھراج ایک بار پھر سونگ کی طرف مائل ہونے لگے۔ سوتیلی ماں نے گورمکھ پر تشدد شروع کر دیا۔ اسے دن میں صرف ایک بار کھانا دیا جاتا۔ سوبھراج کی عدم موجودگی میں وہ اسے بات بے بات بری طرح پیٹ ڈالتی۔ گورمکھ کے ذہن میں باغیانہ خیالات پرورش پانے لگے۔ یہ بات اب رفتہ رفتہ اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی کہ قانونی طور پر اس کا کوئی وجود نہیں۔ اس نے بھی ساؤ کے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع کر دیں۔ وہ سوتیلی ماں کو زک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ وہ پڑوسی عورتوں کے سامنے ساؤ کی برائیاں کرتا اور گالیاں بکتا۔ وہ دن بھر سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا اور اکثر کئی کئی روز تک گھر سے غائب رہتا۔

سائیگون پہنچنے کے دو تین روز کے بعد سونگ جب تیار ہو کر سوبھراج کے دروازے پر پہنچی تو دستک کے جواب میں دروازہ ساؤ ہی نے کھولا تھا۔ وہ دونوں اگرچہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھیں لیکن ایک دوسرے کی شناخت میں بھی انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔

"میں سونگ ہوں۔ اپنے بیٹے گورمکھ سے ملنے آئی ہوں۔" سونگ نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"گورمکھ۔" ساؤ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "وہ یہاں نہیں ہے کہیں بھاگ گیا ہو گا یا ممکن ہے کسی جیل میں پڑا سڑ رہا ہو۔"

"کیا مطلب؟" سونگ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"مطلب وہی ہے جو میں نے کہا ہے۔" ساؤ کے لہجے میں نفرت و حقارت کا عنصر نمایاں تھا۔ "تمہارے بیٹے میں کوئی شیطانی روح حلول کر گئی ہے۔ سوبھراج نے اسے سنبھالنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ انتہائی جھوٹا مکار اور چور ثابت ہوا۔ وہ میرے بچوں کے لیے خطرہ بن گیا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے چاقو سے میری بیٹی کا ہاتھ کاٹنے کی کوشش بھی کی تھی۔ ہاں تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ تمہارا بیٹا ہر وقت جیب میں چاقو رکھتا ہے۔ جاؤ اسے ڈھونڈھ لو لیکن آئندہ اس طرف کا رخ مت کرنا۔"

ساؤ نے ایک دھماکے سے دروازہ بند کر دیا۔ سونگ دروازے پر گھونسے برساتی رہی۔ منت سماجت کرتی رہی لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ سونگ آنسو بہاتی گھر واپس پہنچی۔ اس نے الفانسو کو اس نئی صورتحال سے آگاہ کیا تو وہ دونوں گورمکھ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے تھانوں میں پوچھ گچھ کی گئی پھر شہر کی سڑکیں اور گلیاں چھاننے لگے۔ بالآخر گورمکھ بمباری سے تباہ شدہ ایک عمارت کے کھنڈر سے مل گیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ پانچ لڑکے اور بھی تھے۔ اس مختصر سے گروہ کا لیڈر گورمکھ ہی تھا۔ وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے چوریاں کرتے اور کسی اکیلے شخص کو دیکھ کر لوٹ بھی لیتے۔ ان سب کے پاس چاقو تھے اور ان میں سے کسی کی عمر بھی بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔

ویت نام میں فرانس کی پوزیشن بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ ہیڈکوارٹر میں دفتری کام انجام دینے والے فوجیوں کو بھی اگلے محاذ پر بھیجا جا رہا تھا۔ لیفٹیننٹ الفانسو کو بھی فرنٹ پر جانا پڑا جہاں چند ہی روز بعد اپنے قریب پھٹنے والے بم کے دھماکے سے اس کی یادداشت ختم ہو گئی۔ اسے سائیگون کے فوجی ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ اسے اپنی بیوی بچوں کی پہچان بھی نہیں رہی تھی۔ ڈاکٹروں کی بھرپور توجہ سے کچھ عرصہ بعد اس کی یادداشت تو لوٹ آئی لیکن وہ ذہنی طور پر اب نارمل ہو گیا اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے چاروں طرف بم پھٹ رہے ہوں۔ دماغ میں خوفناک دھماکے ہونے لگتے اور بعض اوقات وہ بری طرح چیخنے لگتا۔ اس صورتحال کے پیش نظر اسکے فرانس واپس بھیجے جانے کے احکامات جاری کر دیے گئے۔

چند روز کی بھاگ دوڑ سے گورمکھ کو بھی سائیگون کی عارضی شہریت کے کاغذات مل گئے۔ اسے جب پتا چلا کہ اس مرتبہ وہ بھی فرانس جا رہا ہے تو وہ بری طرح بلبلا اٹھا۔ اسے آمادہ کرنے کے لیے سونگ کو کچھ سختی بھی کرنا پڑی۔ سونگ جانتی تھی کہ گورمکھ اس سرزمین کو نہیں چھوڑنا چاہتا جہاں اس کا حقیقی باپ رہ رہا ہے۔ اسے اپنے باپ سے بے پناہ محبت تھی۔ دھتکارے جانے کے باوجود وہ سوبھراج کو کسی دیوتا کی طرح پوجتا تھا۔ وہ آئے دن گھر سے بھاگ کر سوبھراج کی دکان کے قریب کسی ایسی جگہ چھپا رہتا جہاں سے

اپنے باپ کو دیکھ سکتا ہو. وہ سامنے آئے بغیر اپنی جگہ پر چھپا کئی کئی گھنٹے باپ کو دیکھتا رہتا. انہی دنوں گورمکھ نے اپنے دوست کو بتایا.

"میرا سوتیلا باپ اب بظاہر محبت سے پیش آتا ہے لیکن اسے مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں. میں اپنے حقیقی باپ کے قریب رہنا چاہتا ہوں وہ میرا خون ہے، میرے جسم کا ایک حصہ. اس کے بغیر میں اپنے آپ میں ایک عجیب سا خالی پن محسوس کرتا ہوں. مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا کچھ کھو گیا ہو. گھر سے بھاگنے کے بعد میں اپنے باپ کے قریب رہنے کی کوشش کرتا ہوں اور جب میری ماں مجھے پکڑ کر پٹائی کرتی ہے اور رسیوں سے باندھ دیتی ہے تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہوتا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ میری باپ سے محبت کی وجہ سے ہو رہا ہے."

فرانس پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد الفانسو کو فرنچ ویسٹ افریقہ کے دارالحکومت ڈاکر بھیج دیا گیا. فرانس کے زیرِ تسلط اس علاقے میں بھی فرانسیسی بولی جاتی تھی اور ڈاکر کو چھوٹا پیرس کہنا غلط نہ ہوگا. انہیں رہائش کے لیے بہت بڑا مکان مل گیا جس کے چاروں طرف وسیع و عریض رقبے پر باغ پھیلا ہوا تھا. ۱۹۵۶ تک سونگ، الفانسو کے چھ بچوں کی ماں بن چکی تھی. گورمکھ ساتواں اور سب سے بڑا بچہ تھا لیکن اسے اس گھر میں ہمیشہ اجنبی سمجھا گیا. اسے بھی اپنے بن بلائے مہمان ہونے کا بڑی شدت سے احساس ہو رہا تھا گھر میں کوئی بھی ناخوشگوار بات ہوتی اس کا الزام بلاتکلف گورمکھ پر تھوپ دیا جاتا. الفانسو کا رویہ ایک بار پھر بدلنے لگا. وہ بات بات پر اسے جھڑک دیتا. سونگ کو اب سماجی سرگرمیوں سے فرصت نہیں تھی. اس کا زیادہ وقت اب پڑوسنوں کے ساتھ گزرتا. گورمکھ نے گھر سے باہر کچھ دور واقع چٹان کی ایک کھوہ میں پناہ حاصل کر لی تھی. وہ دن بھر اس غار میں بیٹھا نئے نئے منصوبے بناتا رہتا. کبھی وہ اپنے دوستوں اور سوتیلے بہن بھائیوں کو بھی غار میں جمع کر لیتا اور تحفے تحائف اور کھانے پینے کی اشیاء سے ان کی تواضع کرتا. اس کا سوتیلا بھائی آندرے اس سے چار سال چھوٹا تھا. دونوں میں بڑی حد تک مشابہت تھی. گورمکھ اس پر خاص توجہ دیتا. بارہ سال کی عمر میں گورمکھ پولیس کی نظروں میں آچکا تھا. وہ کامیاب شاپ لفٹر (بڑی دکانوں سے سامان چوری کرنے والا) بن چکا تھا. شہر کی دکانوں اور ٹھیلوں سے چھوٹی موٹی چیزیں چرانا اس کا معمول بن چکا تھا.

اسکول میں بھی گورمکھ نے اپنا ایک مختصر سا گروہ بنا لیا تھا. بچوں کی کتابیں کاپیاں چرانا اور توڑ پھوڑ اس کے معمولات میں شامل تھا. ۱۹۵۹ء میں جب وہ پندرہ سال کا ہو چکا تھا اس کا نام باقاعدہ طور پر چرچ کے ریکارڈ میں شامل کیا گیا. سونگ نے اس کا نام چارلس گورمکھ لکھوایا تھا لیکن گورمکھ نے اپنے نام کے ساتھ سوبھراج کا اضافہ کر لیا. اب وہ چارلس گورمکھ سوبھراج تھا.

سارک نامی ایک سیاہ فام لڑکا چارلس سوبھراج کا نائب تھا. وہ دونوں مل کر چوریاں کرتے. ایک روز سارک ایک دکان سے چیزیں چراتے ہوئے پکڑا گیا. اس نے چارلس سوبھراج کا نام بھی لے دیا. دکاندار نے سونگ سے شکایت کی. تلاشی پر مکان کے تہ خانے میں مختلف اشیا کا انبار نظر آیا جو مختلف دکانوں سے چرائی گئی تھیں. سونگ نے دکاندار کو سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیا اور چارلس سوبھراج کی گردن پکڑ لی جو تہ خانے ہی میں چھپا ہوا تھا.

"یہ سب کچھ تو نے چرایا ہے؟" سونگ چیخی.

"نہیں." چارلس سوبھراج نے پرسکون لہجے میں جواب دیا.

"لیکن سارک نے تو تمہارا نام لیا تھا. وہ یہ بھی کہتا ہے کہ تم اسے چیزیں چرانے کو کہتے ہو." سونگ غرائی.

"یہ لوگ بیوقوف ہیں جو میری بات بلا چون و چرا مان لیتے ہیں. میں لوگوں کی اس بیوقوفی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں." چارلس سوبھراج کا لہجہ انتہائی جارحانہ تھا.

چارلس گورمکھ سوبھراج کی ناپسندیدہ سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا رہا. اسکول کے علاوہ شہر سے بھی شکایتیں ملنے لگیں. بالآخر تنگ آکر سونگ نے اسے مکان کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں بند کر کے تالا لگا دیا. مگر دوسرے دن جب تالا کھولا گیا تو وہ غائب تھا. اسے وقتاً فوقتاً سزا دینے کے لیے رسیوں سے بھی باندھ دیا جاتا مگر وہ ہر مرتبہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا. اس کے سوتیلے بہن بھائی یہ سمجھنے لگے کہ وہ بعض پُراسرار قوتوں کا مالک ہے جو ایسے موقعوں پر اس کی مدد کرتی ہیں.

چارلس ڈیگال کی حکمتِ عملیوں کی وجہ سے فرانس کو بتدریج اپنی مقبوضہ نوآبادیاتی کالونیوں سے دستبردار ہونا پڑ رہا تھا. فرنچ ویسٹ افریقہ کے ہاتھ سے نکلنے کے بعد وہاں پر تعینات تمام فرانسیسیوں کو واپس بلا لیا گیا. لیفٹیننٹ الفانسو کو بھی ڈاکر سے مارسلز بھیج دیا گیا. وہ اگرچہ عملی طور پر کسی کام کے قابل نہیں رہا تھا لیکن اس کا نام فوج کے پے رول پر موجود تھا اور اسے تمام مراعات بھی حاصل تھیں. مارسلز میں اس کا زیادہ وقت ہسپتالوں اور پرائیویٹ ڈاکٹروں کے ہاں آنے جانے میں صرف ہوتا. دوسرے تیسرے دن اسے دورہ پڑتا. اسے اپنے آس پاس بموں کے خوفناک دھماکے محسوس ہوتے اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بری طرح چیخنے لگتا. اس کے ساتھ ہی چارلس سوبھراج بھی اس کے لیے تکلیف دہ ہوتا جا رہا تھا. دسمبر ۱۹۵۹ء میں دو پولیس والے چارلس سوبھراج کو پکڑ کر لے آئے. انہوں نے بتایا کہ چارلس سڑک کے ایک موڑ پر کھڑا کرسمس کارڈ بیچ رہا تھا. جو راہگیر اس کے کارڈ خریدنے سے انکار کر دیتا چارلس انہیں دھمکاتا اور چاقو کی نوک پر انہیں بوسیدہ اور گھٹیا کارڈ مہنگے داموں خریدنے پر مجبور کرتا. پولیس والوں کے جانے کے بعد جب سونگ نے چارلس کی پٹائی کرنا چاہی تو اس نے ایک لمبے پھل کا چاقو نکال لیا اور دھمکی دی کہ اگر وہ قریب آئی تو اس کا گلا کاٹ دے گا.

لیفٹیننٹ الفانسو کی قوت برداشت جواب دے گئی. اس موقع پر

ایک پادری نے مشورہ دیا کہ اسے کیتھولک بورڈنگ اسکول میں داخل کرا دیا جائے جہاں بچوں کو کاشتکاری کی تربیت بھی دی جاتی ہے. چارلس سوبھراج کو جب پتا چلا تو وہ گھر سے بھاگ نکلا. دو دن بعد وہ بندرگاہ سے پکڑا گیا. جہاں وہ چوری چھپے ایک بحری جہاز پر سوار ہونے کی کوشش کر رہا تھا.

"آخر تم کیا چاہتے ہو. جہاز پر کیوں سوار ہو رہے تھے؟" سونگ نے اسے تھپڑ رسید کرتے ہوئے پوچھا.

"میں اپنے باپ کے پاس جانا چاہتا ہوں." چارلس نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا." میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا. مجھے یقین ہے کہ وہ بھی مجھے چاہتا ہے."

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے." سونگ دہاڑی." سوبھراج کو تم سے کوئی محبت نہیں ہے. پانچ سال کے اس عرصہ میں اس نے تمہاری خیریت معلوم کرنے کے لیے خط تک نہیں لکھا. بھول جاؤ اس شخص کو جو تمہاری زندگی کو گھن کی طرح چاٹ رہا ہے."

اس رات چارلس سوبھراج اپنے کمرے میں بند پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا اور اپنے باپ سوبھراج کو یاد کرتا رہا.

کیتھولک ایگریکلچرل اسکول سے چارلس نے تین مرتبہ فرار ہونے کی کوشش کی. ایک مرتبہ تو اس کوشش میں اپنی ٹانگ بھی تڑوا بیٹھا. پادری نے اس حادثہ کی اطلاع دینے کے لیے جب مارسلز ٹیلی فون کیا تو پتا چلا کہ سونگ اپنے شوہر کے ساتھ اپنے ماں باپ سے ملنے کے لیے سائیگون گئی ہوئی ہے. یہ اطلاع چارلس گورمکھ کے لیے بم کا دھماکہ ثابت ہوئی اور ٹانگ زخمی ہونے کے باوجود وہ ہسپتال سے بھاگ نکلا. دو ہفتے بعد اسے بندرگاہ سے پکڑا گیا جہاں وہ سائیگون جانے والے جہاز پر سوار ہونے کی کوشش کر رہا تھا. اپریل ۱۹۶۰ء میں وہ ایک بار پھر بھاگ نکلا. پادری نے اس روز ٹیلیفون پر سونگ کو اطلاع دی تو اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا.

"اسے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں فادر! میں نے اور میرے شوہر نے فیصلہ کیا ہے کہ چارلس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے."

اس مرتبہ چارلس سوبھراج ڈی جیبوتی جانے والے ایک جہاز پر سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا. اس کی جیب میں کوئی پیسہ نہیں تھا نہ ہی اس کے پاس شناختی کاغذات تھے. اس کا خیال تھا کہ ڈی جیبوتی سے اسے سائیگون کے لیے کوئی نہ کوئی جہاز مل جائے گا. اپنے باپ سے ملاقات کا تصور ہی اس کے لیے بڑا حسین تھا. وہ سوچ رہا تھا کہ جب وہ سائیگون پہنچے گا تو اس کا باپ اسے سینے سے لپٹائے گا اور اس کی ساری مصیبتیں دور ہو جائیں گی. نہر سوئز عبور کرتے ہوئے چارلس سوبھراج کو بحری جہاز کے ایک ملازم کا پاسپورٹ اور رقم چرانے کے الزام میں پکڑ لیا گیا. ڈی جیبوتی پہنچنے پر اسے جہاز راں کمپنی کی انتظامیہ کے حوالے کر دیا گیا. اس نے کمپنی کو سائیگون میں اپنے دولتمند باپ کا پتا دیتے ہوئے بتایا کہ وہ اس کے کرائے کی رقم ادا کر دے گا لیکن سوبھراج نے کمپنی کے ٹیلیگرام کا جواب تک نہیں دیا. کمپنی کی انتظامیہ نے دھمکی دی کہ اگر اس نے کرایہ ادا نہ کیا تو اسے مقامی پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا. چارلس نے جیل سے بچنے کے لیے سونگ کا پتا بتا دیا.

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟" سونگ کا لہجہ رو دینے والا تھا. چارلس کو اسی روز ڈی جیبوتی سے واپس لایا گیا تھا." ہم نے تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کیا. کیا کیا تکلیفیں نہیں اٹھائی ہیں اور تم اس کا یہ صلہ دے رہے ہو."

"بس، اب بہت ہو چکا." قریب کھڑا ہوا الفانسو چیخا." تم اس گھر سے دفع ہو جاؤ. آئندہ ہم تم سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے."

"کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے ماما؟" چارلس نے الفانسو کی بات پر توجہ دیے بغیر سوالیہ نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا.

"اگر تم سے محبت نہ ہوتی تو تمہاری دی ہوئی یہ اذیتیں کیوں برداشت کرتی." سونگ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے.

"اب میں آپ کو کوئی تکلیف نہیں دوں گا، کوئی شکایت نہیں ہوگی آپ کو مجھ سے." چارلس جھک کر ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گیا.

اس واقعہ کے چند روز بعد چارلس کو پیرس بھیج دیا گیا جہاں سونگ کے جاننے والے چند ویتنامی مہاجر آباد تھے. پیرس میں چارلس کو ایک ریسٹورنٹ میں ملازمت مل گئی. وہ دن بھر کچن میں بیٹھا جھوٹے برتن دھوتا رہتا. فرش کی صفائی بھی اس کے فرائض میں شامل تھا. تین ماہ کے اندر اس نے کئی ہوٹل تبدیل کیے. اسے نہ تو یہ کام پسند تھا اور نہ ہی اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ تھا لیکن وہ جس ہوٹل میں بھی جاتا اسے یہی گھٹیا کام ملتا. بالآخر ۱۹۶۰ء کے آخر میں وہ لاکوپل نامی ریسٹورنٹ پہنچ گیا. لاکوپل ان دنوں پیرس کا بہترین ریسٹورنٹ تھا اور یہاں چارلس کو زیادہ کام بھی نہیں کرنا پڑتا تھا. ایک رات وہ کچن میں برتن صاف کر رہا تھا کہ ایک ویٹر نے اسے اشارہ کرتے ہوئے کہا.

"چارلس! کوئی آدمی تم سے ملنا چاہتا ہے."

"کون؟" چارلس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا.

"کوئی گاہک ہے غیر ملکی۔ لباس سے خاصا دولتمند نظر آتا ہے." ویٹر نے بتایا.

چارلس کو ریسٹورنٹ کے اس ہال میں جانے کی اجازت نہیں تھی جہاں گاہکوں کی آمد و رفت تھی لیکن اس وقت اسے اجازت مل گئی. وہ ہال میں داخل ہو کر میزوں کے گرد چکراتا ہوا اس میز کے قریب پہنچا جہاں قیمتی لباس میں ملبوس وہ اجنبی اس کا منتظر تھا.

"گورمکھ!" وہ شخص اٹھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا. چارلس بری طرح چونک گیا. طویل عرصہ بعد کسی نے اسے اس نام سے مخاطب کیا تھا. وہ عجیب سی نگاہوں سے اجنبی کی طرف دیکھنے لگا." میں سوبھراج ہوں. بھوانی سوبھراج۔" اجنبی نے اپنا تعارف کرایا.

چارلس کے صبر کا بندھن ٹوٹ گیا. وہ باپ سے چمٹ کر پھوٹ

پھوٹ کر رونے لگا۔ پھر چیخ چیخ کر دیٹروں کو بتانے لگا کہ اس کا باپ اسے لینے کے لیے آگیا ہے۔

بھوانی سوبھراج ایک کاروباری دورے پر پیرس آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اب سائیگون میں اس کی کئی دکانیں ہیں اور اس کا شہر کے معززین میں شمار ہونے لگا ہے۔ وہ چارلس کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے تاکہ وہ پھیلے ہوئے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹا سکے۔ مارسلز میں سونگ اور الفانسو سے مشورے کے بعد چارلس نے پاسپورٹ کے لیے درخواست دے دی، لیکن بڑی مشکل سے اسے صرف یکطرفہ اجازت نامہ مل سکا۔ اس اجازت نامے کی رو سے وہ فرانس سے صرف ویتنام جا سکتا تھا اسے واپسی کی اجازت نہیں تھی۔ بھوانی سوبھراج نے بتایا کہ سائیگون پہنچنے کے بعد اس کے لیے کوئی مشکل نہیں رہے گی۔ وہ اپنے تعلقات سے کام لے کر چارلس کے لیے ہندوستانی شہریت کے کاغذات بنوالے گا۔

پیرس سے سائیگون روانہ ہونے سے پہلے چارلس نے اپنی ماں کو خط لکھا جس میں مندرجہ ایک بات کو کئی مرتبہ دہرایا گیا تھا۔

"ماما! میں نہ کہتا تھا کہ میرے باپ کو مجھ سے محبت ہے۔ وہ مجھے تلاش کرتا ہوا بالآخر میرے پاس پہنچ گیا۔ اب میں اس کے ساتھ جا رہا ہوں، اپنے خوابوں کی جنت میں جہاں میں ہوں گا، میرا باپ ہوگا اور ہماری چاہت ہوگی۔ کیا یہ ایک معجزہ نہیں؟"

لیکن آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ چارلس کی یہ پیشگوئی زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہو سکی۔ اس کی سوتیلی ویتنامی ماں ساؤ کا سلوک اس کے ساتھ نہایت گھٹیا تھا۔ بھوانی سوبھراج کی ایک بیوی ہندوستان میں بھی تھی جس سے اس کے پانچ بچے تھے، چار بچے ساؤ کے تھے اور چارلس کو ملا کر سات بچے سونگ کے تھے۔ چارلس اکثر سوچتا کہ ان سولہ بچوں میں وہ واحد بدقسمت ہے جو ماں کی ممتا اور شفقت پدری سے محروم ہے۔ ساؤ کے تیور ہر وقت بگڑے رہتے۔ وہ ہاتھ میں بید کی لمبی سی چھڑی لیے اس کے لیے احکامات صادر کرتی رہتی۔ کسی معمولی سی غلطی پر وہ چھڑی سے اس کی کھال ادھیڑ ڈالتی۔ چارلس کے دل میں اپنی سوتیلی ماں کے لیے نفرت کا لاوہ کھول رہا تھا۔ ایک روز ساؤ کے ہاتھوں پٹتے ہوئے اس نے چھڑی چھین کر ساؤ ہی کی مرمت کر ڈالی۔ چارلس نے گھر سے بھاگ جانا چاہا مگر بھوانی سوبھراج نے اسے باندھ کر ڈال دیا۔ دو دن بھوکا پیاسا رکھنے کے بعد اسے جو ذمہ داریاں سونپی گئیں، انہیں پورا کرنے کے لیے چارلس صبح پانچ بجے اٹھتا۔ سب سے پہلے دکان کی صفائی کرتا پھر گھر کے تمام افراد کے لیے ناشتہ تیار کرتا اور سب سے آخر میں خود ناشتہ کر کے نو بجے دکان کھولتا۔ جہاں دکان بند ہونے تک مصروف رہتا۔

چارلس اب سترہ سال کا ہو چکا تھا۔ سوبھراج کو اس کی شہریت کے کاغذات کی فکر تھی۔ اس نے سائیگون میں انڈین کونسلیٹ کو درخواست دی تو اسے بتایا گیا کہ چارلس کو کم از کم اٹھارہ مہینے ہندوستان میں بسر کرنے ہوں گے اس کے بعد اسے ہندوستان کی شہریت مل سکے گی۔ بھوانی سوبھراج نے چارلس کو ہندوستان بھیج دیا۔ اس کی تیسری بیوی اور بچے بمبئی سے کچھ فاصلے پر واقع پونا شہر کے نواح میں رہتے تھے لیکن وہاں بھی چارلس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوا۔ وہ اس غلامانہ زندگی سے جلد ہی بیزار ہو گیا اور گاؤں سے فرار ہو کر بمبئی پہنچ گیا۔ جہاں کئی روز کے انتظار کے بعد اسے سائیگون جانے والے ایک بحری جہاز کے کارگو میں چھپنے کا موقع مل گیا لیکن سائیگون کی بندرگاہ پر جہاز سے اترنے سے پہلے ہی پکڑا گیا۔ اطلاع ملنے پر بھوانی سوبھراج نے پچیس فرانک کرایہ دے کر چارلس کی جان بچائی اور چند حقائق اس پر واضح کر دیے۔

نمبر ۱: یہ کہ عارضی پرمٹ پر اسے صرف چھ ماہ کے لیے ویتنام میں قیام کی اجازت تھی اور یہ مدت اب ختم ہونے والی ہے۔ اس کے بعد اسے گرفتار کر کے جیل میں ٹھونس دیا جائے گا اور کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔

نمبر ۲: سوبھراج اب اس پر ایک پائی بھی خرچ کرنے کو تیار نہیں۔

نمبر ۳: ہندوستانی شہریت حاصل کرنے کے لیے اسے مقررہ مدت تک بمبئی میں اپنے سوتیلے بہن بھائیوں کے پاس رہنا ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

مئی ۱۹۶۲ء میں چارلس ایک بار پھر ویتنامی جہاز ایس۔ ایس۔ لاؤس کے ذریعے بمبئی پہنچ گیا لیکن امیگریشن کے حکام نے اسے جہاز سے نہیں اترنے دیا کیونکہ اس کے پاس نہ تو ضروری کاغذات تھے اور نہ ہی پاسپورٹ۔ جہاز ران کمپنی کی انتظامیہ نے بھوانی سوبھراج کو صورتحال سے مطلع کرتے ہوئے خط لکھا کہ یہ جہاز سات ہفتے بمبئی میں رکنے کے بعد دو جولائی کو مارسلز کے لیے روانہ ہو جائے گا۔ اگر سوبھراج اپنے بیٹے کو واپس سائیگون بلانا چاہتا ہے تو اس کا کرایہ بھیج دے۔

چارلس سوبھراج کو جہاز سے بمبئی بندرگاہ کی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ چار ہفتے بعد بھوانی کی طرف سے خط کا جواب مل گیا۔ اس نے جہاز راں کمپنی کی انتظامیہ کو مطلع کیا کہ وہ چارلس کے کرائے کا انتظام نہیں کر سکتا اسے مارسلز اس کی ماں کے پاس بھیج دیا جائے۔ چارلس یہ خط پڑھ کر چیخ اٹھا۔

"نہیں نہیں، یہ جھوٹ ہے۔" وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولا۔ "یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، میرا باپ بہت دولتمند ہے اور وہ مجھے بہت چاہتا ہے۔"

لیکن اپنے باپ کے بارے میں خوش فہمی تو خود چارلس کو تھی۔ وہ ایک ایسے ہندو بنیے کی محبت میں مرا جا رہا تھا جسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اب اس کے سامنے دو ہی راستے تھے یا کرایہ یا جیل۔ ایک قیدی نے اسے بتایا کہ ہندوستان خود انتشار کا شکار ہے۔ یہاں اندھیر نگری چوپٹ راج ہے۔ چارلس کو پندرہ سے بیس سال کی سزا ہو سکتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ہندوستانی پولیس اسے جیل میں ڈالنے کے بعد بھول ہی جائے اور وہ زندگی بھر جیل میں پڑا سڑتا رہے۔ چارلس لرز اٹھا۔ وہ اپنی زندگی کو اس طرح ضائع کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اس نے مارسلز میں اپنی ماں کو ٹیلیگرام بھیجا۔

"مصیبت و اذیت میں مبتلا ہوں۔ آپ کا بیٹا آپ کی اعانت کا طلبگار ہے۔ بمبئی سے مارسلز تک کا کرایہ بھیج دیجیے۔ پلیز! خدا کے لیے مجھے برباد ہونے سے بچا لیجیے۔"

اس کے ساتھ ہی جہاز راں کمپنی نے بھی سونگ کو ایک تفصیلی خط لکھا جس میں بتایا گیا کہ بمبئی میں فرانسیسی کونسلیٹ چارلس سوبھراج کو فرانس کا تین ماہ کا عارضی ویزا دینے کو تیار ہے۔ بشرطیکہ سونگ اس کے کرائے کی رقم چھ سو اسٹھ فرانک بھیج دے بصورت دیگر چارلس کو ہندوستانی پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

مارسلز میں سونگ کو ٹیلیگرام اور خط ملا تو وہ سناٹے میں آگئی۔ اس نے الفانسو کو ان کی ہوا تک نہ لگنے دی کیونکہ اسے یقین تھا کہ الفانسو اس کی شدید مخالفت کرے گا۔ اس نے ٹیلیگرام اور خط اپنے جیولری بکس میں چھپا دیے۔ وہ انہیں بھول جانا چاہتی تھی۔ چارلس کا خیال ذہن سے نکال دینا چاہتی تھی لیکن اس رات اسے نیند نہ آسکی۔ چارلس سوبھراج کا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے گھومتا رہا۔ اس کا پہلا بچہ جس نے اسے ممتا کے جذبے سے روشناس کرایا تھا، وہ مصیبت میں تھا، اس نے ماں کو مدد کے لیے پکارا تھا۔ اگر اس نے مدد نہ کی تو ممتا کی رسوائی ہوگی۔ اس کا بیٹا ہندوستان کی جیل میں سڑتا رہے گا۔

صبح ہوتے ہی سونگ نے اپنی دو انگوٹھیاں بیچ کر مطلوبہ رقم روانہ کر دی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ وہ آخری مرتبہ اس کی مدد کر رہی ہے، اس کے بعد چارلس اس سے کسی قسم کی امید نہ رکھے۔

مارسلز کی بندرگاہ پر جہاز سے اترتے ہی چارلس سوبھراج نے سونگ کو فون کیا۔ بمبئی سے مارسلز تک، راستے میں وہ اپنی ماں ہی کے بارے میں سوچتا آیا تھا۔ یہ عورت، جس نے اسے جنم دیا تھا، اب اسے اپسراؤں سے بھی زیادہ معصوم اور ممتا کا پیکر نظر آتی تھی اور وہ سوچتا رہا تھا کہ اب اسے کوئی دکھ نہیں پہنچائے گا۔ یہ بات بھی اب اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ اس کا سہارا ماں تھی، ہندو ذہنیت والا باپ نہیں جو اس سے غلاموں سے بھی بدتر سلوک کرتا رہا تھا۔

کال سونگ ہی نے ریسیو کی تھی لیکن اب اس کے بازو چارلس کو آغوش میں لینے کو تیار نہیں تھے۔

"نہیں چارلس!" وہ سرد لہجے میں بولی۔ "اب میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی نہ ہی تمہیں گھر آنے کی اجازت دے سکتی ہوں۔ الفانسو شدید بیمار ہے، وہ تمہیں دیکھتے ہی پاگل ہو جائے گا۔ بہتر ہے کہ اب تم اس گھر سے دور رہو۔ میں دوسرے بچوں کا پیٹ کاٹ کر تمہاری مدد کرتی رہی ہوں لیکن اب کچھ نہیں کر سکتی۔"

فون بند ہوتے ہی چارلس سوبھراج کے منہ سے بے اختیار سسکاری سی نکل گئی۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے آپ کو تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کرنے لگا۔ وہ اس وقت عجیب و غریب صورتحال کا شکار تھا۔ اس کے پاس صرف نوے دن کا ویزا تھا اور بمبئی میں فرانسیسی کونسلیٹ نے نہایت واضح طور پر بتا دیا تھا کہ کسی صورت میں بھی ویزا نہیں بڑھایا جائے گا۔ اس کی جیب خالی تھی اور اسے اس وقت تک کوئی کام بھی نہیں مل سکتا تھا جب تک کہ ورک پرمٹ نہ مل جاتا اور ورک پرمٹ کا حصول آسان نہیں تھا۔ ان دنوں شہر میں الجزائری مہاجرین کی بھرمار تھی جس کی وجہ سے کام کی تلاش میں کچھ اور دشواریاں بھی پیش آسکتی تھیں بہرحال، ایک ریسٹورنٹ میں اسے کام مل گیا لیکن دوسرے ہی دن ایک پلیٹ توڑنے کے جرم میں اسے وہاں سے نکال دیا گیا۔ وہ ایک اور ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جہاں اسے نہایت حقیر معاوضے پر نالیاں اور گٹر صاف کرنے کی پیشکش کی گئی تو وہ غبارے کی طرح پھٹ پڑا۔

"مجھے چار زبانوں پر عبور حاصل ہے اور آدھی دنیا گھوم چکا ہوں، میرا باپ سائیگون کا کروڑپتی ہے اور تم مجھے گٹر صاف کرنے کو کہہ رہے ہو۔"

نومبر ۱۹۶۲ء میں چارلس کا نوے دن کا ویزا ختم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس سے ایک حماقت بھی سرزد ہو گئی۔ ان دنوں وہ ایک ویتنامی لڑکی کے عشق میں مبتلا تھا۔ اس رات وہ چوری کی کار پر اپنی محبوبہ کو سیر کرانے لے گیا اور لیونبراسے ہوتے ہوئے وہ گریس پہنچ گئے۔ یہ وہی شہر ہے جہاں ملکہ وکٹوریہ موسم سرما کی تعطیلات گزارا کرتی تھی اور جس کے نواح میں یاسمین اور گلاب کے کھیت فرانس کی پرفیومری کی صنعت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ گریس سے واپس آتے ہوئے تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنے پر ایک پولیس والے نے اسے روک لیا۔ اس کے ساتھ ہی انکشاف ہوا کہ نہ صرف کار چوری کی تھی بلکہ چارلس ویزا ختم ہونے کے بعد غیر قانونی طور پر فرانس میں قیام پذیر ہے۔ اسے چھ ماہ کی سزا ہوئی اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ سزا کے ختم ہوتے ہی اسے فرانس سے نکال دیا جائے گا۔ جیل میں چارلس سوبھراج نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ ایک قیدی سے کراٹے کی تربیت حاصل کرنے کے علاوہ دوسرے قیدی سے اطالوی زبان بھی سیکھ لی جسے مختصر سی مدت میں وہ بڑی روانی سے بولنے لگا تھا۔

جیل سے رہائی کے دن چارلس کو عدالت سے فرانس میں قیام کی مزید تیس دن کی اجازت مل گئی تاکہ اس دوران وہ اپنے معاملات طے کر سکے۔ وہ سیدھا اپنی ماں کے پاس پہنچا جسے اس کے پکڑے جانے یا سزا کا کوئی علم نہیں تھا۔ چارلس نے بھی اسے اس سلسلے میں کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اٹلی جانا چاہتا ہے تاکہ وہاں سے اپنے کاغذات بنوا کر دوبارہ فرانس آسکے۔ اس نے اخراجات کے لیے چند سو فرانکس کا مطالبہ کیا۔

سونگ کے چہرے کا کرب نمایاں تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور وہ بدنصیب ماں اپنے بیٹے کی طرف دیکھ رہی تھی جو اب بیس سال کا ہونے والا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں، میرے پاس ایک فرانک بھی نہیں ہے۔ میں ابھی تک

وہی قرض نہیں اتار سکی جو رقم تمہیں ممبئی بھیجی تھی۔ تم جوان ہو، اپنے طور پر کچھ کر سکتے ہو تو کر لو، میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"سمجھ گیا ماما!" چارلس سوبھراج کا موڈ ایکدم بگڑ گیا۔ "الفانسو کے بچوں کے لیے تمہارے پاس بہت کچھ ہے، میرے لیے تمہارے دامن میں کچھ نہیں، نہ ایک وقت کی روٹی اور نہ پیار، جو میرا حق تھا۔"

"تم میرا دامن پہلے ہی تار تار کر چکے ہو۔ میرے پاس تمہارے لیے اب واقعی کچھ نہیں۔" سونگ نے کرخت لہجے میں کہتے ہوئے اسے باہر کا راستہ دکھا دیا۔

❋

پیرس چارلس سوبھراج کے لیے وقتی پناہ گاہ ثابت ہوا۔ یہاں ویتنامی مہاجرین کی کثرت تھی۔ ویتنامی نقوش کے باعث وہ بھی ان میں کھپ گیا۔ وہ مختلف ہوٹلوں میں ملازمت کرتا رہا۔ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر بڑی احتیاط سے اٹھا رہا تھا۔ کسی پولیس والے کو دیکھ کر دور ہی سے راستہ بدل لیتا۔ اسے خدشہ تھا کہ کسی پولیس والے کے سوال جواب سے اس کی پول نہ کھل جائے۔ ان دنوں جنرل ڈیگال کی الجزائر سے متعلق پالیسی سے اختلاف کے سلسلے میں تخریب کاروں نے حکومت کے خلاف سرگرمیاں شروع کر رکھی تھیں۔ پولیس والے خصوصاً رات کے وقت ہر شخص کو روک کر باز پرس کرتے۔ ۱۹۶۳ء کا کرسمس چارلس سوبھراج نے ایک ویتنامی ہوٹل کے (کاسینو) جوئے خانے میں گزارا، جہاں وہ سب کچھ ہار گیا۔ حتیٰ کہ وہ کوٹ بھی جو سائیگون میں اس کے باپ نے سی کر دیا تھا۔ آدھی رات کو وہ شکست خوردگی کا شدید تر احساس لیے جوئے خانے سے باہر نکلا اور پولیس کے خوف سے چوروں کی طرح تاریکی کی آڑ میں چلنے لگا۔ بھوک اور سردی سے اس کی حالت بدتر تھی۔ وہ دل ہی دل میں اپنے باپ بھوانی سوبھراج اور ماں سونگ کو گالیاں بکتا رہا جن کی وجہ سے اسے یہ دن دیکھنا نصیب ہو رہا تھا۔ ایک سنسان گلی سے گزرتے ہوئے اس کی نظریں ایک بیکری کے شوکیس پر جم گئیں۔ بیکری بند تھی۔ اندر بتی جل رہی تھی جس کی روشنی میں شوکیس میں سجی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر اس کی بھوک چمک اٹھی۔ اس نے ایک پتھر اٹھا کر شوکیس کے شیشے پر دے مارا اور چھپ کر ردِعمل کا انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ گزر گئے۔ جب کوئی بھی سامنے نہیں آیا تو ٹوٹے ہوئے شیشے کے راستے بیکری میں گھس گیا۔ کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ شمپئن کی ایک بوتل بھی اس کے ہاتھ لگی۔ وہ دریائے سین کے کنارے پہنچ گیا اور رات بھر کیک کھاتا اور شمپئن پیتا رہا۔ علی الصبح جب فاترے ڈیم کے گھڑیال نے پیرس کے لوگوں کو جگانا شروع کیا تو چارلس سوبھراج نیند کی آغوش میں پہنچ رہا تھا۔

رومین ویتنامی تھا جو کئی برسوں سے پیرس کی سڑکوں پر اپنے فن کے جوہر دکھا رہا تھا۔ چوری، رہزنی، زمین دوز ریلوے میٹرو میں اکا دکا مسافروں کو لوٹنا اور کاریں چرانا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ چارلس سوبھراج نے پہلی ہی ملاقات میں اسے متاثر کیا تھا۔ وہ چارلس کو اپنا معتمد خاص بنانا چاہتا تھا لیکن چونکہ چارلس کے پاس شناختی کاغذات تک نہیں تھے اور وہ کسی بھی وقت فرانس میں غیر قانونی قیام کے جرم میں پولیس کی گرفت میں آ سکتا تھا، اس لیے رومین اس کی طرف سے خاصا محتاط تھا لیکن وہ چارلس کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو پہچان گیا تھا چنانچہ ایک رات وہ اسے پیرس کے تاریک علاقے میں واقع ایک ایسے مکان میں لے گیا جہاں پر موجود ایک فرانسیسی بوڑھے نے اس کے سامنے لاتعداد کاغذات پھیلا دیے۔ جن میں اسٹوڈنٹس ویزا، شہریت کے شناختی کاغذات، ورک پرمٹ اور مختلف ممالک کے پاسپورٹ موجود تھے۔ ہر چیز کی قیمت مختلف تھی۔ پانچ سو سے پانچ ہزار فرانک تک کوئی بھی دستاویز خریدی جا سکتی تھی۔ دوسری میز پر وہ چیزیں بکھری پڑی تھیں، جو اس قسم کی جعلسازی میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

"ہاں، اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟ کیا بننا چاہتے ہو؟" رومین نے چارلس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"فی الحال کچھ نہیں۔" چارلس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اب تک قانونی طور پر اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ کسی ملک کا شہری نہیں تھا۔ اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس کے سامنے بیسیوں ممالک کے پاسپورٹ بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بوڑھے کو مطلوبہ رقم کی ادائیگی کے بعد کسی بھی ملک کا شہری بن سکتا تھا۔

۱۹۶۴ء کے موسم بہار تک اس نے چوری، ڈکیتی اور رہزنی کی گیارہ وارداتیں کیں۔ وہ تین ہزار فرانک جمع کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ جعلی پاسپورٹ خرید سکے۔ ممکن ہے وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جاتا لیکن ایک رات پیرس کی ایک حسینہ کو چوری کی کار میں سیر کراتے ہوئے تیز رفتاری کے الزام میں پکڑا گیا۔ شناختی کاغذات نہ ہونے کی وجہ سے عدالت نے اسے تین سال کے لیے جیل بھیج دیا۔ چارلس پہلے تو مجسٹریٹ کے سامنے گڑگڑاتا رہا لیکن پھر ایکدم خاموش ہو گیا اور پولیس والوں کے ساتھ خاموشی سے سر جھکائے پوائسری جیل کی طرف چل دیا۔

پیرس کے نواح میں تقریباً دو سو سال پرانی پوائسری جیل تین حصوں پر مشتمل تھی۔ ایک حصہ عام قیدیوں کے لیے مخصوص تھا۔ دوسرا خطرناک قیدیوں کے لیے اور تیسرا غیر ملکیوں کے لیے۔ چارلس کو اس تیسرے بلاک میں رکھا گیا جہاں تقریباً ڈیڑھ سو قیدی پہلے ہی سے موجود تھے۔ دن کے وقت ان قیدیوں کو ایک بڑے ہال میں رکھا جاتا لیکن رات کو انہیں ڈربہ نما چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں میں ٹھونس دیا جاتا۔ ایک کوٹھری اگرچہ دو قیدیوں کے لیے بھی ناکافی تھی لیکن ان میں بیک وقت دس دس قیدی بھر دیے جاتے۔ دن میں جب قیدی بڑے ہال میں ہوتے تو جیل کے محافظ ہر کوٹھری کی تلاشی لیتے۔ کسی قیدی کو جسم کے کپڑوں کے علاوہ کوئی چیز اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کے نام آنے والے خطوط بھی بڑی سختی سے سنسر کیے جاتے۔ بعض اوقات خطوط قیدیوں تک پہنچانے کے بجائے ضائع کر دیے جاتے۔

نومبر ۱۹۶۶ء میں چارلس کی ملاقات فیلکس نامی ایک ایسے ادھیڑ عمر شخص سے ہوئی جو ایک سماجی خدمتگار کی حیثیت سے مہینے میں ایک دو مرتبہ جیل کے قیدیوں سے ملاقات کیا کرتا تھا۔ چارلس اس کی باتوں سے بیحد متاثر تھا۔ اسے جلد ہی پتا چل گیا کہ جیل کے افسران فیلکس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ فیلکس ہی کی درخواست پر چارلس کو ایک الگ کوٹھری دے دی گئی۔ اسے لکھنے پڑھنے کا سامان بھی مہیا کر دیا گیا۔ فیلکس اب اکثر چارلس سے ملاقات کے لیے جیل آنے لگا۔ وہ اسے زندگی کا فلسفہ سمجھانے کی کوشش کرتا۔ اس نے چارلس کو قانون اور فلسفے کی بہت سی کتابیں بھی لا دیں جن کا وہ مطالعہ کرتا رہتا۔ چارلس کی کہانی سننے کے بعد فیلکس اس کی مدد پر آمادہ ہو گیا اور پیرس میں ہندوستانی سفارت خانے سے رابطہ قائم کر کے اس کے لیے ہندوستان کی شہریت کے کاغذات حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن سفارتی آفیسر نے اس کی فائل کا مطالعہ کرنے کے بعد صرف ایک جملے پر بات ختم کر دی۔

"اس شخص کی قسمت کا فیصلہ ہندوستان ہی میں ہو گا۔"

فیلکس نے چارلس کے باپ بھوانی سوبھراج کو بھی خط لکھا کہ اس کا بیٹا پیرس کی جیل میں سزا بھگت رہا ہے۔ اگر باپ شروع ہی سے چارلس پر توجہ دیتا تو شاید آج اسے ان حالات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ چارلس اب بہت بدل چکا ہے۔ اگر سوبھراج اسے اپنا لے تو اس کی زندگی بدل سکتی ہے۔ اس کے ساتھ چارلس نے بھی باپ کو ایک تفصیلی خط لکھا لیکن کئی ہفتے گزرنے کے بعد جب دونوں میں سے کسی خط کا جواب نہیں آیا تو چارلس نے ایک اور خط لکھا لیکن اس کا بھی جواب نہیں ملا۔

۱۹۶۶ء کے کرسمس سے ایک دن پہلے جب فیلکس جیل میں داخل ہوا تو اس کے پاس سوبھراج کے لیے فلسفے اور قانون کی چند نئی کتابوں کے علاوہ کچھ تحائف بھی تھے۔ سب سے بڑا تحفہ وہ خط تھا جس پر ویتنام کی ٹکٹیں چسپاں تھیں۔

"یہ تمہارے باپ کا خط ہے۔ میں نہ کہتا تھا کہ وہ میرے خط کا جواب ضرور دے گا۔" فیلکس نے اسے خط دکھایا۔

"کیا لکھا ہے، تم ہی بتا دو۔ میں خود یہ خط نہیں پڑھنا چاہتا۔" چارلس نے کہا۔

فیلکس نے خط کھول لیا اور بیچ میں کہیں رکے بغیر پڑھنے لگا۔

بھوانی سوبھراج نے فیلکس کو مخاطب کرتے ہوئے چارلس کی پوری داستانِ حیات لکھی تھی۔ اس نے فیلکس کو یقین دلانے کی کوشش کی وہ بیٹے کو راہ راست پر لانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا۔ اس کی وجہ سے اس نے بے شمار مالی نقصانات بھی اٹھائے ہیں لیکن چارلس اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ ۱۹۶۴ء میں وہ ایک بار پھر چارلس کو لینے کے لیے فرانس آیا تھا لیکن مارسلز میں اس کی ماں نے اس کے بارے میں قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ سونگ کو بھی پتا نہیں تھا کہ اس کا بیٹا کہاں ہے۔ تمہارے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ راہ راست پر آ رہا ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کا وعدہ کرے تو میں اسے ایک اور موقع دینے کو تیار ہوں۔

چارلس سوبھراج فیلکس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ جن دنوں بھوانی سوبھراج مارسلز میں اسے تلاش کرتا پھر رہا تھا انہی دنوں وہ شناختی کاغذات حاصل کرنے کے لیے پیرس میں پے درپے چوریوں کی وارداتیں کرتا پھر رہا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہاری ماں بھی فرانس میں موجود ہے۔ تم نے تو کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔" فیلکس نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اپنی ماں کے بارے میں بتاتے ہوئے ڈرتا تھا لیکن اگر تم مارسلز میں اس سے ملنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

"میں چند روز بعد ایک کام کے سلسلے میں مارسلز جانے والا ہوں، کوشش کروں گا کہ اس دوران تمہاری ماں سے بھی ملاقات ہو سکے۔"

"میری ماں میرے بارے میں تمہیں وہی کچھ بتائے گی جو میں چھپانا چاہتا تھا۔ میرے ماضی کی یادیں کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہیں۔ میری زندگی میں خوشی کا عمل دخل بہت کم اور عارضی رہا ہے۔ میں ہمیشہ بدتر لمحات کا منتظر رہا ہوں۔ اگر میرے ماضی سے آگاہ ہو کر تم جیسا شفیق اور مہربان دوست بھی دور ہٹ جائے تو مجھے کوئی حیرت نہ ہو گی۔ بہرحال، ماں سے ملاقات کے بعد میں تمہارے تاثرات ضرور جاننا چاہوں گا۔"

فیلکس کے جانے کے بعد چارلس حسبِ معمول قانون کی کتاب کے مطالعہ میں غرق ہو گیا۔ جیل کے ایک اور قیدی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"کچھ عرصہ بعد تو تم رہا ہونے والے ہو۔ قانون کے مطالعہ کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہر قسم کی قانون شکنی کے لیے قانون کی باریکیوں سے آگاہ ہونا بہت ضروری ہے۔" چارلس نے جواب دیا۔

اس کے تقریباً ایک ہفتہ بعد فیلکس، چارلس سوبھراج کی ماں سے ملاقات کر کے واپس آگیا۔ وہ سونگ سے کچھ ایسی باتیں معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا جن سے چارلس کے مسئلے کے حل میں مدد مل سکتی تھی۔ پیرس واپس پہنچتے ہی اس نے ایک وکیل سے رابطہ قائم کیا جو کئی روز تک قانونی موشگافیوں کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ چارلس سوبھراج کو قانونی طور پر فرانس کی شہریت مل سکتی ہے۔ فوراً ہی عدالت میں رٹ دائر کر دی گئی اور یہ موقف اختیار کیا گیا کہ چونکہ چارلس گورمکھ سوبھراج نے سائیگون میں جنم لیا تھا، اس دور میں سائیگون، فرانسیسی عملداری میں تھا اس طرح فرانس کی شہریت حاصل کرنا چارلس کا قانونی حق ہے۔ عدالت نے وکیل کا یہ موقف تسلیم کرتے ہوئے چارلس سوبھراج کو فرانس کی شہریت دے دی۔ اور ۱۹۶۹ء میں رہائی سے چند روز پہلے چارلس سوبھراج نے جب یہ خبر سنی تو فرطِ مسرت سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد فیلکس چارلس کو اپنے گھر لے آیا۔ سب سے پہلے اس نے چارلس کے لیے ریڈی میڈ کپڑے، جوتے اور چند دوسری چیزیں خریدیں جن پر تقریباً ساڑھے تین سو ڈالر خرچ ہوئے۔ چارلس سوبھراج کی رہائی کی خوشی میں فیلکس نے اسی رات دعوت کا اہتمام کیا تھا جس میں اس کے چند قریبی دوست شامل تھے۔ چارلس، ہیلن نامی اس لڑکی کی طرف مائل تھا جو اس دعوت میں سب سے زیادہ منفرد نظر آرہی تھی۔ چارلس کی نیت بھانپ کر فیلکس نے اسے خبردار بھی کیا تھا کہ وہ ہیلن پر وقت ضائع نہ کرے کیونکہ وہ ایک ٹھوکر کھا چکی ہے اور ظاہر ہے ایسی دل شکستگی میں چارلس کو مایوسی و ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا مگر چارلس نے اس کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی۔

ہیلن کی عمر بمشکل بیس سال رہی ہوگی۔ چارلس کے خیال میں ایسی حسین لڑکی اب تک اس کی نظروں سے نہیں گزری تھی۔ اس کا باپ پیرس کے نواح میں ایک چھوٹی سی دکان کا مالک تھا جبکہ ہیلن بھی پیرس کی ایک انوسٹمنٹ کمپنی میں کلرک کی حیثیت سے ملازم تھی۔ چارلس کی باتوں اور شخصیت نے اسے بیحد متاثر کیا تھا اور وہ بھی اس میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔

کئی ہفتے گزر گئے۔ چارلس سوبھراج اب بھی فیلکس کے ساتھ رہ رہا تھا۔ فیلکس نے ایک دو جگہوں پر اس کے لیے کام کا بندوبست کیا تھا لیکن چارلس کو کوئی بھی کام پسند نہیں آرہا تھا۔ اس کا زیادہ وقت ہیلن کے ساتھ تفریحی مقامات پر گھومتے ہوئے گزرتا۔ فیلکس شام کو جب گھر میں داخل ہوتا تو ہر چیز بکھری ہوئی نظر آتی۔ الماری میں سلیقے سے آراستہ کپڑے پلنگ اور کرسیوں پر ڈھیر کی صورت میں نظر آتے۔ چارلس، بڑی بے تکلفی سے اس کی چیزیں استعمال کر رہا تھا۔ بالآخر فیلکس نے تنگ آکر اسے الگ مکان لینے کو کہہ دیا۔ دو چار روز کی کوشش کے بعد چارلس کو بالآخر ہیلن کے گھر کے قریب ہی ایک چھوٹا سا فلیٹ مل گیا۔

چارلس سوبھراج کو آگ بجھانے والے آلات تیار کرنے والی کمپنی میں سیلز مین کی حیثیت سے ملازمت مل گئی تھی۔ وہ دن بھر سڑکوں پر مارا مارا پھرتا مگر اسے کبھی کوئی آرڈر نہ مل سکا۔ وہ بائیس تیئس سال کا ایک بھرپور اور وجیہہ نوجوان تھا۔ اس کی شخصیت متاثر کن تھی خصوصاً عورتوں کے لیے اس میں بے پناہ کشش تھی۔ اس نے اپنی اس امتیازی خصوصیت سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کی۔ وہ دفتر میں کام کرنے والی لڑکیوں سے بڑی بڑی رقمیں قرض لے لیتا جنہیں واپس کرنا بھول جاتا۔ ایک مرتبہ اس نے کمپنی کے باس کی سیکریٹری سے بھی لمبی رقم قرض لے لی۔ دفتری اوقات کے دوران چارلس اکثر سیکریٹری کے کمرے میں آجاتا۔ بوڑھے باس کو جب پتا چلا تو اس نے اسی روز چارلس کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ کیونکہ وہ خوبصورت ...... لیڈی سیکریٹری اتفاق سے کمپنی کے بوڑھے باس کی بیوی بھی تھی۔

اس دوران چارلس سوبھراج پیرس کی اعلیٰ سوسائٹی میں متعارف ہو چکا تھا۔ بڑے گھرانوں کی خواتین اسے اپنے ہاں دعوتوں پر مدعو کرنے پر فخر محسوس کرتیں۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ چارلس کے تعلقات بعض ایسے لوگوں سے بھی تھے جنہیں معاشرہ اور قانون پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ ایسے لوگوں میں پورلو، چارلس کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ وہ رات کو پورلو اور اس کے دو ساتھیوں کے ساتھ مل کر راہزنی اور ڈکیتی کی وارداتیں کرتا جس سے اسے اپنے اخراجات کے لیے اچھی خاصی رقم مل جاتی تھی۔ چارلس سوبھراج بہت محتاط ہو کر کام کرتا جب چھوٹی چھوٹی وارداتوں سے ملنے والی رقم اس کے لیے ناکافی ثابت ہونے لگی تو اس نے ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ امیر لوگوں کے ہاں دعوتوں میں شرکت کے دوران وہ خوب گھوم پھر کر گھر کا جائزہ لے لیتا اور بعد میں اپنی یادداشت کے بھروسے پر اس گھر کا نقشہ بنا کر پورلو اور اس کے ساتھیوں کے حوالے کر دیتا۔ جو دوسرے تیسرے دن اس گھر کا صفایا کر ڈالتے اور چارلس کو اس کا حصہ مل جاتا۔

فیلکس سے چارلس سوبھراج کے تعلقات خوشگوار تھے۔ اسے اپنا محسن سمجھتے ہوئے چارلس اس کا احترام بھی بہت کرتا تھا۔ فیلکس کو قطعی علم نہیں تھا کہ چارلس ہی دراصل شہر کے بڑے بڑے گھروں میں ہونے والی ڈکیتی کی ان وارداتوں کا ذمہ دار ہے۔ البتہ ہیلن کے معاملے میں اسے کچھ اختلاف ضرور تھا۔ اس کا خیال تھا کہ چارلس اس معصوم لڑکی کی زندگی برباد کر دے گا۔ وہ وقتاً فوقتاً چارلس کو اس سے دور رہنے کی تلقین کرتا رہتا جسے چارلس ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتا۔

یہ اگست ۱۹۶۸ء کی بات ہے۔ چارلس، ہیلن کو ایک خوبصورت چم چماتی ہوئی گاڑی میں بٹھا کر ڈونوائل کی طرف لے گیا۔ وہ راستے میں ہیلن کو بتا رہا تھا کہ اس کے کروڑپتی باپ نے اپنے کاروبار میں حصہ دار بنانے کے لیے اسے سائیگون بلایا ہے مگر وہ ہیلن کے بغیر کہیں نہیں جانا چاہتا۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ ہیلن سے شادی کے لیے کہہ چکا تھا مگر وہ اپنے ماں باپ کو رضامند نہیں کر سکی تھی۔ اس وقت بھی ہیلن نے چند روز کی مہلت مانگی تاکہ اپنے باپ کو قائل کر سکے۔

اس رات ڈونوائل کے کاسینو میں چارلس بہت دیر تک جوا کھیلتا رہا۔ آدھی رات تک وہ چھ ہزار فرانک جیت چکا تھا۔ ہیلن اسے بار بار روک رہی تھی کہ اب اسے بازی ختم کر کے واپس چلنا چاہیے لیکن اس نے اسے اس بری طرح ڈانٹ دیا کہ ہیلن سہم گئی۔ چارلس کا یہ روپ اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد چارلس سب کچھ ہار گیا حتیٰ کہ وہ پچاس فرانک بھی جو ہیلن نے اپنے پرس میں چھپا رکھے تھے۔ واپس جاتے ہوئے چارلس کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان ابل رہا تھا اور ہیلن پسنجر سیٹ پر سہمی ہوئی بیٹھی کھڑکی سے باہر تاریکی میں گھور رہی تھی۔ چارلس کار کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک بار پھر شادی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ خوف کے مارے ہیلن کے چہرے پر زردی پھیل گئی۔ وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔ کار کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔ چارلس کی کوئی معمولی سی غلطی ان کی زندگیوں کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ ہیلن چیخ چیخ کر گاڑی کی رفتار کم کرنے کو کہہ رہی تھی مگر چارلس نے دھمکی دی کہ اگر اس نے شادی کا اقرار نہ کیا تو وہ کار سامنے سے آنے والی کسی گاڑی یا سڑک کے کنارے کسی درخت سے ٹکرا دے گا۔ بالآخر ہیلن کو اقرار کرنا پڑا۔ چارلس نے رفتار کم کر دی لیکن اسی لمحہ عقب میں پولیس کار کے سائرن کی آواز سن کر اس نے رفتار ایک بار پھر بڑھا دی اور اس کے ساتھ ہی کار کو دائیں طرف ایک کچی سڑک پر موڑ دیا۔ تیز رفتار کار بے قابو ہو کر ایک کھیت کی منڈیر سے ٹکرا کر قلابازیاں کھاتی ہوئی کئی گز دور جا کر رک گئی۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ اس خوفناک حادثے میں معمولی چوٹوں کے علاوہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ پولیس نے چارلس کو تیز رفتاری کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ کار بھی چوری کی تھی۔

چارلس کو آٹھ ماہ کی سزا ہوگئی۔ روٹن کی جیل میں اس سے ملاقات کے لیے آنے والوں میں ہیلن اور فیلکس کے علاوہ پورلو اور اس کا ایک ساتھی بھی شامل تھا۔ فیلکس ہر ملاقات پر چارلس کو سمجھانے کی کوشش کرتا چارلس پہلے تو اس کی باتیں خاموشی سے سنتا رہتا لیکن پھر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور اس نے فیلکس کو برا بھلا کہتے ہوئے اس سے قطع تعلق کا اعلان کر دیا۔ وہ ہیلن سے کسی طرح بھی دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ اس طرح فیلکس کچھ عرصہ کے لیے اس کی زندگی سے نکل گیا۔

پورلو نے جیل کے افسران سے یہ اجازت حاصل کر لی تھی کہ وہ کبھی کبھار چارلس کے لیے گھر کا پکا ہوا کھانا لے آیا کریں گے۔ جیل کے حکام نے ہفتے میں صرف ایک دن کھانا لانے کی اجازت دے دی۔ کھانا دینے کے دوسرے دن پورلو جب خالی ٹفن واپس لے کر جاتا تو ٹفن کے ایک ڈبے کی دوہری تہ میں اسے پیرس کے کسی نہ کسی ایسے دولت مند گھر کا نقشہ مل جاتا جہاں چارلس کبھی دعوت اڑا چکا ہوتا۔ پورلو اور اس کے ساتھی اسی رات اس گھر کا صفایا کر دیتے۔ چارلس کا حصہ وہ الگ جمع کرتے جاتے تھے۔ اس طرح جب وہ مارچ ۱۹۶۹ء میں جیل سے رہا ہوا تو اس کے پاس پندرہ ہزار فرانک کی رقم جمع ہو چکی تھی۔ جیل سے نکلتے ہی اس نے فیلکس سے اپنے رویے کی معافی مانگ لی اور اس کے چند روز بعد ہیلن سے شادی کر لی۔ شادی کی اس تقریب میں فیلکس بھی شریک تھا۔

۱۹۷۰ء کے موسم بہار میں چارلس سوبھراج کے لیے ہیلن کا یہ انکشاف کسی دھماکے سے کم نہیں تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے لیکن شومئی قسمت سے انہی دنوں چارلس کو حکومت کی طرف سے نوٹس ملا کہ فرانس کے ایک شہری کی حیثیت سے اسے کم از کم اٹھارہ مہینے لازمی فوجی خدمات انجام دینا ہوں گی۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا لیکن چارلس کو یقین تھا کہ وہ چند ہفتوں سے زیادہ فوج میں نہیں رہ سکے گا۔ فیلکس نے وعدہ کیا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں وہ ہیلن کا خیال رکھے گا۔

چارلس سوبھراج نے اپنا یہ دعوے ثابت کر دکھایا کہ وہ زیادہ عرصہ تک فوج میں نہیں رہ سکے گا۔ چند ہفتے بعد ہی اسے میڈیکل ڈسچارج مل گیا۔ اس پر اس کے ایک ساتھی فوجی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس نے فوج میں آتے ہی عجیب و غریب حرکتیں شروع کر دیں وہ آئے دن بیمار بن جاتا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر جیسے ہی تھرما میٹر اس کے منہ میں لگاتا تو ٹمپریچر ایک سو تین سے بھی اوپر پہنچ جاتا۔ اس کے لیے وہ کونسا طریقہ اختیار کرتا تھا؟ کبھی کسی کی سمجھ میں نہ آسکا۔ وہ ہمیشہ ڈاکٹروں کو قائل کرنے کی کوشش کرتا کہ وہ خونی السر میں مبتلا ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر بھی سمجھ چکے ہوں کہ وہ محض اداکاری کر رہا ہے لیکن اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر اسے فوج کے لیے اَن فٹ قرار دے دیا اور اس طرح چند ہفتے بعد ہی وہ عیار ترین شخص فوج سے رخصت ہوگیا۔"

چارلس سوبھراج فوج سے ڈسچارج لے کر گھر پہنچا تو اس کی مالی حالت دگرگوں تھی۔ ہیلن کو ان دنوں اگرچہ اچھی غذا اور آرام کی ضرورت تھی لیکن وہ زندہ رہنے کے لیے سخت جدوجہد کر رہی تھی۔ شب و روز کی محنت سے اس کی صحت برباد ہو چکی تھی۔ چارلس کو اس کی یہ حالت دیکھ کر گہرا صدمہ پہنچا۔ اس نے اپنی سوتیلی بہن لیو سے رابطہ قائم کیا جس کا شوہر پیرس ہی میں ایک ریسٹورنٹ چلا رہا تھا۔ لیو نے ترس کھا کر چارلس کو ہوٹل میں ویٹر رکھ لیا لیکن چارلس تیسرے ہی روز لیو کے پرس سے چھ ہزار فرانک چرا لے گیا۔ یہ رقم اس نے اسی رات جوئے میں ہار دی۔ چوری کا انکشاف ہوتے ہی لیو نے پولیس کو رپورٹ کر دی اور چارلس ایک مرتبہ پھر پکڑا گیا۔

"میری نیّت چوری کی نہیں تھی،" چارلس نے فیلکس کو روتے ہوئے بتایا۔ "میں نے یہ رقم قرض سمجھ کر لی تھی تاکہ ہیلن کو بہتر خوراک اور علاج معالجے کی سہولتیں فراہم کرسکوں۔ میرا خیال تھا کہ جوئے میں جیتنے کے بعد لیو کی رقم منافع کے ساتھ واپس کردوں گا۔"

فیلکس نے لیو کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن وہ کسی طور پر بھی چارلس کو معاف کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ بالآخر کئی دن کی کوشش کے بعد فیلکس نے اسے اس بات پر راضی کرلیا کہ اگر چارلس اس کی آدھی رقم فوری طور پر ادا کردے تو وہ چارلس کے خلاف پولیس سے کیس واپس لے لے گی اور باقی رقم بھی ایک ماہ کے اندر اندر ادا کردی جائے گی۔

چارلس کے جیل سے رہا ہونے کے تقریباً دو ہفتے کے بعد ایک روز محض اتفاق سے اس کی ملاقات اپنے باپ بھوانی سوبھراج سے ہوگئی۔ جو اپنے کاروبار کے سلسلے میں اسی روز پیرس پہنچا تھا۔ ان کی یہ ملاقات کئی سال بعد ہوئی تھی۔ چارلس خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس نے اسی روز بھوانی کو پیرس کے سب سے عمدہ ریسٹورنٹ میں کھانے پر مدعو کیا۔ اس رات ہیلن بھی بہترین لباس میں تھی۔ چارلس اپنے باپ کے سامنے بچھا جا رہا تھا کھانے کے دوران اس نے بھوانی کو طلائی چین والی گھڑی پیش کی تو بھوانی حیرت زدہ سا رہ گیا۔

"یہ تحفہ آپ کے لیے ہیلن نے خریدا تھا پاپا! اس کی خواہش تھی کہ آپ کو اس سے بھی اچھی چیز پیش کی جاتی۔" چارلس نے کہتے ہوئے ہیلن کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر ایکدم عجیب وغریب تاثرات ابھر آئے تھے۔ چارلس نے میز کے نیچے سے اس کا پیر دبا دیا تاکہ کسی حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے وہ اس جھوٹ کی پول نہ کھول دے۔

دوسرے دن چارلس نے ہیلن کو نیلم کی ایک طلائی انگوٹھی پیش کی۔

"یہ قیمتی انگوٹھی آج پاپا نے تمہارے لیے خریدی تھی۔" چارلس نے بتایا۔ "لیکن وہ اسے خود تمہاری انگلی میں پہناتے ہوئے جھجک محسوس کر رہے تھے اسی لیے یہ خدمت مجھے سونپ دی اور ہاں، پاپا کے سامنے کبھی اس کا تذکرہ مت کرنا۔ شکریہ ادا کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ اس بات کے دہرائے جانے کو اچھا نہیں سمجھتے۔"

ہیلن اس تحفے سے بیحد متاثر ہوئی تھی۔ فیلکس کو بھی تحائف کے اس تبادلے کا علم ہوگیا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس طرح چارلس سسر اور بہو کی ایک دوسرے کی نظروں میں قدر بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسے حیرت تھی کہ طلائی چین والی گھڑی اور قیمتی انگوٹھی خریدنے کے لیے اس کے پاس رقم کہاں سے آگئی تھی۔

چارلس اپنے باپ کو ایک قیمتی لیموزائن گاڑی میں پیرس کی سیر کراتا رہا۔ باپ کی خاطر مدارات میں اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی آخر دو دن بعد جب بھوانی نے اعلان کیا کہ وہ کاروباری سلسلے میں جنیوا جا رہا ہے تو چارلس نے اسے اپنی گاڑی میں وہاں تک چھوڑ آنے کی پیشکش کی۔

"نہیں۔ اس طرح تمہارے کام کا ہرج ہوگا۔" بھوانی نے اعتراض کیا۔

"کوئی ہرج نہیں ہوگا۔" چارلس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تقریباً دس سال بعد آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔ آپ کی خدمت کرتے ہوئے میں عجیب سی روحانی خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ ہیلن بھی کافی عرصہ سے پیرس سے باہر نہیں نکلی۔ اس بہانے اس کی بھی تفریح ہوجائے گی۔"

اگلے روز وہ چارلس کی کار میں جنیوا روانہ ہوگئے۔ بھوانی نے بہت جلد محسوس کرلیا کہ ہیلن انجانے سے اضطراب کا شکار ہے۔ وہ خاموش بیٹھی بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی جبکہ چارلس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ باپ کو یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بہت بڑا بزنس ہے جس کی دیکھ بھال کے لیے بہت سے ملازم موجود ہیں۔ وہ بار بار جیب سے چیک بک نکال کر دکھاتا کہ بینک میں بھی اس کی خطیر رقم جمع ہے۔ اس کی ہر کہانی کے ساتھ ہیلن کے چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے۔

پیرس کے نواح میں پہنچتے ہی چارلس نے ایک بہت بڑے اسٹور کے سامنے گاڑی روک لی اور دکان میں داخل ہوکر باپ کے لیے ایک دو تحائف منتخب کیے جن کی قیمت تین ہزار آٹھ سو فرانک بنتی تھی۔ جب اس نے چیک کاٹا تو سیلز گرل نے چیک قبول کرنے سے انکار کردیا کیونکہ اس دن ہفتہ تھا، بینک بند تھے اور اکاؤنٹ کی تصدیق نہیں ہوسکتی تھی۔ سیلز گرل کے انکار پر چارلس ایکدم بھڑک اٹھا۔

"کیا تم مجھے چور یا اچکا سمجھتی ہو؟ میں پیرس کا ایک معزز شہری ہوں میرا لاکھوں کا بزنس ہے۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں اپنی بیوی اور باپ کی موجودگی میں کسی کو دھوکا دینے کی کوشش کروں گا۔ اگر تمہیں شبہ ہو تو پیرس کے اس نمبر پر فون کرکے میرے بارے میں تصدیق کرسکتی ہو۔"

سیلز گرل چارلس کے لہجے اور شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے مزید اعتراض کیے بغیر چیک قبول کرلیا۔

وہ دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے ایک ہوٹل میں رک گئے۔ کھانے کے بعد چارلس کوئی چیز لینے کے لیے ہال سے باہر نکل گیا تو سہمی ہوئی ہیلن نے بھوانی کے سامنے اس کا سارا کچا چٹھا کھول دیا۔

"آپ شاید سمجھ رہے ہوں گے کہ چارلس واقعی امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کر رہا ہے اور اس کے پاس بہت سی دولت ہے حقیقت یہ ہے کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ ہم تو نان شبینہ تک کو محتاج تھے۔ جس روز چارلس سے آپ کی ملاقات ہوئی اس نے اسی روز گھر کا سارا فرنیچر اور دیگر قیمتی سامان فروخت کردیا تھا۔ وہ جواری ہے جو رقم ہارنے کے بعد اپنے کپڑے تک داؤ پر لگا دیتا ہے۔ راتوں کو بعض پراسرار لوگ اس کے پاس آتے ہیں مجھے شبہ ہے کہ وہ منشیات کا کاروبار کرتے ہیں۔ چارلس بھی ان کے ساتھ اکثر گھر سے غائب ہوجاتا ہے۔ تحائف خریدنے کے سلسلے میں اس نے سیلز گرل کو جو چیک دیا تھا وہ بھی جعلی ہے۔ ان کا بینک اکاؤنٹ تو بہت عرصہ پہلے ہی

بند ہوچکا تھا۔ یہ کار بھی کرائے کی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکی کہ وہ ایسی حرکتیں کیوں کر رہا ہے۔ اسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں تو مرنے مارنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔"

بھوانی سوبھراج کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔ وہ کچھ دیر تک خاموشی سے ہیلن کی طرف دیکھتا رہا پھر پرسکون لہجے میں بولا۔

"مجھے افسوس ہے کہ تم نے جس شخص کو اپنا شریکِ حیات بنایا ہے اس کا کردار کسی لحاظ سے بھی قابلِ تعریف نہیں۔ میں اپنے بیٹے کو اس وقت سے جانتا ہوں جب اس نے پیروں پر چلنا شروع کیا تھا۔ وہ کوئی شیطانی روح لے کر اس دنیا میں آیا تھا۔ اگر تم اپنی بھلائی چاہتی ہو تو جلد سے جلد اس شخص سے نجات حاصل کرلو۔"

"یہ بھی میرے بس میں نہیں ہے۔" ہیلن نے بے اختیار گہرا سانس لیا "ان سب برائیوں کے باوجود میں اسے ٹوٹ کر چاہتی ہوں۔"

"پھر صبر کرنا سیکھ لو۔" بھوانی کا لہجہ سپاٹ تھا۔

چارلس کے آنے پر انہوں نے موضوع بدل دیا۔ کھانے کا بل چارلس ہی نے دیا تھا۔ راستے میں اس نے یہ بات خاص طور سے محسوس کرلی کہ بھوانی کے چہرے کے تاثرات بدلے ہوئے تھے۔ وہ زیادہ تر خاموش ہی رہا۔ جنیوا پہنچتے ہی اس نے اعلان کیا کہ وہ آج رات ہی کی فلائٹ سے سائیگون واپس جا رہا ہے حالانکہ اس کا یہاں کم از کم تین دن رہنے کا پروگرام تھا۔ چارلس کو باپ کے اس فیصلے کی تبدیلی پر شدید حیرت ہوئی مگر اس نے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ ائیرپورٹ پر باپ کو خدا حافظ کہتے ہوئے چارلس کا چہرہ ملے جلے تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

پیرس واپس پہنچتے ہی چارلس ایک بار پھر اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہوگیا لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ اگر وہ کچھ عرصہ اور اس شہر میں رہا تو اس کی آزادی خطرے میں پڑ جائے گی۔ ایک دن اس نے فیلکس سے چند گھنٹوں کے لیے اس کی وہ ایم جی گاڑی مستعار لے لی جو اپنی طبعی عمر پوری کرچکی تھی۔ اس شام اندھیرا پھیلتے ہی چارلس، ہیلن کے ہمراہ اس گاڑی پر پیرس سے نکل گیا۔ ہیلن کو جب اس کی نیّت کا پتا چلا تو وہ بدحواس سی ہوگئی۔ چارلس اس کھٹارہ سی گاڑی پر ترکی، عراق، ایران، افغانستان پاکستان اور بھارت سے ہوتا ہوا سائیگون جانا چاہتا تھا۔ چارلس نے بتایا کہ سب سے پہلے وہ چند روز کے لیے یونان جائیں گے جہاں ایک دوست سے ملاقات کرنا ہے اس کے بعد وہ ایشیا کا رخ کریں گے۔

تقریباً تین ماہ بعد فیلکس کو چارلس کا خط ملا جو اگرچہ راستے ہی میں کسی جگہ لکھا گیا تھا لیکن اس پر ثبت مہر ثابت کر رہی تھی کہ خط گیارہ ستمبر کو دہلی سے پوسٹ کیا گیا تھا۔

"ڈیئر فیلکس!

میں اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوں۔ میرے اندر اتنی جرأت نہیں تھی کہ تمہیں اپنے پروگرام سے آگاہ کرسکتا اور اگر میں روانگی سے پہلے تم سے مل بھی لیتا تو شاید میرے قدم ڈگمگا جاتے۔ تمہارے ساتھ میں نے بڑا اچھا وقت گزارا ہے۔ تمہاری محبت، تمہارے خلوص اور احسانات کو میں کبھی فراموش نہیں کرسکوں گا اور اب بھی میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں تم سے قطع تعلق نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو اپنے ماضی سے فرار چاہتا ہوں۔ بھیانک ماضی، جو دیمک کی طرح میرے مستقبل کو چاٹ رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ نئی زندگی ہمیں راس آئے گی۔ سائیگون پہنچنے کے بعد تفصیلی خط لکھوں گا۔ ہیلن ٹھیک ہے اور تمہاری ایم جی بھی ہم سے بھرپور تعاون کر رہی ہے۔ دیکھنے میں اگرچہ یہ گاڑی پرانی ہے مگر اس کا انجن بہترین حالت میں ہے۔

چارلس سوبھراج"

اس کے چند روز بعد فیلکس کو بھوانی سوبھراج کا خط ملا۔ جس نے لکھا تھا کہ اسے چارلس کا خط مل چکا ہے کہ وہ سائیگون آرہا ہے اسے چونکہ چارلس کا کوئی ایڈریس معلوم نہیں اس لیے وہ فیلکس کو خط لکھ رہا ہے تاکہ چارلس کو اس کے خیالات سے آگاہ کردیا جائے۔

"ڈیئر فیلکس!

اگر چارلس تم سے رابطہ قائم کرے تو اسے بتا دینا کہ سائیگون میں اسے اور ہیلن کو خوش آمدید نہیں کہا جائے گا۔ اگر انہوں نے میرے پاس آنے کی کوشش کی تو میں پہلا شخص ہوں گا جو سائیگون میں فرانسیسی کونسلیٹ کو اس کے بارے میں مطلع کرے گا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے ان دونوں کو گرفتار کرکے واپس فرانس بھیج دیا جائے گا۔ اگر تم میرے بیٹے کی فطرت سے آگاہ ہوتے تو یقیناً تم بھی میری طرح اس سے دور رہنے کی کوشش کرتے۔ وہ مارِ آستین ہے، محسن کش، وہ سنپولیا جو اپنے محسن کو ڈسنے سے بھی نہیں چوکتا۔ میرا پرخلوص مشورہ یہ ہے کہ آئندہ اس سے دور رہنے کی کوشش کرو۔

بھوانی سوبھراج"

فیلکس نے یہ خط بھی چارلس سوبھراج کے خط کی طرح فائل میں لگا دیا۔

ستمبر ۱۹۷۱ء کی وہ صبح روڈز آئی لینڈ کی پولیس کے لیے نہایت منحوس ثابت ہوئی تھی۔ ڈیسک سارجنٹ نے دفتر میں داخل ہوکر اپنی ڈیوٹی سنبھالی ہی تھی کہ پلازہ ہوٹل کا منیجر داخل ہوا۔ سراسیمگی اور بدحواسی اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ سارجنٹ کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وہ بتانے لگا کہ اس کے ہوٹل میں قیام کرنے والے دو میاں بیوی ہوٹل کا تقریباً آٹھ ہزار ڈالرز کا بل دیے بغیر رات کو چوری چھپے ہوٹل سے فرار

ہو گئے ہیں۔ سارجنٹ نے تفصیل سننے کے بعد رپورٹ کی ابھی چند سطریں ہی لکھی تھیں کہ کاریں کرائے پر فراہم کرنے والی ایک ایجنسی کا منیجر ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا۔

"ہم لٹ گئے آفیسر!" وہ آتے ہی رو دینے والے لہجے میں بولا۔ "ایک شخص نے ہم سے ایک کار کرائے پر حاصل کی تھی لیکن وہ تین ہزار ڈرکمس کا بل دیے بغیر کار ایک ویران سڑک پر چھوڑ کر غائب ہو گیا۔"

"میں پہلے یہ رپورٹ لکھ لوں اس کے بعد تمہاری بات سنوں گا۔ وہاں بیٹھ جاؤ۔" سارجنٹ نے دیوار کے ساتھ رکھی بنچ کی طرف اشارہ کیا۔

سارجنٹ نے قلم اٹھایا ہی تھا کہ روڈز کا سینو کا مالک دفتر میں گھس آیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ رات کاسینو میں آنے والے ایک گاہک نے ایک لمبی رقم جوئے میں ہارنے کے بعد اسے پانچ ہزار فرانک کا چیک دیا تھا لیکن آج صبح جب چیک کیش کرانے کے لیے بینک بھیجا گیا تو انکشاف ہوا کہ وہاں اس نام کا کوئی اکاؤنٹ نہیں ہے۔ سارجنٹ نے اسے بھی اپنی باری کا انتظار کرنے کے لیے بنچ پر بٹھا دیا۔ تقریباً اسی لمحہ ایک بھاری بھرکم برطانوی باشندہ لڑکھڑاتا ہوا دفتر میں داخل ہوا۔ اس کا لباس مسلا ہوا اور بال الجھے ہوئے تھے۔ سرخ آنکھیں بتا رہی تھیں جیسے گہری نیند سے بیدار ہوا ہو۔ اس کے چہرے پر پیلاہٹ اور جسم کسی اندرونی کیفیت کے باعث بولتے ہوئے کپکپا رہا تھا جیسے سردی لگ رہی ہو۔ اس کی کہانی ان سے قدرے مختلف تھی۔

"میرا نام کنورس ہے اور میں ایک برطانوی سیاح ہوں۔" وہ شخص کپکپاتے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ "گزشتہ رات میں کاسینو گیا تھا جہاں میری ملاقات ایک جوان جوڑے سے ہوئی۔ مرد کی عمر چوبیس پچیس سال تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش مشرقیت کا رنگ لیے ہوئے تھے جبکہ اس کی بیوی فرانسیسی تھی۔ ان دونوں میں کچھ ایسی کشش تھی کہ ان کی طرف توجہ دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا تھا۔"

"وہی..... بالکل وہی..... یہ دونوں میاں بیوی وہی ہیں۔" وہ تینوں آدمی بیک وقت چلا اٹھے جو اپنی اپنی شکایات لے کر پولیس اسٹیشن آئے تھے۔ سارجنٹ نے انہیں خاموش رہنے کو کہا اور کنورس کو اپنا بیان جاری رکھنے کو کہا۔

"وہ دونوں خود ہی میری میز پر آئے تھے۔" کنورس بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "آدمی نے اپنا تعارف چارلس کے نام سے کرایا تھا۔ اس کے نام کا دوسرا حصہ کچھ عجیب سا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ بہرحال گفتگو کے دوران اس نے انکشاف کیا کہ وہ اپنی ساری پونجی جوئے میں ہار چکا ہے جبکہ میں رولٹ میں اچھی خاصی رقم جیتا تھا اور میں نے بڑے فخریہ انداز میں اس کا ذکر بھی کیا تھا۔" کنورس چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "آدھی رات کے بعد کاسینو بند ہونے لگا تو ہم تینوں ایک ریسٹورنٹ میں جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے کافی کا آرڈر دیا تھا۔ کافی پینے کے دوران ہی میں اپنے سر پر بوجھ سا محسوس کرنے لگا تھا۔ نیند اچانک ہی حملہ آور ہوئی تھی۔ میرے لیے آنکھیں کھلی رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ دونوں مجھے سہارا دے کر ہوٹل میں لے آئے۔"

صبح آنکھ کھلی تو میں اپنے بستر پر تھا۔ سر میں بوجھل پن اور درد کا احساس اب بھی موجود تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے رات بھر گہری نیند سونے کے باوجود میری نیند پوری نہ ہوئی ہو۔ کچھ دیر بعد جب میں نے اپنے سامان کا جائزہ لیا تو یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ میرے سوٹ کیس میں سے چند قیمتی اشیا کے علاوہ تقریباً بارہ ہزار ڈرکمس (مقامی کرنسی) پینتالیس اسٹرلنگ پونڈ نقد، دو سو پونڈ کی مالیت کے ٹریولرز چیک، میرا پاسپورٹ اور لندن تک کا اولمپک ایئرلائن کا ٹکٹ غائب تھا۔"

یہ شکایات سننے کے بعد پولیس نے فوراً ہی تحقیق شروع کر دی۔ دوپہر تک پولیس اس نتیجہ پر پہنچی کہ ان وارداتوں کا ذمہ دار ایک ہی شخص ہے۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ فراڈ کرنے کے علاوہ برطانوی سیاح کنورس کو بھی خواب آور دوا کھلا کر اس نے لوٹا تھا اور وہ چارلس سوبھراج کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔

پولیس پلازہ ہوٹل کے اس کمرے میں پہنچی جہاں چارلس سوبھراج اور اس کی بیوی ہیلن قیام پذیر تھی۔ کمرے میں رکھے ہوئے کوڑے کے ڈبے میں سے پولیس کو چند ایسے کاغذات مل گئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کاغذات کو یونان میں آمد و رفت کے لیے قانونی دستاویز کے طور پر استعمال کیا جانے والا تھا۔ ویزے کے یہ کاغذات جعلی تھے اور ان پر ثبت مہریں اناڑی پن کا ثبوت فراہم کر رہی تھیں۔ غالباً اسی لیے انہیں یہاں پھینک دیا گیا تھا۔ ہوٹل کے ٹیلیفون آپریٹر نے بتایا کہ چارلس سوبھراج نے یہاں سے طویل فاصلے کی متعدد ٹیلیفون کالز بھی کی تھیں۔ ان میں سات کالیں سائیگون کے لیے، تین کلکتہ اور تقریباً ایک درجن کالیں پیرس کے لیے بک کرائی گئی تھیں۔ آپریٹر کے بیان کے مطابق چارلس سوبھراج اہم شخصیت کا مالک تھا کیونکہ وہ فون پر ہمیشہ بارعب لہجے میں بات کرتا۔ صورتحال سے آگاہ ہونے کے بعد یونانی جزیرے روڈز کی پولیس نے یونان سے باہر جانے والے راستوں کی ناکہ بندی کر دی۔ تمام ہوائی اڈوں کو بھی چارلس اور ہیلن کے حلیے سے آگاہ کر دیا گیا تاکہ وہ دونوں ملک سے باہر نہ جا سکیں لیکن پولیس کی یہ تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں کیونکہ چارلس پولیس کے ان احکامات کے جاری ہونے سے پہلے ہی یونان کی سرحد پار کر چکا تھا۔ اور اس وقت وہ ہیلن کے ہمراہ اس کھٹارا سی ایم جی گاڑی پر استنبول کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ہیلن کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ چارلس سوبھراج کی ان غیر قانونی سرگرمیوں سے آگاہ تھی یا نہیں لیکن اس نے روڈز آئی لینڈ سے اپنے والدین کو جو خط لکھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ چارلس کے ساتھ بہت خوش تھی۔

"ڈیئر ممی! ڈیئر پاپا! ہم اس وقت یونان میں چھٹیاں منا رہے ہیں، یہاں کے تاریخی مقامات قابلِ دید ہیں۔ چارلس بہت محنت سے کام کر رہا ہے۔ اپنے بزنس کے سلسلے میں وہ اکثر مختلف لوگوں سے ملاقاتیں کرتا رہتا ہے۔ بچے کی پیدائش نومبر تک متوقع ہے۔ اس وقت ہم سائیگون میں ہوں گے۔"

اس کے ایک ہفتہ بعد یونان کی عدالت نے چارلس سوبھراج کو چوری رہزنی اور دھوکا دہی کی متعدد وارداتوں کے جرم میں ایک سال قید بامشقت کی سزا سنائی، سزا چارلس سوبھراج کی عدم موجودگی میں سنائی گئی تھی۔

❁

وہ ٹرین کے ذریعے دہلی پہنچے۔ پرانی ایم جی کار انہوں نے لاہور ہی میں تین ہزار روپے میں فروخت کر دی تھی۔ گو ہیلن کے لیے سفر کرنا مناسب نہیں تھا مگر وہ تقریباً تین روز سے مسلسل سفر میں تھی۔ اس دوران انہوں نے ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا لیکن ہیلن کی صحت قابلِ رشک تھی۔ اس نے ابھی تک کسی ڈاکٹر سے بھی رجوع نہیں کیا تھا۔

ہندوستان کا موسم یورپ سے بہت مختلف ہے۔ سورج طلوع ہوتے ہی آسمان سے آگ برسنے لگتی ہے۔ اس قیامت خیز گرمی نے ہیلن کو نڈھال کر رکھا تھا۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے چارلس نے وعدہ کیا کہ وہ کم از کم تین ماہ تک دہلی ہی میں قیام کریں گے۔ اس دوران ان کے پاس ننھا منا سا مہمان بھی آ چکا ہو گا اس کے بعد وہ سائیگون کے لیے روانہ ہوں گے۔ چارلس نے استنبول سے روانہ ہوتے ہوئے فیلکس کو خط لکھا تھا اور جواب کے لیے دہلی کے جی۔ پی۔ او کے اس شعبے کا ایڈریس دیا تھا جہاں سیاحوں کے نام آنے والی ڈاک رکھی جاتی تھی۔ دوسرے دن چارلس جب جی۔ پی۔ او پہنچا تو فیلکس کے چند خطوط اس کے منتظر تھے جنہیں پڑھتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔

پہلے خط میں فیلکس نے اطلاع دی تھی کہ پیرس کی ایک عدالت نے اس کی عدم موجودگی میں اسے ایک سال قید کی سزا سنائی تھی۔ اس پر جعلی چیک کے ذریعے دھوکا دہی کا الزام تھا۔ دوسرے خط کے ساتھ فیلکس نے بھوانی سوبھراج کا وہ خط بھی بھیج دیا تھا جس میں اس نے فیلکس کو اپنے بیٹے کے کرتوت سے آگاہ کیا تھا۔ بھوانی سوبھراج نے نہایت واضح الفاظ میں دھمکی دی تھی کہ چارلس نے اگر اس کے دروازے پر آنے کی کوشش کی تو وہ نہ صرف اسے بلکہ ہیلن کو بھی بلا تکلف فرانسیسی کونسلیٹ کے حوالے کر دے گا۔ تیسرا خط ہیلن کے باپ کا تھا جس نے اطلاع دی تھی کہ انٹرپول کا ایک نمائندہ چارلس سوبھراج کے بارے میں تحقیقات کے سلسلے میں ان کے گھر آیا تھا۔ انٹرپول کے نمائندے کے مطابق چارلس سوبھراج روڈز آئی لینڈ پولیس کو متعدد جرائم کے سلسلے میں مطلوب تھا۔ ہیلن کے باپ نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ ممکن ہے یہ سب کچھ کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہو۔ ملتے جلتے نام بھی بعض اوقات اس قسم کی غلط فہمیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ اس نے چارلس کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ہندوستان میں انٹرپول کی برانچ سے رابطہ قائم کر کے کسی طرح یہ غلط فہمی دور کر دے تاکہ بعد میں انہیں دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

خوش قسمتی سے ہیلن کو ان خطوط کا علم نہیں ہو سکا۔ وہ دن رات ہوٹل کے کمرے میں بند سوتی رہتی۔ وہ دہلی کے تاریخی مقامات کی سیر کرنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے تین ماہ کے اکتا دینے والے سفر کی تکان پوری طرح اتار لینا چاہتی تھی۔ اس دوران چارلس کا زیادہ وقت باہر ہی گزرتا۔ اس نے ہیلن کو مکمل آرام کا مشورہ دیتے ہوئے بتایا تھا کہ اسے کچھ کاروباری مصروفیات ہیں جو چند روز جاری رہیں گی اس کے بعد ہی وہ وقت نکال سکیں گے لیکن تیسرے روز رات کے آخری پہر جبکہ ہیلن گہری نیند میں تھی چارلس نے اسے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ وہ ابھی ابھی باہر سے آیا تھا۔

"کیا ہے، سونے کیوں نہیں دیتے؟" ہیلن نیند میں بڑبڑائی۔

"اٹھو، ہم پانچ منٹ کے اندر اندر یہاں سے جا رہے ہیں۔" چارلس نے ایک بار پھر اسے جھنجوڑا۔

"کیا مطلب؟ کہاں جا رہے ہیں؟" ہیلن کی نیند غائب ہو گئی۔

مگر چارلس نے کچھ نہیں بتایا۔ وہ اسے پانچ منٹ کے اندر اندر تیار ہونے کی ہدایات دیتا ہوا اپنی ضروری چیزیں سمیٹنے لگا۔ ہیلن نے اس سے بحث کرنا بیکار سمجھ کر خاموشی اختیار کر لی۔ شادی کے بعد سے اب تک کے تجربات سے وہ اتنی بات تو سمجھ چکی تھی کہ چارلس اگر کوئی بات نہ بتانا چاہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کی زبان نہیں کھلوا سکتی تھی۔

صبح کی ایکسپریس سے وہ آگرہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ جہاں، چارلس ہیلن کو محبت کی وہ عظیم یادگار دکھانا چاہتا تھا جو تاج محل کے نام سے موسوم تھی۔ مگر ہیلن کے دل میں نجانے کیوں طرح طرح کے خدشات جنم لے رہے تھے — چارلس محض تاج محل دکھانے کے لیے رات کے پچھلے پہر افراتفری میں اسے ہوٹل سے لے کر نہیں بھاگا تھا۔ اس نے تو وعدہ کیا تھا کہ دہلی میں کم از کم تین ماہ قیام کریں گے۔ وہ راستے بھر یہی سب کچھ سوچتی رہی لیکن چارلس سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملے گا۔

بھکاریوں اور گائیڈز کے ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے وہ تاج محل کے بیرونی گیٹ میں داخل ہوئے تو سنگِ مرمر کا فرش انگاروں کی طرح تپ رہا تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہیلن بری طرح ہانپنے لگی۔ اس کے لیے قدم اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ اپنی موجودہ حالت دیکھتے ہوئے چبوترے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک مرتبہ تو اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بچے کی ولادت کے لیے اسے ہسپتال تک جانے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔ اس نے کئی مرتبہ چارلس کو رکنے کو کہا مگر چارلس اس کی طرف دھیان دیے بغیر کسی ماہر گائیڈ کی طرح تاج محل کی تاریخ دہرا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی

وہ گہری نظروں سے سیاحوں کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے قصائی بکرے کا جائزہ لیتا ہے۔ ہیلن ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ اس کا جسم پسینے سے تر ہو رہا تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔

آگرہ میں تین دن قیام کے بعد وہ بمبئی آ گئے۔ جہاں چند روز بعد ۵ نومبر ۱۹۷۰ء کو سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہیلن نے ایک خوبصورت بچی کو جنم دیا۔ وہ اس وقت بمبئی کے سب سے مہنگے اور بہترین ہسپتال میں تھی۔ چارلس سوبھراج کی خوشی قابلِ دید تھی۔ اس نے ہیلن کو پھولوں سے لاد دیا۔ وہ بچی کو گود میں لیے دن بھر کمرے میں ٹہلتا رہتا بچی کا نام اس نے شوبرا رکھا۔ ہسپتال کے کاغذات میں اپنے پروفیشن والے خانے میں اس نے "بزنس مین" لکھا تھا۔ اور یہ غلط بھی نہیں تھا۔ وہ ایسے بزنس سے وابستہ تھا جس میں ہر سو خطرات کے سائے بھی منڈلا رہے تھے۔

چارلس سوبھراج چھبیس سال کا بھرپور جوان تھا۔ خوبرو ہونے کے ساتھ خوش اخلاقی کے باعث دوسروں کے لیے اس میں بڑی کشش تھی۔ وہ چونکہ پیرس سے آیا تھا اور اس کی بیوی بھی فرانسیسی حسینہ تھی، اس لیے بہت جلد بمبئی میں رہائش پذیر فرانسیسی باشندوں میں گھل مل گیا۔ یہاں فرانسیسیوں نے اپنی ایک الگ سوسائٹی بنا رکھی تھی۔ ان کا تعلق اگرچہ فرانس کے مختلف شہروں سے تھا مگر وہ سب ایک خاندان کی طرح رہ رہے تھے۔ سوسائٹی کا ڈائریکٹر موسیو مانٹ اس سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ اس کی بیوی بھی چارلس اور ہیلن کی گرویدہ تھی۔ موسیو مانٹ نے چارلس کو پیش کش کی کہ اگر وہ پسند کریں تو انہیں کچھ عرصہ کے لیے برائے نام کرائے پر سوسائٹی کا گیسٹ اپارٹمنٹ مل سکتا ہے۔ چارلس نے کسی تامل کے بغیر یہ پیش کش قبول کر لی اور گیسٹ اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گیا۔ تین ماہ تک یہاں رہتے ہوئے اسے سوسائٹی کی تقریبات میں بھی شرکت کا موقع ملتا رہا۔ مسز مانٹ تو ہیلن اور شوبرا کی اس طرح گرویدہ ہوئی تھی کہ ان کے بغیر اسے ایک لمحہ کو بھی چین نہ پڑتا۔ اس کا زیادہ وقت ہیلن کے فلیٹ پر گزرتا یا وہ ہیلن اور اس کی بچی کو اپنے مکان پر لے آتی۔ رات کا کھانا اکثر انہی کے ہاں ہوتا وہ اپنے مہمانوں کے سامنے ہیلن اور چارلس کی تعریفیں کرتے ہوئے نہ تھکتی۔ چارلس کے لہجے سے وہ بیحد متاثر تھی۔ کسی بھی موضوع پر چارلس بڑی روانی سے بے تکان بولتا چلا جاتا۔ ہر موضوع پر اس کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔ ان صفات کے باوجود مسز مانٹ کو چارلس سے ایک شکایت ضرور تھی کہ وہ راتوں کو اکثر گھر سے غائب رہتا تھا۔ ایک مرتبہ تو مسز مانٹ نے اس سے پوچھ بھی لیا مگر چارلس نے کاروباری مصروفیات کی آڑ لے کر اسے بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا تھا۔

چارلس سوبھراج کی ذہانت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس نے محنت سے کبھی جی نہیں چرایا تھا۔ ایک مرتبہ جس کام کا ارادہ کر لیتا اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائے بغیر دم نہ لیتا۔ ہندوستان کا رخ کرنے سے پہلے اس نے اس ملک کے قانون کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس قانون میں اس نے کچھ ایسی خامیاں تلاش کر لی تھیں جن سے اب وہ بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔

بمبئی میں ایسے دولتمندوں کی کمی نہیں تھی جو امریکن یا دوسری قیمتی گاڑیاں رکھنے کے خواہشمند تھے لیکن یہ گاڑیاں انہیں بہت مہنگی پڑتیں۔ اگر شیورلیٹ کار قانونی طور پر درآمد کی جاتی تو اس پر کم از کم پچیس ہزار ڈالر کی رقم خرچ ہوتی۔ سرخ فیتے کے باعث طویل انتظار کی کوفت الگ تھی بعض اوقات دو دو سال تک انتظار کرنا پڑتا۔

بمبئی کی اونچی سوسائٹی میں چارلس اب اجنبی نہیں رہا تھا۔ اس کے حلقے میں چوٹی کے فلم اسٹار سے لے کر صنعت کار اور سیاستدان تک شامل تھے۔ ان میں سے بیشتر لوگ قیمتی گاڑیاں حاصل کرنا چاہتے تھے مگر سرخ فیتہ اور طویل انتظار ان کی اس خواہش کا گلا گھونٹے ہوئے تھا۔ چارلس سوبھراج نے ان کی یہ مشکل حل کر دی۔ وہ ایسے لوگوں سے گاڑیوں کے آرڈر بک کرنے لگا۔ ہر گاڑی کے لیے وہ دو ہزار ڈالر پیشگی وصول کر لیتا اور اس کے فوراً ہی بعد ہوائی جہاز کے ذریعے طہران پہنچ جاتا تھا۔ وہ اس بزنس سے منسلک قابلِ اعتماد لوگوں سے رابطہ قائم کر کے کوئی مرسیڈیز وغیرہ خرید لیتا۔ ایسی گاڑیاں عام طور پر یورپ کے کسی نہ کسی ملک سے چوری کر کے طہران لائی جاتی تھیں۔ گاڑی خریدتے ہی چارلس سوبھراج اپنے نام اس کے جعلی کاغذات تیار کروا لیتا اور سڑک کے راستے پاکستان سے ہوتا ہوا کسی ایسی جگہ سے ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوتا جہاں متعلقہ محکمہ کے کارکن گاڑی کے بارے میں زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت محسوس نہ کرتے اور اگر کبھی کوئی اعتراض اٹھایا بھی جاتا تو چارلس کچھ رقم سے مٹھی گرم کر کے اعتراض کرنے والے کی زبان بند کر دیتا۔ دنیا کے کسی بھی ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنے ذاتی مفاد کو قومی مفادات پر ترجیح دیتے ہیں۔

ہندوستان کی حدود میں داخل ہوتے ہی چارلس گاڑی کے کاغذات ضائع کر دیتا اور گاڑی کو بمبئی کے نواح میں واقع ایک ایسے گیراج میں پہنچا دیتا جہاں ایک مکینک کی مدد سے گاڑی کا انجن، ریڈیو، ایئر کنڈیشنر، اسپیئر ٹائر اور دیگر قیمتی اشیاء نکال لی جاتیں۔ اس کے بعد چارلس اس کھٹارے کو کسی مصنوعی حادثے کے ذریعے کوئی چھوٹا موٹا نقصان پہنچا دیتا۔ یہ نقصان عام طور پر گاڑی کے فینڈر کو پہنچایا جاتا اس طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد چارلس گاڑی کو کسی ویران سڑک پر چھوڑ کر گمنام کال کے ذریعے پولیس کو اس لاوارث گاڑی کی اطلاع دے دیتا۔ پولیس اس لاوارث گاڑی کو اپنے قبضے میں لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتی کہ یہ گاڑی اسمگل کر کے ہندوستان لائی گئی تھی لیکن اس کے مالکان پکڑے جانے کے خوف سے گاڑی چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ پولیس کے توسط سے ڈھانچہ نما وہ گاڑی کسٹمز کی تحویل میں پہنچ جاتی جہاں کچھ عرصہ بعد اسے کباڑ کی حیثیت سے نیلام کر دیا جاتا۔ گاڑی کسٹمز کی

تحویل میں پہنچنے کے بعد چارلس کنسوئیاں لیتا رہتا کہ نیلام کب ہو گا۔ نیلام کے دن وہ اپنے کسی آدمی کے ذریعے گاڑی کا وہ ڈھانچہ اپنے کسی گاہک کے نام خرید لیتا اور پھر اس سے نکالے ہوئے آلات دوبارہ فٹ کر کے فنشنگ کے بعد گاہک کے حوالے کر دی جاتی جو کسٹمز کے کاغذات کے باعث اس کی قانونی ملکیت سمجھی جاتی۔ چارلس سوبھراج وہ گاڑی اپنے گاہک کے ہاتھ کم از کم بیس ہزار ڈالر میں فروخت کر دیتا جس میں اسے کم از کم ستر فی صد منافع ضرور ہوتا۔ اب تک وہ چھ گاڑیاں فروخت کر چکا تھا۔ اس کے گاڑی خریدنے والے گاہکوں میں ہندوستان کا وہ فلمسٹار بھی شامل تھا جس کا نام آج بھی برصغیر کے بچے بچے کی زبان پر ہے۔

چند ہفتوں بعد ہی چارلس نے فرنچ سوسائٹی کا گیسٹ اپارٹمنٹ چھوڑ کر جوہو کے علاقے میں ایک لگژری اپارٹمنٹ حاصل کر لیا۔ یہ بمبئی کا فیشن ایبل علاقہ تھا۔ یہاں صرف وہی لوگ رہائش اختیار کر سکتے تھے جنہیں خود بھی علم نہیں تھا کہ ان کے پاس دولت کہاں سے آتی ہے۔ چارلس اب اکثر گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ ہیلن اکیلی گھر میں پڑے پڑے بیزار رہنے لگی۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے فرنچ سوسائٹی میں اس کا آنا جانا کم ہو گیا تھا کبھی کبھار مسز مانٹ آ جاتی تو دو چار گھنٹوں کے لیے اس کا دل بہل جاتا۔ وہ فرانسیسی اور اسپینی کے علاوہ اور کوئی زبان بول یا سمجھ نہیں سکتی تھی۔ اس لحاظ سے اس کے پڑوسیوں سے بھی تعلقات نہیں تھے ۔۔۔ جو مقامی زبانوں کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ ہیلن پر بعض اوقات عجیب سی وحشت طاری ہونے لگتی۔ اس نے کئی مرتبہ چارلس سے پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ دن رات کہاں غائب رہتا ہے لیکن چارلس نے ہمیشہ اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس کی کاروباری مصروفیات اسے کسی ایک جگہ نہیں ٹکنے دیتیں بعض اوقات بات کرتے ہوئے چارلس کے لہجے میں سختی آ جاتی۔ ہیلن اکثر سوچتی کہ اگر اس کی بیٹی شوبرا نہ ہوتی تو وہ اب تک تنہائی میں دم گھٹ کر مر چکی ہوتی۔

وہ ۱۹۷۰ء کا آخری دن تھا۔ ہیلن دن بھر کھڑکی میں بیٹھی تاحدِ نگاہ پھیلے ہوئے سمندر کو گھورتی رہی تھی۔ اس کے کان دروازے کی آہٹ پہ لگے ہوئے تھے۔ بہت دیر ہو گئی لیکن کسی نے دروازے پر دستک نہیں دی وہ سوچ رہی تھی کہ چارلس کہاں غائب ہے۔ کم از کم آج کے دن تو اسے گھر پر ہونا چاہیے تھا۔ اس نے پیرس میں اپنے والدین کو ٹیلیفون کرنے کی کوشش کی لیکن آپریٹر نے بتایا کہ کال ملنے میں کم از کم دو دن لگیں گے۔ ہیلن نے ریسیور پٹخ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

چارلس سوبھراج اس رات ہانگ کانگ کے قریب جزیرہ میکاؤ کے ایک کاسینو میں جوا کھیل رہا تھا۔ جوا اس کی زندگی کا ایک اہم جزو بن چکا تھا۔ قسمت ساتھ دیتی تو اس کی جیبوں میں نوٹ رکھنے تک کو جگہ نہ ہوتی۔ جیبیں تنگیٔ داماں کی شکایت کرتی ہوئی نظر آتیں اور جب ہارنے پر آتا تو سب کچھ ہارتا چلا جاتا۔ اپنی رقم ہارنے کے بعد قرض لیتا، قرض نہ ملتا تو کپڑے تک داؤ پر لگا دیتا لیکن اس رات قسمت کی دیوی اس پر سایہ فگن تھی۔

وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں اکثر کئی کئی روز تک گھر سے غائب رہتا۔ جوا بھی اس کے کاروبار میں شامل تھا۔ اس مرتبہ وہ پندرہ دن بعد بمبئی لوٹا تو ایک خطیر رقم کے علاوہ اس کے پاس چند قیمتی تحائف بھی موجود تھے۔ ہیرے کا نیکلس اور انگوٹھی اس نے اپنے ہاتھ سے ہیلن کو پہنائی تھی۔ شوبرا کے لیے وہ قیمتی موتیوں کا باریک ہار لے کر آیا تھا جو ابھی بمشکل تین ماہ کی تھی۔ ہیلن نے یہ ہار سنبھال کر رکھ لیا۔ ہیلن کو نیکلس اور انگوٹھی پہناتے ہوئے چارلس نے اس سے اپنے گزشتہ رویّے کی معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ چند روز بعد وہ اسے تفریح کے لیے ہانگ کانگ لے جائے گا۔ جہاں اس کی ساری کوفت دور ہو جائے گی۔

"ذرا سوچو تو ڈیئر!" وہ محبت آمیز لہجے میں بولا۔ "جب ہم ہانگ کانگ ایئرپورٹ پر اتریں گے تو خوبصورت مرسڈیز کار ہماری منتظر ہو گی۔ ہمارا قیام بینڈرین ہوٹل میں ہو گا اور رات کا کھانا ہم سمندر میں تیرتے ہوئے ریسٹورنٹس میں کھایا کریں گے۔ ابرڈین کی بندرگاہ پر ہمارے چاروں طرف تیرتی ہوئی رنگ برنگی روشنیاں کیسا دلفریب منظر ہو گا۔"

"سچ کہہ رہے ہو؟" ہیلن نے مشتبہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں جلد ہی میری باتوں کا یقین آ جائے گا۔" چارلس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اس منصوبے کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کی کامیابی کے بعد وہ دنیا کا امیر ترین آدمی بن سکتا تھا۔ یہ پُر اسرار منصوبہ اس نے ہانگ کانگ ہی میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر تیار کیا تھا۔ منصوبہ کامیاب ہوتے ہی وہ ان سے الگ ہو جائے گا۔ اس نے پہلے ہی طے کر رکھا تھا کہ ہانگ کانگ سے پیرس تک بڑے بڑے دارالحکومتوں میں نائٹ کلب کھول لے گا۔ کلب کا نام بھی اس نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ شوبرا نائٹ کلب۔ اس کے خیال میں۔۔۔

اس سے زیادہ خوبصورت اور پرکشش نام اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔

ایک ہفتہ بعد ہیلن روانگی کی تیاری کر رہی تھی۔ آدھے سے زیادہ سامان پیک ہو چکا تھا۔ وہ ایک سوٹ کیس میں شوبرا کے کپڑے تہہ کر کے رکھ رہی تھی کہ کرسی پر بیٹھا ہوا چارلس ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک نظر ہیلن کی طرف دیکھا اور پھر ایک گھنٹے بعد واپس آنے کا کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ ہیلن نے اس سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن چارلس نے جاتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ اسے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔ ہیلن سامان پیک کر کے اس کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ نہیں آیا۔

دوسرے روز ہیلن کو ایران سے چارلس کا ٹیلیگرام ملا۔ ”میں اس وقت طہران کے ہلٹن ہوٹل میں ہوں۔ ایک انتہائی اہم کاروباری سلسلے میں فوری طور پر آنا پڑا۔ چند روز میں واپس آجاؤں گا۔“ ٹیلیگرام پڑھ کر ہیلن کا خون کھول اٹھا۔ اس نے فوراً ہی طہران کے ہلٹن ہوٹل کے پتے پر جوابی ٹیلیگرام دیا جس کا تیسرے دن جواب ملا کہ چارلس سوبھراج وہاں سے جا چکا ہے۔ اس کے تین دن بعد آدھی رات کے وقت چارلس نے کابل سے ٹیلیفون کیا کہ وہ ایک دو دن میں واپس آرہا ہے لیکن وہ ایک دو دن خاصا طول کھینچ گئے۔ پھر استنبول سے ایک ٹیلیگرام ملا۔ اس کے کئی روز بعد تک اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ ہیلن اپنے چاروں طرف ایک عجیب سے سناٹے کی سی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ تقریباً دو ہفتے بعد کراچی سے چارلس نے فون کیا کہ وہ کل بمبئی پہنچ جائے گا اور اس کی یہ کل چار دن سے پہلے نہیں آئی۔ ہیلن پریشان تھی کہ وہ مکڑی کی طرح پورے ایشیا میں آمدورفت کا جالا کیوں بن رہا ہے لیکن کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آسکی اور ظاہر ہے چارلس سے اس سلسلے میں کچھ پوچھنا بیکار تھا۔

❁

بالآخر اپریل ۱۹۷۱ء میں چارلس سوبھراج، ہیلن کو ہانگ کانگ لے گیا۔ بچی کو انھوں نے فرنچ سوسائٹی کی ایک ادھیڑ عمر عورت کے حوالے کر دیا اور وعدہ کیا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر اندر لوٹ آئیں گے لیکن چھ ہفتے گزرنے کے باوجود جب وہ واپس نہیں آئے تو بوڑھی عورت پریشان ہوگئی۔ اس نے دیے ہوئے پتے پر خطوط اور ٹیلیگرام دیے، ٹیلیفون کیا مگر ان کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ بوڑھی عورت کو خدشہ تھا کہ وہ ہانگ کانگ میں کسی قانونی الجھن میں نہ پھنس گئے ہوں یا کسی حادثے کا شکار نہ ہوگئے ہوں۔ اس نے بمبئی میں موجود فرانسیسی کونسلیٹ کو فون کرتے ہوئے صورتحال سے آگاہ کیا اور ہانگ کانگ میں انہیں تلاش کرنے کی درخواست کی لیکن ایک روز اس نے اپنی درخواست واپس لے لی۔ کیونکہ کونسلیٹ کو پہلی مرتبہ فون کرنے کے تقریباً ایک گھنٹہ بعد بالکل غیر متوقع طور پر چارلس بھی پہنچ گیا تھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ تمھیں شوبرا کی وجہ سے پریشانی اٹھانا پڑی۔“ چارلس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ ممکن ہے کہ تم چند روز اور اس کی دیکھ بھال کر سکو۔ دراصل ہم دونوں میاں بیوی ......“

”بالکل نہیں۔“ بڑھیا نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس کے لہجے میں درشتگی نمایاں تھی۔ ”اگر تم اپنی بیٹی کو لے کر نہ گئے تو میں اسے پولیس کے حوالے کر دوں گی۔“

پولیس کا نام سنتے ہی چارلس بدحواس سا ہوگیا۔ اس نے شوبرا کی دیکھ بھال کے معاوضے کی رقم کے علاوہ ایک چھوٹا ٹیپ ریکارڈر بڑھیا کو تحفہ کے طور پر پیش کیا اور شوبرا کو لے کر نو دو گیارہ ہوگیا۔

موسم بہار میں ہانگ کانگ کا حسن شباب پر تھا۔ ہیلن شاہانہ زندگی بسر کر رہی تھی۔ ہوٹل کا لگژری سوٹ ان کے لیے مخصوص تھا۔ ہوٹل کے ملازمین ان کے سامنے بچھے جاتے۔ دن میں دو مرتبہ اس کے کمرے میں تازہ، مہکتے ہوئے پھولوں کے گلدان سجائے جاتے۔ بعض ویٹر شوبرا کو بھی کھلانے کے لیے باہر لے جاتے۔ ہوٹل کی جیولری شاپ کے دروازے ہر وقت ہیلن کے لیے کھلے ہوتے تھے۔ ریشمی ملبوسات اور قیمتی زیورات، وہ جو چیز چاہتی بلاتکلف لے لیتی۔ چیزوں کی قیمت ان کے ہوٹل کے بل میں شامل کر دی جاتی لیکن جسم پر خالص ریشم کے ملبوسات اور قیمتی زیورات... آراستہ ہونے کے باوجود ہیلن محسوس کر رہی تھی کہ اس کا شوہر اس سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ چارلس نے کبھی نہیں بتایا کہ وہ ہانگ کانگ میں کیا کرتا پھر رہا ہے نہ ہی اس نے کبھی ہیلن کے اس خیال کی حوصلہ افزائی کی تھی کہ وہ اس کے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹانے کو تیار ہے۔ ہیلن کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ چارلس کے دل میں اس کے لیے پہلی سی محبت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ جب ہانگ کانگ سے باہر ہوتا تو ہیلن کو بڑے محبت بھرے خطوط لکھتا۔ اس کی تحریر سے اندازہ ہوتا کہ ہیلن سے ایک لمحہ کی جدائی بھی اسے گوارہ نہیں لیکن واپس آنے کے بعد وہ بالکل بدلا ہوا نظر آتا۔ وہ شوبرا کو پیار کرتا اور انتہائی تھکن کا عذر کر کے بستر پر دراز ہو جاتا تھا۔ اپنی زندگی میں اب تک وہ جتنی عورتوں سے ملا تھا، ان کا موازنہ وہ غیر شعوری طور پر اپنی ماں سونگ سے کرنے لگتا جس کے کردار نے اسے محبت اور نفرت کے ایک ایسے بھنور میں پھنسا دیا تھا جس سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہیلن وہ کردار نہ اپنائے جو اس کی بیٹی کو الجھا دے۔

جون میں چارلس سوبھراج، ہیلن اور شوبرا کو لے کر جزیرہ میکاؤ پر منتقل ہوگیا۔ اس علاقے کا سب سے بڑا کاسینو میکاؤ ہی میں تھا اور اسے روزانہ ہانگ کانگ سے یہاں کشتی پر آنا پڑتا تھا۔ اسی رات وہ ہیلن کو لے کر کاسینو پہنچ گیا۔ بہترین لباس اور جگمگاتے زیورات سے لدی پھندی ہیلن کوئی اپسرا ہی لگ رہی تھی۔ یہ ساری تیاری اس نے

چارلس کی ہدایت پر کی تھی اور اسے یہ ہدایت بھی تھی کہ وہ جب تک جوا کھیلتا رہے ہیلن اس کی کرسی کے پاس کھڑی رہے۔ شاید اس طرح وہ دوسروں کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ بعض دوسری قیمتی چیزوں کے علاوہ دنیا کی خوبصورت ترین عورت بھی اس کی ملکیت ہے۔ کھیل کے دوران ہیلن اندازِ دلربائی سے چارلس کے کندھوں پر جھکی رہی۔ آس پاس موجود دوسرے لوگ بار بار اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بعض لوگوں کی آنکھوں میں اس نے عجیب سی چمک بھی دیکھی تھی۔ چارلس بھی وقتاً فوقتاً اس کی طرف دیکھ لیتا۔ ایسے موقع پر ہیلن کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ پھیل جاتی۔ لیکن اسی رات آخری پہر گھر پہنچتے ہی چارلس اس کے وجود کو بھول گیا۔ وہ کرسی پر بیٹھا جوئے میں جیتی ہوئی رقم گن رہا تھا اور تھکن سے چور پلنگ پر نیم دراز ہیلن افسردہ سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

بالآخر چارلس انگڑائی لیتا ہوا کرسی سے اٹھ گیا اور ہیلن پر نوٹوں کی بارش کرتے ہوئے چہکا۔

”آج میں نے بائیس [illegible]الر جیتے ہیں اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ تم واقعی قسمت کی دیوی ہو جو کھیل کے دوران میرے اوپر سایہ کیے رہی۔“

اور پھر قسمت کی یہ دیوی ہر رات کھیل کے دوران چارلس سوبھراج پر سایہ فگن رہنے لگی۔ چارلس اس کی موجودگی میں لمبی لمبی رقمیں جیتتا رہا لیکن گھر آتے ہی وہ اسے بھول جاتا اور اس کے سائے سے اس طرح دور رہنے کی کوشش کرتا جیسے وہ کوئی اچھوت ہو۔ تقریباً دو ہفتے بعد چارلس ایک رات میں تیس ہزار ڈالر ہار گیا۔ اس نے پہلے ہیلن کے جسم پر آراستہ زیورات بھی داؤ پر لگا دیے اور پھر دوسری رات گھر پر رکھے ہوئے ہیلن کے بچے کھچے زیورات اور شوبرا کا موتیوں کا وہ ہار بھی جوئے کی نذر ہوگیا جو اس نے شوبرا کو اس وقت تحفے میں دیا تھا جب وہ صرف تین ماہ کی تھی۔ ہیلن اس رات اسے بار بار ٹوکتی رہی کہ اب وہ ہاتھ روک لے۔ چارلس کا موڈ بگڑ گیا اور وہ آس پاس موجود لوگوں کی پروا کیے بغیر ہیلن پر برس پڑا۔

”تم نہایت منحوس اور خود غرض عورت ہو۔ تمہاری نحوست کی وجہ سے آج میں جیتی ہوئی بازیاں ہار رہا ہوں۔“

”اگر میں منحوس ہوں تو مجھے اپنے ساتھ لے کر کیوں آتے ہو؟“ ہیلن گلوگرفتہ سے لہجے میں بولی۔

”میں بہت عرصہ پہلے ہی تمہیں پیرس واپس بھیج چکا ہوتا لیکن شوبرا کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکا۔ شوبرا کے لیے جیسے ہی کسی نئی ”آیا“ کا انتظام ہوا تمہیں واپس بھیج دوں گا۔“

ہیلن سناٹے میں رہ گئی۔ اس گفتگو سے اسے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ چارلس جوئے کی محفلوں میں اسے محض شو کارڈ کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ ہیلن نے حالات سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی مگر حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ بالآخر اس نے پیرس میں اپنے باپ کو خط لکھا کہ وہ واپس آنا چاہتی ہے اس کے لیے کرائے کی رقم بھیج دی جائے۔

ہیلن کے باپ کا جواب انتہائی مایوس کن تھا۔ اس نے اپنے ناگفتہ بہ مالی حالات کا رونا روتے ہوئے معذرت کا اظہار کیا کہ وہ ہیلن کو ایک فرانک بھی نہیں بھیج سکتا۔ البتہ اس نے ہیلن کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ہانگ کانگ میں فرانسیسی سفارت خانے سے رابطہ قائم کر کے مدد طلب کرے۔ ہیلن کے لیے ایسا کوئی قدم اٹھانا مشکل نہیں تھا لیکن بہت سی باتیں اس کے راستے میں حائل تھیں۔ چند ہفتے قبل چارلس ایک ہوٹل کا ہزاروں ڈالر کا بل دیے بغیر ہیلن اور شوبرا کو لے کر رات کو چوری چھپے ہوٹل سے بھاگ نکلا تھا اور یہ ہوٹل، جہاں وہ ان دنوں قیام پذیر تھے، بھی ان کے لیے جہنم بنتا جا رہا تھا۔ کئی ہفتوں کا بل نہیں دیا تھا اور منیجر دن میں کئی مرتبہ کمرے میں آکر واجبات کی ادائیگی کا تقاضہ کر رہا تھا۔ چارلس اکثر غائب رہتا۔ منیجر کی کڑوی کسیلی باتیں ہیلن ہی کو سننا پڑتیں۔ اس کے پاس صرف ایک ہی جواب ہوتا۔

”میرا شوہر کاروباری سلسلے میں باہر گیا ہوا ہے۔ اس کے آتے ہی تمہاری ایک ایک پائی ادا کر دی جائے گی۔“

ہیلن فرانسیسی سفارت خانے سے رابطہ قائم کرتے ہوئے اس لیے بھی ڈر رہی تھی کہ تحقیقات کے دوران چارلس سوبھراج کے فراڈ کی قلعی کھل جائے گی اور عین ممکن تھا کہ ہیلن کو بھی اس الزام میں دھر لیا جاتا۔ ہانگ کانگ پولیس کے بارے میں وہ بہت کچھ سن چکی تھی۔ پکڑے جانے کے تصور ہی سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

جون کے وسط میں وہ میکاؤ کے لزبوا ہوٹل میں تھے۔ کئی روز سے شوبرا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا اور دن بدن سوکھتی جا رہی تھی۔ شوبرا کو اسہال کے ساتھ بخار بھی مستقل رہنے لگا تھا۔ ہیلن اسے گود میں لیے بے بسی کے آنسو بہاتی رہتی۔ کئی مرتبہ اس کا دل چاہا تھا کہ شوبرا کا گلا گھونٹ کر خود بھی ہوٹل کی چوتھی منزل سے چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کا بھی خاتمہ کرے تاکہ زندگی کے اس کرب اور دکھ سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے لیکن وہ کبھی بھی اپنے آپ میں اتنی ہمت نہ پا سکی۔ چارلس کئی روز سے غائب تھا اور ہوٹل کی انتظامیہ نے اس کے آرڈرز کی تکمیل سے انکار کر دیا تھا۔ ہیلن کے پاس ایک دو قیمتی چیزیں بچ رہی تھیں۔ وہ انھیں بیچ کر شوبرا کا اور اپنا گزارہ کرتی رہی۔ چارلس کو غائب ہوئے بیس روز ہو چکے تھے پھر ایک روز ہیلن کو اس کا ٹیلیگرام ملا کہ وہ دہلی کے ایک ہوٹل میں کاروباری سلسلے میں مقیم ہے۔ یہاں اسے کئی روز لگیں گے۔ ہیلن کے صبر کا بندھن ٹوٹ گیا اور وہ رات بھر پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ تین روز بعد اسے چارلس کی طرف سے

بھیجی ہوئی کچھ رقم مل گئی۔ رقم اتنی زیادہ تو نہیں تھی لیکن اس سے چند روز نکل سکتے تھے۔ کسمپرسی اور تنہائی کے احساس نے اسے ادھ موا کر دیا۔ وہ دھیان بٹانے کے لیے پیرس میں اپنے والدین اور دوستوں کو پے در پے خطوط لکھنے لگی۔

دوسری طرف چارلس سوبھراج دہلی میں ایک ایسی ڈکیتی کا منصوبہ بنا رہا تھا جس کی یاد اس کے خیال میں برسوں قائم رہتی۔ اس منصوبے کی بنیاد دراصل میکاؤ ہی میں رکھی گئی تھی۔ اس رات کاسینو میں چالیس ہزار ڈالر ہارنے کے بعد چارلس کاسینو کا کئی ہزار ڈالر کا مقروض بھی ہو چکا تھا اور کاسینو کے غنڈے اس طرح اس کا گھیراؤ کیے ہوئے تھے کہ نجات کا کوئی راستہ اس گھیراؤ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسے میں مورس نامی ایک برطانوی اس کی مدد کو آن پہنچا۔ مورس طویل عرصہ سے ہانگ کانگ میں اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ زیر زمین دنیا اور جوئے خانوں میں اس کا خاصہ اثر و رسوخ تھا۔ اس نے چارلس کو پیش کش کی کہ اگر ایک معاملے میں وہ اس سے تعاون کرے تو وہ کاسینو کے غنڈوں سے اس کی جان بچا سکتا ہے۔ دہلی میں ڈکیتی کا یہ منصوبہ بہت عرصہ سے مورس کے دماغ میں کلبلا رہا تھا لیکن اس کے لیے کسی انتہائی ذہین اور شاطر آدمی کی ضرورت تھی اور اس کے خیال میں اس مقصد کے لیے چارلس سوبھراج سے بہتر آدمی کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ منصوبے کی تفصیلات سننے کے بعد چارلس نے فوراً ہی ہامی بھر لی۔ مورس نے اسے کچھ رقم ایڈوانس دے دی تاکہ وہ کاسینو کا کچھ قرض چکانے کے علاوہ اپنی حالت بھی سدھار سکے۔

سردیوں کی آمد آمد تھی۔ دہلی کا موسم ان دنوں خاصا خوشگوار تھا۔ سڑکوں پر غیر ملکی سیاحوں کی بھرمار تھی۔ بعض سڑکوں پر تو دکانوں کے سامنے اتنا ہجوم رہتا کہ راہ چلنا مشکل ہو جاتا۔ چارلس سوبھراج اور مورس فرضی ناموں سے ہوٹل اوبرائے انٹرنیشنل میں مقیم تھے۔ لیکن اُن کا زیادہ وقت اشوکا ہوٹل کے قرب و جوار میں ٹہلتے ہوئے گزرتا۔ جہاں وہ ہوٹل کی دکانوں کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے رہتے۔ ہوٹل کا جیولری اسٹور راجستھان ایمپوریم ان کی توجہ کا مرکز تھا۔ چند روز اوبرائے انٹرنیشنل میں قیام کرنے کے بعد ایک رات وہ بل دیے بغیر غائب ہو گئے۔ چارلس کو ایسے کاموں کا خاصا تجربہ ہو چکا تھا۔ وہ دونوں اسی رات طہران پہنچ گئے۔ جہاں چارلس نے ایک پینو میٹک ڈرل مشین، فلیش لائیٹس، واکی ٹاکی کے سیٹ اور چند ایسی چیزیں خریدیں جو اس کے منصوبے میں کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ مورس کو طہران میں چھوڑ کر وہ کراچی آ گیا۔ جہاں اس نے دو فرانسیسیوں سے رابطہ قائم کیا۔ وہ دونوں رہزنی، ڈکیتی، دھوکا دہی اور قتل کی وارداتوں میں فرانسیسی پولیس کو مطلوب تھے لیکن کراچی میں ان کا کوئی جرم ابھی سامنے نہیں آ سکا تھا۔ اتفاق سے ان دونوں کا نام پائرے تھا۔ ان کی الگ الگ شناخت کے لیے چارلس نے ایک کے نام کے ساتھ پرمیئر اور دوسرے کے نام کے ساتھ ڈیوکسم کا اضافہ کر دیا۔

ان دونوں کے ساتھ دہلی پہنچتے ہی چارلس نے منصوبے کی آخری تفصیلات طے کر لیں۔ اس نے ایک چھوٹے سے پریس سے نہایت خوبصورت وزٹنگ کارڈ بھی چھپوا لیے۔ "جے لولو۔ ڈائریکٹر کاسینو۔ میکاؤ۔"

اور پھر اکتوبر ۱۹۷۱ء کے آخری ہفتے کی ایک رات اشوکا ہوٹل کے کلب رُوج نائر میں بیٹھے ہوئے چارلس نے ویٹر کو طلب کر کے ایک وزٹنگ کارڈ جیب سے نکال کر چاندی کی چھوٹی سی ٹرے میں رکھ دیا۔ اس کے ساتھ بیس روپے کا ایک نوٹ بھی تھا۔ چارلس نے ویٹر کو ہدایت کی کہ یہ کارڈ نائٹ کلب کی امریکی رقاصہ کو پہنچا دیا جائے۔ ویٹر نے جھک کر چارلس کو سلام کیا، نوٹ اٹھا کر جیب میں رکھا اور چاندی کی ٹرے لے کر اسٹیج کے پچھلی طرف جانے والی راہداری میں غائب ہو گیا۔ امریکی رقاصہ کمرہ نمبر ۲۸۹ میں مقیم تھی۔ اس کو یرغمال بنانے میں چارلس سوبھراج کو زیادہ دشواری نہیں پیش آئی۔

اشوکا ہوٹل کے کمرہ نمبر ۲۸۹ کے فرش پر ڈرل مشین سے تقریباً ایک گھنٹہ تک سوراخ کرنے کی ناکام کوشش کے بعد چارلس سوبھراج نے مشین بند کر دی۔ اس کے منہ سے بڑبڑاہٹ کے انداز میں غلیظ گالیاں ابل رہی تھیں۔ پرمیئر کے پاس اگرچہ دوسری ڈرل مشین تھی مگر اس کے چلنے کی آواز خوفناک حد تک تیز تھی اور رات دو بجے اس کے استعمال کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ فی الوقت کام بند کر دیا جائے۔ صبح جب ہوٹل کے کسی حصہ میں مرمت وغیرہ کا کوئی کام ہو رہا ہو تو اس کے شور کی آڑ میں اپنا کام شروع کر دیا جائے۔

بستر پر پڑی ہوئی ہوٹل کی امریکن رقاصہ لینزا کے دل میں امید کی ایک موہوم سی کرن چمک اٹھی۔ شاید یہ خطرناک آدمی اس وقت واپس چلے جائیں تاکہ صبح واپس آ کر اپنا کام شروع کر سکیں۔ اس کا دل اگرچہ خوف کی شدت سے تھرتھرا رہا تھا لیکن وہ لہجے کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"میں تمہارے اس خیال کی تائید کرتی ہوں۔ اس طرح کل رات کے پروگرام کے لیے مجھے بھی کچھ آرام کرنے کا موقع مل جائے گا۔"

"نہیں۔" چارلس اس کی طرف دیکھتا ہوا معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "یہاں سے جانے کا ہمارا فی الحال کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ہم رات کا باقی حصہ اسی کمرے میں گزاریں گے۔ ہم میں سے ایک آدمی جاگتا رہے گا جبکہ باقی آرام کریں گے۔ یہ بات اب تمہاری سمجھ میں بھی آ چکی ہو گی کہ ہم کس قسم کے لوگ ہیں۔ اگر تم نے مدد کے لیے چیخنے چلانے کی کوشش کی تو تمہاری زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ اگر تم اسی طرح خاموشی سے ہمارے ساتھ تعاون کرتی رہو تو یقین کرو ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

رقاصہ لینزا تھرا اٹھی۔ چارلس کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچائے گا۔ وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔

صبح ساڑھے سات بجے رقاصہ کی آنکھ کھلی تو چارلس کو اپنے پلنگ کی پٹی پر بیٹھے دیکھ کر گڑبڑا سی گئی۔ رات کا بیشتر حصہ اس نے جاگتے ہوئے گزارا تھا اور نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔

"روم سروس کو فون پر دو آدمیوں کے ناشتہ کے لیے کہہ دو۔ اور خبردار کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔" چارلس نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

رقاصہ نے بلا چون و چرا اس کے حکم کی تکمیل کرتے ہوئے ہوٹل کی روم سروس کو دو آدمیوں کے ناشتے کے لیے کہہ دیا۔ کچھ دیر بعد جب دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ تو پرمیئر بڑی پھرتی سے باتھ روم میں گھس گیا۔ چارلس اس طرح صوفے پر دراز ہو گیا، جیسے وہ لینزا کا کوئی دوست ہو اور صبح ہی صبح اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے آ گیا ہو۔ اس کی نظریں رقاصہ کے چہرے پر مرکوز تھیں اور انداز بتا رہا تھا کہ اگر رقاصہ نے کوئی غلط حرکت کرنے یا ویٹر کو کسی قسم کا خفیہ اشارہ کرنے کی کوشش کی تو ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر شوٹ کر دے گا۔

چارلس اور پرمیئر نے رقاصہ کو ناشتے کے لیے پوچھا تک نہیں تھا۔ وہ دونوں ہی سارا ناشتہ چٹ کر گئے اور اطمینان سے بیٹھ کر ہوٹل میں کسی جگہ کام شروع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ اس قسم کے بڑے ہوٹلوں میں عام طور پر مرمت کا کوئی نہ کوئی کام ہوتا ہی رہتا تھا۔ انہیں بھی مایوسی نہیں ہوئی۔ نو بجے کے لگ بھگ ہوٹل کے کسی حصے میں ٹھک ٹھک کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ دونوں بھی اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ بیس منٹ کی لگاتار کوشش کے باوجود ان کی ڈرل مشین کنکریٹ کے فرش میں ایک انچ سوراخ کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہو پائی تھی۔ بیس منٹ بعد پائرے پرمیئر مشین بند کر کے راہداری میں نکل گیا۔ وہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ ڈرل مشین کی آواز نے کسی کو اس کمرے کی طرف متوجہ تو نہیں کیا لیکن ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ چارلس تھوڑی تھوڑی دیر بعد مدھم لہجے میں واکی ٹاکی پر کسی سے باتیں کرنے لگتا۔ اس نے رقاصہ کو بتایا کہ ان کا ایک اور ساتھی پائرے ڈیوکسم اسی ہوٹل میں کسی جگہ موجود ہے جو تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے اس کمرے سے باہر کے حالات سے مطلع کر رہا ہے۔ ایک موقع پر چارلس نے ہنستے ہوئے رقاصہ کو بتایا کہ اس کمرے کے نیچے واقع جیولری اسٹور کی چھت اس طرح تھرتھرا رہی ہے جیسے زلزلہ آ گیا ہو لیکن کسی نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ وہ لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید اوپر کے کسی کمرے میں مرمت کا کام ہو رہا ہے۔

دس بجے کے قریب دروازے پر دستک کی آواز سن کر وہ چونک گئے۔ وہ ہوٹل کا ایک ملازم تھا جو کمرے کی صفائی کے لیے آیا تھا۔ رقاصہ نے چارلس کی ہدایت پر تھوڑا سا دروازہ کھول کر جواب دے دیا کہ آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ چارلس اس وقت دروازے کی آڑ میں کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا رخ رقاصہ کی طرف تھا۔

دوپہر تک چارلس اور پرمیئر ڈرلنگ میں مصروف رہے۔ فرش نہایت مضبوط ہونے کی وجہ سے انہیں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی، چارلس اس عمارت کے تعمیر کرنے والوں کی شان میں قصیدے بھی پڑھتا جا رہا تھا۔ اس دوران امریکی رقاصہ نے ایک دو مرتبہ ان کی غفلت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن اسے پستول یا چاقو سے دھمکا کر خاموش کر دیا جاتا۔ ایک مرتبہ تو چارلس چلتی ہوئی ڈرل مشین لے کر اس کی طرف لپکا تھا اور پرمیئر اگر لپک کر رقاصہ کا منہ نہ دبا لیتا تو اس کی چیخ دوسروں کو اس کمرے کی طرف متوجہ کر دیتی۔ دوپہر کا کھانا بھی روم سروس ہی کے ذریعے منگوایا گیا۔ چارلس نے اس مرتبہ بھی رقاصہ کو کھانے کے لیے نہیں پوچھا۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ کچھ دوری پر واقع ایک میدان سے فوجی دستوں کی پریڈ کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ چارلس ہندوستان کی سیاست سے بے خبر نہیں تھا۔ اندرا گاندھی پاکستان کے خلاف ایک اور جنگ کی تیاری کر رہی تھی۔ فوجی دستے دہلی کی سڑکوں پر عام طور پر دندناتے ہوئے نظر آتے لیکن چارلس کو یہاں کے سیاسی حالات سے غرض نہیں تھی۔ وہ تو اس ڈرل بٹ کو دیکھ رہا تھا جو دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد دوسری بٹ بھی ٹوٹ گئی۔ چارلس اس نتیجہ پر پہنچا کہ کمرہ نمبر ۲۸۹ کے فرش میں سوراخ کر کے جیولری اسٹور تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ گزشتہ رات سے اب تک کی محنت رائیگاں گئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے بریف کیس میں سے عمارت کا نقشہ نکال لیا اور گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ ہوٹل کی پوری عمارت مرکزی طور پر ائیرکنڈیشنڈ تھی۔ چارلس کو نقشے میں ایک ایسا ائیرکنڈیشنگ پائپ نظر آ گیا جو اس منزل سے نیچے جیولری اسٹور راجستھان ایمپوریم تک چلا گیا تھا۔ وہ دونوں دبلے پتلے تھے اور اس پائپ کے اندر آسانی سے رینگ سکتے تھے۔ مسئلہ صرف رگوں میں خون منجمد کر دینے والی سردی کا تھا۔ چارلس نے رقاصہ کے اٹیچی کیس میں سے اس کے تمام سوئیٹر وغیرہ نکلوا لیے اور رقاصہ کو پلنگ پر لٹا کر اس کے ہاتھ پیر پلنگ سے باندھ دیے اور منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا گیا تاکہ وہ شور نہ مچا سکے۔ رقاصہ لینزا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے پہلی مرتبہ بڑی شدت سے اپنی بے بسی کا احساس ہونے لگا تھا۔

چارلس سوبھراج، پرمیئر کو کمرے میں چھوڑ کر ائیرکنڈیشنگ پائپ کا جائزہ لینے کے لیے راہداری میں نکل آیا۔ پائپ راہداری کی چھت کے ساتھ ساتھ راہداری کی دیوار پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا گیا

تھا لیکن اس کی توقع کے برعکس پائپ کا قطر اتنا زیادہ نہیں تھا کہ اس جیسا دبلا پتلا شخص بھی اس میں داخل ہو سکتا۔ اس نے کمرے میں آکر پریمیئر کو اس صورتحال سے آگاہ کیا اور سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ پریمیئر کے چہرے پر بھی تشویش کے تاثرات ابھر آئے۔

"ایک ترکیب ہو سکتی ہے۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پریمیئر نے لب کشائی کی۔

"وہ کیا؟" چارلس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں نہ ایئر کنڈیشننگ پائپ کو دستی بم سے اڑا دیا جائے؟"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟" چارلس نے اسے گھورا۔ "تمہاری اس تجویز میں بہت سی خامیاں ہیں۔ پہلی تو یہ کہ ہمارے پاس دستی بم نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ ایئر کنڈیشننگ کو اڑانے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا اور تیسری اور سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ بم کا دھماکہ اتنا خوفناک ہو گا کہ اس سے نہ صرف اس ہوٹل کی آدھی بلڈنگ اڑ جائے گی بلکہ ہماری اپنی زندگیوں کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہو گی۔" وہ خاموش ہو کر انگلیاں چٹخانے لگا۔ پھر یکایک اچھل پڑا۔ "تیزاب... ہاں تیزاب، اگر انتہائی طاقتور قسم کا کوئی تیزاب فرش کے اس سوراخ میں ڈال دیا جائے تو ہم اس سوراخ کو نہایت آسانی سے کشادہ کر سکتے ہیں۔"

اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ سوا چھ بج چکے تھے۔ اس وقت تک بلیک آؤٹ کی وجہ سے بیشتر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ اگر کوئی ایک آدھ دکان کھلی بھی ہو گی تو وہاں انھیں مطلوبہ چیز نہیں مل سکتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ ایک ہاتھ کا گھونسہ دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتے ہوئے بولا۔ "ہم آج کی رات بھی بین الاقوامی شہرت کی مالک اس امریکی رقاصہ کے کمرے میں گزاریں گے۔"

رقاصہ لیزا... کو کھول دیا گیا۔ منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکلتے ہی اس نے پہلے چند لمبے لمبے سانس لیے پھر لہجے کو پرسکون بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"تم لوگ شاید یہ بات بھول رہے ہو کہ آج رات ہوٹل کے نائٹ کلب میں میرا ڈانس پروگرام ہے۔"

"آج کا پروگرام بھول جاؤ۔ فون پر کلب کے منیجر کو اطلاع دے دو کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے آج رات تم پروگرام نہیں کر سکو گی۔" چارلس بولا۔

"یہ ناممکن ہے۔" ایستھر نے نفی میں سر ہلایا۔ "آج رات انٹرنیشنل اکیڈمی کے کچھ لوگ کلب میں آنے والے ہیں اور یوں بھی معاہدے کی رو سے میں کسی پروگرام سے انکار نہیں کر سکتی۔"

"اگر تم ڈانس کرنے پر بضد ہو تو۔" چارلس نے سرد لہجے میں کہا۔ "آج رات تمہارا ڈانس اسی کمرے میں ہو گا اور وہ بھی صرف میرے لیے۔ فون کا ریسیور اٹھاؤ اور منیجر کو پروگرام کی منسوخی کی اطلاع دے دو۔"

"وہ نہیں مانے گا۔" لیزا رو دینے والے لہجے میں بولی۔ "میری طبیعت کی خرابی کا سنتے ہی وہ ڈاکٹر کو یہاں بھیج دے گا۔ معاہدے کے بعد کوئی رقاصہ ڈانس سے صرف اس وقت انکار کر سکتی ہے جب اس کی کوئی ٹانگ ٹوٹ چکی ہو۔"

پریمیئر کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ لیزا اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر لرز اٹھی۔ وہ اس سے نظریں چراتے ہوئے ان دونوں کو سمجھانے کی کوشش کرتی رہی کہ اب تک خاموش رہ کر ان سے تعاون کرتی رہی ہے۔ اس نے ان کے کام میں مداخلت کی کبھی کوشش نہیں کی لیکن آج رات ہندوستان کی بعض مقتدر ہستیاں اس کا پروگرام دیکھنے کے لیے آ رہی ہیں اور وہ ان لوگوں کے سامنے اپنے فن کے اظہار کا یہ موقع کھونا نہیں چاہتی تھی۔

"آج کی رات مجھے مت روکو پلیز!" وہ ملتجی لہجے میں بولی۔ "اگر تم چاہو تو میں تم لوگوں کو اسٹیج کے قریب کوئی ایسی میز دلوا سکتی ہوں، جہاں سے میری نگرانی کر سکو گے۔ اگر چاہو تو تم میں سے کوئی ایک مجھے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھے ہوئے پستول کی زد میں رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں، میں کوئی غلط قدم اٹھانے کی حماقت نہیں کروں گی۔"

چارلس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ غالباً لیزا... کی اس تجویز پر غور کر رہا تھا۔ اس کی اس الجھن کو دیکھتے ہوئے لیزا کے دل میں ایک بار پھر امید کی کرن روشن ہوئی اور وہ فرار کا منصوبہ بنانے لگی۔ اسٹیج پر ڈانس کے دوران ایک مرتبہ اسے اسٹیج کے کنارے پر رکھی ہوئی باریک جالی کی ایک اسکرین کے پیچھے جانا پڑتا تھا۔ اس انتہائی مختصر سے وقت میں وہ نہایت پھرتی سے لباس تبدیل کر کے دوبارہ اسٹیج پر آ جاتی۔ اس نے سوچا کہ آج رات اس اسکرین کے پیچھے جاتے ہی مدد کے لیے چیخنا چلانا شروع کر دے گی یا سیدھے سادے طریقے پر عمل کرتے ہوئے کسی تماشائی سے لپٹ کر شور مچا دے گی۔

"ٹھیک ہے۔" چارلس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد جواب دیا۔ "ہال کی مختلف میزوں پر ہمارے کئی آدمی موجود ہوں گے۔ اگر تم نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو چاروں طرف سے فائرنگ شروع ہو جائے گی جس میں لاتعداد بے گناہ بھی مارے جائیں گے اور تمہارے جسم میں تو اتنی گولیاں پیوست ہوں گی کہ ان کا شمار بھی نہیں ہو سکے گا۔"

"کیا تم واقعی مجھے بھی شوٹ کر دو گے؟" لیزا نے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ میں تشدد یا قتل و غارت کو پسند نہیں کرتا لیکن وقت آنے پر ایسا کوئی قدم اٹھانے سے دریغ بھی نہیں کروں گا۔" چارلس نے جواب دیا۔

"کیا واقعی تم مجھے گولی مار سکو گے؟" لیزا نے اپنی بات دہراتے

ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں، یہاں۔" چارلس نے اس کے دل کے مقام کی طرف اشارہ کیا۔ "میں تمہارے چہرے یا ٹانگ پر گولی نہیں ماروں گا کیونکہ نہ میں تمہارا چہرہ بگاڑنا چاہتا ہوں اور نہ میں ٹانگ توڑوں گا کیونکہ میں تم جیسی حسین عورتوں کو پسند کرتا ہوں۔"

پریمیئر نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ چارلس کی اس بات پر اسے واقعی ہنسی آ گئی تھی۔ چارلس کی جگہ اگر وہ اس مشن کا باس ہوتا تو اب تک لیزا کی کم از کم ایک ٹانگ تو ضرور توڑ چکا ہوتا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد چارلس اچانک ہی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور لیزا کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔

"نہیں، آج رات میں تمہیں ڈانس کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

لیزا اس کے فیصلے کی اس تبدیلی پر پریشان سی ہو گئی۔ چارلس نے بتایا کہ دن رات جاگتے رہنے کی وجہ سے بیحد تھکا ہوا ہے اور وہ کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتا۔ مزید برآں اسے اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ وہ ایک بہت بڑی بین الاقوامی تنظیم کا رکن ہے جو اس پر مکمل طور پر اعتماد کرتی ہے۔ تنظیم نے اسے یہ مشن سونپا تھا اور وہ کسی قسم کا خطرہ مول لے کر تنظیم کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ چارلس نے اگرچہ تنظیم کا نام نہیں لیا تھا لیکن لیزا کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ مافیا یا ایسی ہی کسی خوفناک تنظیم کے شکنجے میں آ چکی ہے۔

"لیکن کیا ایک عورت کو اس طرح اذیت دیتے ہوئے تمہارا ضمیر تمہیں ملامت نہیں کرتا؟" لیزا نے ایک آخری کوشش کی۔

"میں ماضی کے جس خارزار سے گزرا ہوں اس کے بعد میری فلاسفی میں ضمیر نام کی کسی چیز کا وجود نہیں رہا۔" چارلس سوبھراج نے کہتے ہوئے فون کا ریسیور اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا رخ لیزا کی طرف تھا۔

لیزا نے کرب آمیز نگاہوں سے چارلس کی طرف دیکھتے ہوئے نائٹ کلب کا نمبر ملایا اور منیجر کو اطلاع دی کہ علالت کے باعث وہ آج کے پروگرام میں حصہ نہیں لے سکے گی۔

بہرحال، ہفتے کی وہ رات کسی نہ کسی طرح گزر گئی۔ شدید ذہنی اذیت کے باعث لیزا رات کو نیند میں بھی چونک چونک کر اٹھ جاتی۔ چارلس نے اسے ایک بار پھر پلنگ سے باندھ دیا تھا کیونکہ وہ خود بھی کچھ آرام کرنا چاہتے تھے۔ اس نے جب لیزا کے منہ میں کپڑا ٹھونسنا چاہا تو اس نے وعدہ کیا کہ وہ شور مچانے کی کوشش نہیں کرے گی۔ وہ رات بھر جسمانی اور ذہنی کرب میں مبتلا رہی۔ کچھ دیر کو آنکھ لگتی تو بھیانک خواب دکھائی دینے لگتے۔ اس کی رات اسی طرح سوتے جاگتے ہوئے گزر گئی۔ رات کو کئی مرتبہ اس نے سڑک پر دندناتے ہوئے فوجیوں کے بھاری جوتوں کی دھمک سنی تھی۔ بلیک آؤٹ کی وجہ سے فوجی دستے رات بھر شہر میں گشت کرتے رہتے۔ کئی مرتبہ اس نے اس ہاتھی کی چنگھاڑ بھی سنی تھی جس پر ہوٹل میں قیام کرنے والے مہمانوں کو دن بھر سیر کرائی جاتی تھی۔ لیزا ایک مرتبہ خود بھی اس ہاتھی پر بیٹھ کر سیر کر چکی تھی لیکن اس نے کبھی اس کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ لیکن اس رات چنگھاڑ سن کر اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ دن بھر مشقت کرنے والے اس ہاتھی کو بھی رات کے وقت آہنی زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔

اتوار کی صبح لیزا کے لیے کچھ زیادہ ہی خوفناک ثابت ہوئی۔ وہ چھتیس گھنٹوں سے ان کی قید میں تھی۔ اس کے جسم پر شب خوابی کا وہی لباس تھا، جو اس رات ان کے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے اس نے پہنا تھا۔ پسینے کی بو سے اس کا دماغ ماؤف ہو چلا تھا۔ پھر یکایک اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور وہ بری طرح چیخ اٹھی۔ صوفے پر بیٹھا ہوا چارلس سوبھراج بدحواسی میں اچھل کر پلنگ کے قریب پہنچا اور تکیے سے لیزا کا منہ دبا دیا۔ اس نے تکیہ اس وقت ہٹایا جب لیزا کی آنکھیں اپنے حلقوں سے ابلنے لگی تھیں۔

"مجھے افسوس ہے۔" لیزا گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے بولی۔ "مگر یہ ذہنی اذیت اب میری برداشت سے باہر ہو رہی ہے۔"

"اس قسم کی کوئی دوسری کوشش تمہاری زندگی کے خاتمے پر ختم ہو گی۔" چارلس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

وہ کچھ دیر تک لیزا کی چیخ کے ردِعمل کا انتظار کرتا رہا مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ چیخ کی آواز یا تو کمرے سے باہر نہیں پہنچی تھی اور اگر کسی نے وہ آواز سنی بھی تھی تو اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ مطمئن ہونے کے بعد چارلس نے پریمیئر کو تیزاب کی تلاش میں بھیج دیا اور لیزا کو مشورہ دیا کہ گرم پانی سے نہا لے۔ غسل سے اس کی تھکن دور ہو جائے گی اور وہ ذہنی طور پر جو ٹینشن محسوس کر رہی ہے وہ بھی کسی حد تک کم ہو جائے گا۔ مگر لیزا نے اس کا مشورہ ماننے سے انکار کر دیا۔ چارلس چند لمحے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بریف کیس سے ایک شیشی نکال لی جس میں رنگ برنگی گولیاں بھری ہوئی تھیں۔

"غسل سے تم تازگی محسوس کرو گی اور کسی حد تک ذہنی سکون بھی ملے گا۔ اس طرح تم چیخنے چلانے والی حماقت دوبارہ نہیں دہراؤ گی بصورتِ دیگر تمہیں خاموش رکھنے کے لیے دو چار خواب آور گولیاں تمہارے حلق میں ٹھونسنی پڑیں گی۔"

لیزا بدحواس سی ہو کر باتھ روم میں گھس گئی۔

ظاہر ہے لیزا کے لیے اس ہدایت پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ نیم گرم پانی کے غسل سے اسے واقعی کچھ سکون سا ملا تھا اور وہ کچھ سوچنے کے قابل ہو سکی تھی۔ نہاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ گزشتہ تقریباً چالیس گھنٹوں کے دوران ان لوگوں نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا اور غالباً اسے نقصان پہنچانے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے

تھے۔ اس کے خیال میں لوبو (چارلس سوبھراج رقاصہ سے اسی نام سے متعارف ہوا تھا) ایک معقول آدمی تھا۔ نجانے وہ کیا حالات ہوں گے جو اس خوبرو نوجوان کو اس راستے پر لے آئے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ ایک منجھا ہوا مجرم تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے سینے میں ہمدردی اور ملامت کے جذبات بھی موجود تھے۔ ایستھر نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ وہ لوگ اسے جب بھی پلنگ سے باندھتے لوبو اس بات کا خیال رکھتا کہ بندشیں اتنی سخت نہ ہوں کہ لیزا کو کسی قسم کی تکلیف پہنچ سکے۔ یہ صورتحال دیکھتے ہوئے لیزا کو قدرے اطمینان سا ہوا کہ اسے کسی قسم کا جسمانی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ خاموشی سے آنے والے وقت کا انتظار کرتی رہے۔ عین ممکن تھا کہ کسی وقت وہ دونوں کسی کام سے کمرے سے باہر نکلیں تو اسے اپنے بچاؤ کا موقع مل جائے یا نائٹ کلب کی انتظامیہ کا کوئی شخص اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے اس طرف آنکلے۔ وہ جمعہ کی رات سے اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اسے امید تھی کہ کوئی نہ کوئی اس کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہو کر اس طرف ضرور آئے گا۔

گیارہ بجے کے قریب پرمیئر واپس آگیا اس نے بتایا کہ اتوار ہونے کی وجہ سے شہر کی بیشتر دکانیں بند ہیں۔ تیزاب کہیں سے بھی نہیں مل سکا۔ البتہ ڈیوکسم فوٹو گرافی کی ڈیولپمنٹ میں استعمال ہونے والا کیمیکل حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے یہ کیمیکل کنکریٹ کے فرش کو نہیں گلا سکتا تھا۔ لوبو ایک ایسی زبان میں گالیاں بکنے لگا جس کا ایک لفظ بھی لیزا کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ وہ خاموشی سے بستر پڑی رہی۔

لوبو تقریباً ایک گھنٹے تک بے چینی اور اضطراب کی کیفیت میں کمرے میں ٹہلتا رہا۔ کبھی کبھی وہ اس طرح بڑبڑانے لگتا کہ اس کا کوئی لفظ کسی کی سمجھ میں نہ آتا۔ اس نے اس مرتبہ یہ بھی سوچا تھا کہ یہ منصوبہ ختم کر کے یہاں سے نکل جائے لیکن مورس کا خوف اس کے ذہن پر مسلط تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ میکاؤ میں جب وہ مورس کے ساتھ اس ڈکیتی کی تفصیلات طے کر رہا تھا اور ایک موقع پر اس نے اس منصوبے سے دستبرداری کا اعلان کیا تھا تو مورس نے نہ صرف اسے اپنے ذاتی خرچ کے لیے بلکہ اس منصوبے کے اخراجات کے لیے دی جانے والی تین ہزار ڈالر کی رقم کی واپسی کے مطالبے کے علاوہ اسے یہ بھی دھمکی دی تھی کہ وہ اسے میکاؤ کاسینو کے غنڈوں کے حوالے کر دے گا۔ جو اس سے اپنے قرض کی وصولی کے لیے اس کے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دیں گے۔

چارلس عجیب سی ذہنی الجھن کا شکار تھا۔ کمرے کے فرش میں سوراخ کر کے نیچے جیولری اسٹور تک رسائی حاصل کرنا ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔ کوئی اور طریقہ اس کے ذہن میں نہیں آرہا تھا۔ بالآخر اس نے براہِ راست قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ایک نیا منصوبہ تیار کیا جس میں امریکی رقاصہ لیزا کو نہایت اہم کردار ادا کرنا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ انہیں اپنے منصوبے کی تفصیلات سمجھا رہا تھا۔

سہ پہر پانچ بجے کے لگ بھگ اشوکا ہوٹل کے جیولری اسٹور راجستھان ایمپوریم کے سپروائزر رلائن نے کلب کی نامور رقاصہ لیزا کی ٹیلیفون کال ریسیو کی۔ لیزا نے بتایا کہ کل اس کی والدہ امریکہ سے آرہی ہے اور وہ خوش آمدید کے طور پر اپنی ماں کو چند قیمتی تحائف دینا چاہتی ہے۔ طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے وہ خود اسٹور تک نہیں آسکتی۔ اگر مناسب سمجھا جائے تو چند چیزیں اس کے کمرے میں بھیج دی جائیں تاکہ وہ اپنی پسند کے مطابق انتخاب کر سکے۔ اس نے سپروائزر سے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر راجستھان ایمپوریم میں کوئی معیاری چیز نہ ہو تو پھر زحمت نہ کی جائے۔

فون کا ریسیور رکھتے ہوئے لیزا کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ لوبو نے اس کی گردن پر رکھا ہوا پستول پیچھے ہٹا لیا اور جھک کر اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ حقیقت یہ تھی کہ لیزا نے فون پر بڑی کامیاب اور تاثر انگیز گفتگو کی تھی اور لوبو سوچ رہا تھا کہ منصوبے کی تکمیل کے بعد لیزا کو بھی کچھ نہ کچھ حصہ ضرور دے گا۔

لوبو کی ہدایت پر لیزا چند منٹ کے اندر اندر تیار ہو گئی۔ سرخ ڈیلویٹ کے نائٹ گون اور ہلکے سے میک اپ میں وہ خاصی پرکشش نظر آرہی تھی۔ لوبو ہی کی ہدایت پر اس نے اپنے زیورات بھی پہن لیے تھے، جو اس کے وقار میں مزید اضافے کا باعث بن رہے تھے۔ چند منٹ بعد جب دروازے پر دستک کی آواز ابھری تو لیزا کے اعصاب سکڑ گئے۔

لوبو فوراً ہی باتھ روم میں گھس گیا۔ پرمیئر مطمئن انداز میں صوفے پر نیم دراز تھا۔ پستول صوفے کے کشن کے نیچے ایسی جگہ رکھا تھا جہاں سے وہ اسے آسانی سے گرفت میں لے سکتا تھا۔ پرمیئر کو اس ڈرامے میں لیزا کے سوشل سیکریٹری کا کردار سونپا گیا تھا۔ دروازے پر دستک ہوتے ہی لیزا نے پرمیئر کی طرف دیکھا اور پھر پروقار انداز میں آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ راجستھان ایمپوریم کا سپروائزر رلائن تھا جو اسے دیکھ کر ایک لمحہ کو تو پلک جھپکنا بھی بھول گیا تھا۔

چند رسمی جملوں کے بعد رلائن نے وہ کیس اس کے سامنے کھول دیا جس میں بچھے ہوئے سفید مخمل کی سطح پر انگوٹھیاں، بریسلٹ، اور نیکلس آراستہ تھے۔ ان میں جڑے ہوئے ہیروں کی جگمگاہٹ سے ایک لمحہ کو تو لیزا کی آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔

"ان سے بہتر چیزیں آپ کو ہندوستان میں کہیں بھی نہیں مل سکیں گی میڈم!" رلائن نے خالص کاروباری لہجے میں کہا، "کوئی بھی چیز اٹھا لیجیے۔ آپ کی والدہ کے لیے اس سے عمدہ اور قیمتی تحفہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"شاید۔" لیزا نے کہتے ہوئے ایک انگوٹھی اٹھالی اور کسی ماہر جوہری کی طرح اس میں جڑے ہوئے ہیرے کا جائزہ لینے لگی۔ انگوٹھی رکھ کر ایک نیکلس اور بریسلٹ اٹھا لیا لیکن چند لمحوں بعد اس نے یہ دونوں چیزیں بھی واپس رکھ دیں۔ اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ "میں نے فون پر بھی کہا تھا کہ اگر راجستھان ایمپوریم میں ڈھنگ کی کوئی چیز نہ ہو تو زحمت نہ کی جائے۔ مجھے افسوس ہے کہ ان میں کوئی بھی چیز میرے معیار کی نہیں ہے۔ ایسی چیزیں تو دہلی کے کسی عام جوہری کی دکان پر بھی مل سکتی ہیں۔ یہ دیکھو۔" اس نے اپنے نیکلس کی طرف اشارہ کیا۔ "کوئی ایسی چیز ہو تو دکھاؤ ورنہ میں معذرت چاہوں گی۔"

رلائن کی نظریں بے اختیار اس کے نیکلس کی طرف اٹھ گئیں جس میں جڑے ہوئے قیمتی پتھروں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ اسے دل ہی دل میں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ وہ واقعی میڈم لیزا کے ذوق و معیار کی کوئی چیز نہیں لایا تھا۔ وہ معذرت کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔

رلائن کے جاتے ہی لوبو باتھ روم سے نکل آیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ توصیفی نگاہوں سے لیزا کی طرف دیکھ رہا تھا جس نے اب تک اپنا کردار بڑی خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔ وہ اس حقیقت سے پہلے ہی آگاہ تھا کہ پہلے بلاوے پر راجستھان ایمپوریم کی انتظامیہ کوئی کام کی چیز نہیں بھیجے گی لیکن اب لیزا کی شخصیت اور باتوں سے متاثر ہونے کے بعد وہ اس گاہک کو مسخر کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ لوبو نے فوراً ہی اس ڈرامے کے اگلے منظر کی تیاری شروع کر دی۔ لیزا کو ایک کرسی پر بٹھا کر اس کے پیر رسی سے باندھ دیے گئے اور اس پر اس طرح کمبل ڈال دیا گیا کہ پوری ٹانگیں ڈھک گئیں۔ لوبو نے اپنے اس رویّے کی معافی بھی مانگی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ اس ڈرامے کے کلائمیکس پر اس کے اوپر سے کمبل ہٹا دیا جائے گا تاکہ راجستھان ایمپوریم کا نمائندہ اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ لے کہ ان خطرناک لٹیروں نے اسے اپنا قیدی بنا رکھا تھا جس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ اس ڈکیتی میں مجرموں کی شریک کار نہیں تھی۔ اس طرح پولیس اس کا لوبو یا اس کے ساتھیوں سے کوئی تعلق ثابت نہ کر سکے گی۔

لوبو نے لیزا کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ایک بار پھر کمرے کا تنقیدی جائزہ لیا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر سیٹ تھی۔ پرمیئر بھی پہلے کی طرح صوفے پر نیم دراز تھا۔ دستک کے جواب میں دروازہ اسی کو کھولنا تھا۔ لوبو مطمئن انداز میں گردن ہلاتا ہوا باتھ روم میں چلا گیا۔ اس وقت شام کے ساڑھے سات بجے تھے اور ایک انجانے خوف کے باوجود کرسی پر بیٹھی ہوئی لیزا یوں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ واقعی کسی ڈرامے کا کردار ہو اور اپنی پرفارمنس دینے کے لیے پردہ اٹھنے کا انتظار کر رہی ہو۔

دروازے پر دستک کی ہلکی سی آواز ابھری، پرمیئر اور لیزا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر پرمیئر نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ

راجستھان ایمپوریم کا مالک مسٹر پرویش تھا جس نے پہلے گاہک کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے اپنے سپروائزر کو چند عام سی چیزیں دے کر بھیج دیا تھا اور اب وہ بنفسِ نفیس حاضر ہوا تھا۔ لینزا شاہانہ انداز میں کرسی پر براجمان تھی۔ اس نے سر کے اشارے سے پرویش کے سلام کا جواب دیا۔ اس کے اس انداز میں بھی وقار کی جھلک نمایاں تھی۔ چند ایک رسمی باتوں کے تبادلے کے بعد پرویش نے بریف کیس کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی لینزا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

مخصوص طرز کے بنے ہوئے اس بریف کیس کی مخملی سطح پر سجے ہوئے جواہرات آنکھوں میں چکاچوند سی پیدا کر رہے تھے۔ طلائی نیکلس، آویزے جن میں روبی کی چمک نمایاں تھی۔ زمرد کا ہاتھی کی شکل کا بروچ، نیلم اور یاقوت کے جڑاؤ والی انگوٹھیاں اس کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھیں۔ ان چیزوں کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں تھی لیکن لینزا کا اندازہ تھا کہ ان کی مالیت لاکھوں ڈالر میں ہوگی۔ وہ ایک ایک چیز اٹھا کر گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ توصیفی جملے بھی بولتی جا رہی تھی۔ اسی دوران باتھ روم کا دروازہ کھلا اور لوبو سامنے آ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں پر تولیہ پڑا ہوا تھا۔ پرویش نے سرسری سی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔ تولیہ دیکھ کر وہ یہی سمجھا کہ باتھ روم سے برآمد ہونے والا وہ شخص گیلے ہاتھ پونچھ رہا ہے۔ اس کے دل میں ایک لمحہ کو بھی کسی قسم کا شک نہیں ابھرا تھا لیکن لینزا جانتی تھی کہ لوبو کے ہاتھوں میں تولیے کے اندر پستول پوشیدہ تھا جس کا رخ پرویش کی طرف تھا۔ لوبو تولیہ ہٹائے بغیر پرویش کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں بریف کیس میں آراستہ جواہرات کی مالیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس نے جواہرات کی تعریف میں چند جملے کہے اور پرویش سے اس طرح باتیں کرنے لگا جیسے وہ پرانے دوست ہوں۔ گفتگو موسم اور فلموں سے ہوتی ہوئی سیاست پر پہنچ گئی۔ پرویش ملکی حالات سے مطمئن نہیں تھا۔ اسے اندرا گاندھی کی پالیسیوں سے شدید اختلاف تھا جو ان دنوں بڑے زور شور سے پاکستان کے خلاف جنگی تیاریوں میں مصروف تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق جنگ کسی بھی وقت چھیڑی جا سکتی تھی۔ لوبو اس دوران سامنے والی کرسی سے اٹھ کر پرویش کے ساتھ ہی صوفے پر آن بیٹھا تھا۔ لینزا کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے تھے۔ چند لمحوں میں جو کچھ ہونے والا تھا اس کے تصور ہی سے اس کے حواس جواب دینے لگے تھے۔ اس کے اعصاب کا تناؤ بڑھ رہا تھا اور وہ کسی بھی لمحہ چیخ سکتی تھی۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر لوبو نے مزید انتظار مناسب نہیں سمجھا اور ہاتھوں پر سے تولیہ ہٹا دیا۔ دوسرے ہی لمحہ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی نال پرویش کی پسلیوں کو چھو رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے لینزا کے جسم پر پڑا ہوا کمبل کھینچ کر ہٹا دیا۔ اس کے پیر بندھے ہوئے تھے۔ لینزا کے اعصاب جواب دے گئے۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ پرمیر نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تولیے سے اس کا منہ بند کر دیا۔ لینزا کی چیخ حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔

”منہ سے کسی قسم کی آواز نکالنے کی کوشش مت کرنا۔“ لوبو، پرویش کی پسلیوں میں پستول کی نال گاڑتے ہوئے غرایا۔ ”میرا خیال تھا کہ تم اپنی ساری دکان لاؤ گے لیکن آخر ہندو بنیے ہی ٹھہرے۔ مگر اطمینان رکھو۔ صبح جب تم دکان کھولو گے تو وہاں تمہیں ایک چھلا تک نہیں ملے گا۔“

پرویش کے چہرے پر موت کی سی سفیدی چھا گئی۔ خوف و دہشت سے وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کی قوتِ گویائی سلب ہو کر رہ گئی تھی اور کوشش کے باوجود اس کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا تھا۔ لوبو کے اشارے پر پرمیر نے آگے بڑھ کر پرویش کی جیب سے دکان کی چابی نکال لی۔ لوبو نے بتایا کہ وہ کم از کم دس بجے تک انتظار کریں گے۔ اس وقت تک ہوٹل کے شاپنگ آرکیڈ کی ساری دکانیں بند ہو چکی ہوں گی اور ہوٹل کی راہداریاں بھی تقریباً سنسان ہو چکی ہوں گی۔ اس وقت ہم اطمینان سے دکان میں داخل ہو کر اپنا کام کر سکیں گے۔

”ہمیں کوئی عجلت نہیں ہے۔ ہم انتظار کریں گے۔“ لوبو نے کہتے ہوئے میز پر رکھے ہوئے ٹیپ ریکارڈر پر ایک کیسٹ چلا دیا۔ کمرے کی فضا میں لتا منگیشکر کی آواز بکھرنے لگی۔ لینزا اردو زبان کے صرف دو چار الفاظ ہی بول سکتی تھی لیکن اس نے اردو گانوں کے چند ایسے کیسٹ بھی خرید رکھے تھے جن کی موسیقی پر اپنے طور پر مشرقی رقص سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

پرمیر نے پرویش کے ہاتھ پیر باندھ کر باتھ روم میں ڈال دیا۔ اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا گیا تھا تاکہ دوسروں کو متوجہ کرنے کے لیے وہ کسی قسم کی آواز نہ نکال سکے۔ اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد لوبو نے باتھ روم کا دروازہ بند کر دیا اور لینزا کو ہوٹل کی روم سروس سے کھانا منگوانے کے لیے کہا۔ لینزا الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ صورتحال انتہائی سنگین ہونے کے باوجود وہ مطمئن و پرسکون تھا۔

کچھ دیر کے بعد جب ویٹر کھانا لے کر کمرے میں آیا تو لوبو بڑے پرسکون لہجے میں لینزا سے باتیں کر رہا تھا۔ اسے ذرا بھی پروا نہیں تھی کہ ایک شخص باتھ روم میں بند پڑا ہے اور لینزا اس کے سامنے بیٹھی تھی جس کی ذہنی کیفیت نہایت ابتر تھی۔ اس کی کوئی معمولی سی لغزش بھی اس کھیل کا پانسہ پلٹ سکتی تھی لیکن لینزا محسوس کر رہی تھی کہ لوبو آہنی اعصاب کا مالک تھا۔ وہ بد سے بدتر حالات کا سامنا کرنا بھی جانتا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب لوبو، پرمیر کو ان دونوں کی نگرانی کی ہدایت کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پی او اے سی کا فلائیٹ بیگ لٹکا ہوا تھا۔ لینزا کے قریب پہنچ کر اس نے بیگ کی زپ کھول دی۔ بیگ میں جھانکتے ہی لینزا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

راجستھان ایمپوریم کا سارا خزانہ اس بیگ میں موجود تھا۔ ہیروں کی چمک کچھ عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔ لوبو نے مٹھی بھر کر ہیرے بیگ میں سے نکال کر لینزا کی گود میں ڈال دیے۔

”تم ان میں سے کوئی ایک اپنے لیے منتخب کر سکتی ہو۔“ لوبو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

لینزا کے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔ ایک لمحہ کو وہ الجھ کر رہ گئی۔ حرص اسے اکسا رہی تھی لیکن عقل نے اس کا ہاتھ روک لیا اور اس نے لوبو کی طرف دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ لوبو کندھے اچکا کر رہ گیا۔ بہرحال، یہ بحث کا موقع نہیں تھا۔ اس نے بیگ بند کر کے میز پر رکھ دیا اور لینزا کے ہاتھ بھی باندھنے لگا۔ پیر تو اس کے پہلے ہی بندھے ہوئے تھے۔ پھر لوبو اور پرمیر نے لینزا کو بھی اٹھا کر باتھ روم میں ڈال دیا۔ وہ ہر کام پورے اطمینان اور سکون سے کر رہا تھا۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے جب وہ نیچے دکان میں گھسا ہیرے جواہرات سمیٹ رہا تھا تو اس نے ہوٹل میں قیام پذیر ایک مہمان کو شیشے سے دکان کے اندر جھانکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ دکان میں چونکہ گہری تاریکی تھی اور لوبو فوراً ہی ایک شوکیس کے پیچھے دبک گیا تھا اس لیے اسے اطمینان تھا کہ ہوٹل کا یہ مہمان مزید توجہ نہیں دے سکا ہوگا۔ اگر اس نے کوئی غیر معمولی بات محسوس کی ہوتی تو اب تک ہنگامہ مچ چکا ہوتا۔

”اب مجھے ایک اور ناگوار فریضہ انجام دینا ہوگا۔“ لوبو نے لینزا کو غسل خانے کے فرش پر ڈالتے ہوئے پرویش کی طرف دیکھا۔ ”ایک ایک خواب آور گولی کھا لو تاکہ تم دونوں صبح تک اطمینان سے سوتے رہو۔“

لینزا کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ لوبو جیب سے گولیوں کی شیشی نکال کر پرویش کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پرویش سر کو جھٹک جھٹک کر مزاحمت کرتا رہا مگر لوبو نے اس کے جبڑے چیر کر گولی اس کے حلق میں ٹھونس دی اور منہ پر کپڑا باندھ کر لینزا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لینزا کی حالت بہت ہی ابتر تھی۔ لوبو نے کچھ سوچ کر اسے خواب آور گولی کھلانے کا ارادہ ترک کر دیا اور کمرے سے ایک نپکن اٹھا کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا تاکہ وہ شور نہ مچا سکے۔ پھر وہ اس کے سامنے بیٹھا عجیب سی نگاہوں سے لینزا کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ جمعہ کی رات سے اب تک اس کمرے میں رہتے ہوئے وہ لینزا کے لیے کچھ عجیب سے جذبات محسوس کرنے لگا تھا۔ اس دوران ایک دو مرتبہ اس نے اپنے ذاتی معاملات پر بھی گفتگو کی تھی۔ اسے اپنی بیوی ہیلن اور بیٹی شوبرا کے بارے میں بتاتے ہوئے اسے ان کی تصویر بھی دکھائی تھی۔

”میں تمہارے ساتھ مزید کوئی زیادتی نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے خواب آور گولی کھلانے کے بجائے تمہارے منہ میں کپڑا ٹھونسنے پر ہی اکتفا کر رہا ہوں۔“ وہ لینزا کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”صبح پانچ بجے سے پہلے کوئی حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا۔ ہوٹل میں میرے چند دوسرے ساتھی بھی موجود ہیں جو میرے جانے کے بعد بھی کم از کم چوبیس گھنٹے یہاں رہیں گے اور وہ میری طرح نرم دل نہیں ہیں۔“

لینزا نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلا دیا پھر سر کو اس طرح جھٹکے دینے لگی جیسے اسے منہ میں ٹھونسا ہوا کپڑا نکالنے کا اشارہ کر رہی ہو۔ لوبو نے نپکن کھینچ لیا۔

”میرا دم گھٹ رہا ہے۔ پلیز! میرے منہ میں کپڑا مت ٹھونسو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ صبح سے پہلے کوئی آواز تک نہیں نکالوں گی۔“

لوبو، لینزا کے لہجے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ چند لمحے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر نپکن ایک طرف پھینکتا ہوا باتھ روم سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد کمرے کے خارجی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے مڑ کر باتھ روم کی طرف دیکھا۔

”تم واقعی اچھی لڑکی ہو اور خوبصورت بھی۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا رقص بھی ایسا ہی خوبصورت ہوگا۔ میں ایک نہ ایک دن تمہارا رقص دیکھنے کے لیے ضرور آؤں گا۔“ وہ کہتا ہوا دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

❋

مشرقِ بعید اور یورپ کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے دہلی کا پالم ایئرپورٹ آدھی رات سے صبح تک انتہائی مصروف رہتا ہے۔ بیشتر انٹرنیشنل پروازیں انہی اوقات میں لینڈ یا پرواز کرتی ہیں۔

یکم نومبر ۱۹۷۱ء کی رات کا آخری پہر یہاں ایک عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ ٹرمنل کے برآمدوں اور راہداریوں میں بھکاریوں کی بھرمار تھی۔ وہ مختلف روپ میں مسافروں کو متاثر کر کے ان کی جیب سے کچھ نہ کچھ نکلوانے کی کوشش کر رہے تھے۔ غیر ملکی مسافر عجیب صورتِ حال سے دوچار تھے۔ ایئرلائنز کا مقامی عملہ ان پر طرح طرح کے اعتراضات کر رہا تھا۔ مسلح فوجی ہر جگہ دندناتے پھر رہے تھے۔ وہ ہر شخص کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ غیر ملکی ان کی توجہ کا خاص مرکز بنے ہوئے تھے۔

ایسی صورتحال کا جائزہ چارلس بہت پہلے لے چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایئرپورٹ اس انداز میں پہنچا تھا کہ اسے طہران کا ٹکٹ لینے اور کسٹمز سے نمٹنے کے بعد وہاں لاؤنج میں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑے۔ اس کے فلائیٹ بیگ میں لاکھوں ڈالر کی مالیت کے ہیرے جواہرات کے علاوہ دس ہزار

ڈالر نقدی کی صورت میں بھی موجود تھے۔ اسے معلوم تھا ان دنوں شہر کی سڑکوں کے علاوہ ایئرپورٹ پر بھی فوجی گشت کرتے رہتے تھے۔ پولیس اور سکیورٹی کا عملہ بھی خاصا مستعد تھا۔ ایسی صورت میں وہ ایئرپورٹ پر زیادہ دیر رک کر کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹہ پہلے اشوکا ہوٹل کے ایک عقبی دروازے سے نکلے تھے۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق پرمیرا اور ڈیوکسم کو ٹرین کے ذریعے بمبئی روانہ ہو جانا تھا جہاں سے وہ کسی بھی فلائٹ سے طہران پہنچ جاتے جہاں مالِ غنیمت تقسیم کیا جاتا۔ لوٹ کا مال چونکہ چارلس کے پاس تھا اس لیے اسے کسی بھی پہلی فلائٹ سے ہندوستان سے نکل جانا تھا۔

چارلس ہندوستانیوں کی نفسیات سے بھی پوری طرح آگاہ تھا۔ انگریزوں نے دو سو سال تک ہندوستان پر حکومت کی تھی اور یہاں کے باشندے آزادی ملنے کے طویل عرصہ بعد بھی اسی غلامانہ ذہنیت کا شکار تھے۔ غیر ملکیوں کے سامنے تو وہ بچھ بچھ جاتے خصوصاً کوئی ایسا غیر ملکی جو قیمتی لباس میں ہو اور پُروقار شخصیت کا مالک ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اشوکا ہوٹل سے نکلنے سے پہلے چارلس نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ایئرپورٹ پر کسٹمز کا عملہ غیر ملکیوں کے ساتھ خصوصی رعایت برت رہا تھا۔ یہ بھی شاید اسی غلامانہ ذہنیت کا اثر تھا کہ وہ بعض غیر ملکی مسافروں کا سامان کھلوانا بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

چارلس نے ایئرلائن کاؤنٹر سے طہران کا ٹکٹ خریدا۔ اس نے رقم کی ادائیگی ہندوستانی کرنسی میں کی تھی۔ اسے راجستھان ایمپوریم کے سیف سے ڈالرز کے علاوہ ہندوستانی کرنسی بھی خاصی مقدار میں مل گئی تھی۔ امیگریشن کاؤنٹر سے بھی وہ کسی رکاوٹ کے بغیر گزر گیا حالانکہ ایلن گیلین کے نام سے اس کا پاسپورٹ جعلی تھا۔ بالآخر وہ کسٹمز کاؤنٹر پر پہنچ گیا جہاں کسٹمز کا عملہ مسافروں کا سامان چیک کرنے اور اس پر چاک سے او کے کے نشان لگانے میں مصروف تھا۔ یہ اس کے راستے کی آخری رکاوٹ تھی۔ اس کے بعد ٹرانزٹ لاؤنج تھا جہاں دوسرے گیٹ کے سامنے مسافروں کو جہاز تک لے جانے کے لیے بس کھڑی تھی اور مسافر بس میں سوار ہو رہے تھے۔ چارلس سے آگے کسٹمز کاؤنٹر کے سامنے قطار میں گنتی کے صرف چند آدمی تھے اور وہ بڑے سکون سے کھڑا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کہ دفعتاً ایک آواز سن کر وہ بری طرح چونک گیا۔

"مسٹر گیلین!"

یہ آواز ہال کے داخلی دروازے سے آئی تھی اور جب سے اس نے یہ نام اپنایا تھا کسی نے پہلی مرتبہ اسے اس نام سے مخاطب کیا تھا۔ اس کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اس نے ایسا انداز اختیار کر لیا جیسے آواز سنی ہی نہ ہو۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو پیچھے مڑ کر دیکھنے سے باز رکھ سکا تھا لیکن چند لمحوں بعد کسی نے دوبارہ اس کا نام پکارا اور اس مرتبہ یہ آواز بہت قریب سے آئی تھی اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے کندھے پر کسی مضبوط ہاتھ کا بوجھ محسوس کیا۔ چارلس کے جسم کے مسام بڑی تیزی سے پسینہ اگلنے لگے لیکن اس نے اپنے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ ایئر انڈیا کا بکنگ ایجنٹ تھا جس نے نرم لہجے میں بتایا کہ اس کے ٹکٹ کے معاملے میں ایک پیچیدگی سی پیدا ہو گئی ہے۔

"کیسی پیچیدگی؟" چارلس نے پُرسکون لہجے میں کہتے ہوئے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ اس کی فلائٹ روانہ ہونے میں صرف چند منٹ رہ گئے تھے۔

"آپ نے ٹکٹ خریدتے وقت رقم کی ادائیگی ہندوستانی کرنسی میں کی تھی جبکہ غیر ملکی مسافر اس کے مجاز نہیں ہیں۔ وہ صرف ڈالر، پونڈ اسٹرلنگ یا فرانک میں ہی ادائیگی کر سکتے ہیں۔" بکنگ ایجنٹ نے بتایا۔

چارلس کا چہرہ بگڑ گیا۔ وہ بکنگ ایجنٹ پر برس پڑا کہ محض اس معمولی سی بات پر اسے پریشان کر رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس قسم کا درشت رویہ اکثر معاون ثابت ہوتا تھا لیکن اس مرتبہ اس کا یہ حربہ کامیاب نہ ہو سکا اور بکنگ ایجنٹ بضد رہا کہ وہ بکنگ کاؤنٹر پر جا کر اس معاملے کو سلجھا لے۔ ایجنٹ نے اسے یقین دہانی کرائی تھی کہ جہاز اس کے سوار ہونے سے پہلے پرواز نہیں کرے گا۔ چارلس بڑبڑاتا ہوا ایجنٹ کے ساتھ چل پڑا۔ کرنسی کے تبادلے کا مسئلہ حل کرنے میں پانچ منٹ لگ گئے جبکہ چارلس کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کسٹمز کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔ وہاں اس وقت کوئی مسافر نہیں تھا۔ کسٹمز کا عملہ عام طور پر مسافروں کے دستی سامان پر زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا۔ کسٹمز انسپکٹر بیگ کی زپ کھول کر سرسری سے انداز میں اس کا جائزہ لینے لگا جس میں چند کپڑے، شیونگ کا سامان ٹوتھ پیسٹ و برش اور سیاحت سے متعلق چند کتابچے بے ترتیبی سے ٹھنسے ہوئے تھے۔ لاکھوں ڈالر کی مالیت کے جواہرات اور دس ہزار ڈالر کی نقد رقم بیگ کے نیچے خفیہ تہ میں پوشیدہ تھی۔ انسپکٹر جس انداز میں چیکنگ کر رہا تھا اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ زیادہ گہرائی میں نہیں جائے گا۔ چارلس کی نظریں انسپکٹر کے ہاتھ پر تھیں اور ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اس آخری مرحلے کے بعد اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکے گی۔ اسی لمحہ ملے جلے شور کی آواز سن کر چارلس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اشوکا ہوٹل کے جیولری اسٹور راجستھان ایمپوریم کا مالک پردیش نہایت خستہ حالت میں گیٹ میں داخل ہو کر لاؤنج میں موجود مسافروں کے چہروں کو گھور رہا تھا اس کے ساتھ آٹھ دس مسلح پولیس والے بھی تھے۔ چارلس کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ امریکی رقاصہ لیبزا نے اپنا خاموش رہنے کا وعدہ پورا نہیں کیا تھا۔

ایک طرف کسٹمز آفیسر اور دوسری طرف پولیس۔

چارلس سوبھراج قدرت کی اس ستم ظریفی پر دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ وہ آہنی اعصاب کا مالک تھا۔ کسی بدحواسی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اس نے اپنے ذہن کو کنٹرول میں رکھا اور وہی کچھ کیا جو ایسے موقع پر کسی عقل مند آدمی کو کرنا چاہیے۔ اس نے کسٹمز آفیسر کی طرف دیکھا جو ابھی تک اس کے ایئر بیگ میں ٹھنسی ہوئی چیزوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ محض رسمی کارروائی کر رہا ہے۔ ورنہ اسے اس بیگ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"آپ میرا بیگ چیک کر لیجیے آفیسر، میں ابھی آیا۔" چارلس نے مسکراتے ہوئے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی اٹھا دی اور اس کاؤنٹر کے سامنے سے ہٹ کر ایک اور کاؤنٹر کی آڑ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہال کے آخری سرے کی طرف چل دیا۔ یہاں بھی کچھ مسافر بنچوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ غالباً انہیں کسی دوسری فلائٹ سے جانا تھا۔ چارلس اس طرح آڑا ہو کر چل رہا تھا کہ اس کی پشت ہال میں داخل ہونے والے پولیس والوں اور راجستھان ایمپوریم کے مالک پردیش کی طرف تھی جو ہونق سا چہرہ بنائے اس طرف موجود مسافروں کے چہروں میں جھانک رہا تھا۔ ہال کے آخری سرے پر ایک دفتر کا دروازہ دیکھ کر چارلس تیزی سے اندر گھس گیا۔ اتفاق سے دفتر میں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ چارلس متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا دوسرے دروازے کی طرف لپکا جو دوسری طرف واقع لگیج روم میں کھلتا تھا۔ دو پورٹر سامان اٹھا اٹھا کر رن وے کی طرف رخ کیے ہوئے ٹرک پر لاد رہے تھے۔ مسافروں کا یہ سامان یقیناً کسی فلائٹ سے جانے والا تھا۔ چارلس ان پورٹروں کی طرف توجہ دیے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دائیں طرف ایک اور دروازے میں گھس گیا۔ اس کا دوسرا قدم اس لاؤنج میں تھا جو کسی ریلوے اسٹیشن کے تھرڈ کلاس ویٹنگ روم کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ستون کے قریب بیٹھا ہوا ایک بھکاری اس کی طرف لپکا مگر چارلس اسے دھکیلتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ چند ہی لمحوں بعد وہ بھیگی ہوئی رات کی کھلی فضا میں سانس لے رہا تھا۔

کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہوئے کسٹمز آفیسر نے مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بیگ کی زپ بند کر دی اور چاک سے اس پر "او کے" کا نشان لگا کر مسافر کی واپسی کا انتظار کرنے لگا جو ٹائلٹ گیا تھا۔ دو منٹ گزر گئے۔ مسافر ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ اس دوران راجستھان ایمپوریم کا مالک پردیش مسلح پولیس والوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور کاؤنٹر پر رکھے ہوئے پی او اے سی کے فلائٹ بیگ کو دیکھتے ہی مُردار خور گدھ کی طرح اس پر جھپٹا۔

"یہ......یہ......یہی ہے وہ بیگ!" پردیش کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔ کاؤنٹر کی دوسری طرف ایستادہ کسٹمز آفیسر حیرت سے کبھی حواس باختہ پردیش کو اور کبھی پولیس والوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

چارلس سوبھراج صبح پہلی ٹرین سے بمبئی روانہ ہو گیا۔ عین آخری لمحات میں جس صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس کا اسے افسوس تھا لیکن اشوکا ہوٹل کے اس کمرے میں اس نے وہ تین دن جس کیفیت میں گزارے تھے وہ اس کی زندگی کے یادگار لمحات تھے۔ اس کا خیال تھا کہ تین دن تک کمرے میں بند رہتے ہوئے اس نے ہر ہر لمحہ زندگی کو بھرپور انداز سے محسوس کیا تھا۔

دہلی کے اخبارات نے اس ڈکیتی کی خبر نمایاں طور پر شائع کی تھی۔ امریکن رقاصہ الینٹھر کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ اس تصویر میں وہ اپنی عمر سے کہیں بڑی نظر آ رہی تھی۔ اس نے اس سنسنی خیز ڈرامے کے ایک ایک لمحے کی تفصیل بیان کی تھی۔ اخبارات نے جیولری اسٹور کے مالک پردیش کا بیان بھی نمایاں طور پر شائع کیا تھا۔ اس نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ وہ پُراسرار "مسٹر لولو" کوئی پیشہ ور قاتل تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑی خوفناک تھی۔ چارلس سوبھراج نے دو تین اخبارات اپنے پاس محفوظ کر لیے تاکہ مورس کے سامنے انہیں ثبوت کے طور پر پیش کر سکے کہ اس نے منصوبے کی تکمیل میں کسی بددیانتی یا کوتاہی کا ثبوت نہیں دیا تھا بلکہ عین آخری لمحات میں اسے ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا فلائٹ بیگ پالم ایئرپورٹ پر چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کرنا پڑی تھی۔

بمبئی پہنچنے کے دوسرے ہی دن وہ طہران روانہ ہو گیا۔ اسے ہندوستان سے نکلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ویسے بھی اس وقت اس کے پاس ایک اور فرضی نام سے نیا پاسپورٹ موجود تھا۔ چارلس سوبھراج کے خیال میں بمبئی جیسے شہر میں جعلی پاسپورٹ خریدنا ایسا ہی تھا جیسے چلتے چلتے کسی دکان سے مٹھائی خرید لی جائے۔

تہران میں چارلس کو بڑی پیچیدہ صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ مورس کسی طرح اس کی اس کہانی پر یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ لیکن جب چارلس نے دہلی کے اخبارات اس کے سامنے رکھے تو اس کا غصہ کسی حد تک کم ہوا تاہم وہ مسلسل چارلس کو برا بھلا کہتے ہوئے اس کو اس ناکامی کا ذمہ دار ٹھہراتا رہا۔ اس کے خیال میں اشوکا ہوٹل سے فرار ہوتے وقت چارلس اگر امریکی رقاصہ کو بھی بے ہوش کر دیتا یا اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیتا تو اس وقت صورتحال مختلف ہوتی۔ مورس کو رہ رہ کر چارلس کی اس حماقت پر تاؤ آ رہا تھا جس کی وجہ سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا تھا۔ مورس جس طرح بار بار سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے چارلس پر جھپٹ پڑے گا۔ چارلس بھی غیر محتاط نہیں تھا۔ اس کا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں چاقو پر تھا لیکن اسے یقین تھا کہ چاقو کے استعمال کا

موقع نہیں آئے گا کیونکہ وہ جس لہجے میں مورس کی باتوں کا جواب دے رہا تھا وہ سلگتی ہوئی لکڑی پر پانی کے چھینٹوں کا کام دے رہا تھا۔ بالآخر مورس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور وہ سر جھٹکتے ہوئے متوازن لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ میرے ذہن میں ایک اور منصوبہ ہے جس سے ہم اپنا یہ نقصان بھی پورا کر سکتے ہیں۔"

"وہ کیا؟" چارلس نے کوٹ کی جیب سے ہاتھ نکالتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ چارلس کو یہ احساس بڑی شدت سے تھا کہ وہ مورس کا مقروض ہے۔ دہلی میں ناکام ہونے والے اس منصوبے میں ضائع ہونے والی تین ہزار ڈالر کی رقم بھی اسی نے فراہم کی تھی اور یہ رقم بھی اب چارلس ہی کے کھاتے میں شامل کر دی گئی تھی ظاہر ہے جب تک یہ قرض بے باق نہیں ہو جائے گا چارلس اس کے انگوٹھے تلے دبا رہے گا۔

"اس کے لیے تمہیں بمبئی واپس جانا پڑے گا۔ بہت سیدھا سادا سا منصوبہ ہے۔ تم جیسا شاطر آدمی اکیلا بھی یہ کام کر سکتا ہے۔" مورس نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اپنا منصوبہ بتانے لگا۔

مورس طویل عرصے سے بمبئی کے ایک بنک کی نگرانی کر رہا تھا۔ عام دنوں میں زیادہ رقم کا لین دین تو نہیں ہوتا تھا لیکن ہفتے میں ایک دن ایسا ضرور آتا تھا جب اس علاقے میں واقع تین چار بڑی بڑی فیکٹریوں کے ملازمین کی تنخواہوں کے علاوہ ہندوستان کی ایک بہت بڑی لاٹری کی رقم بھی اس بنک میں جمع کرائی جاتی تھی۔ مورس کے اندازے کے مطابق فیکٹریوں کے ملازمین کی تنخواہوں اور لاٹری کو ملا کر کل رقم ایک کروڑ روپے کے لگ بھگ ضرور ہوتی ہو گی۔ یہ رقم اسی روز صبح ہی ہیڈ آفس سے بنک کی اس برانچ میں پہنچا دی جاتی تھی جسے دوپہر کے بعد تقسیم کیا جاتا تھا۔ منصوبے کی تفصیلات بتاتے ہوئے مورس نے آنسو گیس پھینکنے والے دو پستول بھی چارلس کے حوالے کر دیے جو دیکھنے میں بالکل اصلی معلوم ہوتے تھے۔ اس سے کسی کو دھمکانے کے علاوہ ہنگامی صورتحال میں آنسو گیس استعمال کر کے اپنا بچاؤ بھی کیا جا سکتا تھا۔

اس کے دوسرے ہی روز وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ پروگرام کے مطابق انہیں کئی روز بعد بمبئی کے تاج محل ہوٹل میں ملاقات کرنا تھی۔ مورس نے چارلس کو مشورہ دیا تھا کہ وہ تاج محل ہوٹل میں ملاقات سے پہلے اس منصوبے کو کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچا لے کیونکہ اسی میں اس کی بھلائی تھی۔

بمبئی کے ہوٹل میں چارلس سوبھراج اور ہیلن کی ملاقات کم از کم ہیلن کے لیے بڑی امید افزا تھی۔ چارلس نے اسے ٹیلیگرام دے کر میکاؤ سے یہاں بلا لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آنے والے دنوں میں اپنی طویل غیر حاضری اور ہیلن کو پہنچنے والی ذہنی کوفت کی تلافی کر دے گا۔ ہیلن نے فوراً ہی گلے شکوے شروع کر دیے تھے مگر چارلس اس کی باتوں پر کان دھرنے کے بجائے شوبھرا کی طرف متوجہ تھا جو اب ایک سال کی ہو چکی تھی۔ شوبھرا کو پیار کرتے ہوئے چارلس نے کوٹ کی جیب سے ایک طلائی انگوٹھی نکالی جس میں جڑا ہوا ہیرا بلب کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ ہیلن کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ آخر وہ لمحہ آ ہی گیا تھا جب وہ اس کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کی تلافی کرنے جا رہا تھا مگر اس وقت تو ہیلن کا دل پارہ پارہ ہو گیا جب چارلس نے انگوٹھی اس کے بجائے ننھی شوبھرا کی انگلی میں ڈال دی۔ شوبھرا کے لیے یہ انگوٹھی بہت بڑی تھی۔ وہ انگوٹھی دوبارہ جیب میں ڈالتے ہوئے بڑبڑایا۔

"انگوٹھی بڑی ہے۔ اسے چھوٹا کروانا پڑے گا۔"

۱۲ نومبر ۱۹۷۱ء کی شام کو چارلس سوبھراج تاج محل ہوٹل سے کچھ فاصلے پر واقع ایک ریسٹورنٹ کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ یہ ریسٹورنٹ درمیانے درجے کے فلمی اداکاروں اور فلمسازوں کی آمد و رفت کا مرکز تھا۔ گھر سے بھاگے ہوئے نوجوان بھی کسی فلمساز کی نظروں میں آنے کے خیال سے شام سے رات گئے تک اس ریسٹورنٹ کے ارد گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ چارلس کو یاد تھا کہ پہلی مرتبہ جب وہ بمبئی آیا تھا تو اسی ریسٹورنٹ میں چائے پینے کے دوران ایک فلمساز نے اسے اپنی زیر تکمیل فلم میں ایک ایکسٹرا کردار کی پیشکش کی تھی جس کے لیے غیر ملکی ہونا ضروری تھا۔ مگر چارلس نے ہنس کر فلمساز کی اس پیشکش کو ٹال دیا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر اسے کبھی اداکاری کا شوق چرایا تو وہ اس فلمساز سے ضرور رابطہ قائم کرے گا لیکن اس وقت یہاں اس کی موجودگی کا مقصد کسی فلمساز سے ملاقات نہیں تھا۔ وہ تو ایک شناسا چہرے کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔

وہ ریسٹورنٹ کے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑا متجسس نگاہوں سے راہگیروں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ گشت پر نکلے ہوئے دو کانسٹیبل اسے دیکھ کر رک گئے۔ وہ چند لمحے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے رہے پھر سرگوشیانہ انداز میں آپس میں کچھ مشورہ کیا اور آگے بڑھ کر اسے ایک کار کی چوری اور دھوکا دہی کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ یہ کیس اس وقت کا تھا جب شروع دنوں میں چارلس نے بمبئی میں غیر ملکی کاروں کی فروخت کا کاروبار شروع کیا تھا۔ اس کا ایک گاہک جس نے اس سے مرسیڈیز خریدی تھی، تیز رفتاری کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ وہ پولیس کے سامنے اکڑ بیٹھا اور پھر تفتیش کے دوران انکشاف ہوا کہ کار کے کاغذات جعلی تھے۔ مرسیڈیز کے مالک نے چالان تو بھگت لیا مگر اس کے ساتھ ہی اس نے چارلس سوبھراج نامی کار ڈیلر کے خلاف دھوکا دہی کی رپورٹ درج کرا دی تھی اور پولیس اسی وقت سے اس کی تلاش میں تھی۔ اس شخص نے رپورٹ میں چارلس سوبھراج کا جو حلیہ درج کرایا تھا وہ اتنا واضح تھا کہ ایک بچہ بھی اسے شناخت کر سکتا تھا۔

چارلس پولیس والوں پر برس پڑا کہ انہیں اپنے مطلوبہ آدمی کی شناخت کے سلسلے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے شناختی کاغذات نکالنے کے لیے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس کے کوٹ کی جیب میں فرضی نام کا ایک پاسپورٹ موجود رہتا تھا تاکہ کسی ایسے موقع پر پولیس کو غچہ دیا جا سکے لیکن بدقسمتی سے پاسپورٹ کے ساتھ ہی ایک وزٹنگ کارڈ جیب سے نکل کر نیچے گر گیا جسے ایک پولیس والے نے جھک کر اٹھا لیا۔ کارڈ پر "جے لوبو، ڈائرکٹر کاسینو میکاؤ" کا نام پڑھتے ہی پولیس والا بری طرح چونک گیا۔ دہلی کے اشوکا ہوٹل میں ڈکیتی کی واردات ہندوستان کے تمام اخبارات میں شہ سرخیوں سے شائع ہوئی تھی۔ ڈاکوؤں کے سرغنہ "پُراسرار مسٹر لوبو" کے بارے میں ہر اخبار میں بہت کچھ لکھا گیا تھا اور یہ نام تقریباً ہر شخص کے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ ایک بڑی مچھلی کے اس طرح اتفاقیہ طور پر جال میں آ جانے سے پولیس والے اپنی کارکردگی پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

۱۴ نومبر کو کسی نے ٹیلیفون پر ہیلن کو بتایا کہ اس کے شوہر کو دہلی کے اشوکا ہوٹل کی ڈکیتی کے الزام میں گرفتار کر کے تفتیش کے لیے دہلی بھیج دیا گیا ہے۔ ہیلن کو سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس نے شوبھرا کی وہ انگوٹھی بیچ دی جو چارلس نے اسے سنبھال کر رکھنے کو دی تھی کہ بعد میں اسے کٹوا کر چھوٹا کروا لیا جائے گا۔ انگوٹھی کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم سے اس نے جہاز کا ٹکٹ خریدا اور اسی روز دہلی روانہ ہو گئی۔

چارلس نے بڑے محتاط الفاظ میں اپنے جرم کا اعتراف کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ پولیس اس کا یہ بیان کسی بھی عدالت میں اس کے خلاف استعمال نہیں کر سکے گی۔ بیان دیتے وقت اس نے فرانسیسی زبان بکثرت استعمال کی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پولیس والے ان الفاظ کا صحیح ترجمہ نہ کر سکیں گے اور وہ اس نکتے کو بھی اپنے دفاع میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر بھی فوراً ہی اعترافِ جرم کر لیا تھا کہ ہندوستان کی پولیس کے بارے میں وہ بہت کچھ سن چکا تھا۔ یہاں کی پولیس تو تشدد کے نت نئے حربوں سے ایسے لوگوں سے بھی اعترافِ جرم کروا لیتی تھی جنہوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کوئی جرم نہ کیا تھا۔ اس نے پولیس کو جو بیان دیا تھا وہ خاصا سنسنی خیز تھا۔

"میرا بچپن سائیگون میں گزرا تھا۔ میرا باپ سائیگون میں چار ٹیلرنگ شاپس اور ایک ہوٹل کا مالک ہونے کی وجہ سے سائیگون کی اعلیٰ سوسائٹی میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ میں نے اپنی تعلیم سائیگون اور فرانس میں حاصل کی۔ ۱۹۶۲-۶۴ء میں، میں نے سوربون کی یونیورسٹی سے گریجویشن کی سند حاصل کی۔ دو سال تک قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مزید دو سال تک سائنٹفک اکیڈمی میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ ہیلن سے میری ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ جہاں وہ اسپینی زبان میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کرنے کی تیاری کر رہی تھی ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے اور ۱۹۶۹ء میں ہم نے شادی کر لی۔ اس کے بعد میں نے آگ بجھانے کے آلات تیار کرنے والی ایک کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی جہاں بیس فیصد کمیشن کے حساب سے ایک ہزار سے پندرہ سو ڈالر ماہانہ تک کماتا رہا۔ اس وقت بیس افراد میری ماتحتی میں کام کرتے تھے۔ میں نے آئی بی ایم کا پروگرامنگ کورس بھی کیا ہے۔ ایک سال بعد کمپنی کی ملازمت چھوڑ کر میں نے اپنا بزنس شروع کر دیا۔ میں فیکٹریوں سے مال خرید کر مناسب کمیشن پر دکانداروں کے ہاتھ فروخت کر دیتا۔ اس سلسلے میں مجھے چند مرتبہ ملک سے باہر جانے کا موقع بھی ملا۔ پھر ۱۹۷۰ء میں، میں نے یہ کام بھی چھوڑ دیا کیونکہ میں سائیگون میں اپنے باپ کے کاروبار میں ہاتھ بٹانا چاہتا تھا۔"

چارلس کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اب وہ بری طرح پھنس چکا ہے اور فوری طور پر اس کا چھٹکارہ پانا بہت مشکل ہے۔ اشوکا ہوٹل کی ڈکیتی کے سلسلے میں بیان دیتے ہوئے اس نے ہوٹل کے نائٹ کلب کی رقاصہ الیستھر کو بھی سزا دینے کا فیصلہ کر لیا جس کی وجہ سے عین آخری لمحات میں اس کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا تھا۔ اس نے پولیس کو بتایا کہ ہوٹل کی رقاصہ الیستھر بھی ڈکیتی کی اس واردات میں ان کے ساتھ شامل تھی۔ اس نے اس مقصد کے لیے جیولری اسٹور کے عین اوپر ہوٹل کا کمرہ نمبر ۲۸۹ حاصل کیا تھا۔ ڈکیتی کا یہ منصوبہ بھی الیستھر ہی نے بنایا تھا اور وہ شروع سے آخر تک ان کی رہنمائی کرتی رہی تھی۔

پولیس نے فوراً ہی اشوکا ہوٹل کی رقاصہ الیستھر کو گرفتار کر لیا۔ وہ اپنی بے گناہی اور چارلس سے لاتعلقی کا یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی لیکن پولیس نے اسے دہلی کے نواح میں جیل بھیج دیا جہاں اس کی چیخیں جیل کی اونچی فصیلوں میں گھٹ کر رہ گئیں۔

گرفتاری کے کئی روز بعد چارلس عدالت کے احاطے میں

واقع جوڈیشل حوالات میں بند مجسٹریٹ کے سامنے پیشی کا منتظر تھا کہ دفعتاً وہ بری طرح چیخنے چلّانے لگا۔ اس کی حالت اس بکرے کی سی تھی جسے زمین پر گرا کر ذبح کیا جا رہا ہو۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ تھام رکھا تھا اور اس کے حلق سے نکلنے والی چیخیں آسمان کی خبر لا رہی تھیں چہرے پر کرب و اذیت کے تاثرات ظاہر کر رہے تھے کہ وہ واقعی تکلیف میں ہے۔ جوڈیشل حوالات کے آفیسر انچارج نے اسے فوری طور پر ہسپتال بھیج دیا۔

ہسپتال کا نوجوان ڈاکٹر اس کے پیٹ کو قدرے دائیں طرف سے دباتے ہوئے اس سے مختلف سوالات کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے جیسے ہی ایک جگہ ہاتھ رکھ کر دبایا چارلس بری طرح چیخ اٹھا۔

''یہی...... ہاں یہی جگہ ہے۔ مجھے پرانا السر ہے۔ کبھی کبھی بری طرح تڑپا دیتا ہے۔''

''السر نہیں، اپنڈکس ہے۔ آپریشن ہوگا۔'' ڈاکٹر نے یہ کہتے ہوئے اپنے ماتحتوں کو اشارا کیا کہ اسے آپریشن تھیٹر پہنچا دیا جائے۔

چارلس بری طرح بدحواس ہو گیا۔ اس نے تکلیف کا بہانہ محض ہسپتال میں آنے کے لیے کیا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ایک دو دن ہسپتال میں رہتے ہوئے وہ فرار کا کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کر لے گا لیکن اب الٹی آنتیں گلے میں پڑ رہی تھیں۔ اس نے یقین دلانے کی بہت کوشش کی کہ اب وہ قدرے بہتر ہے لیکن اس کی کسی بات پر کان دھرنے کے بجائے اسے آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا۔

اپنڈکس کے آپریشن کے بعد چارلس کو ایک پرائیویٹ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں چار پانچ روز تک تو اس نے بستر سے ہلنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک مسلح پولیس والا چوبیس گھنٹے دروازے پر موجود رہتا تھا۔ چارلس کو اکیلے باتھ روم تک جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ ایسے موقع پر پولیس والا اسے ہتھکڑی لگا دیتا اور زنجیر کا دوسرا سرا تھامے اس کے ساتھ کھڑا رہتا۔ البتہ اس کے پاس ملاقاتیوں کی آمد و رفت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام ہیلن پھولوں کا گلدستہ اور بادام کے بسکٹوں کا ڈبہ لے کر پہنچی تو دروازے پر موجود سنتری نے حسب معمول پھولوں کے گلدستے اور بسکٹوں کے ڈبے کو چیک کرنا ضروری سمجھا تاکہ کوئی ممنوعہ چیز اندر نہ لے جائی جا سکے۔ چارلس کے ہسپتال میں داخل ہونے کے بعد ہیلن کئی مرتبہ یہاں آ چکی تھی اور پولیس کانسٹیبل اس سے کسی حد تک مانوس ہو چکا تھا۔

کمرہ تاریک تھا۔ بلیک آؤٹ کے باعث رات کے وقت کمرے میں موم بتی تک جلانے کی اجازت نہیں تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی ہیلن نے نتھنے سکوڑ لیے۔ کمرے میں طویل عرصے سے سفیدی اور صفائی وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے ایک عجیب ناگوار سی بو کا احساس ہو رہا تھا۔ چارلس آہنی پٹی والے پلنگ پر نیم دراز تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ہتھکڑی تھی جس کی زنجیر کا دوسرا سرا پلنگ کی پٹی سے منسلک تھا۔ وہ دونوں فرانسیسی زبان میں باتیں کرتے رہے۔ حالانکہ انہیں کسی ایسی زبان میں باتیں کرنے کی ممانعت تھی جو محافظ کی سمجھ میں نہ آسکے۔ محافظ جب انہیں ٹوکتا تو وہ انگلش میں باتیں کرنے لگتے لیکن کچھ دیر بعد دوبارہ فرانسیسی بولنے لگتے۔ ایک گھنٹہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ ملاقات کا وقت ختم ہو رہا تھا۔

''ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ اب تم جا سکتی ہو مس!'' دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے سنتری نے ہیلن کو مخاطب کیا۔

''کیا تم کچھ دیر اور رکنے کی اجازت نہیں دے سکتے؟ یہاں دیکھنے والا کون ہے جو تمہاری شکایت کرے گا؟'' ہیلن کا لہجہ ملتجی تھا۔

سنتری نے زیادہ اصرار نہیں کیا اور اپنی جگہ پر بیٹھا خلا میں گھورتا رہا۔ ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ چارلس اور ہیلن سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ ان کی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہونے پر کمرے کی نیم تاریک فضا میں خاموشی پھیل گئی۔ سنتری نے بنچ پر بیٹھے بیٹھے دیوار سے ٹیک لگا لی تھی، اور پھر چارلس کی پیشگوئی کے عین مطابق وہ اسی طرح بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ باقاعدہ خراٹے لینے لگا۔ کمرے کی خاموش فضا میں اس کے خراٹوں کی آواز بڑا پُراسرار تاثر دے رہی تھی۔ چارلس نے کن انکھیوں سے سنتری کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے ہیلن کا ہاتھ دبایا ہیلن نے معنی خیز انداز میں سر ہلا دیا۔ ہیلن جب پہلی مرتبہ چارلس سے ملاقات کے لیے اس کمرے میں آئی تھی تو چارلس نے اسی روز فرار کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ ہیلن کو اس منصوبے میں اہم کردار ادا کرنا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دبے پاؤں سنتری کی طرف بڑھنے لگی۔ اسے صورتحال کی نزاکت اور اس کے نتائج کا پوری طرح احساس تھا لیکن اس کے باوجود وہ پوری طرح مطمئن اور پُرسکون تھی۔ سنتری کے قریب پہنچ کر اس نے کسی ماہر جیب تراش کی طرح سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں اس کی جیب میں داخل کر دیں جس میں چابیوں کا گچھا رکھا ہوا تھا۔ اس نے نہایت ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے چابیوں کا گچھا نکال لیا اور بڑی عجلت سے چارلس کی ہتھکڑی کھول دی۔ چارلس آہستگی سے پلنگ سے اتر آیا۔ اس نے ہیلن کو اشارے سے خدا حافظ کہا اور دبے قدموں کمرے سے نکل کر تاریک راہداری میں غائب ہو گیا۔ ہیلن نے بستر پر لیٹ کر چادر اوڑھ لی۔ آنے والے لمحات کے خیال سے پہلی مرتبہ اس کے دل میں خوف کی لہریں سی اٹھنے لگیں لیکن اس نے جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔

ہسپتال سے باہر آنے میں چارلس کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے سفید رنگ کا کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ یہ لباس چونکہ ہسپتال میں عام طور پر استعمال ہوتا تھا اس لیے کسی نے اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ ہسپتال سے باہر آتے ہی اس نے ایک

ٹیکسی رکوائی اور پچھلی سیٹ میں دھنستے ہوئے ڈرائیور کو نئی دہلی کی طرف چلنے کو کہا۔ چارلس ٹیکسی کو کچھ دیر تک اس علاقے میں گھماتا رہا پھر ڈرائیور کو گاڑی کا رخ موڑ لینے کی ہدایت کی۔ پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن کے قریب گنجان آبادی والے علاقے میں پہنچ کر اس نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں کمرہ حاصل کرنے میں بھی اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس بھاگ دوڑ میں اس کے زخم کے ایک دو ٹانکے کھل گئے تھے جن سے خون رسنے لگا تھا۔ اس نے بستر کی چادر پھاڑ کر زخم پر نئی پٹی باندھی اور رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ زخم میں تکلیف کے باعث اسے ایک لمحے کو بھی آرام نہیں ملا تھا۔ صبح پانچ بجے کے قریب اس نے بستر چھوڑ دیا۔ بستر کی چادر کو پگڑی کی طرح سر پر لپیٹ لیا اور کمبل جسم پر لپیٹ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ ہوٹل میں سناٹا تھا۔ اسے عقبی دروازے سے باہر نکلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس کا حلیہ کسی نچلی ذات کے دیہاتی سے ملتا جلتا تھا۔ اسٹیشن پر پہنچتے ہی اس نے بمبئی کا ٹکٹ خریدا اور ٹرین کے انتظار میں پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ اس دوران اس نے اسٹال سے چائے کا ایک کپ لیا۔ اسٹال والے سے بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ غیر ملکی ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔ قریب ہی کھڑا ہوا پولیس والا اس کے لہجے سے چونک سا گیا۔ اسے حیرت تھی کہ ایک غیر ملکی کو ایک اچھوت کا روپ دھارنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟ اس نے چارلس سے باز پرس شروع کر دی۔ چارلس اس کے سوالات سے بوکھلا گیا اور ایک دم بھاگ کھڑا ہوا لیکن زخم کی وجہ سے وہ زیادہ دور تک نہ جا سکا۔ لڑکھڑا کر گرا اور سنبھلنے سے پہلے ہی پولیس والے کی گرفت میں آ چکا تھا۔

ادھر ہسپتال سے چارلس کے فرار کے تقریباً ایک گھنٹے بعد اس کا راز فاش ہو چکا تھا۔ سنتری نے آنکھ کھلتے ہی بوکھلا کر کمرے کی تاریک فضا میں گھورا۔ چارلس کی بیوی نظر نہیں آئی۔ وہ اٹھ کر جمائی لیتا ہوا پلنگ کے قریب آ گیا اور پھر جیسے ہی اس نے چادر ہٹائی پلنگ پر قیدی کے بجائے اس کی بیوی کو دیکھ کر اس کے دیوتا کوچ کر گئے۔ اسے صورتحال کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ اس نے ہیلن کو بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا اور منہ پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے قیدی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ چارلس کی ہدایات کے مطابق ہیلن صرف فرانسیسی زبان میں بات کر رہی تھی جس کا ایک لفظ بھی سنتری کے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ بالآخر اسے پولیس اسٹیشن لے جایا گیا جہاں ہیلن نے بیان دیا کہ اس کے شوہر نے اسے خواب آور دوا کھلا کر بے ہوش کر دیا تھا اور پھر اسے اپنے بستر پر لٹا کر فرار ہو گیا۔ کوئی بھی اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ایک ایسا شخص جو زنجیر بکف تھا یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ہیلن کو اعانت جرم کے الزام میں جیل بھیج دیا گیا۔

جیل میں پہلی رات ہیلن کے لیے بڑی خوفناک ثابت ہوئی۔ وہ بار بار سوچتی رہی کہ چارلس کی باتوں میں کیسے آ گئی تھی؟ دہلی کے اشوکا ہوٹل میں ڈکیتی کی واردات کی خبر سننے کے بعد ہیلن نے فیصلہ کر لیا کہ وہ چارلس سے علیحدگی اختیار کر لے گی۔ چارلس نے اسے بتایا تھا کہ مورس نے اسے ہیلن اور شوبھرا کے اغوا اور قتل کی دھمکی دے کر یہ واردات کرنے پر مجبور کیا تھا اور ان کی زندگیاں بچانے کے لیے ہی وہ اس خطرناک منصوبے میں حصہ لینے پر آمادہ ہوا تھا۔ اور اب اس نے ہسپتال سے فرار کے لیے ہیلن کو اپنی مدد پر آمادہ کر لیا تھا۔ اس نے ہیلن سے وعدہ کیا تھا کہ ہندوستان کی سرحد سے نکلتے ہی وہ پولیس کو ڈاک کے ذریعے حلفیہ بیان بھیج کر ہیلن کی بے گناہی کا یقین دلا دے گا اور ہیلن کو پولیس سے نجات مل جائے گی کیونکہ انڈیا کی پولیس کسی فرانسیسی شہری کو کسی جرم کے ثبوت کے بغیر جیل میں بند نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ مقامی پولیس کو فرانسیسی سفارتخانے کا خوف بھی ہوگا۔ ہیلن نے چارلس کی اس تجویز سے اختلاف کیا تھا مگر چارلس ہر ملاقات پر اسے اکساتا رہا۔ اس نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ یہاں سے نکلتے ہی وہ ہیلن کو پیرس واپس بھجوا دے گا۔ ہیلن اس کے اس جال میں آ گئی تھی اور اب اپنی حماقت کا خمیازہ بھگت رہی تھی۔

چند روز بعد فرانسیسی سفارتخانے کے توسط سے ہیلن کو ایک ''دوست'' کی طرف سے تین سو ڈالر کی ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ رہائی کا مژدہ سنتے ہی ہیلن، شوبھرا کے ہمراہ پیرس واپسی کا پروگرام بنانے لگی لیکن جب پولیس سے اسے اپنا ہینڈ بیگ واپس ملا تو اس میں سے پاسپورٹ، دہلی سے ہانگ کانگ کا ہوائی ٹکٹ اور دو سو ڈالر کی رقم غائب تھی۔ اس نقصان پر صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن جب ایک پولیس آفیسر نے بتایا کہ وہ انٹرپول کے ریکارڈ پر بھی آ چکی ہے تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ چارلس کی بیوی ہونے کی حیثیت سے اسے بھی اپنے شوہر کے جرائم میں برابر کا شریک تصور کیا جا رہا تھا۔ ہیلن نے اسی روز اپنے والدین اور فیلکس کو خط لکھا کہ وہ اس جہنم سے نکلنا چاہتی ہے۔ اسے پیرس آنے کے لیے کرائے کی رقم بھیجی جائے۔ اس نے اپنی ماں کو یہ بھی لکھ دیا تھا کہ ان مصائب کا باعث چارلس ہے اور آئندہ وہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔

اس رات وہ ہوٹل کے کمرے میں شوبھرا کو سلانے کی کوشش کرتے ہوئے یہی کچھ سوچ رہی تھی کہ دروازے پر دستک کی تیز آواز سن کر چونک گئی۔ اس نے شوبھرا کو بستر پر لٹا دیا اور اٹھ کر دروازہ کھولا لیکن باہر کوئی نہیں تھا۔ یخ بستہ ہوا کے جھونکے نے اس پر کپکپی طاری کر دی۔ اس کی نظریں کاغذ کے اس پُرزے پر جم گئیں جو اس کے پیروں کے قریب پڑا تھا۔ اس نے جھک کر کاغذ اٹھا لیا اور اس کی مختصر سی تحریر پڑھتے ہی ہیلن کو سینے میں اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

''چارلس قریب المرگ ہے۔ وہ تمہاری زندگی بچانے کے لیے

اپنی جان دے رہا ہے۔"

دہلی سے تقریباً دس میل دور قلعہ نما وسیع و عریض وہ پرانی تہار جیل جہنم کا نمونہ پیش کر رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف وہ علاقہ تھا جہاں فوجی دستے چوبیس گھنٹے جنگی مشقوں میں مصروف رہتے تھے۔

جیل کی طرف جاتے ہوئے ہیلن کے دل پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ کچی اور ناہموار سڑک پر کھٹارہ سی ٹیکسی کسی بیل گاڑی سے بھی زیادہ ہچکولے کھا رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کسانوں کی چھوٹی چھوٹی آبادیاں نظر آ رہی تھیں۔ مٹی کے ان گھروندوں اور سڑک پر کھیلتے ہوئے ننگ دھڑنگ بچوں کو دیکھ کر ان کے معاشی حالات کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ فضا میں فائرنگ اور توپوں کے گولوں کی گرج بھی مسلسل گونج رہی تھی۔ ہیلن کو محسوس ہو رہا تھا جیسے چند میل کا یہ فاصلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ ہوٹل میں ملنے والے کاغذ کے پرزے پر چارلس کے بارے میں تفصیل سے کچھ نہیں بتایا گیا تھا صرف یہ لکھا تھا کہ وہ قریب المرگ ہے اور ہیلن دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ وہ زندہ ہو۔ چارلس ہی کی وجہ سے وہ اگرچہ اب تک مسلسل مصائب میں مبتلا تھی مگر اس کے دل میں چارلس کے لیے جو محبت تھی اس کا اندازہ صرف وہی لگا سکتی تھی۔

ہیلن کو کئی گھنٹوں تک تہاڑ جیل گیٹ کے سامنے رک کر انتظار کرنا پڑا۔ وہاں اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے جو اس جیل میں بند اپنے عزیزوں سے ملاقات کے لیے آئے تھے۔ ان سب کا تعلق نچلے طبقے سے تھا۔ ہیلن نے گیٹ پر موجود سنتریوں کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ہندی کے علاوہ کوئی زبان نہیں سمجھ سکتے تھے۔ بالآخر ایک آفیسر کو بلوایا گیا جو انگریزی سمجھ سکتا تھا۔ اس نے ہیلن کو بتایا کہ مجسٹریٹ کے تحریری اجازت نامے کے بغیر اسے جیل میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یا پھر کسی وکیل کا اس کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔ ہیلن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگی۔

"تم لوگوں نے میرے شوہر کو مار ڈالا ہے۔ میں اخبارات کے ذریعے پوری دنیا کو بتاؤں گی کہ اس ملک میں معزز غیر ملکیوں کے ساتھ کیسا غیر انسانی سلوک کیا جاتا ہے۔"

جیل کا آفیسر بھونچکا سا رہ گیا۔ وہ ہیلن کی حالت سے کسی حد تک متاثر بھی ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا شوہر بالکل ٹھیک ہے۔ کسی بات پر اس نے احتجاجاً کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ معمولی سی کمزوری کے علاوہ اسے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ہیلن کے اصرار پر آفیسر اسے جیل کے اندر لے گیا۔ جہاں سامنے ہی نہرو اور اندرا گاندھی کی بڑی بڑی رنگین تصویریں آویزاں تھیں۔ باپ بیٹی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جیسے وہ یہاں آنے والوں کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ ہیلن کو ملاقاتیوں کے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں کچھ دیر بعد چارلس کو بھی لے آیا گیا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پیروں میں بیڑیاں تھیں۔ اسے زندہ دیکھ کر ہیلن نے اطمینان کا سانس لیا۔

دونوں فرانسیسی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ چارلس سرگوشیوں میں اسے بتا رہا تھا کہ اس نے جیل کے ایک سنتری کو چند روپے رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ مزید برآں اس نے ایک وکیل کی خدمات بھی حاصل کر لی ہیں جو اس کے باپ بھوانی سوبھراج سے رقم لینے کے لیے اب تک سائیگون روانہ ہو چکا ہوگا۔ بھوانی لاکھ سنگدل سہی لیکن بیٹے کی مصیبت کا حال سن کر وہ یقیناً کچھ نہ کچھ رقم دے دے گا جس سے ضمانت کراتے ہی پہلی پرواز سے وہ فرانس روانہ ہو جائیں گے۔ اس نے یہ باتیں کچھ اس اعتماد اور یقین سے کہی تھیں کہ ہیلن کو ایک بار پھر اس کی صداقت پر یقین آ گیا۔

رو پندر سنگھ ۱۹۴۸ء میں اس وقت پیدا ہوا تھا جب ہندوستان کی آزادی کی پہلی سالگرہ منانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ اس کا باپ بھی دہلی کا ایک بلند پایہ وکیل تھا اور اس نے بیٹے کو بھی وکالت کی تعلیم دلائی تھی۔ دبلا پتلا جسم، نکلتا ہوا قد، آنکھوں پر موٹے عدسے کی عینک، گھنی سیاہ داڑھی اور سر پر پگڑی جو سکھ فیملی سے اس کا تعلق ثابت کرنے کی واضح علامت تھی۔ تیئیس سالہ روپندر سنگھ کو آزادانہ طور پر وکالت شروع کیے ہوئے ابھی صرف ایک سال ہی ہوا تھا لیکن اس مختصر سے عرصے ہی میں اس نے یہ ثابت کر دکھایا تھا کہ اس کا مستقبل بہت تابناک ہوگا۔ اسی روز وہ دہلی کی سنٹرل جیل میں ایک ملزم کی ضمانت کے کاغذات پر اس کے دستخط کرانے کے لیے آیا تھا کہ چارلس سوبھراج سے آمنا سامنا ہو گیا جسے دہلی کے اشوکا ہوٹل کی ڈکیتی کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا تھا۔ چارلس نے اس سے اپنے کیس کی پیروی کی درخواست کی تھی۔ روپندر سنگھ نے اپنی ڈائری میں چارلس سے پہلی ملاقات کے تاثرات کچھ اس انداز میں رقم کیے۔

"اس نوجوان کو دیکھتے ہی مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش نہ تو پوری طرح مغربیت کا رنگ لیے ہوئے تھے اور نہ ان میں مشرقیت تھی لیکن اس کے باوجود وہ پُروقار اور بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ مجھ سے کیس کی پیروی کی درخواست کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کیونکہ قتل اور اسمگلنگ وغیرہ کے مقدمات میں مجھے خاصی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ میرے والد کی پیشہ ورانہ مہارت کی ساکھ بھی میرے نام سے وابستہ تھی۔ سنٹرل

جیل کا عملہ اور بہت سے قیدی بھی مجھے جانتے تھے۔ چارلس نے مجھے بتایا کہ وہ سائیگون کے ایک لکھ پتی باپ کا بیٹا ہے۔ اگر میں اس کی خاطر سائیگون جا سکوں تو اس کا باپ ضمانت کی رقم کے علاوہ میری فیس بھی ادا کر دے گا۔ اس نے مجھ سے اپنی بیوی اور بیٹی کی دیکھ بھال کی درخواست کی تھی جنہیں وہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ چاہتا ہے۔"

چارلس نے سائیگون تک آمد و رفت کے ہوائی ٹکٹ کے علاوہ روپندر سنگھ کو ایڈوانس کے طور پر دینے کے لیے کچھ رقم کا انتظام بھی کر لیا تھا۔ چند روز بعد ہی روپندر سنگھ سائیگون روانہ ہو گیا۔ چارلس نے ہانگ کانگ ٹیلرز کمپنی لمیٹڈ کے نام سے جس فرم کا پتا دیا تھا اسے تلاش کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی لیکن وہاں پہنچ کر انکشاف ہوا کہ بھوانی سوبھراج نے تین سال پہلے یہ فرم فروخت کر دی تھی اور اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہے۔ کمپنی کے نئے مالکوں یا کسی ملازم کو اس کے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا۔ روپندر اس قسم کے کاروبار سے منسلک پرانے ویتنامیوں سے اس کا پتا دریافت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ بالآخر اس کی محنت رنگ لائی اور وہ بھوانی سوبھراج کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جو شہر کے نواح میں واقع ایک خوبصورت بنگلے میں رہائش پذیر تھا۔ بھوانی سوبھراج بوڑھا ہو چکا تھا۔ طویل عرصے سے بیمار رہنے کے باعث اس میں اب زیادہ چلنے پھرنے کی سکت نہیں تھی۔ وہ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا۔ دوپہر کے کھانے کے دوران روپندر سنگھ اصل موضوع پر آیا اور بھوانی کو صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے بیٹے کو مقدمے کی پیروی اور ضمانت کے لیے چالیس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ ثبوت کے طور پر اس نے چارلس کا ایک مختصر خط پیش کیا جو چارلس کے کارڈ کے پیچھے لکھا ہوا تھا۔ چارلس نے وعدہ کیا ہے کہ یہ رقم بہت جلد لوٹا دی جائے گی۔ بھوانی سوبھراج خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کی نظریں اپنے ہاتھوں کی انگلیوں پر جمی ہوئی تھیں جن میں مختلف قیمتی پتھروں والی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔

"وہ لڑکا ـ" بالآخر وہ ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے بولا۔ "ذہانت کے علاوہ اس میں اور بھی بہت سی صفات بدرجہ اتم موجود ہیں لیکن اس نے اپنی ان اضافی صفات اور ذہانت کو ہمیشہ غلط راستوں پر استعمال کیا۔" اس نے اٹھ کر کمرے کے ایک کونے میں رکھا ہوا سیف کھولا اور مطلوبہ رقم نکال کر روپندر سنگھ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میں اب بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ کسی بھی وقت اس دنیا سے رخصت ہو سکتا ہوں۔ یہ دولت اب میرے کس کام کی۔ کاش! میرا بیٹا ہی اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکتا۔"

ہیلن نے شوہرا کو ایک دوست کے ساتھ پیرس بھیج دیا جس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پیرس پہنچتے ہی شوہرا کو اس کی نانی اور نانا کے پاس پہنچا دے گا۔ ہیلن نے اسے اپنے والد کے نام ایک خط بھی دیا تھا جس میں اصل بات کو نظرانداز کرتے ہوئے ہیلن نے لکھا تھا کہ وہ دونوں میاں بیوی ان دنوں بعض دشواریوں میں گھرے ہوئے ہیں ان سے نجات ملتے ہی وہ پیرس آ کر اپنی بیٹی کو لے لیں گے۔

۱۹۷۲ء کے ابتدائی چند مہینے ہیلن کے لیے بڑے کٹھن ثابت ہوئے۔ وہ ایک نہایت گھٹیا سے ہوٹل میں مقیم تھی۔ عام حالات میں وہ ایسی جگہوں کے قریب سے گزرنا بھی پسند نہ کرتی تھی لیکن مجبوری اور بےبسی نے اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کا گزارہ اس رقم پر تھا جو چارلس کسی طرح جیل سے اسمگل کر کے اس تک پہنچا دیتا یا جب وہ خود اس سے ملاقات کے لیے جاتی تو وہ سنتریوں کی نگاہ بچا کر چپکے سے اس کے ہاتھ میں تھما دیتا لیکن یہ رقم اتنی مختصر ہوتی کہ ہوٹل کا کرایہ ادا کرنے کے بعد مشکل دو وقت کی روٹی چل سکتی۔ اسے کبھی یہ پتا نہ چل سکا کہ جیل میں چارلس کے پاس یہ رقم کہاں سے آتی تھی۔ لیکن اتنا بہرحال وہ جانتی تھی کہ چارلس بد سے بدتر حالات میں بھی اپنے دماغ سے کام لینا جانتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ چارلس جیل میں رہتے ہوئے بھی ہیلن کی سرگرمیوں سے پوری طرح آگاہ تھا۔ ہیلن کو فروری کی وہ رات یاد تھی جب فرانسیسی سوسائٹی میں رہنے والی اس کی جان پہچان کی ایک عورت اسے زبردستی ایک ڈانس پارٹی میں لے گئی تھی۔ طویل عرصے بعد ہیلن کو خوشی کے وہ چند لمحات میسر آئے تھے۔ رقص کی یہ محفل رات بھر جاری رہی اور وہ فراخدلی سے قہقہے لگاتی رہی لیکن اس کے دو تین روز بعد جب وہ چارلس سے ملاقات کے لیے جیل پہنچی تو خیریت دریافت کرنے پر چارلس برس پڑا۔

"میری خیریت سے تمہیں کیا مطلب؟ تم عیش کرو، کلب جاؤ رات رات بھر غیر مردوں کے ساتھ رقص کرتی رہو۔ میں یہاں جیل کی صعوبتیں اٹھا رہا ہوں تو تمہیں اس سے کیا۔"

"کیا مطلب؟ تمہیں کس نے بتایا کہ میں....."

"میں سب جانتا ہوں۔" چارلس نے اس کی بات کاٹ دی۔ "لیکن میں پوچھتا ہوں کہ تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی؟"

"ان حالات اور تنہائی نے میرا ذہنی سکون چھین لیا۔ بہرحال، اگر تمہیں اعتراض ہے تو آئندہ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" ہیلن نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ اس روز اسے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ چارلس جیل میں رہتے ہوئے بھی بےبس نہیں تھا۔

امریکی رقاصہ ایستھر کئی ہفتوں سے قید و بند کی صعوبتوں کے ساتھ ذہنی اذیت برداشت کر رہی تھی۔ مختلف اوقات میں اسے مجسٹریٹ

کے سامنے پیش کیا جا چکا تھا۔ ایستھر نے اپنی بیگناہی کا ثبوت دینے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن وہ ابھی تک قانون کو متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ پولیس کی ایف آئی آر میں اس پر نہایت سنگین الزامات عائد کیے گئے تھے۔ اس ابتدائی رپورٹ کے مطابق اشوکا ہوٹل میں ڈکیتی کا منصوبہ ایستھر ہی کے ذہن کی پیداوار تھا۔ اُسی کے تعاون سے چارلس اور اس کے ساتھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے تھے۔ وہ چوروں کے بین الاقوامی گروہ کی سرگرم رکن ہے اور پس پردہ رہ کر اپنے ساتھیوں سے بھرپور تعاون کرتی ہے۔ استغاثہ نے عدالت پر زور دیا تھا کہ اس کی ضمانت قبول نہ کی جائے۔ اس طرح اس کے ملک سے فرار ہونے کا اندیشہ ہے کیونکہ اس بین الاقوامی گروہ کے لوگ کسی ایک ملک میں وارداتیں کرنے کے بعد جعلی پاسپورٹس کے ذریعے فرار ہو کر دوسرے ملک پہنچ جاتے ہیں۔

گرفتار ہونے کے فوراً ہی بعد ایستھر نے ٹیلیگرام کے ذریعے امریکا کی ریاست ایریزونا میں اپنے والدین کو صورتحال سے مطلع کر دیا تھا جنہوں نے ضمانت کے لیے فوری طور پر اسے پچیس سو ڈالر کی رقم بھیج دی تھی۔ رقم ملتے ہی ایستھر نے اپنے لیے وکیل کا انتظام کیا۔ ضمانت کی درخواست دینے سے پہلے وکیل نے اس سے چند سوالوں کے جواب حاصل کرنا ضروری سمجھا۔ نمبر ۱۔ کیا وہ ثابت کر سکتی ہے کہ ڈکیتی کی واردات سے پہلے اس کا چارلس یا اس کے ساتھیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا؟ نمبر ۲۔ یہ کہ وہ واقعی رقاصہ ہے اور چوروں کے کسی گروہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے؟

خوش قسمتی سے جس روز ایستھر کی چارلس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی اسی رات اس نے جاپان میں اپنے ایک دوست کو خط لکھا تھا کہ اس کی ملاقات مسٹر لوبو نامی ایک معزز شخص سے ہوئی ہے۔ وہ میکاؤ کے کاسینو کا ڈائرکٹر ہے اور اس نے مجھے اپنے کاسینو میں مستقل طور پر فن کے مظاہرے کی دعوت دی ہے۔ جاپان سے وہ خط منگوا لیا گیا۔ لفافے پر ڈاکخانے کی مہر اور خط کے متن نے ایستھر کے بیان کی تصدیق کر دی۔

اسی دوران گپتی کاجو نامی ایک شخص ایستھر کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ وہ ہندوستان کی ایک سابق ریاست کا مہاراجہ تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سے کچھ اوپر ہی تھی۔ بے تحاشہ بڑھی ہوئی توند اور بے ترتیب داڑھی نے کچھ عجیب سا حلیہ بنا دیا تھا۔ ایک بیوی کے علاوہ تین جوان بیٹیاں بھی تھیں۔ اپنی جائیداد کے بارے میں گپتی کاجو کو بھی ٹھیک طور سے علم نہیں تھا لیکن ایک بات یقینی طور پر کہی جا سکتی تھی کہ جتنے ہاتھی اس کے پاس ہیں پورے ہندوستان میں کسی اور کے پاس نہیں ہوں گے۔ عمر ساٹھ سے اوپر اور نہایت بھاری بھرکم ہونے کے باوجود وہ ہر صبح مدراس کی سڑکوں پر تین میل کی دوڑ لگایا کرتا تھا۔ وہ دن میں صرف ایک مرتبہ کھانا کھاتا لیکن اس کا ایک وقت کا کھانا بھی ایک تندرست آدمی کے آٹھ وقت کے کھانے کے برابر تھا۔ گپتی کاجو فن کا قدردان تھا۔ بہت سے فنکار اس کی سرپرستی میں پل رہے تھے۔ ایستھر سے اس کی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب وہ مدراس میں ہندوستانی رقص سیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے مخصوص خاندانی مونوگرام والے لیٹر پیڈ پر ایستھر کی حمایت میں عدالت کو ایک طویل خط لکھا جس میں شرلاک ہومز کی طرح متعدد سوالات اٹھائے گئے تھے۔

ہوٹل کا کمرہ نمبر ۱۲۸۹ ایستھر کی خواہش پر اسے نہیں دیا گیا تھا بلکہ اشوکا ہوٹل کی انتظامیہ نے یہ کمرہ اسے اپنی طرف سے دیا تھا۔ چند روز بعد ایستھر نے ہوٹل کی انتظامیہ سے درخواست کی تھی کہ اسے کوئی اور کمرہ دیا جائے کیونکہ کلب میں جانے کے لیے تیار ہو کر جب وہ کمرے سے نکلتی ہے تو اسے لفٹ تک طویل فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔

ایستھر مدد حاصل کرنے کے لیے چیخی کیوں نہیں تھی؟ اس کی وضاحت گپتی کاجو نے اس طرح کی کہ ڈاکوؤں کے پاس پستول اور چاقو جیسے خطرناک ہتھیار موجود تھے۔ اس پر انتہائی خوف و دہشت کی کیفیت طاری تھی۔ ان تین دنوں کے دوران اس نے کمرے میں آنے والے ویٹروں کو بھی کمرے میں ڈاکوؤں کی موجودگی سے آگاہ نہیں کیا کیونکہ ایسی صورت میں ڈاکو اسے جان سے مار دیتے۔

ڈاکوؤں کے فرار کے فوراً ہی بعد ایستھر نے اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح رسی کی بندشوں سے آزاد کراتے ہی سب سے پہلے ٹیلیفون کے ذریعے ہوٹل کے استقبالیہ کاؤنٹر پر ڈکیتی کے بارے میں اطلاع دی۔ اگر وہ بھی ان کی شریک کار ہوتی تو کم از کم اس وقت تک خاموش رہتی جب تک چارلس لوٹا ہوا مال لے کر بحفاظت دہلی سے نہ نکل جاتا۔

اگر ایستھر فوری طور پر متعلقہ لوگوں کو اس ڈکیتی سے مطلع نہ کرتی تو چارلس لاکھوں روپے کی مالیت کے ہیرے جواہرات لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا ہوتا مگر محض ایستھر کی بدولت ہی وہ لوٹ کا مال پالم ایئرپورٹ کے کسٹمز کاؤنٹر پر چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا۔

گپتی کاجو کے اس خط کا اثر تھا کہ ایستھر کے خلاف تمام الزامات پولیس نے واپس لے لیے اور اسے "عدم ثبوت" کی بنا پر رہا کر دیا گیا۔ اس کے چند ہی روز بعد ایستھر نے ہندوستان چھوڑ دیا۔ البتہ کئی مہینوں بعد وہ گپتی کاجو کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مدراس آئی اور کئی روز اس کی مہمان رہی۔ گپتی کاجو نے اس کے فن کی قدر کرتے ہوئے اس پر عنایات کی بارش کر دی۔ اس کے اکاؤنٹ سے لاکھوں روپے ایستھر کے بینک اکاؤنٹ میں منتقل ہو گئے، اور پھر ایک روز صبح مدراس کے قریب سمندر میں گپتی کاجو کی لاش ملی جس کا چہرہ بری طرح مسخ ہو چکا تھا۔

روپندر سنگھ نے سائیگون سے ملنے والی رقم کے سہارے عدالت میں چارلس کا ضمانت نامہ داخل کر دیا جسے ایک دو پیشیوں کے بعد قبول کرتے ہوئے چارلس کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ اسے اس حکم کا پابند کر دیا گیا تھا کہ وہ عدالت کی اجازت کے بغیر دہلی شہر سے باہر نہیں جائے گا۔ لیکن جب رہائی کے بعد ایک ہفتے کے اندر اندر چارلس غائب ہو گیا تو روپندر سنگھ کو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

چارلس اور ہیلن نے اب یہ طے کر لیا تھا کہ ہندوستان سے وہ سیدھے فرانس جائیں گے جہاں سے اپنی بیٹی کو لے کر سوئٹزرلینڈ روانہ ہو جائیں گے اور پرسکون زندگی گزارنے کی کوشش کریں گے۔ دہلی سے روانہ ہوتے وقت کم از کم ہیلن تو اس ارادے پر قائم تھی۔

دہلی سے بمبئی پہنچتے ہی چارلس نے دو جعلی پاسپورٹ خریدے جن پر اگرچہ شبہ ہو سکتا تھا لیکن چارلس نے انہیں استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ خوش قسمتی سے ایئرپورٹ کے امیگریشن کاؤنٹر پر ان کے پاسپورٹس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی تھی کیونکہ اس مرتبہ بھی چارلس نے فلائٹ کی روانگی سے صرف چند منٹ پہلے ایئرپورٹ پہنچنے کا حربہ استعمال کیا تھا۔ چند روز انہوں نے کراچی میں قیام کیا جہاں چارلس کو ایسے پاسپورٹ مل گئے جن پر آسانی سے نقلی ہونے کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کی اگلی منزل کابل ثابت ہوئی۔ اس پر ہیلن کچھ حیران بھی ہوئی تھی کیونکہ چارلس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان سے سیدھے فرانس جائیں گے لیکن وہ کراچی سے ہوتے ہوئے افغانستان پہنچ گئے تھے۔ ہیلن کے دل میں شبہات جنم لینے لگے لیکن چارلس نے یہ کہہ کر اسے مطمئن کر دیا کہ یہاں وہ چند روز سے زیادہ نہیں رکیں گے۔ اسی دوران وہ "بزنس" کے سلسلے میں چند لوگوں سے بھی مل لے گا۔

ایک سیاح کی حیثیت سے چارلس کے لیے کابل میں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن ان بین الاقوامی اسمگلروں کی کمی نہیں تھی جو مشرق سے مغرب یا مغرب سے مشرق کے درمیان آمد و رفت کے لیے اسی شہر کو عارضی ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں ہپیوں کی بھی ایک بستی آباد تھی۔ مادر پدر آزاد یہ لوگ حشیش کی کشش میں یہاں کھنچے چلے آتے تھے۔ افغانستان کی لق و دق سرزمین کا بیشتر رقبہ افیون کی کاشت کے لیے مخصوص تھا جس سے حشیش اور ہیروئن وغیرہ تیار ہوتی اور ان کی کھپت کا ذریعہ بھی ہپی اور اسمگلر تھے جو اپنی حیثیت کے مطابق یہ زہر پوری دنیا میں پھیلا رہے تھے۔

چارلس کا زیادہ وقت ہپیوں کی کالونی میں گزرتا۔ اسے کسی ایسے ہپی کی تلاش میں زیادہ دشواری پیش نہ آتی جس کی جیب میں پاسپورٹ کے علاوہ نقدی یا معقول مالیت کے ٹریولرز چیک موجود ہوتے۔ چارلس دوستی کے جذبات کے اظہار کے طور پر اپنی گرہ سے حشیش خرید کر اس کی تواضع کرتا اور پھر ایک دو دن بعد وہ ہپی غائب ہو جاتا۔

دو ماہ تک ہیلن کابل کی سیر و تفریح اور شہر کے سب سے بڑے ہوٹل کی میزبانی سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ چارلس کے پاس ایک بار پھر پیسے کی فراوانی تھی۔ اس کی جیبیں ہر وقت نوٹوں سے بھری رہتیں۔ ہیلن کو قطعی علم نہیں تھا کہ چارلس کے پاس یہ دولت کہاں سے آ رہی تھی۔ وہ اس سلسلے میں کچھ جاننا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس کے لیے سب سے بڑا اطمینان تو یہ تھا کہ اس کا شوہر اس کے پاس تھا اور وہ پہلے کی طرح بزنس کے چکر میں کئی کئی روز غائب نہیں رہتا تھا۔

۱۹۷۲ء کے وسط میں چارلس نے ہیلن کو یہ خوشخبری سنائی کہ ایک دو دن میں وہ کابل سے رخصت ہو جائیں گے۔ استنبول میں دو چار روز رک کر تفریح سے لطف اندوز ہوں گے اور پھر کہیں اور رکے بغیر سیدھے پیرس چلے جائیں گے۔ اسی روز چارلس نے سیٹیں بھی بک کروا لیں لیکن جب وہ ایئرپورٹ پر پہنچے تو اچانک پولیس نے ان دونوں کو گھیرے میں لے لیا۔ اس وقت ہیلن پر انکشاف ہوا کہ چارلس نے ہوٹل کا دو مہینے کا بل ادا نہیں کیا تھا۔ پولیس والے انہیں ایک طرف لے جا رہے تھے کہ چارلس نے ہیلن کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے فرانسیسی زبان میں سرگوشی کی۔

"ذہن نشین کر لو کہ نہ تم میری بیوی ہو اور نہ ہی تمہارا مجھ سے کوئی تعلق ہے۔ ہم محض اتفاقاً ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ باقی سب کچھ میں سنبھال لوں گا۔"

ہیلن نے وہی کیا جو اسے کہا گیا تھا۔ باز پرس کے سلسلے میں ایک رات حوالات میں رکھنے کے بعد اسے چھوڑ دیا گیا لیکن اس کا پاسپورٹ ابھی پولیس کی تحویل ہی میں تھا تاکہ اس کے بارے میں مزید تحقیقات کی جا سکیں۔ وہ دن ہیلن نے کابل کی سڑکوں پر گھومتے پھرتے گزارا۔ وہ ایک بار پھر اپنے آپ کو ایک اجنبی ملک میں تنہا اور بے آسرا پا کر بکھر بکھر گئی۔ اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ تو یہ تھا کہ نہ تو کسی کی زبان سمجھ سکتی تھی، نہ کسی کو اپنی بات سمجھا سکتی تھی۔ بدقسمتی سے اس کے پاس کوئی پیسہ بھی نہیں تھا۔ وہ رات اس نے ہپیوں کی کالونی میں ایک درخت کے نیچے گزاری جہاں دس بارہ ہپی جمع تھے۔ وہ رات بھر حشیش کا زہر اپنے اندر منتقل کرتے رہے۔ ایک دو مرتبہ ہیلن کو بھی پیشکش کی گئی لیکن اس نے ٹال دیا۔

چند روز گزر گئے۔ ہیلن کٹی پتنگ کی طرح اجنبی فضاؤں میں ڈولتی رہی۔ ایک روز دو دن کے فاقے سے انتہائی مایوسی کی کیفیت میں وہ سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھی تھی کہ دو آدمی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے خاکی رنگ کا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور دونوں جس انداز سے آئے تھے اسی انداز میں چلے گئے۔ ہیلن نے لفافہ کھول کر دیکھا۔

اس میں ایک جعلی پاسپورٹ اور کچھ رقم کے علاوہ ایک کاغذ بھی تھا جس پر چارلس کی تحریر کو شناخت کرنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ چارلس نے صورتحال پر معذرت کرتے ہوئے اسے کسی ہوٹل میں کمرہ لے کر انتظار کرنے کو کہا تھا۔

اس کا نام تو پیٹر ٹوبل تھا لیکن وہ اپنے آپ کو "ریڈ آئی" کہلوانا پسند کرتا تھا۔ حشیش کے نشے سے اس کی آنکھیں ہر وقت خونِ کبوتر کی طرح سرخ رہتیں۔ کالج کے زمانے میں اس کا کردار قابلِ تقلید سمجھا جاتا تھا۔ اپنے حلقۂ احباب میں بھی اسے ایک مثالی حیثیت حاصل تھی۔ جس روز ڈلاس میں امریکی صدر جون ایف کینیڈی کو گولی کا نشانہ بنایا گیا، پیٹر ٹوبل اسی روز ویسٹ کوسٹ یونیورسٹی میں داخلے کا فارم پُر کر رہا تھا۔ یہی دن اس کی زندگی کا اہم موڑ ثابت ہوا۔ وہ نوجوانوں کے اس گروہ میں شامل ہو گیا جو غیر محسوس انداز میں امریکی تہذیب و معاشرے میں ایک خوفناک تبدیلی لا رہے تھے۔ ایک سال بعد پیٹر نے جو حلیہ اختیار کیا اس سے اس کی شخصیت کو شناخت کرنا مشکل ہو گیا۔ ٹانگوں سے چپکی ہوئی تنگ پتلون اور لڑکیوں سے زیادہ لمبے بال۔ دوسرے سال وہ اسٹوڈنٹس کے اس گروہ میں شامل تھا جنہوں نے ویتنام کی جنگ کے خلاف مظاہرہ کرتے ہوئے یونیورسٹی کے ڈین کے دفتر پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ امریکی عوام کے ٹیکسوں کی رقم کو جنوبی افریقہ کی مہم پر ضائع نہ کیا جائے۔ اس ہنگامہ آرائی اور بدنظمی کے جرم میں پیٹر کو بھی چند اور لڑکوں کے ساتھ یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد اسے پے در پے چند اور افسوسناک واقعات پیش آئے۔ اس کے والدین ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے اور اس کی منگیتر اسے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ فرار ہو گئی۔ حالات سے دل برداشتہ ہو کر پیٹر فوج میں بھرتی ہو گیا۔ فوج میں بھرتی ہوتے وقت اس کے ذہن میں بڑا خوفناک منصوبہ تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر اسے ویتنام بھیجا گیا تو اسے وہاں اس جنگ میں امریکہ کے ملوث ہونے کے خلاف کام کرنے کا موقع مل جائے گا مگر بدقسمتی سے اسے ویتنام کے بجائے یورپ بھیج دیا گیا، جہاں اسے سنسر آفیسر کے فرائض سونپے گئے۔ وہ اس کمیٹی کا ممبر تھا جو امریکی فوجیوں کو دکھائی جانے والی فلمیں سنسر کرتی تھی۔

یورپ میں فوجی خدمات کی انجام دہی کے دوران پیٹر ایک جرمن لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ پیٹر نے شادی کی پیشکش کی جسے اس لڑکی نے بخوشی قبول کر لیا۔ اس وقت تک پیٹر پانچ ہزار ڈالر جمع کر چکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس رقم سے وہ اپنی نئی زندگی کی ابتدا بڑی سہولت سے کر سکیں گے لیکن عین وقت پر لڑکی کی طرف سے شادی سے انکار نے پیٹر کو ایک بار پھر مایوسی کے بھنور میں دھکیل دیا۔

فوج سے سبکدوش ہونے کے بعد امریکہ واپس آنے کے بجائے اس نے ایک پرانی کار خریدی اور دنیا کی سیاحت پر نکل کھڑا ہوا۔ استنبول میں یورپ کو پیچھے چھوڑ کر وہ ایشیا کی طرف نکل آیا۔ ۱۹۷۱ء کے اواخر میں وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو چکا تھا لیکن اس کا دل اس طویل سفر کے دوران راستے میں پیش آنے والے خوشگوار حادثات کی یاد سے معمور تھا۔ ترکی اور ایران میں حشیش کے کثرتِ استعمال سے اس کی صحت گرنے لگی۔ کرسمس کے روز وہ کابل کے ایک چنڈو خانے میں بیٹھا صورتحال کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا وزن تیس پونڈ کم ہو چکا تھا اور فاقہ کشی نے اس کی جسمانی طاقت کو سلب کر لیا تھا۔ ان دنوں بھارت اور پاکستان برسرِپیکار تھے اور پیٹر سوچ رہا تھا کہ جنگ بند ہوتے ہی وہ پاکستان سے ہوتا ہوا بھارت چلا جائے گا۔ کابل کا وہ چنڈو خانہ ہپیوں کا بہت بڑا گڑھ تھا۔ اس رات اوکلاہاما کا رہنے والا ڈینس نامی ایک نوجوان محفل پر چھایا ہوا تھا۔ وہ اپنے شہر کی فٹ بال ٹیم کا کپتان تھا لیکن منشیات کے استعمال نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ پیٹر سے حالات معلوم کرنے کے بعد ڈینس نے پیشکش کی کہ اگر وہ چاہے تو چند روز تک اس کے کمرے میں رہ سکتا ہے۔ پیٹر نے اس کی پیشکش کو فوراً قبول کر لیا۔ اسے علم تھا کہ اس کے علاوہ بھی کچھ لڑکے لڑکیاں اس کے کمرے میں مقیم تھے۔ انہی میں سے ایک لڑکی نے پہلی مرتبہ اسے ریڈ آئی کے نام سے مخاطب کیا تھا اور پھر پیٹر اسی نام سے جانا پہچانا جانے لگا۔

دو دن بعد پولیس نے ڈینس کو کابل ایئرپورٹ سے گرفتار کر لیا اس کے قبضے سے حشیش برآمد ہوئی تھی۔ اس طرح پولیس نے "ریڈ آئی" کو بھی حراست میں لے لیا کیونکہ اس وقت وہ بھی کمرے میں موجود تھا اور ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ حشیش اس کی ملکیت نہیں تھی بلکہ حقیقت تو یہ تھی گزشتہ دو دن سے طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے اس نے حشیش یا کوئی اور نشہ آور چیز استعمال ہی نہیں کی تھی۔

پولیس انہیں تھانے کے بجائے فائر بریگیڈ کی پشت پر واقع ایک عمارت میں لے آئی تھی جہاں انہیں ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ "ریڈ آئی" دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا اپنی قسمت پر آنسو بہا رہا تھا کہ ایک شخص اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور بڑے رازدارانہ لہجے میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ اجنبی نے اپنے آپ کو ایک وکیل ظاہر کرتے ہوئے اسے مشورہ دیا کہ اگر وہ کم از کم ایک ہزار ڈالر کی رقم متعلقہ پولیس والوں میں تقسیم کر دے تو اس کی جاں بخشی ہو سکتی ہے لیکن اسی روز ڈینس اور اس کے ساتھی مکان سے فرار ہو گئے۔ پولیس کا نزلہ "ریڈ آئی" پر گرا۔ اسے تھانے میں بند کر کے باقاعدہ رپورٹ درج کی گئی اور اس سے اگلے روز عدالت سے چھ ماہ کی سزا ملنے پر اسے کابل کی سنٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔

جیل کو دیکھ کر کئی صدیوں پرانے قلعے کی یاد ذہن میں تازہ

ہوتی تھی۔ مٹی کی اونچی فصیل، لکڑی کے بھاری بھرکم دروازے، جن میں آہنی قبضوں کی جگہ چمڑے کے ٹکڑے استعمال کیے گئے تھے۔ جیل کا ایک الگ تھلگ حصہ غیرملکی قیدیوں کے لیے مخصوص تھا جس میں فصیل کے ساتھ ایک قطار میں چھوٹی چھوٹی لاتعداد کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ مٹی کی بنی ہوئی ان کوٹھریوں کی چھتوں پر سنتری چوبیس گھنٹے گشت کرتے رہتے۔ کوٹھریوں کا فرش بھی کچا تھا۔ ان میں نہ روشنی تھی نہ ہوا کی آمد و رفت کا کوئی انتظام تھا۔ یہاں قیدیوں کو نہ علاج معالجے کی سہولتیں مہیا تھیں نہ انہیں سرکاری طور پر کھانا وغیرہ فراہم کیا جاتا تھا۔ قیدی اپنے خرچ سے جو چاہتے بازار سے منگوا سکتے تھے۔ جن قیدیوں کے پاس پیسے ختم ہو جاتے وہ کچھ عرصہ تو اپنے ساتھیوں سے مانگ تانگ کر گزارا کرتے، پھر بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ختم ہو جاتے۔

۱۹۷۲ء کا موسمِ بہار شروع ہو چکا تھا۔ "ریڈ آئی" اس وقت تک یہاں کے معمولات سے کسی حد تک آشنا ہو چکا تھا۔ کوٹھریوں کی پشت پر واقع فصیل کے دوسری طرف بازار تھا جہاں سے ضرورت کی کوئی بھی چیز منگوائی جا سکتی تھی۔ جیل کے گیٹ کے عین سامنے واقع ریسٹورنٹ کا نوعمر ملازم باچا قیدیوں سے چائے کا آرڈر لینے کے لیے دن میں کئی کئی مرتبہ جیل کے چکر لگاتا رہتا تھا۔ قیدی چائے کے علاوہ بازار سے اپنی ضرورت کی دوسری چیزیں بھی اسی سے منگوا لیتے تھے۔ "ریڈ آئی" کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ بیشتر غیرملکی قیدی منشیات کے استعمال یا خرید و فروخت کے جرم میں سزا بھگت رہے تھے لیکن قیدیوں کو باہر سے نشہ آور چیزیں منگوانے کی بھی اجازت تھی۔ بیشتر قیدی حشیش کے علاوہ باچا کے ذریعے مارفین بھی منگوا لیتے جسے خود ہی بازو میں انجکٹ کر کے وہ وقتی طور پر ذہنی اذیت سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔

اپریل کی وہ صبح "ریڈ آئی" کے لیے بڑی تعجب خیز ثابت ہوئی تھی۔ شاید گیارہ بجے ہوں گے کہ پولیس اور جیل کے محافظوں کے ایک دستے کو غیرملکی قیدیوں والے حصے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ چونک سا گیا۔ اس کی نظریں پولیس والوں کے درمیان میں اس خوبرو شخص پر جمی ہوئی تھیں جس نے قیمتی کپڑے کا فرانسیسی کٹ تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ پیروں میں نئے جوتے بھی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک اور چہرے پر حاکمانہ تاثر دیکھ کر ایک لمحے کو "ریڈ آئی" کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ وہ یقیناً افغان حکومت کا کوئی وزیر یا افسرِ اعلیٰ ہے جو جیل کے معائنے کے لیے آیا ہے۔ وہ ایک ہاتھ میں اٹیچی کیس اٹھائے بڑے پُروقار انداز میں پولیس والوں کے قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا لیکن جب پولیس والوں نے اسے بڑی بے رحمی سے ایک کوٹھری میں دھکیل دیا تو "ریڈ آئی" کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ پولیس کے جاتے ہی نووارد نے قیدیوں سے ملاقات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ چارلس سوبھراج تھا جو بہت جلد قیدیوں میں گھل مل گیا۔ اور پھر ایک گھنٹے بعد اس نے اعلان کر دیا کہ وہ یہاں سے فرار کا منصوبہ بنا رہا ہے جو قیدی اس جہنم سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہو اسے بتا دے۔

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔" ریڈ آئی نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں بہت سے قیدیوں کو فرار کی کوشش میں جان سے ہاتھ دھوتے دیکھ چکا ہوں۔ فصیل کے قریب جانے والے شخص کو جیل کے محافظ گولیوں کا نشانہ بنا دیتے ہیں اور پھر اس کی لاش کسی مرے ہوئے کتے کی طرح گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔"

"ہر کام کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر شخص کے پاس عقل نہیں ہوتی۔" چارلس نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔

ریڈ آئی دلچسپی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ چارلس کی کلائی پر قلب گھڑی چمک رہی تھی جسے دو ہزار ڈالر میں آسانی سے فروخت کیا جا سکتا تھا۔ ریڈ آئی کو حیرت تھی کہ چارلس وہ قیمتی گھڑی اور اٹیچی کیس ساتھ لے آنے میں کس طرح کامیاب ہو گیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اسے کس جرم کی سزا بھگتنے کے لیے یہاں لایا گیا تھا؟ جب کہ ریڈ آئی کے خیال میں اس جیسا باوقار شخص کوئی معمولی سا جرم بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بالآخر جب دل کی بات زبان پر آ ہی گئی تو چارلس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"بیوقوف ہیں یہ لوگ لیکن انہیں اپنی اس حماقت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ کسی نے شکایت کر دی تھی کہ میں جعلی پاسپورٹ پر سفر کر رہا ہوں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ میری بیوی ان کے شکنجے میں نہیں آ سکی۔ وہ اب تہران میں میرا انتظار کر رہی ہو گی۔"

"کتنے عرصے کے لیے آئے ہو؟" ریڈ آئی نے پوچھا۔

"سوال یہ نہیں کہ مجھے کتنے عرصے کے لیے بھیجا گیا ہے۔" چارلس نے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ "دیکھنا تو یہ ہے کہ یہ دیواریں کتنے عرصے تک میرا راستہ روک سکتی ہیں۔"

ریڈ آئی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ چارلس اب اسے اپنے بارے میں تفصیل سے بتا رہا تھا۔ آخر میں اس نے ایسا لہجہ اختیار کر لیا جیسے محلے میں آنے والا کوئی نیا لڑکا وہاں رہنے والے لڑکوں کے سامنے اس خواہش کا اظہار کر رہا ہو کہ اسے اپنا لیڈر تسلیم کر لیا جائے۔

"میں جلد سے جلد طہران پہنچنا چاہتا ہوں، جہاں نہ صرف میری بیوی منتظر ہو گی بلکہ مجھے ہیروں کا ایک بڑا سودا بھی طے کرنا ہے۔" چارلس نے بتایا۔

"ہیرے!" ریڈ آئی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" چارلس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ہندوستان سے ہیرے ایکسپورٹ کر کے دوسرے ممالک میں دولتمند لوگوں کے

ہاتھ فروخت کرتا ہوں۔ عرب اور یورپ کے بیشتر ممالک میں میرے مستقل گاہک موجود ہیں۔"

"اس طرح تو تم اچھا خاصا منافع کما لیتے ہو گے؟"

"کیوں نہیں؟" "اگر تم بھی میرے نمائندے کی حیثیت سے کام کرنا پسند کرو تو ابتدا میں کم از کم پانچ ہزار ڈالر ماہانہ کما سکتے ہو۔" چارلس نے اسے پیشکش کی۔ ان کی ملاقات کو ابھی بمشکل دس منٹ ہی ہوئے تھے۔

'ریڈ آئی' اچھل پڑا۔ اسے اپنے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اسکول کے زمانے میں وہ گھر گھر جا کر انسائیکلوپیڈیا بیچا کرتا تھا۔ ہر جلد پر اسے پچاس سینٹ کمیشن ملتا تھا۔ اس نے بڑے ہو کر کسی منافع بخش کاروبار کے بارے میں سوچا ضرور تھا لیکن پانچ ہزار ڈالر ماہانہ کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے چارلس کی طرف دیکھنے لگا جو گھوم پھر کر کوٹھری کا جائزہ لے رہا تھا۔ کبھی وہ تنکے سے کچے فرش پر کوئی نقشہ بنانے لگتا۔ یہ کمرہ بارہ فٹ لمبا اور نو فٹ چوڑا تھا جس میں چھ قیدی رکھے گئے تھے۔ چارلس نے یہاں آتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ جیل میں غیر ملکی قیدیوں کے اس سیکشن میں حفاظتی انتظامات دوسرے حصوں کی نسبت نرم تھے۔ کوٹھریوں کی چھت پر سنتریوں کے قدموں کی آواز ضرور سنائی دیتی رہتی تھی لیکن کوٹھریوں یا قیدیوں کا معائنہ دن میں صرف ایک دو مرتبہ ہوتا تھا۔ کبھی تو کوئی سنتری دن بھر اس طرف کا رخ ہی نہ کرتا۔ کوٹھریوں کی عقبی دیوار جیل کی بیرونی فصیل سے ملی ہوئی تھی جس کے دوسری طرف بازار تھا جہاں سے دن بھر شور و غل کر آوازیں سنائی دیتی رہتیں۔ چارلس کا خیال تھا کہ اگر اس دیوار کے دوسری طرف پہنچنا ممکن ہو تو پر ہجوم بازار میں اسے تلاش کرنا آسان نہ ہو گا۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک حساب کتاب لگانے کے بعد چارلس اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر کوٹھری کے کچے فرش میں سرنگ لگائی جائے تو فصیل کے نیچے سے دوسری طرف بازار تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اس نے اٹیچی کیس کھول کر اسٹین لیس اسٹیل کا ایک چمچہ نکال لیا جو دہلی کے ایک ہوٹل سے چرایا گیا تھا۔

"تم میں سے کون میرے ساتھ جانا چاہتا ہے؟" وہ چمچہ اوپر اٹھاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا تم اس چمچے کی مدد سے فرار ہونا چاہتے ہو؟ یہ تمہارے کس کام آ سکتا ہے؟" 'ریڈ آئی' نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس سے سرنگ کھودوں گا۔" چارلس نے جواب دیا۔

"سرنگ!" 'ریڈ آئی' پر لمحے بھر تو سکتے کی سی کیفیت طاری رہی، پھر اس کے منہ سے بے اختیار قہقہوں کا فوارہ ابل پڑا۔

"میں بالکل سنجیدہ ہوں۔" چارلس نے اسے گھورا۔ "اس چھوٹے سے چمچے کی مدد سے کئی میل طویل سرنگ کھودی جا سکتی ہے لیکن اس کے لیے مجھے کسی اور کی مدد کی بھی ضرورت ہو گی۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔" 'ریڈ آئی' نے جواب دیا۔ اس کی رہائی میں صرف دو ماہ رہ گئے تھے اور وہ چارلس کے کسی احمقانہ منصوبے میں شامل ہو کر کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ دو اور قیدی بھی جن میں ایک برطانوی اور دوسرا کینیڈا کا باشندہ تھا، پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن ایک فرانسیسی قیدی جس کی عمر کا اندازہ پچاس سال تک کا لگایا جا سکتا تھا، دلچسپ نگاہوں سے چارلس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں بھی تمہارے اس منصوبے میں شامل ہونے سے انکار کر دیتا لیکن میں جلد سے جلد یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں تاکہ اس عورت کا گلا گھونٹ سکوں جس نے مجھے اس جیل میں پہنچایا ہے۔"

'ریڈ آئی' کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ اس فرانسیسی سے کئی مرتبہ اس عورت کی کہانی سن چکا تھا جسے وہ قتل کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک خوبصورت ہپی لڑکی تھی جو حشیش حاصل کرنے اس کے پاس آئی تھی۔ لیکن پیسوں کے معاملے میں دونوں لڑ پڑے۔ بعد میں اس ہپی لڑکی نے پولیس کو اطلاع کر دی کہ اس فرانسیسی کے پاس لاتعداد پاسپورٹ موجود ہیں۔ پولیس نے فوراً ہوٹل کے اس کمرے پر ہلہ بول دیا اور مختلف ناموں سے مختلف ممالک کے چھ پاسپورٹس کے علاوہ اس کے سامان سے جعلی شناختی کاغذات، چند گرام حشیش اور چند ہیرے بھی برآمد ہوئے تھے۔ پولیس نے اسے جعلسازی اور اسمگلنگ کے جرم میں ڈھائی سال کے لیے جیل بھیج دیا۔ وہ اگرچہ آدھی سے زیادہ سزا بھگت چکا تھا لیکن جلد سے جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا تاکہ اس ہپی لڑکی کو تلاش کر کے اس سے اپنی بربادی کا انتقام لے سکے۔

"گڈ۔" چارلس نے ہمدردانہ نگاہوں سے فرانسیسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں فوراً ہی اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔"

اس نے چمچہ موڑ لیا اور ایک جگہ کھدائی شروع کر دی۔ 'ریڈ آئی' کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ سخت زمین کھودتے ہوئے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں اس خوبرو اور نازک اندام شخص کے ہاتھوں پر چھالے ابھر آئیں گے تو وہ لعنت بھیجتا ہوا سرنگ کا خیال ذہن سے نکال دے گا۔ لیکن شام کا اندھیرا پھیلنے تک چارلس تین فٹ گہرا گڑھا کھود چکا تھا۔ اتنی کھدائی میں تربوز کے حجم کے دو تین پتھر بھی نکالے جا چکے تھے۔ 'ریڈ آئی' کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر سنتریوں کو اس سرنگ کا پتا چل گیا تو وہ بلاتخصیص اس کوٹھری کے تمام قیدیوں کو الٹا لٹکا دیں گے۔ اپنے آپ کو ان سے لاتعلق ظاہر کرنے کے لیے وہ دوسری کوٹھری میں منتقل ہو گیا۔ یہاں قیدیوں کو اپنی مرضی سے کوٹھریاں تبدیل کرنے کی بھی اجازت تھی۔ ان سے الگ ہونے کے باوجود وہ اپنے طور پر انہیں تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ چند روز قبل اس نے پانی رکھنے کے

لیے چائے والے لڑکے با چا سے ٹین کا ایک خالی ڈبہ منگوایا تھا۔ وہ اپنی کوٹھری کے دروازے میں بیٹھا دن بھر یہ ڈبہ بجاتا رہتا تاکہ اس کے شور میں کھدائی کی آواز دبی رہے۔ اگر بالفرض کوئی سنتری اس طرف آ نکلتا تو 'ریڈ آئی' اسے کم از کم اس وقت تک باتوں میں لگائے رکھتا جب تک کہ چارلس اور اس کا فرانسیسی ساتھی سرنگ کے منہ پر کمبل نہ بچھا دیتے۔ وہ اس طرح کمبل پر لیٹ جاتے کہ وہاں سرنگ کی موجودگی کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

دوسرے دن چارلس کو اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑا کہ سرنگ سے نکلنے والی مٹی کا کیا کیا جائے؟ تھوڑی بہت مٹی تو انہوں نے اپنی قمیصوں اور پتلونوں میں بھر بھر کے صحن کے ایک طرف واقع ٹائلٹ میں پھیلا دی تھی لیکن اب بیت الخلا میں زیادہ مٹی ڈالنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا کیونکہ ہفتے میں ایک مرتبہ بیت الخلا کی صفائی ضرور ہوتی تھی اور زیادہ مقدار میں تازہ مٹی کی موجودگی ان کا راز فاش کر سکتی تھی۔ بالآخر چارلس نے اس کا بھی حل دریافت کر لیا۔ وہ سرنگ سے نکلنے والی مٹی کو کوٹھری کے کچے فرش پر بچھی ہوئی چٹائی کے نیچے پھیلانے لگے۔ اس طرح ان کے کمرے کے فرش کی سطح دن بدن بلند ہوتی چلی گئی۔ کھدائی کے چوتھے دن معائنے کے دوران جب ایک سنتری کوٹھری میں داخل ہوا تو چارلس کا فرانسیسی ساتھی پسینے میں شرابور ہو گیا مگر چارلس نہایت پرسکون لہجے میں کھڑا سنتری سے باتیں کرتا رہا۔ اس طرح اسے کسی قسم کا شبہ نہ ہو سکا۔ دوسری کوٹھری کے دروازے پر بیٹھا 'ریڈ آئی' اب بھی ان کی مدد کر رہا تھا۔ کسی سنتری کو اس طرف آتے دیکھ کر وہ مخصوص انداز میں ٹین کا ڈبہ بجاتا اور انہیں سگنل دے دیتا۔ چارلس کمرے میں جلنے والا چالیس واٹ کا بلب بجھا کر موم بتی روشن کر لیتا تاکہ اس کی مدھم روشنی میں کوئی اندازہ نہ لگایا جا سکے کہ اس کوٹھری میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ ایک سنتری نے بلب کے بجائے موم بتی جلانے کی وجہ دریافت کر لی تو چارلس نے نہایت معصومیت سے جواب دیا کہ بلب کی تیز روشنی میں پتنگے پریشان کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ موم بتی کو ترجیح دیتا ہے۔

پانچویں دن وہ نو فٹ کی گہرائی تک پہنچ چکے تھے۔ اس کے بعد رخ موڑ دیا گیا۔ تقریباً پندرہ فٹ سیدھی کھدائی کرنے کے بعد انہوں نے سرنگ کا رخ ایک بار پھر اوپر کی طرف موڑ دیا۔ فاصلے کا تعین انہوں نے بہت محتاط انداز میں کیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی سرنگ جیل کی فصیل سے دو تین فٹ باہر نکل چکی ہو گی۔ اوپر کی طرف کھدائی کرتے ہوئے بالآخر انہوں نے ہاتھ روک لیا۔ اب صرف ایک دو فٹ کی کھدائی باقی تھی۔ اس کے بعد وہ سطح پر نکل آتے۔ لیکن دن کے وقت سرنگ کے راستے بھرے بازار میں نمودار ہونے کا مطلب خودکشی کے مترادف تھا۔ رات کو تمام تیاری مکمل کرنے کے بعد انہوں نے 'ریڈ آئی' کو بھی اپنی کوٹھری میں بلا لیا۔

"آج رات ہم یہاں سے رخصت ہو رہے ہیں۔ اگر تم ہمارا ساتھ دینا چاہو تو تیار ہو جاؤ۔" چارلس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" 'ریڈ آئی' نے نفی میں گردن ہلا دی۔ "میری سزا چند ہفتوں بعد پوری ہونے والی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی جگہ ہم دوبارہ ضرور ملیں گے۔ تم ایک اور طریقے سے میری مدد کر سکتے ہو۔" 'ریڈ آئی' خاموش ہو کر چارلس کی طرف دیکھنے لگا۔ چارلس نے ایک روز اسے اپنے اٹیچی کیس میں رکھی ہوئی ایک شیشی دکھاتے ہوئے بتایا تھا کہ اس میں کلوروفارم ہے جس سے وہ وقتاً فوقتاً کام لیتا رہتا ہے۔ 'ریڈ آئی' کو معلوم تھا کہ ان کے فرار کے بعد اس سیکشن کے دوسرے قیدیوں پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ وہ سنتریوں کی درندگی دیکھ چکا تھا۔ ان کے تشدد سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا۔ اس نے چارلس سے کہا۔ "تم مجھے تھوڑا سا کلوروفارم دے جاؤ تاکہ تمہارے فرار کے انکشاف کے وقت میں سنتریوں کو گہری نیند یا بے ہوشی کی حالت میں ملوں اور اگر وہ مجھے تشدد کا نشانہ بنائیں بھی تو میں اس کا احساس نہ کر سکوں۔" چارلس نے مسکراتے ہوئے تھوڑا سا کلوروفارم ایک پیالی میں انڈیل کر اس کے حوالے کر دیا۔ 'ریڈ آئی' کلوروفارم کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ ایک گھونٹ اسے ہمیشہ کی نیند بھی سلا سکتا ہے۔

اس رات 'ریڈ آئی' اپنی کوٹھری میں بیٹھا موم بتی کی مدھم روشنی میں ایک پرانا انگریزی اخبار پڑھ رہا تھا کہ فضا سائرن، شور و غل اور سیٹیوں کی ملی جلی آوازوں سے گونج اٹھی۔ اس شور میں کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی شامل تھی۔ 'ریڈ آئی' ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ چارلس کوٹھری میں داخل ہوا۔ اس کا لباس گرد آلود تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"ہمارا راز فاش ہو گیا۔ وہ خونخوار بھیڑیے کچھ دیر میں یہاں پہنچنے ہی والے ہیں۔" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے افسوس ہے۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" 'ریڈ آئی' نے قریب پڑی ہوئی پیالی اٹھا کر کسی جھجک کے بغیر کلوروفارم حلق میں انڈیل لیا اور اپنے بے ہوش ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ سنتریوں کے آنے سے پہلے دنیا و مافیہا سے غافل ہو جائے تاکہ جسم پر پڑنے والی ٹھوکروں کا پتا نہ چل سکے۔ چارلس اور اس کے ساتھی کا راز کس طرح فاش ہوا تھا، یہ اسے بہت دنوں بعد معلوم ہو سکا تھا۔

چارلس اور اس کا فرانسیسی ساتھی سرنگ میں داخل ہو کر آگے بڑھتے رہے۔ چارلس آگے تھا۔ سرنگ کے آخر میں جیل کی فصیل کے باہر زمین کی سطح پر نکلنے کے لیے ابھی تقریباً ایک فٹ کھدائی باقی تھی۔ اس

کام میں چارلس کو آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگا۔ زمین کی سطح پر شگاف ہوتے ہی ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ شگاف کو مزید کشادہ کر کے چارلس نے سر اوپر نکالا اور اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ بازار کی بیشتر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ قرب و جوار میں تاریکی تھی، لیکن یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ عین اسی وقت ڈیوٹی سے فارغ ہو کر بازار کی طرف جانے والا جیل کا ایک سنتری وہاں پہنچ گیا۔ اگر وہ اپنے راستے چلتا رہتا تو شاید اس سرنگ سے لاعلم ہی رہتا۔ مگر وہ بیڑی سلگانے کے لیے رک گیا۔ اس کا رخ بازار کی طرف تھا۔ ہوا کے جھونکوں کی وجہ سے دیا سلائی دو مرتبہ بجھی تھی۔ وہ رخ پھیر کر کھڑا ہو گیا تاکہ جسم کی آڑ لے کر بیڑی سلگا سکے۔ اسی لمحے اس نے چارلس کے سر کو سرنگ سے نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ پہلے تو وہ بھونچکا سا رہ گیا لیکن پھر اسے صورتحال کو سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ اس نے فوراً پستول نکال کر فائر جھونک دیا۔ یہ چارلس کی خوش قسمتی تھی کہ بدحواسی میں چلائی جانے والی گولی اس کے سر سے کئی فٹ دور گری تھی لیکن وہ فوراً ہی نیچے جھک گیا اور فرانسیسی کو صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے وہ دونوں سانپ کی سی پھرتی سے سرنگ میں رینگتے ہوئے کوٹھری میں واپس پہنچ گئے۔

سنتری دوڑتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا جہاں اس نے زمین سے سر کو نمودار ہوتے اور غائب ہوتے دیکھا تھا۔ سرنگ دیکھتے ہی وہ بری طرح چونک گیا۔ اس نے سرنگ میں دو تین فائر جھونک دیے۔ بدحواسی میں جیل کے گیٹ کی طرف دوڑا اور دفتر میں قیدیوں کے فرار کے اس منصوبے کی اطلاع دے دی۔ جیل کا انچارج میجر یہ اطلاع ملتے ہی سناٹے میں آ گیا اور دوسرے لمحے وہ مسلح سنتریوں کا ایک دستہ لے کر دوڑتا ہوا جیل کے اس سیکشن میں پہنچ گیا جو غیر ملکی قیدیوں کے لیے مخصوص تھا۔ سنتریوں نے قیدیوں کو کوٹھریوں سے نکال کر صحن میں جمع کر لیا۔ ان کی تعداد دس تھی جن میں ریڈ آئی بھی شامل تھا۔ نیم بے ہوشی کے باعث دو سنتری اسے گھسیٹتے ہوئے کوٹھری سے نکال کر لائے تھے۔ میجر چند لمحوں تک قیدیوں کے چہروں کا جائزہ لیتا رہا پھر قریب کھڑے ہوئے سنتری سے رائفل لے کر اس کی سنگین ریڈ آئی کے نرخرے پر رکھ دی اور بھیڑیے کی طرح غرّایا۔

"آج تک کوئی قیدی میری اس جیل سے فرار نہیں ہوا۔"

میجر نے سنگین چند انچ پیچھے ہٹا لی۔ ریڈ آئی کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس کی زندگی کے آخری لمحات آن پہنچے ہیں میجر کا چہرہ غصے کی شدت سے بہت بھیانک ہو رہا تھا کنپٹیوں کی نسیں پھولی ہوئی تھیں، آنکھوں سے خون ابل رہا تھا۔ وہ رائفل کو حرکت دینا ہی چاہتا تھا کہ قریب کھڑے ہوئے ایک سنتری نے رائفل پر گرفت جماتے ہوئے سرگوشی کی۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں ایک امریکی شہری کو اس طرح موت کے گھاٹ اتارنا ہمارے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔"

بات شاید میجر کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس نے رائفل چھوڑ دی اور اپنے ماتحت کو حکم دیا کہ ان قیدیوں کو اس کے دفتر میں پیش کیا جائے۔ کچھ دیر بعد تمام قیدی اس کے دفتر میں موجود تھے۔ سنتری ہر قیدی پر تشدد کے نت نئے حربے استعمال کرتے ہوئے پوچھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ فرار کے اس منصوبے کا سرغنہ کون تھا، اور اس منصوبے میں کون کون شامل تھا۔ چارلس اگرچہ پہلے ہی اعتراف کر چکا تھا کہ فرار کا یہ منصوبہ اس نے بنایا تھا اور کوئی دوسرا قیدی اس کے ساتھ شامل نہیں تھا لیکن میجر اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ریڈ آئی نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ میجر چارلس کے بارے میں کسی اور انداز میں سوچ رہا تھا، شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ قیمتی لباس پہنا ہوا یہ شخص جس کی کلائی پر دو ہزار ڈالر مالیت کی گھڑی بندھی ہوئی تھی، جو عالیشان ہوٹلوں میں قیام کرتا ہے اور جس کے ہاتھ عورتوں کے ہاتھوں کی طرح ملائم تھے، وہ بھلا ایسے مشقت طلب کام میں کیسے ہاتھ ڈال سکتا ہے؟ تشدد کے باعث قیدیوں کے جسم زخمی ہو گئے، وہ ذبح ہوتے ہوئے جانوروں کی طرح بلبلا رہے تھے۔ ریڈ آئی نے بیہوش ہونے کی کوشش کی تھی مگر یہ فارم بھی دھوکا دے گیا تھا۔ وہ بری طرح پٹتا اور بلبلاتا رہا۔ چارلس چیخ چیخ کر کہتا رہا کہ فرار کا یہ منصوبہ اسی کا تھا اور کوئی اور قیدی اس کے ساتھ شامل نہیں تھا مگر میجر نے اس کی بات پر کان نہ دھرا، اس کا خیال تھا کہ چارلس یہ الزام اپنے سر لے کر دوسرے قیدیوں کو بچانا چاہتا ہے۔

مارپیٹ کا یہ سلسلہ صبح تک جاری رہا۔ بیشتر قیدی لہولہان ہو چکے تھے۔ چارلس کا فرانسیسی ساتھی کئی مرتبہ بے ہوش ہوا تھا مگر ہر مرتبہ اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے ڈال کر اسے ہوش میں لایا جاتا اور مارپیٹ کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا۔ یہ صورتحال دیکھ کر ریڈ آئی نے بے ہوش ہونے کا خیال ذہن سے نکال دیا اور خاموشی سے پٹتا رہا۔ بالآخر صبح انہیں کوٹھریوں میں واپس بھیج دیا گیا۔ ان سب کو ہتھکڑیاں پہنا دی گئی تھیں۔ اس دوران سنتریوں نے تمام کوٹھریوں کو چھان مارا تھا، مگر مڑے تڑے ایک چمچے کے علاوہ انہیں ایسی کوئی چیز نہیں مل سکی جس سے زمین کھودی جا سکتی۔ مڑا تڑا وہ چمچہ سنتری اپنے ساتھ لے گئے لیکن چارلس کا سوٹ کیس چھوڑ دیا تھا۔ چارلس کے ساتھ اس امتیازی سلوک سے ریڈ آئی کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ چارلس جیل میں آتے ہی جیل کے کسی ذمہ دار آفیسر کی مٹھی گرم کر چکا تھا تاکہ اسے ایسی چھوٹی موٹی رعایتیں ملتی رہیں لیکن اس وقت ایسی باتیں سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ سنتریوں کی مارپیٹ سے اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ دو دانت بھی اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے۔ وہ بار بار اپنی زبان پر خون کا ذائقہ محسوس کر رہا تھا لیکن تکلیف کے باوجود اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور وہ

نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ جلد ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ چارلس کو اپنے اوپر جھکے ہوئے دیکھ کر وہ چونک گیا۔ اسے مزید حیرت اس بات پر ہوئی کہ چارلس کے ہاتھ آزاد تھے اور کھلی ہوئی ہتھکڑی اس کی ایک کلائی میں جھول رہی تھی۔

"میری وجہ سے تمہیں جس اذیت کا سامنا کرنا پڑا ہے، اس پر میں شرمندہ ہوں۔" چارلس سرگوشیانہ لہجے میں کہتا ہوا اور آگے جھک گیا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی چابی سے ریڈ آئی کی ہتھکڑی بھی کھول دی "انہیں اپنے ہاتھوں سے مت نکالنا۔ اگر سنتری اس طرف آنکلیں تو اپنے دونوں ہاتھ اسی طرح ملائے رکھنا جیسے وہ اب بھی ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے ہیں۔"

چارلس کے اس انکشاف نے ریڈ آئی کے دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ اس کے اٹیچی کیس کے ایک خفیہ خانے میں ایسی نو چابیاں موجود ہیں جو ایشیا کے نو مختلف ممالک میں استعمال ہونے والی ہتھکڑیوں کو کھولنے میں استعمال ہو سکتی ہیں۔ چارلس نے بتایا کہ یہ چابیاں اس نے ہانگ کانگ میں خریدی تھیں جنہیں وہ مختلف ممالک میں استعمال کر چکا تھا۔

"میں نے جتنی رقم ان چابیوں کے حصول پر خرچ کی ہے اس سے بآسانی ایک رولز رائس خریدی جا سکتی تھی۔" چارلس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن شاید رولز رائس میرے لیے اتنی مفید ثابت نہ ہوتی جتنا فائدہ میں ان چابیوں سے اٹھا رہا ہوں۔"

اس روز دوپہر کے بعد ان دس غیر ملکی قیدیوں کو جیل کے ایک ایسے حصے میں منتقل کر دیا گیا جہاں حفاظتی انتظامات اس سے زیادہ سخت تھے۔ انہیں جن کوٹھریوں میں رکھا گیا وہ چارلس کے خیال میں کسی زمانے میں کتوں کی رہائش کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہوں گی گارے اور کچی اینٹوں کی بنی ہوئی ہر کوٹھری تین فٹ چوڑی، پانچ فٹ لمبی تھی اور اونچی صرف اتنی تھی کہ سیدھا ہو کر نہیں بیٹھا جا سکتا تھا۔ ہر کوٹھری میں دو دو قیدیوں کو ٹھونس دیا گیا تھا۔ اس سے پہلے انڈرویئر کے علاوہ انہیں ہر قسم کے لباس سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔ اس یخ بستہ تاریک کوٹھری میں داخل ہوتے ہی مکڑیاں اور چیونٹیاں نہایت بے تکلفی سے ان کے جسموں پر رینگنے لگیں۔ ریڈ آئی نے چارلس کا ساتھ پسند کیا اور یہ جان کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ چارلس کا بریف کیس اس ڈبہ نما کوٹھری میں بھی اس کے ساتھ تھا۔

ان کے ساتھ یہ سلوک اگرچہ جانوروں سے بھی بدتر تھا لیکن انہیں اب بھی یہ سہولت بہرحال حاصل تھی کہ وہ باچا کے ذریعے بازار سے اپنی کوئی مطلوبہ چیز منگوا سکتے تھے۔ یہاں منتقل ہونے کے بعد پہلی مرتبہ جب باچا چکر لگاتا ہوا اس طرف آیا تو ریڈ آئی نے اس سے پینڈرکس کی چند گولیاں منگوا لیں تاکہ اس عقوبت خانے میں زیادہ سے زیادہ وقت سو کر گزار سکے۔ چارلس نے سب سے پہلے جو چیزیں منگوائی تھیں ان میں ایک گلاس کے علاوہ ایک لمبی سرنج بھی شامل تھی۔ انتہائی کڑی نگرانی کے باوجود قیدیوں کو ایسی چیزیں منگوانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

"کیا مطلب؟ تم نے یہ سرنج کیوں منگوائی ہے؟" ریڈ آئی نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

جواب میں چارلس نے صرف کندھے اچکانے پر ہی اکتفا کیا، لیکن اس کی آنکھوں میں ابھرتی ہوئی چمک دیکھ کر ریڈ آئی کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ چارلس کے دماغ میں فرار کا کوئی نیا منصوبہ کلبلا رہا ہے۔ وہ چارلس کے آہنی اعصاب کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا جو شکست تسلیم کرنے کے بجائے پینترے بدل بدل کر حالات کا مقابلہ کر رہا تھا۔

ریڈ آئی کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس نے اس اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے پینڈرکس کی ایک گولی نگل لی جس کے کچھ ہی دیر بعد وہ نیم دراز پوزیشن میں اونگھنے لگا۔

چارلس نے وہ سرنج نکال لی جو بلاشبہ گھوڑوں کو انجکشن لگانے کے لیے استعمال ہو سکتی تھی۔ وہ چند لمحے سرنج کو گھورتا رہا پھر ریڈ آئی کو جھنجھوڑنے لگا۔ ریڈ آئی کے ذہن پر غنودگی طاری تھی۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر چارلس کی طرف دیکھا۔ پہلے تو کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آ سکی لیکن پھر چارلس کا ارادہ جان کر وہ لرز اٹھا۔ چارلس سرنج کی لمبی سوئی اپنے بازو میں گھونپ رہا تھا پھر اس نے آہستہ آہستہ پسٹن کھینچنا شروع کیا۔ اس کے جسم کا خون آہستہ آہستہ سرنج میں منتقل ہونے لگا۔

"یہ خون اس گلاس میں ڈال دو۔" چارلس نے خون سے بھری ہوئی سرنج ریڈ آئی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

ریڈ آئی نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے سرنج گلاس میں خالی کر دی۔ چارلس نے اسے لے کر سوئی دوبارہ اپنے بازو میں گھونپ دی اور خون کھینچنے لگا۔ تین مرتبہ خون نکالنے سے گلاس تقریباً بھر چکا تھا۔ چارلس کا چہرہ اب بھی پرسکون تھا لیکن ریڈ آئی کے چہرے پر کرب کے ایسے تاثرات تھے جیسے یہ خون چارلس کے بازو سے نہیں اس کے جسم سے نکالا گیا ہو۔

"شکریہ۔" چارلس کے لہجے میں نقاہت تھی۔ "مجھے یقین ہے کہ کہیں نہ کہیں ہماری ملاقات پھر ہو گی اور عین ممکن ہے کہ ہمیشہ کی طرح تم اس وقت بھی میری کوئی مدد کر سکو۔"

چارلس نے جملہ ختم کرتے ہی گلاس ہونٹوں سے لگا لیا اور آنکھیں بند کر کے ایک ہی سانس میں اپنا خون پی گیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ حلق میں انگلی ڈال کر ابکائیاں لینے لگا اور منہ سے نکلنے والا خون اپنی ٹھوڑی، گردن اور کپڑوں پر پھیلانے لگا۔ اسے دیکھ کر ریڈ آئی کے ذہن میں کسی خون آشام کا تصور ابھر آیا لیکن کسی ایسے خون آشام کے بارے میں اس نے کبھی نہیں سنا تھا جو اپنا ہی خون پیتا ہو۔ چارلس اب قدرے

مطمئن نظر آرہا تھا جیسے اس کا یہ حلیہ اس کی مرضی کے عین مطابق ہو۔ چارلس کے اشارے پر ریڈ آئی نے بری طرح چیخنا شروع کر دیا۔ اس کے انداز میں تصنع نہیں تھا۔ اگر چارلس اسے اشارہ نہ بھی کرتا تو وہ چیخنا شروع کر دیتا۔ چیخوں کی آواز سن کر سنتری وہاں پہنچ گیا اور چارلس کو دیکھتے ہی اس کے منہ سے بھی بے اختیار ایک خوفناک چیخ نکل گئی۔ چارلس کو اس حالت میں دیکھ کر سنتری کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ لبِ مرگ ہے۔ اسے اسٹریچر پر ڈال کر فوراً وزیر اکبر خان ہسپتال پہنچا دیا تھا۔ اس کے پیروں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور ہونٹوں کے گوشوں سے اب بھی خون بہہ رہا تھا۔

چارلس نے ڈاکٹر کو جو کیفیت بتائی، اس نے اسی کے مطابق تشخیص کا اعلان کر دیا کہ اس قیدی کو خونی اسہال ہے اور اسے کئی روز تک ہسپتال میں رہنا ہوگا۔ چارلس کو ہسپتال کے ایک پرائیویٹ کمرے میں منتقل کر دیا گیا جہاں اس کی چوبیس گھنٹے نگرانی کے لیے ایک مسلح کانسٹیبل کو بھی متعین کر دیا گیا۔ جیل کے ایک سنتری نے واپس جاتے ہوئے اس کا اٹیچی کیس بھی لے جانا چاہا تو چارلس رو پڑا اور درخواست کی کہ اس اٹیچی کیس میں اس کی بیوی اور بیٹی کی تصویریں ہیں۔ وہ قریب المرگ ہے۔ یہ اٹیچی کیس اس کے پاس رہنے دیا جائے تاکہ وہ وقتاً فوقتاً ان تصویروں کو دیکھتا رہے۔ کسی قریب المرگ شخص کی آخری خواہش سمجھتے ہوئے اٹیچی کیس اس کے پاس رہنے دیا گیا۔

ایک دو دن بعد چارلس کی حالت کچھ اور بگڑ گئی۔ اس کی ہتھکڑی کھول دی گئی لیکن پیروں کو بدستور پابندِ سلاسل رہنے دیا گیا۔ زنجیر کا دوسرا سرا آہنی پلنگ کے پائے سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ تیسرے دن چارلس نے کانسٹیبل کو چائے لانے کے لیے کہا اور یہ پیشکش بھی کی کہ اگر وہ چاہے تو اپنے لیے بھی ایک کپ منگوا سکتا ہے۔ کانسٹیبل نے دروازے ہی میں کھڑے ہو کر لڑکے کو چائے لانے کے لیے کہہ دیا۔ تقریباً بیس منٹ بعد لڑکا دو کپ چائے لے کر آ گیا۔ کانسٹیبل نے ٹرے چارلس کے قریب پلنگ پر رکھ دی اور دروازہ بند کرنے کے لیے مڑا۔ یہی ایک لمحہ تھا جس کے انتظار میں چارلس نے تین دن گزار دیے تھے۔ اس نے نہایت پھرتی سے کلوروفارم کی ایک خوراک کانسٹیبل کے کپ میں انڈیل دی اور دوسرا کپ خود اٹھا کر ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔

چارلس کی توقع کے عین مطابق چائے پینے کے بعد پانچ منٹ کے اندر اندر کانسٹیبل لڑھک گیا۔ اس نے بڑے اطمینان سے اٹیچی کیس کی خفیہ تہ میں سے ایک چابی نکال کر پیروں کی بیڑی کھولی اور کانسٹیبل پر آخری نگاہ ڈالتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

❁

بھارت اور پھر افغانستان سے فرار ہونے کے بعد چارلس مکڑی کے جال کی طرح دنیا کے بیشتر ممالک میں گھومتا رہا۔ وہ ایک چھلاوہ تھا جس کے بارے میں کوئی پیشگوئی نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ کہاں سے غائب ہو کر کہاں نمودار ہوگا۔ اس کے ایک تحریری بیان سے اس کے ان طوفانی دوروں کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"کابل سے فرار ہوتے ہوئے میں نے اپنی بیوی کو وہیں چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ میرے خلاف لگائے جانے والے الزامات اور پولیس کی تحقیقات کا جائزہ لے سکے۔ جلال آباد ہوتا ہوا میں خیبر کے راستے پاکستان میں داخل ہوا جہاں پشاور سے ایک جعلی پاسپورٹ خرید کر کراچی چلا گیا۔ وہاں میں نے صرف دو دن قیام کیا اور پھر طہران پہنچ گیا جہاں ایک امریکی تاجر کا پاسپورٹ چوری کر کے اس پر اپنی تصویر لگائی اور روم چلا گیا۔ اس خوبصورت شہر میں میں چند گھنٹوں سے زیادہ نہ ٹھہر سکا کیونکہ مجھے فوری طور پر پیرس پہنچنا تھا۔

پیرس پہنچتے ہی میں نے ہیلن کے والدین سے ملاقات کی۔ شوبھرا مجھے دیکھ کر خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ اسی روز میں نے ٹیلیفون پر کابل میں ہیلن سے بات کی۔ شوبھرا کی آواز سن کر ہیلن فرطِ جذبات سے بے قابو ہو رہی تھی۔ دوسرے روز میں نے پیرس چھوڑ دیا۔ شوبھرا میرے ساتھ تھی۔ ہم بذریعہ ہوائی جہاز روم ہوتے ہوئے کوپن ہیگن پہنچ گئے جہاں ہم نے دو دن قیام کیا۔ روم ہی سے میں نے کرائے پر ایک فیاٹ گاڑی حاصل کی جس کے لیے مجھے ایک سو پچاس ڈالر ایڈوانس دینے پڑے تھے۔ کرائے کی اسی گاڑی پر ہم یوگوسلاویہ سے ہوتے ہوئے بلغاریہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ روم میں قیام کے دوران میں نے ہپیوں سے بیس پاسپورٹ خریدے تھے۔ ہپیوں کا یہ طبقہ بھی خوب ہے۔ یہ لوگ منشیات کے استعمال ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا بیٹھے ہیں۔ مادر پدر آزاد یہ لوگ کسی منزل کا تعین کیے بغیر چلتے رہتے ہیں۔ نشہ کرنے کے لیے یہ اپنا لباس اور خون تک بیچ دیتے ہیں۔ پاسپورٹ ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ پاسپورٹ فروخت کر کے اس ملک میں اپنے سفارت خانے سے دوسرا پاسپورٹ حاصل کر لیتے ہیں اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ میں نے ہپیوں سے جو پاسپورٹ خریدے تھے وہ اصلی ہی تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ انہیں

کس طرح ذہانت سے استعمال کیا جائے اور مجھے اس فن میں ملکہ حاصل تھا۔

بلغاریہ کی سرحد پر پہنچنے تک کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ میں چیک پوسٹ پر گاڑیوں کی قطار میں اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ شوبھرا میرے قریب ہی دوسری سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور میرا پاسپورٹ بھی اسی سیٹ پر پڑا تھا۔ میری باری آنے ہی والی تھی کہ بچی نے پیشاب کر کے پاسپورٹ کا ستیاناس کر دیا۔ کسی متبادل انتظام کے لیے وقت نہیں تھا۔ میں نے متعلقہ کسٹمز آفیسر کو بھیگے ہوئے پاسپورٹ کے بارے میں قائل کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے دل میں شبہات جنم لے چکے تھے۔ اس نے میری گاڑی ایک سائیڈ پر لگوالی اور جب ڈکی کھلوائی گئی تو وہ بیس پاسپورٹ کسٹمز آفیسر کی نظروں میں آ گئے جو میں نے روم سے خریدے تھے۔ اتفاق سے اس وقت کوئی ذمہ دار آفیسر چیک پوسٹ پر نہیں تھا چنانچہ کار کو قبضے میں لینے کے بعد مجھے سرحد سے تقریباً گیارہ کلومیٹر دور ایک قصبے میں پہنچا دیا گیا اور ہدایت کر دی گئی کہ صبح نو بجے چیک پوسٹ پر پہنچ جاؤں تاکہ اس معاملے کا تصفیہ کیا جا سکے۔

ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد میں زیادہ دیر وہاں نہیں رکا۔ شوبھرا کو گود میں اٹھایا اور ہوٹل کے پچھلے دروازے سے نکل کر سڑک پر آ گیا اور ایک ٹیکسی کے ذریعے اٹلی کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس مرتبہ میں نے وہ راستہ استعمال نہیں کیا تھا جس سے ہوتا ہوا میں بلغاریہ کی سرحد تک پہنچا تھا۔ یہاں میں یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ واپسی کے اس سفر کے دوران میں نے اپنے اور شوبھرا کے لیے دو پاسپورٹ خرید لیے تھے، جن پر مجھے اپنی اور شوبھرا کی تصویریں چپکانی پڑی تھیں۔ نام وہی رہنے دیے گئے تھے جو پہلے سے پاسپورٹس پر موجود تھے۔

روم میں صرف تین دن قیام کے بعد میں شوبھرا کو لیے ہوئے بیروت پہنچ گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں کچھ بزنس کا موقع مل جائے گا لیکن بیروت کے حالات ایسے نہیں تھے چنانچہ میں پاکستان کے لیے روانہ ہو گیا۔ کراچی میں بھی میرا قیام مختصر رہا اور بالآخر طہران پہنچ گیا جہاں طے شدہ پروگرام کے مطابق ہیلن کو میرا منتظر ہونا چاہیے تھا لیکن طہران پہنچ کر پتا چلا کہ وہ ابھی تک کابل ہی میں تھی۔ میں نے ہلٹن ہوٹل میں کمرہ حاصل کر لیا جہاں میری ملاقات ایک خوبصورت اطالوی لڑکی سے ہوئی۔ اس لڑکی سے کچھ عرصہ پہلے بھارت میں بھی میری ملاقات ہو چکی تھی۔ ان دنوں وہ کوڑی کوڑی کو محتاج تھی۔ اس کا ایک دوست اسے ہلٹن میں چھوڑ کر غائب ہو گیا اور وہ ہوٹل کے بل کی ادائیگی کے سلسلے میں پریشان تھی۔ میں نے اسے پیشکش کی کہ اگر وہ میرے لیے کوئی پاسپورٹ کہیں سے حاصل کرے تو میں اس کی مالی مدد کر سکتا ہوں۔ اطالوی لڑکی نے اسی روز ہلٹن ہی میں مقیم ایک امریکی بزنس مین کا پاسپورٹ چوری کر کے میرے حوالے کر دیا لیکن کچھ دیر بعد وہ اس چوری کے الزام میں پکڑی گئی اور اس نے میرے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا۔ اسی رات پولیس نے مجھے بھی گرفتار کر لیا۔ شوبھرا کو فرانسیسی سفارت خانے کی تحویل میں دے دیا گیا اور اسے دوسرے روز سفارت خانے ہی کے ذریعے پیرس بھیج دیا گیا۔ مجھے پاسپورٹ فراڈ کے جرم میں چھ ماہ کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

جیل سے میں نے ہیلن کو خط کے ذریعے اس موجودہ صورتحال سے آگاہ کیا تو تیسرے روز وہ بھی کابل سے طہران پہنچ گئی۔ طہران جیل میں ہیلن سے وہ میری آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد وہ میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے فرانس چلی گئی۔"

اس مختصر سے عرصے میں چارلس نے اپنے لیے بیشمار فرضی نام استعمال کیے۔ ہر مرتبہ وہ ایک نئے پاسپورٹ پر سفر کرتا جس سے اس کی شہریت بھی بدل جاتی۔ حیرت تو اس بات کی تھی کہ چارلس کو اپنے یہ نام کیسے یاد رہتے ہوں گے۔ اسے یہ کیسے یاد رہتا ہوگا کہ کس وقت وہ کون ہے اور کیا ہے؟ ۱۹۷۲ء میں ایرانی پولیس نے اس کے بارے میں جو رپورٹ تیار کی اس میں چارلس کے لیے ڈاکٹر جولین کلیئر، چارلس سونڈرز، ایڈولف نومر، ڈاکٹر مارشل گوبین اور سلیم حیدری کے نام استعمال کیے گئے تھے۔ اس کی ذہانت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اسے دنیا بھر کی معلومات حاصل تھیں اور وہ کسی بھی موضوع پر بڑی روانی سے بحث کر سکتا تھا۔ کبھی وہ اپنے آپ کو کسی یونیورسٹی کا پروفیسر ظاہر کرتا، کبھی تاجر اور ایک دو مرتبہ تو اس نے اپنے آپ کو ایک دولتمند عرب شیخ کے روپ میں بھی پیش کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی طے تھی کہ مختلف ممالک کے ان طوفانی دوروں میں وہ چھوٹے

پیمانے پر ہیروں اور منشیات کی اسمگلنگ کے علاوہ پاسپورٹس کی خرید و فروخت کا کاروبار بھی کر رہا تھا۔ لیکن بعد کے واقعات سے اس حقیقت کا انکشاف بھی ہوا کہ یورپ اور ایشیا کے مختلف ممالک میں آمد و رفت کے دوران اس سے سنگین نوعیت کے جرائم بھی سرزد ہوئے تھے۔ ۱۹۷۲ء میں اس کے نام سے پہلا قتل منسوب کیا گیا۔ مقتول ایک پاکستانی تھا۔

انٹرپول اور پاکستانی پولیس ریکارڈ کے مطابق بھاری بھرکم حبیب راولپنڈی کا باشندہ تھا جو گائیڈ اور شوفر کی حیثیت سے غیر ملکی سیاحوں کو اپنی خدمات پیش کیا کرتا تھا۔ ایک پرانی سی گاڑی اس کے روزگار کا وسیلہ تھی۔ غیر ملکی سیاحوں سے گاڑی کا کرایہ اور گائیڈ کے طور پر حاصل ہونے والی رقم سے وہ آسائش کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

ستمبر ۱۹۷۲ء میں ایک فرانسیسی جوڑے نے راولپنڈی میں گائیڈ کی حیثیت سے حبیب کی خدمات حاصل کیں۔ مسٹر اور مسز ڈیمن سیمن پہلے اسلام آباد اور اس کے نواح کی سیر کرتے رہے پھر حبیب کو پشاور چلنے کے لیے کہا۔ یہ حبیب کی زندگی کا آخری سفر تھا۔ اس کے بعد اسے نہیں دیکھا گیا۔ اس کے تقریباً ایک سال بعد ماریا نونز نامی ایک غیر ملکی لڑکی اسمگلنگ کے الزام میں پکڑی گئی۔ تحقیقات کے دوران اس نے حبیب کے بارے میں بھی سنسنی خیز انکشافات کیے۔

"پشاور کے سفر کے دوران میں چارلس کے ساتھ تھی۔ حبیب گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ راستے میں آنے والے مختلف مقامات کے بارے میں معلومات بھی فراہم کرتا جا رہا تھا۔ نزلے کی وجہ سے بعض اوقات اسے بولنے میں بھی تکلیف سی محسوس ہو رہی تھی چارلس اسے فوری علاج کی تلقین کر رہا تھا پھر اس نے حبیب کو پیشکش کی کہ اگر وہ پسند کرے تو چارلس اسے ایک ایسا انجکشن دے سکتا ہے جس سے نزلہ فوری طور پر ختم ہو جائے گا۔ حبیب نے پہلے تو ٹالنے کی کوشش کی لیکن چارلس نے کسی نہ کسی طرح اسے انجکشن لینے پر آمادہ کر لیا اور حسن ابدال سے کچھ آگے نکلنے کے بعد گاڑی ایک ویران جگہ پر روک لی گئی۔ چارلس نے حبیب کو انجکشن لگانے کے بعد پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ کیونکہ اس کے بیان کے مطابق انجکشن کے ساتھ تھوڑا سا آرام ضروری تھا۔ اسٹیئرنگ چارلس نے خود سنبھال لیا۔ لیکن چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر گاڑی روکی اور حبیب کو پچھلی سیٹ سے گھسیٹ کر کار کی ڈکی میں ٹھونس دیا کیونکہ وہ مر چکا تھا۔ کچھ اور فاصلہ طے کرنے کے بعد چارلس نے اس کی لاش دریا میں پھینک دی تھی۔"

پولیس نے ڈیمن سیمن نامی اس فرانسیسی کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کر لیا تھا جس کے بارے میں بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ چارلس سوبھراج تھا۔ پولیس نے ملک بھر کے پولیس اسٹیشنوں اور سرحدی چوکیوں کو چارلس کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیے مگر چارلس اس طرح غائب ہو چکا تھا جیسے روئے زمین پر اس کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ اس واقعے کے بعد سے چارلس سوبھراج نے اپنا اصل نام ترک کر دیا۔ وہ ہر ہفتے ایک نئی شخصیت اختیار کر لیتا تھا۔

۱۹۷۲ء کے آخر میں چارلس ایک بار پھر ایک فرضی نام سے طہران میں نمودار ہوا۔ اس کا قیام ہوٹل 'نپولین' میں تھا۔ دوسرے ہی دن اس نے ایک طویل ٹیلیگرام کے ساتھ ہیلن کو کچھ رقم بھی بھیجی۔ اس کے چند روز بعد ہیلن بھی شوبھرا کو لے کر طہران پہنچ گئی۔ ان کی یہ ملاقات کافی عرصے بعد ہوئی تھی۔ انہیں دہلی سے فرار ہوئے تقریباً ایک سال ہو چکا تھا۔ اس دوران میاں بیوی ہونے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے دور رہے تھے۔ ہیلن شوہر کی محبت کو ترس گئی تھی۔ وہ جب بھی اس کے قریب آتی چارلس بڑی خوبصورتی سے اسے ٹال جاتا۔ ہیلن کو بہر حال یہ اطمینان تھا کہ اسے چارلس کی رفاقت حاصل تھی۔ جب وہ ہوٹل کے کمرے میں ہوتے تو چارلس کا زیادہ وقت شوبھرا سے باتوں میں گزرتا جو اب دو سال کی ہو چکی تھی۔ وہ دن بھر شہر کے مختلف تفریحی مقامات پر گھومتے رہتے۔ چارلس نے ایک بار پھر ہیلن کو جواہرات سے لاد دیا تھا۔ انہیں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بازار میں گھومتے دیکھ کر لوگوں کو رشک آتا۔

شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ہیلن اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ ایک روز اس کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور وہ چارلس سے جھگڑ بیٹھی۔ بات بڑھی تو چارلس نے اسے تھپڑ رسید کر دیا۔ ہیلن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ چند لمحے متوحش نگاہوں سے چارلس کی طرف دیکھتی رہی پھر زخمی شیرنی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی اس نے چارلس کا منہ نوچ لیا۔ چہرے کی خراشوں سے رسنے والے خون نے چارلس پر بھی دیوانگی سی طاری کر دی اور اس نے ہیلن کو بری طرح دھنک ڈالا۔

ہیلن اس کے قدموں میں گر پڑی اور رونے لگی۔ "میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ شوبھرا کا مستقبل کیا ہوگا؟ اگر تم غیر قانونی سرگرمیوں کے بجائے یہ توانائی جائز کاموں پر صرف کرو تو اپنی محنت اور ذہانت کی بدولت لکھ پتی بن سکتے ہو۔ اس طرح ہمیں بھی کچھ تحفظ حاصل ہوگا۔"

"میں یہ سب کچھ تم لوگوں کے لیے ہی کر رہا ہوں۔" چارلس نے جواب دیا۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

ہیلن زخمی نگاہوں سے اسے گھورتی ہوئی بیڈ روم میں گھس گئی۔ شوبھرا کو گود میں اٹھایا اور اپنے اور شوبھرا کے کپڑے سوٹ کیس میں ٹھونسنے لگی۔

"میں فرانسیسی سفارت خانے جا رہی ہوں۔" اس نے چارلس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اس کے پیچھے ہی چلا آیا تھا۔ "اگر سفارت خانہ بند ہوا تو رات کسی فٹ پاتھ پر بسر کروں گی۔ کسی نے میری مدد نہ کی تو پیرس واپسی کے کرائے کیلیے بھیک مانگنے سے بھی گریز نہ کروں گی۔"

چارلس سناٹے میں آ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر ہیلن کے کندھے

پر ہاتھ رکھ دیا لیکن ہیلن اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے چیخی۔ "ہماری شادی کو تین سال ہو چکے ہیں اور اس عرصہ میں سکون کا ایک لمحہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ میں ہوٹلوں کی زندگی سے تنگ آ چکی ہوں اور تمہاری بدولت اب میرا نام بھی پولیس کے ریکارڈ پر آ چکا ہے۔ مجھے تو تم برباد کر ہی چکے ہو لیکن میں اپنی بیٹی کو اس طرح برباد نہیں ہونے دوں گی۔"

چارلس چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے لپک کر ہیلن کے دونوں بازو پکڑ لیے اور ملامت آمیز لہجے میں گویا ہوا۔ "میری طرف دیکھو ہیلن! میں یہ سب کچھ کس کے لیے کر رہا ہوں۔ صرف تمہارے اور شوبھرا کے لیے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے پاس اتنی رقم جمع ہو جائے کہ باقی زندگی ہم آرام و سکون سے گزار سکیں۔ اگر تمہیں یہ سب کچھ پسند نہیں تو ہم کل ہی فرانس روانہ ہو جائیں گے۔"

"کیا واقعی؟" ہیلن نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں، لیکن تمہاری یہ ضد پوری کرنے کے لیے مجھے بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"مجھے ایک آدمی کا انتظار ہے جو روم سے آنے والا ہے۔ اگر اس سے میری ملاقات نہ ہو سکی تو طہران میں میری اب تک کی محنت رائیگاں جائے گی۔" چارلس نے کہا۔

"وہ آدمی کب آئے گا؟" ہیلن نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"صرف چند روز کی بات ہے۔ اس کے فوراً ہی بعد ہم پیرس چلے جائیں گے۔" چارلس نے کہا۔ اور ہیلن ایک بار پھر اس کی باتوں میں آ گئی۔

اس کے چند روز بعد پولیس نے چارلس کو طہران ہلٹن کی لابی سے گرفتار کر لیا۔ کسی نے اس کے خلاف مخبری کر دی تھی۔ تلاشی کے دوران اس کے بریف کیس سے مختلف ممالک کی کرنسی، ہیرے اور کئی پاسپورٹ برآمد ہوئے جن کا تعلق مختلف لوگوں سے تھا۔ شبہے کی بنا پر چارلس کا کیس ایران کی سیکریٹ پولیس ساوک کے حوالے کر دیا گیا۔ ان دنوں شاہِ ایران کے خلاف انقلابی سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں۔ تخریب کاری کے واقعات میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا۔ ساوک کو شبہ تھا کہ چارلس کا تعلق تخریب کاروں کے کسی ایسے گروہ سے تھا جو انہیں ملک میں آمد و رفت کے لیے مالی امداد اور جعلی پاسپورٹ فراہم کر رہا تھا۔ ساوک کے درندہ صفت ایجنٹ اپنا مخصوص 'طریقہ' کار استعمال کرتے ہوئے چارلس سے کچھ اگلوانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہیلن ایک بار پھر اکیلی رہ گئی۔ اس روز چارلس یہ کہہ کر نکلا تھا کہ دوپہر کے کھانے تک لوٹ آئے گا لیکن نہ تو وہ لوٹ کر آیا، نہ اس کے بارے میں کوئی اطلاع تھی کہ وہ کہاں ہوگا۔ کئی روز کی پریشانی کے بعد ایک دن صبح سویرے ہی ہیلن کو فرانسیسی سفارت خانے سے فون پر اطلاع ملی کہ چارلس ایک بار پھر گرفتار ہو چکا ہے اور اس مرتبہ وہ واقعی سنگین صورت حال سے دوچار ہے کیونکہ ایرانی پولیس کسی ایسے شخص کے ساتھ قطعی کوئی رعایت نہیں برتتی جس کے بارے میں شبہ ہو کہ وہ شاہ کی کسی مخالف تنظیم سے وابستہ ہو سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ کسی ملک کے سیاسی حالات سے پوری طرح آگاہ ہونے کے باوجود چارلس کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی سرگرمیاں صرف اپنے 'بزنس' تک محدود تھیں۔

فرانسیسی سفارت خانے کے توسط سے دسمبر میں ہیلن کو چارلس سے ملاقات کی اجازت مل گئی۔ شادی کے بعد سے اب تک پہلی مرتبہ ہیلن نے چارلس کے چہرے پر خوف و ہراس کے تاثرات دیکھے۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ بازوؤں، گردن اور جسم کے مختلف حصوں پر خراشوں کے نشان نظر آ رہے تھے جن سے رسنے والا خون جم چکا تھا۔ دونوں جبڑے سوجے ہوئے تھے۔ چارلس نے بتایا کہ تفتیش کے دوران ساوک کے بھیڑیوں نے اسے بار بار پیٹا تھا۔ کئی مرتبہ اسے الٹا لٹکا کر سر پانی میں ڈبو دیا گیا تھا۔

"میں ہمیشہ تم سے اسی طرح محبت کرتی رہوں گی جس طرح تین سال پہلے تمہیں چاہا تھا۔" ہیلن نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "تمہارے لیے میری محبت میں کبھی کمی نہیں آئے گی لیکن میرے لیے اپنی بیٹی کا مستقبل ہر شے پر مقدم ہے۔"

فرانسیسی سفارت خانے کی طرف سے ہیلن اور شوبھرا کی پیرس واپسی کا انتظام کیا جا چکا تھا اور ہیلن نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ پیرس پہنچتے ہی عدالت میں چارلس سے طلاق کی درخواست دیدے گی اور نام بدل کر فرانس کے کسی دوسرے شہر میں منتقل ہو جائے گی تاکہ چارلس اسے تلاش نہ کر سکے۔ اس نے چارلس کو بھی اپنے اس پروگرام سے آگاہ کر دیا۔

چارلس خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا پھر اس نے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوئے ساوک کے تین ایجنٹوں کی طرف دیکھا جن کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی سب مشین گنوں کا رخ اس کی طرف تھا۔ اس نے ہیلن کے چہرے پر نظریں جما دیں اور سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تم یہ فیصلہ کرنے میں خاصی عجلت سے کام لے رہی ہو۔ میرے بارے میں یہاں کی پولیس کو کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک دو دن میں باہر آ جاؤں گا۔"

"فرانسیسی سفارت خانے کا کہنا ہے کہ تم اب کبھی ایران کی جیل سے باہر نہیں نکل سکو گے۔" ہیلن آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "اور میرا خیال ہے کہ وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ تم پر جو سنگین الزامات عائد ہیں انہیں دیکھتے ہوئے تم اپنی زندگی کا آخری سانس بھی ایران کی

جیل ہی میں لوگے۔"

وہ اچانک اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور مزید کچھ کہے یا جواب کا انتظار کیے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ چارلس اس شیر خوار بچے کی طرح چیخ رہا تھا جسے اس کی ماں چھوڑ کر جا رہی ہو۔

دوسرے دن جہاز میں سوار ہوتے وقت بھی ہیلن کے کانوں میں اس کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ طویل ہوائی سفر کے دوران وہ ذہنی کرب کا شکار رہی اور جب گھر پہنچی تو صبر کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ ماں کے سینے سے لپٹ کر روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔

دوسرے دن کرسمس تھا۔ چرچ میں موم بتی جلاتے ہوئے ہیلن دعا مانگ رہی تھی کہ چارلس سوبھراج آئندہ اس کی زندگی میں داخل نہ ہو۔

❀

فرانس میں چارلس کے رشتے دار اس کی سرگرمیوں سے قطعی لاعلم تھے۔ سونگ نے تو آخری مرتبہ اسے اس وقت دیکھا تھا جب اس نے ہیلن سے شادی کی تھی لیکن اس کے کچھ ہی عرصے بعد وہ اپنی بیوی کو لے کر فرانس سے غائب ہو گیا۔ گھر والوں کو کبھی کبھار مشرقِ وسطیٰ یا مشرقِ بعید کے کسی مقام سے ایک ویو کارڈ مل جاتا جس میں چارلس اور ہیلن کی خیریت درج ہوتی۔ اس نے ماں کو کبھی کوئی تفصیلی خط بھی نہیں لکھا تھا۔ البتہ فیلکس ان کی نسبت چارلس کے بارے میں زیادہ آگاہ تھا۔ خطوط کے علاوہ مختلف اوقات میں دو مرتبہ اسے ہیلن یا چارلس کی طرف سے ٹیلیگرام بھی ملے تھے جن میں کچھ رقم بھیجنے کی درخواست کی گئی تھی اور وہ ہر مرتبہ ان کے کام آیا تھا۔ اور پھر ایک موقع پر جب وہ چارلس کی دعوت پر بمبئی آیا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ چارلس کی بود و باش دیکھ کر اس پر کسی لارڈ یا مہاراجہ کا شبہ ہوتا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب چارلس دہلی کے اشوکا ہوٹل کی ڈکیتی کے سلسلے میں پولیس کو مطلوب تھا۔ چارلس نے فیلکس کو بمبئی کے تاج محل ہوٹل میں ٹھہرایا تھا اور اس کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اس نے پیرس میں اپنے باپ کی بھی اتنی خدمت نہیں کی ہوگی جتنی وہ فیلکس کی کر رہا تھا۔ چارلس نے اگرچہ فیلکس کو بتایا تھا کہ وہ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کر رہا ہے لیکن فیلکس اتنا بیوقوف نہیں تھا کہ آنکھیں بند کر کے اس کی ہر بات پر یقین کر لیتا۔ ہیلن کی آنکھوں میں چھپا ہوا کرب اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔ وہ ننھی شوبھرا کو گود میں لے کر گھنٹوں اس کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اس نے کئی مرتبہ چارلس سے اس کے اصل کاروبار کے سلسلے میں دریافت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ جب بھی اس موضوع پر آتا چارلس بڑی خوبصورتی سے اسے ٹال جاتا۔ زیادہ اصرار پر چارلس ہمیشہ اسے یہی بتاتا کہ وہ ایک ایسا کامیاب بزنس مین ہے جس کا کاروبار دنیا کے بیشتر ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔ ویسے وہ ایشیائی ممالک کے بڑے بڑے شہروں میں نائٹ کلب کھولنے کا پروگرام بنا رہا ہے۔ اور اس سلسلے میں بہت جلد بیروت جانے والا ہے تاکہ وہاں سے پرانی جوئے کی مشینیں اپنے نائٹ کلبوں کے لیے امپورٹ کر سکے۔

فیلکس کے پیرس واپس آنے کے بعد بھی چارلس کی خط و کتابت جاری رہی۔ کبھی اسے یہ نوید ملتی کہ چارلس نے پانچ ہزار ڈالر مالیت کی نئی رولیکس خریدی ہے۔ کبھی یہ سننے میں آتا کہ وہ سیاحت کے لیے امریکا جانے والا ہے۔ کبھی جوئے میں پچاس ہزار ڈالر ہارنے کی اطلاع دیتا اور کبھی اسے یہ خوشخبری سناتا کہ اسے بھارت کے ایک فلم ساز نے اپنی نئی فلم میں ہیرو کے رول کی پیشکش کی ہے جس پر وہ غور کر رہا ہے۔ آخری خط میں فیلکس کو یہ خبر سننے کو ملی کہ وہ ہیلن سے علیحدگی اختیار کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں چارلس نے ہیلن پر ایک گھناؤنا الزام لگایا تھا۔

"یہ صورتحال میرے لیے نہایت افسوسناک ہے اور تمہیں یہ اطلاع دیتے ہوئے بڑا دکھ محسوس کر رہا ہوں کہ میں ہیلن کو اپنی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال رہا ہوں۔ میں اسے پانچ ہزار فرانک بھی دے رہا ہوں تاکہ اسے فوری طور پر مالی دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ دراصل بہت عرصے سے چھوٹی چھوٹی کچھ باتیں سامنے آ رہی تھیں جن سے بالآخر چھپی ہوئی حقیقت سامنے آ ہی گئی۔ دو روز پہلے چند ایسے ثبوت مل چکے ہیں جنہیں ہیلن بھی نہیں جھٹلا سکتی۔ میرے کرب کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا۔ میں نے ہیلن کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ چاہا تھا لیکن وہ بھی بے وفا نکلی۔ چند روز پہلے ہیلن مجھے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی کہ میں اس کے نام سے بنک اکاؤنٹ کھلوا کر ایک بڑی رقم جمع کرا دوں۔ دراصل اس کا پروگرام یہی تھا کہ وہ بنک سے رقم نکلوا کر اپنے دوست کے ساتھ ہانگ کانگ فرار ہو جاتی لیکن اس سے پہلے ہی اس کا راز فاش ہو گیا۔ اور اب میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دنیا کی کسی بھی عورت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ مرد کو دوستی کسی مرد ہی سے رکھنی چاہیے جس پر اعتماد بھی کیا جا سکتا ہو جیسے میں اور تم......"

چارلس کے اس خط نے فیلکس کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے اسے ہیلن کا بھی ایک مختصر سا خط مل چکا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب چارلس کابل کی جیل سے فرار کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ ہیلن نے انتہائی دکھ اور کرب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"میں زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتی لیکن یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ یہ چند مہینے ہمارے لیے بدترین عذاب کے ثابت ہوئے ہیں۔ چارلس کابل کی جیل میں ہے اور انٹرپول کو بھی اس کی تلاش ہے۔ چارلس کی وجہ سے میں بھی پولیس کی ریکارڈ پر آ چکی ہوں۔ اگر میرے والدین کو اس کی اطلاع ہو گئی تو نجانے ان پر کیا بیتے گی۔ ۲۔ جولائی کو کابل پولیس نے ہمیں گرفتار کر لیا تھا۔ دوسرے دن مجھے تو چھوڑ دیا گیا مگر چارلس کو سزا ہو گئی لیکن ۲۹۔ جولائی کو وہ جیل کے ہسپتال سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس بات کو تین ہفتے ہو چکے ہیں اور مجھے چارلس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں لیکن اتنا جانتی ہوں کہ وہ دوبارہ پولیس کے ہاتھ نہیں آ سکا۔ ممکن ہے وہ افغانستان کی سرحد عبور کر چکا ہو۔ اگر واقعی ایسا ہے تو میرے خیال میں اسے دوبارہ افغانستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے۔ میری اپنی صحت گرتی جا رہی ہے۔ اعصاب جواب دے رہے ہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ ان مصائب کا سامنا کرنے کے لیے مجھے اپنے آپ پر قابو رکھنا ہوگا۔ گزشتہ کچھ عرصے سے چارلس بار بار پولیس کی نظروں میں آ رہا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اب اسے اپنی غیر قانونی سرگرمیاں ترک کر کے کہیں آرام سے بیٹھ جانا چاہیے۔ آپ چارلس کو بتا دیں کہ وہ افغانستان یا فرانس میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرے۔ کوئی بھی جگہ اس کے لیے محفوظ نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر وہ اسی طرح بھاگتا رہا تو اسے دنیا کے کسی گوشے میں پناہ نہیں ملے گی۔"

فیلکس نے یہ دونوں خطوط بھی فائل میں لگا دیے۔ چارلس کے گھر والوں کو اس نے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا کیونکہ وہ انہیں مزید ذہنی کرب میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ چارلس کے سوتیلے بھائی آندرے ڈارپو کی طرف سے زیادہ محتاط تھا جو چارلس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً اس کے پاس آتا رہتا تھا۔ آندرے، چارلس کا ہم شکل تھا۔ ویسا ہی قد و قامت، ویسی بھوری آنکھیں چہرے کے وہی نقوش اور وہی پُر وقار شخصیت۔

آندرے پہلی مرتبہ ۱۹۷۰ء میں پیرس آیا تھا۔ اس روز دستک کی آواز سن کر فیلکس نے دروازہ کھولا تو آندرے کو دیکھ کر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ پہلے تو وہ یہی سمجھا کہ وہ چارلس ہے لیکن آندرے نے اپنا تعارف کراتے ہوئے اس کی یہ مشکل حل کر دی تھی۔ وہ دونوں گھنٹوں بیٹھے چارلس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ آندرے کی باتوں سے فیلکس کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ چارلس کے لیے اس کے دل میں بڑی محبت تھی۔ وہ اسے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ چاہتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اسے چارلس کے بارے میں کوئی اطلاع مل گئی تو وہ اس سے رابطہ قائم کرنے میں دیر نہیں لگائے گا جبکہ فیلکس نہیں چاہتا تھا کہ آندرے بھی چارلس کے نقشِ قدم پر چل نکلے۔ آندرے مستقل طور پر مارسلز سے پیرس منتقل ہو گیا تھا۔ وہ فیلکس سے اکثر ملتا رہتا تھا لیکن فیلکس نے اسے چارلس کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔

پیرس میں منتقل ہونے کے بعد آندرے کو کچھ دشواریاں پیش آئی تھیں لیکن فیلکس قدم قدم پر اس کی رہنمائی کرتا رہا۔ اسے ایک مختصر سا فلیٹ کرائے پر دلانے کے علاوہ فیلکس نے اسے اپنا کچھ فرنیچر بھی مستعار دے دیا تھا۔ فیلکس ہی کی کوشش سے اسے ایک انشورنس کمپنی میں کلرک کی حیثیت سے ملازمت بھی مل گئی۔ آندرے اکثر و بیشتر اس سے چارلس کے بارے میں دریافت کرتا رہتا لیکن فیلکس بڑی خوبصورتی سے اس کا دھیان بٹا دیتا۔ فیلکس اس کے دل سے چارلس کا خیال نکال دینا چاہتا تھا جس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چارلس کے بارے میں آندرے کے سوالات کی شدت کم ہوتی گئی اور پھر اس نے کچھ پوچھنا ہی چھوڑ دیا۔ فیلکس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ اس بیس سالہ وجیہہ و شکیل نوجوان سے بڑا متاثر تھا۔ وہ انتہائی خوش اخلاق، محنتی اور ذمہ دار آدمی تھا جو نہایت کامیابی سے زندگی کی منزل کی طرف گامزن تھا۔

وہ ۱۹۷۳ء کے موسم بہار کی ایک رات تھی۔ آندرے اپنے مختصر سے فلیٹ کے ڈربہ نما بیڈ روم میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ آپریٹر نے طویل فاصلے کی کال کی اطلاع دیتے ہوئے انتظار کرنے کو کہا۔ آندرے سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے مارسلز سے اس کی ماں یا بہن بھائیوں میں سے کسی نے فون کیا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے ایک تھرتھراتی ہوئی سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ آواز بہت مدھم تھی جیسے اس کا مخاطب دنیا کے آخری سرے سے بول رہا ہو۔ "آندرے! میں چارلس بول رہا ہوں۔ تمہارا چارلوٹ۔"

فون کا ریسیور آندرے کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ دماغ میں تیز سنسناہٹ ہو رہی تھی اور کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ فون پر ابھرنے والی یہ آواز تو وہ ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ اسے یاد تھا کہ جب وہ مارسلز میں زیرِ تعلیم تھا تو چارلس نے ایک مرتبہ پیرس سے اسے فون کیا تھا اور اسے پیشکش کی تھی کہ وہ تعلیم ترک کر کے اس کی آرگنائزیشن میں شامل ہو جائے لیکن آندرے نے اس کی یہ پیشکش مسترد کر دی تھی۔ کئی سال بعد اب پھر فون پر اسے وہی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"کیسے ہو آندرے؟ اب تو تم جوان ہو گئے ہو گے۔" چارلس کی آواز سنائی دی۔

"ہاں، ماما اور پاپا اکثر کہا کرتے ہیں کہ میں بالکل تمہاری طرح ہوں۔" آندرے نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اور غالباً خود مختار بھی ہو۔" چارلس نے کہا۔ "اب وقت آ گیا ہے کہ ہم دونوں بھائی مل کر کام کریں۔ یہاں آ جاؤ۔ میں تمہارے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھیج رہا ہوں۔ بمبئی کے تاج محل میں تمہارا منتظر ہوں۔"

آندرے کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے امڈتے ہوئے جذبات پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ اس کی قوتِ فیصلہ جواب دے رہی تھی لیکن بالآخر اس نے فیصلہ کر ہی لیا اور

ایک بار پھر چارلس کی اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔

دو ہفتے گزر گئے۔ اس دوران آندرے عجیب سی الجھن کا شکار رہا اس نے فیلکس سے بھی چارلس سے فون پر ہونے والی اس گفتگو کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن دو ہفتے بعد رات کو ایک بار پھر فون کی گھنٹی نے اس کا ذہنی شیرازہ بکھیر دیا۔ وہ چارلس کی کال تھی۔

"تمہیں چند روز پہلے کی گفتگو یاد ہے آندرے؟" چارلس نے دریافت کیا۔

"ہاں، ایک ایک لفظ میرے ذہن کی لوح پر ثبت ہے۔" آندرے نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"اور مجھے امید ہے کہ تم نے کوئی فیصلہ بھی کر لیا ہوگا۔ میں اس وقت استنبول میں ہوں اور مجھے ایک قابلِ اعتماد ساتھی کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھیج رہا ہوں۔" چارلس کی آواز سنائی دی۔

آندرے کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس کے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں اور وہ اپنے آپ میں کوئی فیصلہ کرنے کی جرأت نہیں پا رہا تھا۔

"اس دنیا میں دو قسم کے انسان بستے ہیں۔" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد چارلس کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ "ایک وہ جو زندگی کو داؤ پر لگا کر کامیابی حاصل کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو اپنے خول سے نکلنا پسند نہیں کرتے اور بالآخر دوسروں کے قدموں تلے کچلے جاتے ہیں۔ میں استنبول ایئرپورٹ پر تمہارا انتظار کروں گا۔ کیا تم مجھے پہچان لوگے؟"

"ہاں پہچان لوں گا۔" آندرے کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

استنبول ایئرپورٹ پر کسٹمز لاؤنج میں داخل ہوتے ہی آندرے نے چارلس کو دیکھ لیا تھا۔ ان کا آمنا سامنا اگرچہ تقریباً دس سال بعد ہوا تھا مگر آندرے کو اسے پہچاننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ جسم پر بہترین تراش کا تھری پیس قیمتی سوٹ اور آنکھوں پر گہرے شیشوں والی عینک نے اس کی شخصیت کو خاصا پُروقار بنا دیا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو محافظ بھی موجود تھے۔ اس رکھ رکھاؤ کے ساتھ وہ کوئی یونانی کروڑپتی ہی لگ رہا تھا۔ آندرے کے جسم پر معمولی سے کپڑے کی پتلون اور ہائی نیک کی بنیان تھی۔ اپنا اور چارلس کا موازنہ کرتے ہوئے وہ ایک لمحے کو احساسِ کمتری کا شکار ہو گیا لیکن پھر فوراً ہی اس نے اپنے اس احساس کو ذہن سے جھٹک دیا۔

آندرے اپنا سامان جمع کروا رہا تھا کہ ہال کے اسپیکر پر اس کے نام کا اعلان ہوا۔ اس کے لیے فون کال تھی۔ آندرے سامان کاؤنٹر پر چھوڑ کر اس طرف بڑھ گیا جہاں ٹیلیفون بوتھ واقع تھا۔ کیبن میں داخل ہو کر ریسیور اٹھاتے ہوئے اس نے کسٹمز لاؤنج کے گیٹ کے قریب شیشے کی دیوار کی طرف دیکھا۔ چارلس اب وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسی لمحے ریسیور پر چارلس کی آواز ابھری۔

"خوش آمدید آندرے!" چارلس کا لہجہ سرگوشیانہ تھا۔ "لاؤنج سے نکلنے کے بعد باہر آ کر مجھ سے ملو تو مجھے ایلین کے نام سے مخاطب کرنا۔ ذہن نشین کر لو میرا نام ایلین گنھتر ہے۔ اس کی وضاحت میں بعد میں کروں گا۔"

اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ آندرے ریسیور رکھ کر کیبن سے باہر آ گیا اور کسٹمز کاؤنٹر سے اپنا سامان لے کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چارلس گیٹ کے سامنے ہی بانہیں پھیلائے کھڑا تھا۔ اس نے آندرے کو اپنے مضبوط بازوؤں میں بھینچ لیا اور پھر اس کی پیشانی اور رخساروں پر بوسوں کی بارش کر دی۔ چارلس نے اپنے دونوں ساتھیوں سے اس کا تعارف کرایا۔ ان میں ایک باڈی گارڈ تھا اور دوسرا اس کا پرائیویٹ سیکریٹری۔ یہ تو آندرے کو کئی دن بعد معلوم ہوا کہ ڈچ باڈی گارڈ ایک خوفناک قاتل تھا۔ اب تک کئی افراد اس کے ہاتھوں موت کی وادی میں پہنچ چکے تھے اور اس کا سیکریٹری پائرے پرمیٹر تھا جو دہلی میں اشوکا ہوٹل کی ڈکیتی کے بعد کسی طرح بھارت سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

طہران سے فرار ہونے کے بعد چارلس نے ان دونوں کو بھی استنبول بلا لیا تھا۔ طہران جیل میں کئی روز تک 'ساوک' کا تشدد برداشت کرنے کے بعد چارلس کسی نہ کسی طرح ضمانت پر رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی ضمانت منظور کر لینا ایسا ہی تھا جیسے کسی پالتو بلی سے کہہ دیا جائے کہ وہ رات کو گھر سے باہر نہ نکلے۔ بہرحال، زنداں سے نکلتے ہی وہ چوری کی ایک کار میں سرحد عبور کر کے عراق پہنچ گیا۔ وہاں سے ترکی کی سرحد عبور کرنے میں بھی اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ انقرہ پہنچتے ہی اس نے چوری کی وہ کار بیچ دی اور ایک عالیشان ہوٹل میں قیام کے دوران ایک لکھ پتی تاجر کی بیٹی کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ چند ہی ملاقاتوں میں دولتمند لڑکی اسے اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھی تھی۔ اس رومانس کے دوران چارلس کی نظر اس کی دولت پر تھی۔ بالآخر چارلس نے اس لڑکی کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اگر وہ سرمایہ لگانے پر راضی ہو تو چارلس استنبول میں ایک بہت بڑا ڈیپارٹمنٹ اسٹور کھول سکتا ہے۔ اس طرح اس نے دولتمند تاجر کی بیٹی سے ایک لمبی رقم وصول کر لی اور اسے صبر و انتظار کی تلقین کر کے استنبول آ گیا۔

ایئرپورٹ کے باہر ایک نئی امریکی کار کے قریب کھڑے ہوئے باوردی شوفر نے انہیں دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا اور چاروں گاڑی میں گھس گئے۔ راستے میں وہ پیرس اور استنبول کے موسم پر تبصرہ کرتے رہے اور آندرے چارلس کے ساتھ جیسے ہی ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا چارلس نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ بے صبری سے ایک ایک فرد کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ آندرے بڑے سکون سے

اس کے سوالات کا جواب دیتا رہا اور بالآخر اس نے بھی وہ سوال پوچھ ہی لیا جو بہت دیر سے اس کے دماغ میں کلبلا رہا تھا۔ چارلس نے فرضی نام کیوں اپنا رکھا ہے؟

چارلس کے لیے یہ سوال غیر متوقع نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ بہت عرصہ پہلے اس کا چالان ہو گیا تھا اور وہ عدالت میں پیش ہونے کے بجائے بھاگ نکلا تھا۔ ان دنوں وہ چونکہ ایک نہایت اہم کاروباری مشن پر استنبول آیا ہوا تھا اس لیے وہ نہیں چاہتا تھا کہ پولیس اسکے پرانے کیس کی آڑ لے کر اس کے کاروباری معاملات میں روڑے اٹکائے، اس لیے اس نے وقتی طور پر فرضی نام اپنا لینے ہی کو ترجیح دی تھی۔

"مشرق میں اسے برا نہیں سمجھا جاتا۔" وہ آخر میں بولا۔ "میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو ہر صبح کپڑے تبدیل کرنے کے ساتھ اپنا نام بھی بدل لیتے ہیں۔"

آندرے نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس کے لیے یہ بات اگرچہ کسی لطیفے سے کم ثابت نہیں ہوئی تھی لیکن وہ چارلس کی بات پر یقین لے آیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ چونکہ یہ بات اس کے بھائی نے کہی تھی، اس لیے اس کی صداقت میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔

"ہیلن کا کیا معاملہ ہے؟" آندرے نے ڈرتے ڈرتے وہ سوال بھی کر ہی ڈالا جس نے اسے پیرس میں بھی پریشان کر رکھا تھا۔

"وہ ذلیل!" چارلس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ "میں جسے دیوی سمجھا تھا وہ شیطان نکلی۔ وہ میری نرمی اور عدم موجودگی سے ناجائز فائدہ اٹھاتی رہی۔ میری بدنامی اور رسوائی کا باعث بن گئی تھی۔ ثبوت مل جانے کے بعد میں نے اسے ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے نکال دیا لیکن اب میں مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہوں تاکہ شوبھرا کو اپنی تحویل میں لے سکوں۔ میں اپنی بیٹی کو اس بدذات عورت کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔"

آندرے خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے ذہن میں اچانک یہ خیال ابھرا کہ ممکن ہے چارلس نے شوبھرا کے سلسلے میں مشورہ کرنے کے لیے ہی اسے استنبول بلایا ہو لیکن وہ اس سلسلے میں کوئی سوال کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ چارلس نے اس پر ایک عجیب سا سحر طاری کر رکھا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی غیر مرئی قوت اسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہو۔ وہ خاموش بیٹھا چارلس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کی نظریں کمرے میں بھٹکنے لگیں جہاں چاروں طرف انگریزی، فرانسیسی اور کئی مختلف زبانوں کے اخبارات بکھرے ہوئے تھے۔

چارلس اب موضوع بدل کر حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کر رہا تھا۔ واٹر گیٹ اسکینڈل، مشرقِ وسطیٰ میں ایک نئی جنگ کی تیاریاں، سوئس اسٹاک ایکسچینج میں سونے پر دباؤ اور دنیا کے مختلف ممالک کی کرنسی کے

تبادلے کی شرح وغیرہ۔ وہ ہر موضوع پر بڑا رواں تبصرہ کر رہا تھا اور آندرے حیرت سے منہ کھولے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ چارلس دنیا کے حالات سے اس قدر گہری واقفیت رکھتا ہوگا۔ وہ میز پر رکھی ہوئی روسی اور چینی زبانوں کی گرامر کی کتابوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں آجکل یہ دونوں زبانیں سیکھ رہا ہوں۔" چارلس نے اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے بتایا پھر بولا۔ "کیا تم فرانسیسی کے علاوہ کوئی اور زبان بھی بول سکتے ہو؟"

"ٹوٹی پھوٹی انگلش اور اطالوی زبان کے چند الفاظ۔" آندرے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میرے کاروبار میں زبان کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔" چارلس نے کہا۔ وہ خود فرانسیسی، انگریزی، جرمن، اسپینی، اطالوی اور ویتنامی زبانیں کسی اہلِ زبان ہی کی طرح بولتا تھا جبکہ یونانی، ہندی اور اردو میں بھی اسے شد بد حاصل تھی۔ "کوئی زبان سیکھنا زیادہ مشکل نہیں۔ بس صرف توجہ کی ضرورت ہے۔" اس نے فرش پر بکھری ہوئی کتابوں کی طرف اشارہ کیا جن میں نصابی اور کلاسیکی ادب دونوں قسم کی کتابیں شامل تھیں "یہ کتابیں میں اپنی معلومات کے اضافے اور ہوم ورک کے طور پر پڑھتا رہتا ہوں۔ جوزف کونارڈ، گراہم گرین اور سمرسٹ ماہم میرے پسندیدہ رائٹر ہیں۔"

ایک چھوٹی میز پر شطرنج دیکھ کر آندرے کو مزید حیرت ہوئی بساط اور مہرے سنگِ مرمر کے بنے ہوئے تھے۔ آندرے اپنے کالج کا بہترین شاطر سمجھا جاتا تھا شطرنج میں اس کی دلچسپی دیکھ کر چارلس نے میز اٹھا کر سامنے رکھ لی اور بازی شروع ہوگئی۔ ساتویں ہی منٹ پر آندرے کو شہ مات ہو چکی تھی۔

"کراٹے جانتے ہو؟" چارلس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں، مگر مجھے اس میں زیادہ مہارت حاصل نہیں ہے۔" آندرے نے جواب دیا۔ اسے حیرت تھی کہ چارلس اس کی زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں معلومات کیوں حاصل کر رہا تھا۔

"کیا تم کسی کو ناک آؤٹ کر سکتے ہو؟ میرا مطلب ہے کہ ضرورت پڑے تو کیا....." چارلس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"شاید۔" آندرے نے گردن ہلائی۔ "میں نے کراٹے کو ہمیشہ گیم کی حیثیت سے استعمال کیا ہے، ہتھیار کی حیثیت سے نہیں۔"

"میں اس فن میں تمہاری کارکردگی دیکھنا چاہتا ہوں۔" چارلس کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔ آندرے کے چہرے پر خوف کے ہلکے سے سائے تھے جبکہ چارلس کے چہرے پر درندگی تھی۔ اس وقت اسے دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ محض ایک کھیل کھیل رہا ہے۔ یہی لگتا تھا جیسے وہ اپنے بدترین دشمن کے سامنے کھڑا ہو۔ چند منٹ کے اندر اندر وہ آندرے کو ڈھیر کر چکا تھا پھر وہ خود دلشپت کے بل قالین پر لیٹ گیا۔

"اب تم میرے پیٹ پر کودو اور پوری قوت سے ٹھوکریں مارو۔"

"نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔" آندرے نے نفی میں سر ہلا دیا غالباً وہ بڑے بھائی کے رتبے کو ملحوظ رکھنا چاہتا تھا لیکن چارلس کے اصرار پر اسے ایسا کرنا پڑا۔ وہ اس کے پیٹ پر کودنے کے ساتھ ساتھ پوری قوت سے ٹھوکریں رسید کر رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی چٹان پر کود رہا ہو۔

"چند روز کی تربیت کے بعد تم بھی ایسی ہی قوت کے مالک بن جاؤ گے۔" چارلس کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

آندرے ہانپتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ استنبول ائیرپورٹ پر اترنے سے اب تک عجیب و غریب باتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ چارلس شروع ہی سے اس کا آئیڈیل تھا۔ تقریباً دس سال بعد اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ جس سے چند حیرت انگیز انکشافات ہوئے تھے۔ یہ کہ اس کا بھائی بہت دولتمند تھا اور دنیا کے حالات پر اس کی نظر بہت گہری تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے ایک فرضی نام اپنا رکھا تھا لیکن جو سوال اس کے ذہن کو سب سے زیادہ الجھائے ہوئے تھا وہ یہ تھا کہ چارلس کا بزنس کیا تھا اور اس نے اسے استنبول کیوں بلایا تھا؟ اس سلسلے میں وہ زیادہ دیر تک خاموش نہ رہ سکا۔ باتھ روم سے نکلنے کے بعد اس نے جب چارلس سے یہ سوال پوچھ ہی لیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہم ایک دو دن میں اس موضوع پر بات کریں گے۔ اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ تمہیں استنبول کی سیر کرالاؤں۔"

شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے وہ ہلٹن ہوٹل پہنچ گئے۔ ہوٹل کی لابی کسی بارونق بازار کا منظر پیش کر رہی تھی۔ قالین، ہیرے جواہرات اور نوادرات کی دکانوں پر ہوٹل میں قیام پذیر مہمانوں کا ہجوم سا تھا۔ خوبصورت، دولتمند غیر ملکی خواتین لابی میں ایک طرف سے دوسری طرف آتی جاتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ دونوں لابی کے مختلف حصوں میں ٹہلتے ہوئے ٹیرس میں آ گئے جہاں سے ایک طرف فاسفورس اور دوسری طرف شہر کی مساجد کے بلند مینار دلکش منظر پیش کر رہے تھے۔ چارلس اسے لے کر ہوٹل کے تہہ خانے میں واقع بار روم میں آ گیا۔ وہاں کچھ دیر رکنے کے بعد وہ دوسرے ہال میں پہنچ گئے جہاں ایک امریکن مغنیہ حلق پھاڑ پھاڑ کر کوئی مقامی گیت گانے کی کوشش کر رہی تھی دوسرے ہال میں کاسینو تھا جہاں میزیں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ خوبصورت لڑکیاں ایک میز سے دوسری میز پر آ جا رہی تھیں۔

"چند ہی روز پہلے میں نے یہاں ایک بڑی رقم جیتی تھی۔" چارلس

نے آندرے کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔ "مجھے مسلسل جیتتے دیکھ کر کاسینو کی انتظامیہ بری طرح بدحواس ہو گئی تھی۔ انہوں نے میری توجہ ہٹانے کے لیے میرے چاروں طرف خوبصورت لڑکیاں کھڑی کر دیں لیکن ان کا یہ حربہ بھی کامیاب نہ ہو سکا اور میں مسلسل جیتتا رہا۔"

اس گفتگو کے دوران آندرے نے محسوس کیا کہ کاسینو کے دو ایجنٹ بڑی خونخوار نگاہوں سے چارلس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جس سے آندرے کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ چارلس نے جو کچھ بھی کہا تھا اس میں کسی مبالغے سے کام نہیں لیا گیا تھا۔

وہ کاسینو سے نکل کر تنگ سی گلیوں میں ہوتے ہوئے ایک اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں آ گئے۔ چائے پینے کے دوران چارلس آس پاس کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ آندرے کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ پلک جھپکے بغیر چارلس کی طرف دیکھ رہا تھا جو کسی ماہرِ نفسیات کی طرح لوگوں کا نفسیاتی تجزیہ کر رہا تھا۔

"میرے کاروبار میں نفسیات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔" چارلس نے بتایا۔ "میں نفسیات کو ایک انتہائی مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہوں۔"

وہ تقریباً ایک گھنٹے تک بے تکان نفسیات کے موضوع پر بحث کرتا رہا، پھر موضوع تبدیل ہو گیا۔ "تمہیں یاد ہے میں نے فون پر کہا تھا کہ اس دنیا میں دو قسم کے انسان بستے ہیں۔ ایک وہ جو خطرات میں کود کر کامیابی حاصل کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو اپنے خول سے باہر نہیں نکلتے۔" چارلس نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "ہٹلر کے سوانح حیات کے مطالعہ سے پتا چلے گا کہ اس نے پے در پے کامیابیاں کس طرح حاصل کیں۔ وہ ایک جفت ساز کا بیٹا تھا جو بچپن میں محرومیوں کا شکار رہا لیکن وہ اپنے خول سے باہر نکل آیا اور آدھی سے زیادہ دنیا پر قابض ہو گیا۔ اس کے برعکس اس دنیا میں وہ لوگ بھی ہیں جو مقدر کا لکھا سمجھ کر اپنے خول سے باہر آنا پسند نہیں کرتے۔ وہ حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ دبتے چلے جاتے ہیں اور بالآخر خاموشی سے مر جاتے ہیں۔ دنیا ایسے لوگوں کو جلد ہی فراموش کر دیتی ہے۔ ایسے لوگ یہ نہیں سوچتے کہ زندگی انہیں فریب دے رہی ہے لیکن میرے خیال میں انسان اگر چاہے تو زندگی کا رخ بدل سکتا ہے۔ اگر تم میں جرأت و استقلال ہو تو تم اپنی تقدیر بدل سکتے ہو۔ کسی مناسب وقت پر میں تمہیں یہ ثابت کر دکھاؤں گا کہ تقدیر آدمی خود بناتا ہے۔"

زندگی کے اس فلسفے نے آندرے کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ چارلس کی باتوں سے وہ اپنے آپ میں ایک عجیب سی سنسنی محسوس کرنے لگا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ چارلس وہ انکشاف کرنے والا ہے جس کا وہ کئی روز سے منتظر تھا۔

اس رات وہ اپنے کمرے میں بھی اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ رات بیت رہی تھی۔ مشرق میں سرخی پھیلنے لگی تو چارلس اٹھ کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بلند عمارتوں کے اس پار سورج کا سرخ گولا نمودار ہو رہا تھا۔

"تم سمجھتے ہو کہ میں خود پسند ہوں۔" وہ آندرے کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ "یہ درست ہے کہ خود پسندی ایک اچھی صفت نہیں لیکن یہ میری زندگی کا ایک جز و بن چکی ہے۔ میں ایک مہم جو ہوں اور میری یہی خود پسندی مجھے آگے دھکیل رہی ہے۔ یہاں آؤ۔ میرے قریب۔"

آندرے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کے قریب اس کے پہلو میں جا کھڑا ہوا۔ دور شہر کے اس پار سڑک کا وہ چوراہا نظر آ رہا تھا، جسے دو برِاعظموں کا قیامِ اتصال کہا جا سکتا تھا۔

"مجھے تمہاری ضرورت ہے۔" چارلس اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "میرا ساتھ دے سکتے ہو؟"

چارلس نے یہی سوال دو مرتبہ فون پر بھی پوچھا تھا لیکن اس وقت آندرے کی قوتِ فیصلہ الجھن کا شکار ہو گئی تھی لیکن اس وقت کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"گڈ۔" چارلس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ "ہم کل ہی سے اپنا کام شروع کر دیں گے۔"

"کام شروع کر دیں گے؟ کیا مطلب؟" آندرے نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا کام بہت سیدھا سادا ہے۔" چارلس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "میں چور ہوں۔"

آندرے سکتے میں رہ گیا۔ اس کی نظریں چارلس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ چارلس اس کا رخسار تھپتھپاتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔

ناشتے کے فوراً ہی بعد آندرے کی تربیت شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے چارلس اسے شہر کے سب سے بڑے درزی کے پاس لے گیا جہاں آندرے کے لیے قیمتی ملبوسات کا آرڈر دیا گیا کیونکہ چارلس کے کہنے کے مطابق لباس کو بھی اس کے کاروبار میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس کے بعد چارلس نے اس کے سامنے اخبارات، میگزین اور سیاحت کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والے کتابچوں کا ڈھیر لگا دیا۔ آندرے کو ان سب باتوں میں مہارت حاصل کرنی تھی۔ دو دن بعد اس کے دماغ میں معلومات کا اتنا ذخیرہ ہو چکا تھا کہ وہ توپ کاپی میوزیم میں رکھے ہوئے قیمتی جواہرات سے لے کر استنبول کے گلی کوچوں تک کے بارے میں تفصیل سے بتا سکتا تھا۔ اس کے بعد جب وہ میدان میں اترا تو اسے اپنا کام زیادہ مشکل معلوم نہیں ہوا۔ اس کا کام شکار تلاش کرنا تھا۔

جب کوئی شخص سیاحت کے لیے کسی دوسرے ملک جاتا ہے تو زبان اور اجنبیت اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ بن جاتی ہے لیکن اگر انہیں پردیس میں کوئی ایسا شخص مل جائے جو نہ صرف خوش اخلاق ملنسار

اور ہمدرد ہو بلکہ ان کی زبان بھی روانی سے بول سکتا ہو تو وہ اس اجنبی ملک میں اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھتے اور خصوصاً کوئی فرانسیسی جب کسی سے اپنی زبان سنتا ہے تو وہ فوراً ہی اعتماد کر لیتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں فرانسیسی بولنے والا کوئی شخص دھوکا نہیں دے سکتا۔

خوبرو آندرے میں یہ تمام صفات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ وہ کسی ہوٹل، بار روم یا تفریح گاہ میں گھومتے ہوئے اپنے کسی شکار کا انتخاب کرتا۔ بات موسم سے شروع ہوتی اور چند منٹ کے اندر اندر وہ اس سے بے تکلف ہو جاتا۔ اس کی پسند، ناپسند اور اس کی بعض کمزوریوں سے واقفیت حاصل کرنے میں بھی آندرے کو چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے اور پھر اسے اپنے ساتھ شام گزارنے پر آمادہ کر لینا زیادہ مشکل ثابت نہ ہوتا۔ چارلس کے سکھائے ہوئے نفسیات کے سبق سے آندرے پورا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اگر اس کا شکار کوئی مرد ہوتا تو آندرے لڑکیوں کے تذکرے سے اسے اس طرح شیشے میں اتار لیتا کہ وہ اس کا گرویدہ ہو کر رہ جاتا۔ اگر کوئی عورت ہوتی تو آندرے اس کے حسن کی تعریفیں کرتے ہوئے نہ تھکتا۔ یہاں تک کہ وہ عورت اس کے سامنے پوری طرح بے بس ہو کر رہ جاتی۔ ابتدائی چند منٹوں میں اپنے شکار کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کے بعد آندرے انہیں ان کے ذوق کے مطابق تحریص و ترغیب دلاتا مثلاً وہ شہر کی ایسی دکانوں سے واقف تھا جہاں بازار سے پچاس فیصد رعایت پر قیمتی پتھر اور جواہرات مل سکتے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بہترین حشیش کہاں مل سکتی تھی اور ایسے جوئے خانوں سے بھی واقف تھا جہاں انتظامیہ کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لمبی رقمیں جیتی جا سکتی تھیں۔

چارلس اور آندرے اکثر ایک ساتھ شکار پر حملہ آور ہوتے۔ وہ اپنے آپ کو بہت بڑے بزنس مین سیاح ظاہر کر کے سیاحوں سے بے تکلف ہو جاتے جو بالآخر ان کی طرف سے رات کے کھانے کی دعوت قبول کر لینے میں کوئی ہرج نہ سمجھتے۔ کھانے کے دوران چارلس بڑی ہوشیاری سے مہمان کے کھانے یا مشروب میں خواب آور دوا ملا دیتا جس کے چند ہی منٹ بعد وہ انٹا غفیل ہو جاتا اور صبح جب اس کی آنکھ کھلتی تو وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا احمق تسلیم کر لیتا۔ اس کے سامان سے نقدی، پاسپورٹ اور ٹریولرز چیک وغیرہ غائب ہو چکے ہوتے تھے۔

چارلس نے ایک اچھے کاروباری کی طرح اس بزنس کے کچھ اصول بنا رکھے تھے جن پر وہ سختی سے کاربند تھا۔ اس کا پہلا اصول تو یہ تھا کہ ان وارداتوں میں پستول، چاقو یا منشیات وغیرہ استعمال نہیں کرتا تھا تاکہ بعد میں اس کے خلاف کسی قسم کا ثبوت مہیا نہ ہو سکے۔ منشیات کے بارے میں تو اس نے آندرے کو بھی سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ ایسی کوئی چیز نہ تو استعمال کی جائے اور نہ اپنے پاس رکھی جائے۔ شکار پھانسنے کے لیے اسے حشیش یا ہیروئن کا لالچ ضرور دیا جائے لیکن خود ان چیزوں کے قریب نہ پھٹکا جائے۔

آندرے یہ سن کر دہشت زدہ سا رہ گیا تھا کہ ہزاروں غیر ملکی سیاح منشیات کے استعمال، اور اسمگلنگ کے الزام میں استنبول سے لے کر سنگاپور تک کی جیلوں میں بھرے ہوئے ہیں۔

ہر روز صبح ناشتے سے پہلے تقریباً ایک گھنٹے تک دونوں بھائی کراٹے کی مشق کرتے اور ایک دوسرے کے پیٹ پر گھونسے برساتے۔ چند روز بعد آندرے وہ طاقت حاصل کر چکا تھا کہ اپنے سے کئی گنا طاقتور شخص کو پلک جھپکتے... میں ناک آؤٹ کر سکتا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ دنیا بھر کے سیاسی و غیر سیاسی حالات پر بحث کرتے جن میں عام معلومات بھی شامل تھیں مثلاً قبرص سے ایتھنز آمد و رفت کے لیے کون کون سے ذرائع استعمال کیے جا سکتے تھے۔ مراکو سے اسمگل ہونے والے چار ضرب چھ فٹ کے قالین کی استنبول میں کیا قیمت مل سکتی تھی؟ امریکا کے سرکاری ٹی وی کے خاص خاص پروگرام کون سے تھے؟ شاہ ایران سردیوں کی چھٹیاں کہاں گزارتا ہے؟ وغیرہ۔ رات کو چارلس کا زیادہ وقت ٹائم، نیوز ویک، ٹائمز آف لندن، واشنگٹن پوسٹ اور پیرس کے ہیرالڈ ٹریبیون جیسے اخبارات کے مطالعہ میں گزرتا تاکہ صبح آندرے کے سوالوں کا اطمینان بخش جواب دے سکے۔ وہ دونوں آپس میں بھی اب صرف انگریزی میں گفتگو کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آندرے بھی روانی سے انگریزی بولنے لگا۔

یہ انکشاف بھی آندرے کے لیے حیرت انگیز تھا کہ پائرے پریمیر اور ڈچ باڈی گارڈ، جو دوسرے ہوٹل میں مقیم تھے اور ہمہ وقت چارلس کے سگنل کے منتظر رہتے تھے، انکے علاوہ کچھ اور لوگ بھی چارلس کے پے رول پر تھے جن میں زیادہ تعداد نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں پر مشتمل تھی۔ یہ لڑکیاں کسی غیر ملکی سیاح کو پھانس کر چارلس کو اطلاع دے دیتیں چارلس فوراً پہنچ جاتا اور بالکل روایتی انداز میں کسی لڑکی کے پھانسے ہوئے شکار سے تعارف ہوتا۔ لڑکی درمیان سے نکل جاتی اور چارلس اسی رات اپنے شکار پر خواب آور دوا استعمال کر کے اسے اس کے اثاثے سے محروم کر دیتا۔ ان لڑکیوں میں بھی زیادہ تر فرانسیسی اور امریکن تھیں۔ یہ سب کی سب چارلس پر فریفتہ تھیں اور اس کے اشاروں پر ناچ رہی تھیں۔ آندرے کے لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ عورتوں کے لیے چارلس میں خاصی کشش تھی۔ کسی عورت سے متعارف ہونے کے چند منٹ بعد ہی چارلس نہایت آسانی سے اسے اپنے اشاروں پر ناچنے پر مجبور کر دیتا۔ اس سلسلے میں آندرے نے اپنی ڈائری میں ایک دلچسپ واقعہ بھی قلم بند کیا تھا۔

ان دنوں استنبول میں غیر ملکی سیاح کثیر تعداد میں آرہے تھے، ایک دن ایک ایسی لڑکی ان کی نظروں میں آگئی جو اگر کسی مقابلۂ حسن میں حصہ لیتی تو ملکۂ حسن کا خطاب حاصل کرنے میں اسے ذرا بھی دشواری پیش نہ آتی، وہ امریکی لڑکی بیس سال سے کچھ کم ہی تھی۔ وہ جس طرف سے بھی گزرتی،

لوگ اسے مڑ مڑ کر دیکھنے پر مجبور ہو جاتے۔ کچھ دل پھینک قسم کے لوگوں نے اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن لڑکی کا بوائے فرینڈ آڑے آیا اور لڑکی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے والے لوگ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ لڑکی کے بارے میں چارلس کی اطلاع یہ تھی کہ وہ اپنے بوائے فرینڈ سے شادی کرنے والی تھی اور اس کے سوا کسی اور کا خیال ذہن میں لانے کو تیار ہی نہیں تھی۔ چارلس نے دعویٰ کیا کہ وہ ان کا ملاپ نہیں ہونے دے گا۔

اسی روز چارلس اس لڑکی کے بوائے فرینڈ سے تعارف حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بیس سالہ ٹام شکاگو کا رہنے والا تھا اور ابھی تک اس نے زندگی کی کسی منزل کا تعین نہیں کیا تھا۔ اس رومانس ہی کو اس نے اپنا مقصدِ حیات بنا لیا تھا۔ چارلس نے جلد ہی معلوم کر لیا کہ ٹام اپنے قصبے میں ایک ایسا اسٹور کھولنے کے خواب دیکھ رہا تھا جس کے ساتھ ایک خوبصورت ریسٹورنٹ بھی ہو جس کے ہال میں وقت کے مشہور پوپ سنگرز کے نغمے گونجتے رہیں۔ چارلس نے فوراً اس کی تائید میں سر ہلا دیا۔ اس کے خیال میں اس سے بہتر اور کوئی بزنس ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی باتوں نے ٹام کو آسمان پر چڑھا دیا۔ چارلس نے اسے مشورہ دیا کہ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے تو شادی کا خیال فی الحال ذہن سے نکال دے۔ اس نے ترکی کے ایک گاؤں کا پتا بتاتے ہوئے کہا کہ وہاں قدیم نوادرات کوڑیوں کے مول بکتے ہیں اگر ٹام وہاں سے کچھ نوادرات لے آئے تو انہیں استنبول میں فروخت کر کے اتنا منافع حاصل کر سکتا ہے کہ امریکا میں اپنے مطلب کا اسٹور اور ریسٹورنٹ کھولنے کے لیے اسے مزید رقم کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

ٹام فوراً اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے دوسرے دن چارلس نے اپنی توجہ شیری کی طرف مبذول کر دی لیکن اس مرتبہ اس کی حکمتِ عملی کچھ اور تھی۔ اس نے شیری کو بتایا کہ اس کا دوست انتہائی غیر ذمہ دار، جواری اور منشیات کا عادی ہے۔ اگر اس کا بس چلے تو وہ شیری کو بھی جوئے میں داؤ پر لگانے سے نہیں چوکے گا۔ آندرے بھی اس وقت قریب ہی تھا۔ وہ خاموشی سے باتیں سنتا رہا۔ اسے کسی قسم کی مداخلت کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

شیری نے اس کی بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے خیال میں ٹام نہایت شریف لڑکا تھا۔ اس میں کوئی برائی نہیں تھی۔

"ٹام کے بارے میں تمہارا یہ موقف میرے لیے غیر متوقع نہیں ہے۔" چارلس نے کہا۔ "محبوب کی اچھائی اور برائی میں امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ایسی باتوں کو تو کوئی غیر جانبدار شخص ہی محسوس کر سکتا ہے۔ میرے خیال میں اب بھی وقت ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے تم اس سے اپنا دامن چھڑا لو۔ بھلا اس شخص پر کیا اعتماد کیا جا سکتا ہے جس نے اب تک اپنی زندگی کی کسی منزل کا تعین ہی نہ کیا ہو؟"

چارلس کی ان نپی تلی باتوں سے شیری کا ٹام پر یقین متزلزل ہونے لگا۔ اسے ٹام کی وہ چھوٹی چھوٹی کمزوریاں یاد آنے لگیں جنہیں وہ اب تک نظر انداز کرتی رہی تھی۔ چارلس نے شیری کی اس کیفیت سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ٹام کی ان کمزوریوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے لگا۔

کئی روز بعد ٹام جب چارلس کے بتائے ہوئے گاؤں سے خالی ہاتھ واپس لوٹا تو شیری کا بدلا ہوا رویہ دیکھ کر حیرت زدہ سا رہ گیا۔ شیری نے فوراً اعلان کر دیا کہ وہ شادی کے فیصلے پر نظر ثانی کرنا چاہتی ہے جس کے لیے ٹام کو انتظار کرنا پڑے گا۔ اب ٹام واقعی پریشان ہو کر رہ گیا لیکن وہ شیری پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈال سکتا تھا۔ دوسرے روز ٹام جب چارلس سے ملا تو چارلس نے اسے ایک نیا مشن سونپ دیا۔ مشن یہ تھا کہ ٹام نیلی مسجد کے گرد و نواح میں پڑے رہنے والے ہپیوں میں گھوم پھر کر یہ جائزہ لے کہ کن کن ہپیوں کی جیبوں کو ان کے پاسپورٹس اور ٹریولرز چیکس کے بوجھ سے ہلکا کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے چارلس نے اسے پچاس فیصد کمیشن کی پیشکش کی تھی۔ ٹام انتہائی فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتا ہوا اپنے اس نئے مشن پر روانہ ہو گیا۔

دوسری طرف شیری، چارلس کے اشاروں پر ناچ رہی تھی۔ عزت و ناموس کی اب اس کی نظروں میں کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ وہ چارلس کی ہدایات پر غیر ملکی مرد سیاحوں کو اپنے حسن کے جال میں پھانس لیتی۔ آدھی رات کے لگ بھگ جب اس کا شکار خواب آور گولیوں کے زیرِ اثر انٹا غفیل ہو چکا ہوتا تو چارلس بھی اطلاع پا کر وہاں پہنچ جاتا اور وہ دونوں نقدی، ٹریولرز چیکس اور پاسپورٹ لے کر رفوچکر ہو جاتے۔

آندرے اکثر سوچتا کہ وہ لوگ جن کا ماضی بے داغ تھا جنہوں نے کبھی کوئی معمولی سا جرم بھی نہیں کیا تھا، اس قدر آسانی سے چارلس کے جال میں کیوں پھنس جاتے تھے اور اس کے معمولی سے اشارے پر بڑے سے بڑے جرائم پر آمادہ کیوں ہو جاتے تھے؟

"وہ سب لوگ چارلس کے سامنے اس لیے گھٹنے ٹیک دیتے کہ وہ اسے چاہتے تھے۔" آندرے نے اپنی ڈائری میں لکھا۔ "مردوں کو چارلس میں ہر وہ چیز نظر آتی جس کا اپنے لیے وہ محض تصور ہی کر سکتے تھے۔ عورتیں اسے اپنا محبوب سمجھتیں۔ بہت کم عورتیں ایسی تھیں جو اس کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکی ہوں گی۔ اس کے علاوہ چارلس انہیں معقول معاوضہ ادا کرتا تھا۔ شیری جب استنبول سے روانہ ہوئی تو اس کے پرس میں تین ہزار ڈالر نقد اور کلائی پر دو ہزار ڈالر مالیت کی گھڑی موجود تھی۔ ٹام استنبول کی جیل میں تھا۔ اسے ایک ہپی کا پاسپورٹ اور ٹریولرز چیکس چرانے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کے بارے میں چارلس کا یہ تجزیہ درست ثابت ہوا تھا کہ ٹام کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی اپنی زندگی بھی

اپنے کنٹرول میں نہیں ہوتی۔"

۱۹۷۰ء کے آخر تک چارلس، آندرے اور اس کے ساتھی رہزنی اور ڈکیتی کی متعدد وارداتوں کا ارتکاب کرچکے تھے لیکن نتائج ان کے لیے زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھے۔ سب سے بڑی واردات میں اخراجات نکالنے کے بعد پندرہ سو ڈالر فی کس ان کے حصے میں آئے تھے۔ نومبر کے شروع ہی میں چارلس محسوس کرچکا تھا کہ استنبول میں سیاحوں کا سیزن اختتام پذیر ہونے کے باعث اس کا بزنس بھی مندا پڑ رہا تھا۔ پولیس کا اسے کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ واردات کے لیے وہ ایسے سیاحوں کا انتخاب کرتا تھا جن کے ویزے کی مدت ختم ہو رہی ہو اور وہ ایک دو دن میں واپس جانے والے ہوں۔ ایسے لوگوں کو لوٹنے کے بعد وہ لوگ چار چھ دن کے لیے غائب ہو جاتے اور اپنے کمروں سے اس وقت باہر نکلتے جب یقین ہو چکا ہوتا کہ لٹنے والا استنبول سے جا چکا ہوگا۔ اس کے بعد وہ کسی نئے شکار کی تلاش شروع کر دیتے۔

نومبر کے وسط میں ہلٹن ہوٹل کی لابی میں ٹہلتے ہوئے چارلس نے آندرے کو ایک طرف اشارہ کیا جہاں ایک امریکن جوڑا ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہا تھا۔ ان دونوں کی عمریں کسی طرح بھی ساٹھ سال سے کم نہیں تھیں۔ عورت کے جسم پر گھٹنوں تک منک کوٹ اور انگلیوں میں انگوٹھیوں کے ہیرے جگمگا رہے تھے۔ کانوں کے آویزوں میں بھی ہیرے جڑے ہوئے تھے جو اس کی گردن کی خفیف سی حرکت سے چمک اٹھتے۔ مرد کے جسم پر بھی قیمتی سوٹ اور انگلیوں میں طلائی انگوٹھیاں تھیں۔ انہیں دیکھ کر یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ ان کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ان کا شمار ایسے لوگوں میں کیا جا سکتا تھا جو اپنے کمرے سے نکلنے سے پہلے جیبیں نوٹوں سے بھر لیتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ بوڑھے تھے اور ان کے ساتھ کوئی باڈی گارڈ یا کوئی اور ساتھی نہیں تھا۔ وہ فل اور ایتھل تھے۔ دونوں میاں بیوی اپنی شادی کی چالیسویں سالگرہ کی خوشیاں منانے کے لیے دنیا کی سیاحت پر نکلے ہوئے تھے۔

دوسرے دن چارلس نے ان کی نگرانی شروع کر دی۔ وہ بازکی طرح ان کی ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے تھا اور جس وقت وہ دونوں ہوٹل کے ایک ملازم سے استنبول کے تفریحی مقامات کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر رہے تھے اس وقت چارلس بھی ان کے قریب ہی موجود تھا۔ وہ سیاحت سے متعلق ایک کتابچہ اپنے چہرے کے سامنے پھیلائے یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا جیسے وہ بھی اپنے لیے کوئی تفریحی پروگرام ترتیب دے رہا ہو۔ کچھ دیر بعد جب فل اور ایتھل لابی میں بیٹھے چائے پی رہے تھے تو چارلس بھی ان کے پیچھے ایک صوفے پر نیم دراز بڑے انہماک سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد دونوں میاں بیوی اٹھ گئے اور چوتھی منزل پر اپنے کمروں میں جانے کے لیے لفٹ کے سامنے پہنچے ہی تھے کہ ایک آواز سن کر رک گئے۔

"ایک منٹ پلیز۔"

انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ چارلس ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ سجائے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہی لفٹ میں داخل ہوگیا۔ اس نے یہی تاثر دیا تھا کہ وہ بھی اوپر کسی منزل پر اپنے کمرے میں جا رہا تھا لیکن چوتھی منزل پر لفٹ کے پہنچنے تک چارلس ان سے متعارف ہو کر اس حد تک بے تکلف ہو چکا تھا کہ فل اور ایتھل نے بلا جھجک اس کی مے نوشی کی دعوت قبول کر لی۔

"اگر میرا ایک کاروباری دوست بھی اس محفل میں شریک ہو تو آپ لوگوں کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟" چارلس مسکراتے ہوئے بولا۔

"اوہ، نہیں۔ بالکل نہیں۔" ایتھل نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

اس طرح آندرے بھی اس پارٹی میں شامل ہوگیا۔ چارلس اور آندرے ایک دوسرے کو فرضی ناموں سے مخاطب کر رہے تھے اور اپنے آپ کو امپورٹر ظاہر کر کے باتوں سے یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے تھے کہ غیر ممالک کی کرنسی کے لین دین کے سلسلے میں بھی انہیں حکومت کی طرف سے خصوصی اختیارات حاصل ہیں۔

دونوں بوڑھے میاں بیوی پہلے تو اپنے آپ کو احمق محسوس کرتے رہے پھر آہستہ آہستہ وہ بھی ان کی باتوں میں شریک ہو گئے۔ چارلس نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ [illegible] نوں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتے تھے۔ یہ کسی بدحواسی کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ان کی آپس کی اس محبت کا اظہار تھا جسے وہ چالیس سال سے نبھا رہے تھے۔ وہ جس موضوع پر بھی بات کرتے چارلس بڑی روانی سے بحث کرتا۔ فل اور ایتھل کو اعتراف [illegible] نا پڑا کہ ان کے مقابلے میں چارلس کے دلائل زیادہ ٹھوس اور وزنی تھے۔ ایتھل ایک ہائی اسکول کی ریٹائرڈ کونسلر تھی۔ ان کی شادی کو اگرچہ چالیس سال ہو چکے تھے لیکن اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ انہوں نے ایک کتا پال رکھا تھا جو ان دونوں کی چاہت کا مرکز تھا۔ وہ بار بار اس کتے کا ذکر کر رہی تھی۔ چارلس نے کتوں پر بھی ایک طویل تقریر کر ڈالی اور خصوصاً اس نسل کے کتوں کی تعریف میں تو زمین و آسمان کے قلابے ملا ڈالے جو ایتھل نے پالا تھا۔ ایتھل اس کتے کے انتخاب پر خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد چارلس انہیں لے کر ہوٹل سے باہر آگیا اور وہ چاروں ٹیکسی میں شہر کے مختلف علاقوں میں گھومتے ہوئے فاسفورس کے کنارے ایک ایسے ریسٹورنٹ میں آگئے جو اپنے آرکسٹرا کی وجہ سے خاصی شہرت رکھتا تھا۔ یہ استنبول کا واحد آرکسٹرا تھا جو دنیا کے ہر خطے کی موسیقی کی دھن بجا سکتا تھا۔ چارلس بہت دیر تک بوڑھی ایتھل کے ساتھ ڈانس فلور پر تھرکتا رہا۔ ایتھل کو خوش دیکھ کر فل کا چہرہ بھی خوشی سے دمک رہا تھا۔ جب بل دینے کا وقت آیا تو چارلس نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال دیا لیکن بوڑھا فل اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا اور جیب سے پرس نکال کر بل کی ادائیگی کرنے لگا۔ پرس میں ہزاروں ڈالر کی مالیت کے کرنسی نوٹ اور ٹریولرز چیک بھرے ہوئے تھے۔ چارلس اور آندرے نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن دوسرے ہی لمحے آندرے نے محسوس کیا تھا کہ چارلس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ کوئی بات تھی جو اسے پریشان کر رہی تھی۔

ہلٹن ہوٹل پہنچ کر ایتھل اور فل کے اپنے کمروں میں جانے سے پہلے چارلس نے الوداعی جام کی تجویز پیش کی جسے ان دونوں نے بخوشی قبول کر لیا۔ بار روم میں کونے کی ایک میز پر بیٹھے وہسکی کی چسکیاں لیتے ہوئے ایتھل خوب چہک رہی تھی۔ اس کے خیال میں یہ اس کی زندگی کی یادگار شام تھی جو اس نے دنیا کے تین خوبصورت ترین مردوں کے ساتھ تفریح کرتے ہوئے گزاری تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ چارلس ان کی آنکھ بچا کر ان کے گلاسوں میں ویلیم کی گولیاں ڈال چکا تھا۔ گلاسوں میں خواب آور گولیاں ڈالنے کے فوراً ہی بعد چارلس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ آندرے کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ چارلس اپنے شکار پر ویلیم کے استعمال میں بھی بڑی مہارت رکھتا تھا۔ وہ گولیوں کی مقدار کا تعین ان کی عمر اور صحت کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہی کرتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا شکار کتنے منٹ بعد غافل ہو جائے گا۔ وقت کے اس اندازے میں اسے کبھی دھوکا نہیں ہوا تھا۔ اس نے فل اور ایتھل کے گلاسوں میں ویلیم کی جتنی مقدار ڈالی تھی اس کے مطابق انہیں زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں نیند کی آغوش میں پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن وہ وقت آنے سے پہلے ہی چارلس کو انہیں ان کے کمرے میں پہنچا دینا تھا۔

آندرے گہری نظروں سے ان دونوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ ایسے حالات سے گزر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ویلیم کے استعمال کے کچھ ہی دیر بعد شکار اپنے آپ میں کچھ عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگتا تھا۔ سر پر بوجھ سا محسوس کر کے وہ سر کو بار بار جھٹکے دینے لگتا کہ شاید اس بوجھ سے نجات مل جائے پھر اس کی پلکیں بھاری ہونے لگتیں اور غنودگی اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ یہی وہ موقع ہوتا کہ انہیں ان کے کمروں میں پہنچا دیا جاتا لیکن اس وقت وہ قدرے مختلف صورتحال کا سامنا کر رہا تھا۔ پندرہ منٹ گزر چکے تھے اور بوڑھے فل اور ایتھل پر ابھی تک ویلیم کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوا تھا۔ اس کے برعکس وہ دونوں پوری طرح چاق و چوبند تھے اور چارلس کے مشورے کے باوجود وہ اس دلچسپ محفل کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں جانے کو تیار نہیں تھے۔ چند منٹ اور گزر گئے اور پھر ان دونوں کے چہروں پر وہ ردِعمل ظاہر ہونے لگا جس کا آندرے کو انتظار تھا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں الجھن سی تیر رہی تھی۔ ایک موقع پر ایتھل اپنے شوہر کی طرف جھکی اور پھر اس کا سر فل کے کندھے پر ٹک گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ فل کے چہرے کے تاثرات بھی بتا رہے تھے کہ وہ بھی چند ہی لمحوں میں اونگھنا شروع کر دے گا۔

"رات کافی ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے اب آپ لوگوں کو آرام کرنا چاہیے۔ اگر اجازت ہو تو ہم آپ کو کمرے تک پہنچا دیں۔" چارلس نے کہا۔

"ہاں، ضرور۔ میں بہت زیادہ تھکن محسوس کر رہا ہوں۔" فل کے لہجے میں نقاہت تھی۔

آندرے نے ایتھل کو بازو سے سہارا دے کر اٹھا دیا۔ وہ ابھی کچھ ہوش میں تھی۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے فل کا ہاتھ تھام لیا جو خود بھی اپنے آپ میں عجیب سی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ کمرے تک پہنچتے ہوئے اس کے حواس جواب دے چکے تھے۔ اگر چارلس پھرتی سے آگے بڑھ کر سہارا نہ دے دیتا تو وہ یقیناً ایتھل کو ساتھ لے کر راہداری میں ڈھیر ہو چکا ہوتا۔ آندرے نے فل کی جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور وہ دونوں انہیں لیے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔ چارلس نے فل کو بستر پر لٹا دیا۔ وہ پوری طرح دنیا و مافیہا سے غافل ہو چکا تھا۔ آندرے نے ایتھل کو اس کے پلنگ پر لٹایا تو اس نے آنکھیں کھول کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ان دونوں کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

چارلس اور آندرے نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ایک لمحے کے انتظار کے بعد آندرے نے آگے بڑھ کر فل کی جیب سے اس کا پرس نکال لیا۔ وہ پرس کھول کر اس میں بھرے ہوئے کرنسی نوٹوں اور ٹریولرز چیکس کا جائزہ لے رہا تھا کہ دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ دونوں اس طرح اچھل پڑے جیسے ان کے قریب ہی کوئی بم پھٹ پڑا ہو۔

آندرے کی آنکھوں میں خوف ابھر آیا لیکن چارلس کا چہرہ پُرسکون تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اُلجھن ضرور تھی لیکن اس کا خوف سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے بے ہوش فل اور ایتھل کی طرف دیکھا پھر آندرے کو اشارہ کرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس دوران دروازے پر دوسری مرتبہ دستک دی جا چکی تھی۔ آندرے بڑی پھرتی سے دروازے کی آڑ میں دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ فل کا بٹوہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا اور خوف و دہشت سے اس کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح تھرتھرا رہا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ ایسی خوفناک صورتحال کا سامنا کر رہا تھا۔

"ہیلو..... اوہ۔"

دروازہ کھلتے ہی ایک مردانہ آواز آندرے کی سماعت سے ٹکرائی۔ بولنے والے کے لہجے میں حیرت تھی اور شاید اس وجہ سے وہ جملہ بھی مکمل نہیں کر سکا تھا۔

"یس پلیز!" چارلس نے دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے اس شخص کے چہرے پر نظریں جما دیں جو چہرے سے کوئی یونانی لگ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں تازہ پھولوں کا ایک بڑا سا گلدستہ اٹھا رکھا تھا۔ چارلس کو دیکھ کر اس کے چہرے پر عجیب سی بدحواسی چھائی تھی اور وہ چارلس کے کندھے کے اوپر سے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن چارلس نے دروازہ چند انچ سے زیادہ نہیں کھولا تھا۔

"یس پلیز! کس سے ملنا ہے؟" چارلس نے پُرسکون لہجے میں کہتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مس لوڈینا۔" اجنبی کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ "شاید اس نے اپنا پروگرام بدل دیا ہے۔"

"تمہاری مس لوڈینا نے یقیناً اپنا پروگرام نہیں بدلا ہو گا بلکہ تم غلط دروازے پر آ گئے ہو۔"

اجنبی نے چونک کر دروازے کے اوپر پیتل کے چمکتے ہوئے نمبر کی طرف دیکھا اور پھر "سوری..... تھینک یو۔" کہتا ہوا تیزی سے دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

چارلس نے دروازہ بند کر کے آندرے کی طرف دیکھا جو دیوار سے چپکا، پیشانی سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔ پھر اس کی نظریں پلنگ کی طرف اٹھ گئیں جہاں فل اور ایتھل دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے تھے۔ چارلس کی آنکھوں کی الجھن کچھ اور بھی بڑھ گئی۔

آندرے نے فل کا بٹوہ اپنی جیب میں رکھا اور آگے بڑھ کر ایتھل کے ہینڈ بیگ کی تلاشی لینے لگا۔ وہ پاسپورٹ نکال ہی رہا تھا کہ چارلس نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے ہینڈ بیگ لے کر اسی جگہ رکھ دیا جہاں سے اٹھایا تھا پھر آندرے کی جیب سے فل کا بٹوہ نکال کر اسے دوبارہ فل کی جیب میں رکھا اور کچھ کہے بغیر آندرے کو اشارہ کرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ آندرے حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

"یہ دونوں بہت عظیم ہیں۔" چارلس نے راہداری میں چلتے ہوئے کہا۔ "میرے دل میں ان کے لیے بہت احترام ہے اور میں انہیں کوئی نقصان پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

دوسرے دن صبح سویرے چارلس نے فون پر دونوں میاں بیوی کی خیریت دریافت کی اور بتایا کہ وہ اپنے شوفر کو گاڑی اور مووی کیمرے دے کر بھیج رہا ہے تاکہ وہ دونوں استنبول میں اپنا آخری دن پوری طرح سیر و تفریح میں گزار سکیں۔

اسی رات استنبول ائیرپورٹ پر چارلس اور آندرے سے رخصت ہوتے ہوئے فل اور ایتھل کے دل ان کی محبت سے معمور تھے۔ ایتھل سوچ رہی تھی کہ اپنے وطن پہنچتے ہی وہ اپنے دوستوں سے بڑے فخریہ انداز میں ان دونوں کا تذکرہ کرے گی جو استنبول جیسے خطرناک شہر میں قدم قدم پر ان کے کام آئے تھے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ وہ خود تباہی کے دہانے سے لوٹ کر آئے تھے۔ انہیں ان کی محبت نے بچا لیا تھا۔ وہ جس طرح ایک دوسرے کے لیے چاہت کا اظہار کرتے رہے تھے اس نے چارلس جیسے لٹیرے کو بھی متاثر کر دیا تھا اور میاں بیوی کی یہی محبت ان کی زندگیوں کی ضامن بن گئی تھی۔

۱۰ نومبر کا دن ترکی کی تاریخ میں اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس روز جدید ترکی کا بانی کمال اتاترک پوری ترک قوم کو روتا ہوا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ کمال اتاترک کی برسی پورے ملک میں عقیدت و احترام سے منائی جاتی ہے۔ اس روز نہ صرف ترکی کا قومی پرچم سرنگوں رہتا ہے بلکہ تمام سینما ہال، شراب خانے اور تفریحی مقامات بند کر دیے جاتے ہیں۔ صبح سے شام تک مساجد میں تل دھرنے کو جگہ نہیں رہتی۔ لوگ گھروں میں بھی اس قسم کی تقریبات کا اہتمام کرتے ہیں جس میں ترکی کے بابائے قوم کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔

۱۰ نومبر ۱۹۷۳ء کو پیرس سے آنے والا ایک متوسط جوڑا استنبول ہلٹن میں داخل ہوا تو انہیں یہ جان کر سخت مایوسی ہوئی کہ کم از کم آج کے دن وہ استنبول میں کسی قسم کی تفریح سے لطف اندوز نہیں ہو سکیں گے۔ حالانکہ یہ بات انہیں پیرس سے روانگی سے پہلے ہی معلوم ہونا چاہیے تھی کہ آج کے دن ترکی میں کمال اتاترک کا سوگ منایا جاتا ہے، کیونکہ کچھ عرصہ قبل وہ دونوں استنبول میں رہ چکے تھے۔

اینٹن اور اس کی بیوی کرسٹا کا تعلق امریکہ سے تھا۔ عرصہ پہلے وہ الگ الگ سیاحوں کی حیثیت سے استنبول آئے تھے۔ ان کی پہلی ملاقات یہیں پر ہوئی تھی۔ چند ملاقاتوں ہی میں انہوں نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا اور جلد ہی رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ ایشیا

اور یورپ کے سنگم پر واقع یہ شہر انہیں کچھ زیادہ ہی پسند آگیا تھا۔ شادی کے بعد انہوں نے استنبول ہی میں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ کرسٹا کا تعلق امریکہ کے ایک غریب کاشتکار گھرانے سے تھا۔ اسے بچپن ہی سے نت نئے قسم کے کپڑے بنانے کا شوق رہا تھا۔ پہلے وہ اپنی گڑیوں کے لیے کپڑے تیار کرتی رہی پھر ذرا بڑی ہوئی تو اپنے اور قصبے کی دوسری لڑکیوں کے لیے بھی نئے نئے فیشن کے کپڑے سینے لگی۔ بچپن اور لڑکپن کا شوق شادی کے بعد استنبول میں اس کے کام آیا۔ کرسٹا اس فن سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ وہ دن بھر گھر میں بیٹھی ملبوسات تیار کرتی اور اینٹن بازار میں آواز لگا کر انہیں فروخت کرتا۔ کرسٹا کو ملبوسات کی سلائی اور ڈیزائننگ میں مہارت حاصل تھی تو اینٹن کو کاروباری تجربہ حاصل تھا۔ پہلے وہ بازاروں میں گھوم پھر کر کرسٹا کے تیار کردہ کپڑے فروخت کیا کرتا تھا پھر اس نے شہر کے سب سے بارونق بازار میں کیبن نما ایک چھوٹی سی دکان کھول لی۔ کہتے ہیں نیت صاف ہو تو منزل بھی قریب آجاتی ہے۔ گارمنٹس کے کاروبار میں ان دونوں نے بہت جلد نام پیدا کرلیا اور وہ اپنا تیار کردہ مال ایکسپورٹ بھی کرنے لگے۔ کرسٹا اب صرف اس چھوٹی سی گارمنٹس فیکٹری کی نگرانی کرتی جس میں بیسیوں ہنرمند کام کررہے تھے لیکن کچھ عرصہ بعد انہوں نے استنبول میں کاروبار بند کردیا اور دونوں پیرس منتقل ہوگئے۔ اس وقت وہ دونوں اپنی اپنی عمروں میں چالیس کے ہندسے کو چھو چکے تھے۔ پیرس میں بھی انہوں نے جلد ہی اپنی ساکھ قائم کرلی اور گارمنٹس انڈسٹریز میں ان کا نام جانا پہچانا نظر آنے لگا۔ رہائش کے لیے انہوں نے ایونیو واگرم کا انتخاب کیا تھا۔ وسیع وعریض اور عالیشان اپارٹمنٹ ان کی خوشحالی کی منہ بولتی تصویر تھا۔

وہ دونوں سال میں ایک مرتبہ اپنے پرانے دوستوں سے ملاقات کے لیے استنبول ضرور آتے جہاں ان کا قیام ہمیشہ ہلٹن ہی میں ہوتا۔ کرسٹا گھٹنوں تک کا منک کوٹ پہنے ہلٹن کی لابیوں میں ٹہلتی رہتی۔ اس کا جسم غیر ضروری طور پر پھیلتا جارہا تھا جس سے وہ خود بھی پریشان تھی۔ بالوں میں کہیں کہیں سفیدی چمکنے لگی تھی جسے چھپانے کے لیے وہ باقاعدگی سے ہیئر کلر استعمال کررہی تھی۔ اس کے برعکس اینٹن میں سوائے اس کے کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی کہ کے سر کے عین بیچ میں چندیا سی چمکنے لگی تھی، دبلا پتلا جسم، مسکراتا ہوا چہرہ اور انگلی میں ہیرے کی چمکتی دمکتی انگوٹھی۔

اس روز ہوٹل کے رجسٹر پر دستخط کرتے ہوئے اینٹن کچھ دیر کے لیے کاؤنٹر کلرک سے باتوں میں الجھ گیا تھا۔ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ وہ ایسے دن استنبول پہنچے تھے جب پوری قوم کمال اتا ترک کی برسی منا رہی تھی۔ وہ تو یہ سوچ کر پیرس سے چلا تھا کہ استنبول پہنچتے ہی کیسینو پر حملہ بول دے گا اور رات بھر جوا کھیلتا رہے گا لیکن سارا پروگرام گڑبڑ ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اینٹن نے اس خوشی کا اظہار بھی کیا تھا کہ کم از کم آج کے دن اس کی فضول خرچ بیوی بھی جواہرات کی دکانوں پر حملہ آور نہیں ہوسکے گی۔ ہوٹل کے کلرک سے باتیں کرتے ہوئے اینٹن نے اس شخص کی طرف قطعی توجہ نہیں دی تھی جو استقبالیہ کاؤنٹر کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھا بڑے انہماک سے سیاحت کے متعلق ایک کتابچے کا مطالعہ کررہا تھا۔ قیمتی سوٹ میں ملبوس اس شخص کے چہرے کے نقوش میں مشرقیت کا رنگ قدرے غالب تھا۔

اگلے دو دن بڑی مصروفیت میں گزرے لیکن اینٹن اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ ایک شخص سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اور پھر اس دن اینٹن جب اپنے کاروبار سے متعلق ایک پرانے دوست کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھا اسے بتا رہا تھا کہ اس نے خواتین کے ملبوسات کے سلسلے میں جاپان کی اس علاقے میں اجارہ داری ختم کرنے کے لیے ایک زبردست منصوبہ بنایا ہے تو دوسری میز پر ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ کوک کی چسکیاں لیتے ہوئے چارلس اس کے ایک ایک لفظ کو اپنے دماغ کے کمپیوٹر میں محفوظ کرتا جارہا تھا۔ اسی روز شام کو ہلٹن کی کافی شاپ میں بیٹھی ہوئی کرسٹا اپنی ایک دوست کو شکایتی لہجے میں بتا رہی تھی کہ اینٹن ہر سال پیرس سے ایک خطیر رقم لے کر آتا ہے جس کا بیشتر حصہ وہ جوئے کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے تو چارلس اس وقت بھی قریبی میز پر بیٹھا ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔

استنبول میں اینٹن کے قیام کے تیسرے دن چارلس نے بھی عملی قدم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ سب سے پہلے اس نے ہلٹن ہوٹل کا کمرہ نمبر چار سو دس ایک فرضی نام سے بک کروایا اور اپنی "کمپنی" کی میٹنگ طلب کرلی جس میں آندرے، ڈچ باڈی گارڈ وان ڈیم اور پائرے پریمیئر شامل تھے۔ اس پروجیکٹ میں چونکہ فی الحال کسی عورت کی ضرورت نہیں تھی اس لیے چارلس نے میٹنگ میں کسی عورت کو بلایا بھی نہیں تھا۔ میٹنگ کا روایتی افتتاح فن کراٹے کے مظاہرے سے ہوا۔ وہ آندرے کے ساتھ کچھ دیر تک کراٹے کے مختلف حربوں کا مظاہرہ کرتا رہا۔ چارلس کی کڑی ہدایات کے تحت کراٹے کی مشق اس کے ساتھیوں کے روزمرہ کے معمولات میں شامل تھی کیونکہ کسی ہنگامی صورتِ حال میں اسی فن کو دفاعی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ چارلس کا حکم تھا کہ کسی مشن کے دوران وہ کسی قسم کا ہتھیار اپنے پاس نہ رکھیں بصورتِ دیگر انہیں سخت ترین سزا دی جائے گی۔

کراٹے کے مظاہرے کے بعد چارلس نے اپنے ساتھیوں کو ایک نئے پروجیکٹ کی خوشخبری سنائی اور بتایا کہ چونکہ سیاحوں کا سیزن ختم ہورہا ہے اس لیے استنبول میں یہ ان کا آخری کاروباری مشن ہوگا۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہوگئے، جس کا اسے سو فیصد یقین تھا، تو وہ لوگ لمبی چھٹیاں منانے کے لیے استنبول سے غائب ہوجائیں گے۔ چارلس کا خیال تھا کہ استنبول میں اس آخری آپریشن کی کامیابی کے بعد ان میں سے ہر ایک کے حصے میں اتنی رقم آجائے گی کہ وہ کم از کم چھ مہینے آرام و سکون سے گزار سکیں گے۔ اس نے اپنے منصوبے کی تفصیلات بتاتے ہوئے ہر ایک کو اس کا کردار سمجھا دیا۔ مطمئن ہونے کے بعد اس نے تینوں کو ان کے نئے مشنوں پر رخصت کردیا۔ آندرے کو نقلی پستول خریدنے تھے، وان ڈیم کو استنبول میں کوئی ایسا پریس تلاش کرنا تھا جو فوری طور پر ان کے معیار کے مطابق جاپانی زبان میں وزٹنگ کارڈ تیار کرسکے۔ پائرے پریمیئر کو مشرق بعید میں ٹیکسٹائلز اور گارمنٹس کی صنعت سے متعلق معلوماتی لٹریچر کی تلاش میں بھیجا گیا تھا اور ہر ایک کو سختی سے ہدایت کردی گئی تھی کہ وہ شام سے پہلے پہلے لوٹ آئیں تاکہ کیسینو کھلنے کے ساتھ ہی وہ اپنی کارروائی کا آغاز کردیں۔

کیسینو کی وہ رات اینٹن کے لیے خاصی مہربان ثابت ہوئی تھی۔ تاش کی میز پر پتے اس کے حق میں گرتے رہے۔ اس رات اس نے پچیس ہزار ترکی لیرا (تقریباً پانچ ہزار ڈالر) جیتے تھے۔ جس سے اس کا موڈ خاصا خوشگوار ہورہا تھا۔ اس سے تیسری میز پر بیٹھا ہوا قدرے مشرقی نقوش کا مالک وہ شخص اینٹن کے برعکس اس لحاظ سے واقعی بدقسمت ثابت ہورہا تھا کہ اب تک اس نے کوئی بازی بھی نہیں جیتی تھی۔ ہارنے والی رقم اگرچہ زیادہ نہیں تھی لیکن وہ ہر بازی ہار رہا تھا۔ کچھ دیر سستانے کے خیال سے اینٹن نے جوئے کی میز چھوڑ دی اور بار کاؤنٹر پر پہنچ کر وِھسکی کے گھونٹ بھرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اینٹن نے مشرقی نقوش والے اس نوجوان کو بھی میز سے اٹھ کر بار کاؤنٹر کی طرف آتے دیکھا جو غالباً جوئے میں اپنا سب کچھ ہار چکا تھا۔ اینٹن دل ہی دل میں اس کے لیے ہمدردی محسوس کرنے لگا۔ وہ نوجوان بھی اس کے قریب ہی دوسرے اسٹول پر ٹِک گیا۔ اینٹن اس کی ہار پر ہمدردی ظاہر کرنے لگا جس کے لیے اس نے انگریزی کا سہارا لیا تھا جس کا جواب اس نوجوان نے فرانسیسی زبان میں دیا۔

"اوہ، تم فرانسیسی زبان بول سکتے ہو۔" اینٹن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے پیرس سے ہزاروں میل دور ایک اجنبی شہر میں فرانسیسی زبان سن کر واقعی خوشی ہوئی تھی۔

"میرا تعلق جاپان سے ہے۔" چارلس نے اوکاڈا کے نام سے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا "لیکن میری زندگی کا بیشتر حصہ پیرس میں بسر ہوا ہے۔" اس نے جیب سے خوبصورت وزٹنگ کارڈ نکال کر اینٹن کی طرف بڑھا دیا۔ جواب میں اینٹن نے بھی اسے اپنا کارڈ تھما دیا۔

وہ دونوں پیرس کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ گفتگو جوئے سے ہوتی ہوئی کاروباری موضوع پر پہنچ گئی۔ چارلس نے انکشاف کیا کہ وہ سرمایہ کاری کونسلر ہے جو پیرس میں سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہے۔ وہ پیرس کی ریڈی میڈ گارمنٹس انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے صنعتکاروں سے مذاکرات کے سلسلے میں پیرس جارہا تھا کہ چند روز کے لیے استنبول رک گیا۔ چارلس کا یہ انکشاف اینٹن کے لیے حیرت انگیز تھا۔ وہ اس اتفاق کو اپنی خوش قسمتی ہی سمجھتا تھا کہ ایک جاپانی سرمایہ کار اس سے ٹکرا گیا تھا۔ جبکہ وہ خود بھی کئی روز سے اس سلسلے میں سوچ رہا تھا۔

گفتگو کے دوران اوکاڈا نے بتایا کہ جاپان کے ملبوسات کی صنعت اب دم توڑ رہی ہے۔ جاپانی خواتین اپنے ملک میں تیار ہونے والے ایک ہی قسم کے ملبوسات سے بیزاری کی حد تک اکتا چکی ہیں۔ اب وہ ہندوستان میں تیار ہونے والے ملبوسات کی طرف مائل ہیں۔ جو اگرچہ انتہائی گھٹیا میٹریل سے تیار کیے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود نہ صرف جاپان بلکہ امریکہ میں بھی ان کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ اوکاڈا کا فرانس جانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اس صنعت میں سرمایہ کاری کرکے فرانس سے جاپان کو مال ایکسپورٹ کرتا رہے۔ صرف وہی نہیں، جاپان کا ایک اور سرمایہ کار بھی، جس نے الیکٹرونکس کی صنعت میں بہت کمایا ہے، اسی مقصد کے لیے پیرس جارہا تھا اور اتفاق سے یہ دوسرا جاپانی سرمایہ کار بھی ان دنوں اسی ہوٹل میں مقیم تھا۔ اینٹن کے لیے اس کی باتیں حیرت انگیز تھیں۔ وہ اس علاقے میں جاپانی ملبوسات کی اجارہ داری ختم کرنا چاہتا تھا اور اب اسے براہِ راست جاپان پر یلغار کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ صحیح طریقے سے اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہوگیا تو جاپان میں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ سکتا ہے۔ وہ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھ رہا تھا کہ اوکاڈا سے اس کی ملاقات ہوگئی تھی جو فرانس میں سرمایہ کاری کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ نہ صرف اوکاڈا بلکہ ایک اور جاپانی سرمایہ کار بھی اسی ہوٹل میں مقیم تھا۔ اوکاڈا کے کہنے کے مطابق سینتو نامی وہ دوسرا جاپانی سرمایہ کار بہت کم اپنے کمرے سے باہر نکلتا تھا۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے ہی میں لوگوں سے ملاقات کرتا تھا۔ لیکن چونکہ سینتو کا شمار جاپان کے چوٹی کے چند صنعتکاروں میں ہوتا تھا اسلیے اس سے ملاقات بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ لیکن اوکاڈا نے وعدہ کیا کہ اینٹن اگر پسند کرے تو وہ سینتو سے ملاقات کے لیے وقت لے سکتا ہے۔ اینٹن کے دل کی دھڑکن تیز تر ہورہی تھی اور پھر اس کی وہ رات بھی بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے ہی گزری۔ جوئے میں شاندار جیت اور اوکاڈا سے اتفاقی ملاقات۔ اس کے خیال میں یہ اتفاق اس کی قسمت بدل سکتا تھا۔

دوسرا دن بھی اسی بے چینی میں گزارا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد لابی میں اوکاڈا سے آمنا سامنا ہوگیا۔ وہ ایک ضروری کام سے کہیں جارہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ مسٹر سینتو سے ملاقات کا وقت لینے کی

کوشش کر رہا ہے، شاید یہ ملاقات آج ہی رات ہو جائے۔

رات دس بجے اینٹن اور کرسٹا ڈنر کے لیے کمرے سے باہر نکلنے ہی والے تھے کہ فون کی گھنٹی نے ان کے قدم روک لیے۔ اینٹن نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف اوکاڈا تھا۔

"یہ تمہاری خوش قسمتی ہے مسٹر اینٹن کہ مسٹر سیتو اپنی مصروفیات کے باوجود تمہیں چند منٹ دینے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم اپنی دیگر تمام مصروفیات منسوخ کر کے کیسینو پہنچ جاؤ۔"

اینٹن کا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔ اس نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا اور کرسٹا سے معذرت چاہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد کرسٹا کو کمرے ہی میں کھانا منگوانا پڑا تھا۔

کیسینو میں داخل ہوتے ہی اینٹن نے اوکاڈا کو دیکھ لیا جو اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اضطراب اس کے چہرے سے نمایاں تھا لیکن اسے تنہا دیکھ کر اینٹن کو کسی حد تک مایوسی ہوئی تھی۔ قریب پہنچنے پر اوکاڈا نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور ایک بار پھر گھڑی دیکھتے ہوئے معذرت آمیز لہجے میں بولا۔

"مجھے افسوس ہے کہ مسٹر سیتو ابھی تک نہیں آئے۔ وہ شاید اپنے ملاقاتیوں کو انتظار کرانا کچھ زیادہ ہی پسند کرتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں، چند منٹ انتظار کر لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔" اینٹن نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے خیال میں یہ دنیا بھر کے دولتمندوں کا وطیرہ تھا کہ اپنے ملاقاتیوں کو بعض اوقات گھنٹوں انتظار کی اذیت میں مبتلا رکھتے تھے۔

آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ اوکاڈا کے ساتھ اب اینٹن بھی بے چینی سے بار بار کرسی پر پہلو بدل رہا تھا۔ اوکاڈا ہر چند منٹ بعد ندامت کا اظہار کر رہا تھا کہ مسٹر سیتو نے ایک شریف آدمی کو بلاوجہ انتظار کے کرب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ پھر وہ اٹھ کر کاؤنٹر پر چلا گیا اور فون پر نمبر ملا کر کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد واپس آ گیا۔

"فضا میں خنکی کی وجہ سے مسٹر سیتو طبیعت میں کچھ بوجھل پن سا محسوس کر رہے ہیں۔ انہوں نے انتظار کی اس زحمت پر معذرت کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ اگر آپ پسند کریں تو وہ اپنے کمرے ہی میں آپ کو خوش آمدید کہیں گے۔" اوکاڈا نے بتایا۔

"میرا خیال ہے یہ مناسب بھی رہے گا۔ کیسینو کے اس شور و غل میں ڈھنگ کی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔" اینٹن نے کہتے ہوئے کرسی چھوڑ دی۔

کمرہ نمبر چار سو دس خالی تھا البتہ اس قسم کے آثار نظر آ رہے تھے کہ کچھ دیر پہلے یہاں کوئی موجود تھا۔ اس کمرے کو دیکھ کر یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ کوئی کروڑپتی جاپانی یہاں رہائش اختیار کر سکتا ہے۔ اینٹن کی آنکھوں میں الجھن دیکھ کر اوکاڈا فوراً ہی صورتحال کی وضاحت کرنے لگا۔

"یہ کمرہ مسٹر سیتو نے دراصل اپنے کاروباری ملاقاتیوں کے لیے لے رکھا ہے کیونکہ وہ اپنے رہائشی کمرے میں کسی قسم کی کاروباری گفتگو کو پسند نہیں کرتے۔ آپ سمجھتے ہیں نا، کچھ لوگ اپنے لیے چند اصول بنا لیتے ہیں اور بڑی سختی سے ان پر کاربند رہتے ہیں۔" اوکاڈا نے کہتے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کر ہوٹل کی روم سروس کو کافی کا آرڈر دیا اور پیرس کے بارے میں گفتگو چھیڑ دی۔

کافی آ گئی۔ اینٹن نے چند گھونٹ بھرنے کے بعد کپ میز پر رکھ دیا اور کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر شہر کی جگمگاتی ہوئی روشنیوں کا نظارہ کرنے لگا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چارلس نے ویلیم کی اچھی خاصی مقدار اس کی کافی میں ملا دی۔ اینٹن نے کافی میں شکر زیادہ ملائی تھی اس لیے چارلس کو یقین تھا کہ وہ خواب آور گولیوں کی وجہ سے کافی کا بدلا ہوا ذائقہ محسوس نہیں کر سکے گا۔ چند منٹ کھڑکی کے سامنے کھڑے رہنے کے بعد اینٹن واپس آ گیا اور کسی قسم کا ردِعمل ظاہر کیے بغیر کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ اس نے واقعی گولیوں کا ذائقہ محسوس نہیں کیا تھا۔

"بہت دیر ہو چکی۔ میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔" اینٹن بالآخر اکتا کر جانے کے لیے اٹھ گیا۔

"یہ واقعی مسٹر سیتو کی زیادتی ہے۔" چارلس گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "اتنا وقت ضائع کیا ہے تو میرے خیال میں چند منٹ اور انتظار کر لیتے ہیں۔"

اینٹن گہرا سانس لیتا ہوا دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور بار بار دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ اوکاڈا کی نظریں اینٹن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں لیکن ابھی تک کسی ردِعمل کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ وہ بار بار کرسی پر پہلو بدل رہا تھا، کبھی انگلیوں سے کرسی کے ہتھے پر طبلہ بجانے لگتا۔ وہ پوری طرح چاق و چوبند نظر آ رہا تھا جس پر اوکاڈا کو شدید حیرت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ اس کی کافی میں جتنی گولیاں ملا چکا تھا، وہ اینٹن جیسے چار آدمیوں کو اس سے بھی نصف وقت میں گہری نیند سلا دینے کے لیے کافی تھیں لیکن اینٹن پر ان گولیوں نے ابھی تک کوئی اثر نہیں کیا تھا۔

"بس بہت ہو چکی۔" اینٹن کہتا ہوا ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس جاپانی صنعتکار نے اسے واقعی بور کیا تھا اور اپنی شام کی بربادی پر اسے افسوس ہو رہا تھا۔ "میں کیسینو میں ہوں۔ اگر اس دوران مسٹر سیتو آ جائے اور ملاقات پسند کرے تو مجھے کیسینو میں اطلاع کر دینا۔"

"یہ تو واقعی بہت زیادتی ہے، مسٹر سیتو کو ایسی غیر ذمے داری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔" چارلس نے کہا اور پھر خود ہی سیتو کی وکالت کرتے ہوئے بولا۔ "عین ممکن ہے کہ وہ جاپان سے کسی کال کا انتظار کر رہا ہو یا حساب لگا رہا ہو کہ آپ سے گفتگو میں کسی نتیجہ پر پہنچتے ہوئے اسے کتنی سرمایہ کاری کرنی چاہیے۔ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ چند منٹ اور ان کی راہ دیکھ لی جائے؟" لیکن اس مرتبہ اوکاڈا کا یہ حربہ کارگر ثابت نہیں ہوا کیونکہ اینٹن اس دوران دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ چکا تھا۔ "ایک منٹ پلیز!" اوکاڈا نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ "میں بھی آپ کے ساتھ نیچے چل رہا ہوں۔ بس ذرا باتھ روم ہو آؤں، چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ پھر ہم اکٹھے ہی چلیں گے۔"

اینٹن رک گیا۔ اوکاڈا باتھ روم میں گھس گیا لیکن اس کے فوراً بعد دو آدمی ہاتھوں میں تکیے اٹھائے باتھ روم سے برآمد ہوئے۔ وہ آندرے اور وان ڈیم تھے۔ انہیں دیکھ کر اینٹن کی آنکھیں پھیل گئیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ صورتِ حال کو سمجھ سکتا یا مدد کے لیے چیخ سکتا، وہ دونوں چیل کی طرح اس پر جھپٹے۔ آناً فاناً اینٹن کو فرش پر گرا کر اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا گیا۔ اسی لمحہ چارلس بھی باتھ روم سے باہر آ گیا۔ اس نے مسٹر سیتو اور اوکاڈا والا ڈراما جاری رکھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اینٹن پر خواب آور گولیوں کا اثر نہ ہونے کی وجہ سے اس کے چہرے کے تاثرات بگڑے ہوئے تھے۔ اس نے جیب سے ایک لمبی سی سرنج نکالی اور سوئی اینٹن کے بازو میں پیوست کر کے سرنج میں بھرا ہوا تمام سیال اس کے جسم میں منتقل کر دیا۔ اس مرتبہ اینٹن کی آنکھیں بند ہونے میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

چارلس نے اس کی قیمتی گھڑی اتارنے کے علاوہ جیب سے ساری نقدی بھی نکال لی تھی۔ اسے غصّہ آ رہا تھا کہ اس وقت اینٹن کی انگلی میں ہیرے کی وہ انگوٹھی نہیں تھی جو اس نے پہلے روز دیکھی تھی۔ وہ انگوٹھی اس نے یا تو اپنے کمرے میں چھوڑ دی تھی یا اسے ہوٹل کے لاکر میں رکھوا دیا تھا۔ اس نے اینٹن کی جیب سے برآمد ہونے والی رقم گنی جو اس کی توقع سے بہت کم نکلی۔ اس پر اس کا پارہ کچھ اور بھی چڑھ گیا لیکن اسی لمحہ اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا اور وہ آندرے اور وان ڈیم کو اینٹن کی نگرانی کی ہدایت کرتا ہوا کمرے سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا لابی کی طرف چل دیا۔ ایک فون بوتھ میں گھس کر اس نے اینٹن کے کمرے کا نمبر ملایا اور جیسے ہی کرسٹا نے کال ریسیو کی وہ لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے بولا۔

"میں اوکاڈا بول رہا ہوں میڈم! آپ کے شوہر مسٹر اینٹن اور مسٹر سیتو کے مابین ایک بہت بڑا کاروباری معاملہ طے پا چکا ہے۔ مسٹر سیتو آپ کے شوہر کے بزنس کو ترقی دینے کے لیے کم از کم پچاس لاکھ ڈالر کا سرمایہ فراہم کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اس وقت سب لوگ لابی میں موجود ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ خوشی کے اس موقع پر آپ کی موجودگی ضروری ہے تاکہ آپ اپنے ہاتھوں سے اپنے شوہر اور مسٹر سیتو کو خوشی کا جام پیش کر سکیں۔ کیا آپ لابی تک آنے کی زحمت گوارہ کر سکتی ہیں میڈم؟"

"اوہ کیوں نہیں۔" کرسٹا کے لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ "میں چند منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔"

کرسٹا لابی میں داخل ہوئی تو اوکاڈا نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا اور جاپانیوں کے مخصوص انداز میں خم ہو کر تعظیم دیتے ہوئے بولا۔

"انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ صبح کا انتظار کرنے کے بجائے اسی وقت معاہدے کی دستاویز تیار کر کے دستخط کر دیے جائیں۔ وہ دونوں اس وقت مسٹر سیتو کے کمرے میں ہیں، جہاں میری اور آپ کی موجودگی بھی ضروری ہے تاکہ ہم گواہوں کی حیثیت سے دستخط کر سکیں۔ معاہدے کی تکمیل میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے، اس کے بعد خوشی کا جشن منایا جائے گا۔" اوکاڈا نے کہتے ہوئے لفٹ کی طرف اشارہ کیا۔

اوکاڈا کی دستک کے جواب میں جیسے ہی کمرہ نمبر چار سو دس کا دروازہ کھلا، کرسٹا کی نظریں کمرے کے فرش پر پڑے ہوئے اپنے شوہر پر جم گئیں۔ اس کی آنکھوں اور منہ پر ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتی، چارلس نے اسے پوری قوت سے کمرے میں دھکیل دیا۔ دوسرے ہی لمحہ وہ بھی اپنے شوہر کے برابر فرش پر پڑی تھی اور اس کے منہ پر بھی ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ چارلس نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھا دیا۔ کرسٹا دہشت زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی دونوں ہتھیلیاں بھی زمین پر ٹکی ہوئی تھیں۔ چارلس نے بڑی بے رحمی سے سرنج کی سوئی اس کے بازو میں پیوست کر دی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ درندگی تھی۔ سوئی کھینچنے کے ساتھ ہی کرسٹا اپنے شوہر کے پہلو میں فرش پر لڑھک گئی۔

چارلس نے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے انگوٹھیاں نکال کر اپنی جیب میں ڈال لیں اور کرسٹا کا ہینڈ بیگ آندرے کی طرف اچھالتا ہوا ایک بار پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ کرسٹا اور اینٹن کے پاسپورٹ، ان کی تمام تر نقدی، ٹریولرز چیک اور میز کی دراز میں رکھی ہوئی ایک اور قیمتی گھڑی بھی اس کی جیب میں پہنچ چکی تھی۔

پو پھٹنے سے پہلے چارلس، آندرے اور ان کے دونوں ساتھی کمرہ نمبر چار سو دس سے نکل گئے۔ اینٹن اور کرسٹا کمرے کے فرش پر خواب آور گولیوں کے زیرِ اثر گہری نیند میں تھے۔ چارلس نے دروازے پر "ڈونٹ ڈسٹرب" کا کارڈ آویزاں کر دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ صبح دس گیارہ بجے سے پہلے انہیں ہوش نہیں آئے گا اور وہ اس وقت تک استنبول چھوڑ چکے ہوں گے۔ چارلس کو اس پروجیکٹ میں پچاس ساٹھ ہزار ڈالر کی توقع تھی لیکن ہاتھ آنے والی رقم

بیس ہزار ڈالر سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے خیال میں یہ مشن ایسا ناکام بھی ثابت نہیں ہوا تھا کہ تاسف کا اظہار کیا جاتا۔ وان ڈیم اور پائرے برنیئر کو ان کا حصہ دے کر رخصت کر دیا گیا اور انہیں ہدایت کر دی گئی کہ وہ اپنے خفیہ ٹھکانوں پر موجود رہیں تاکہ چند ہفتوں کے آرام کے بعد دوبارہ ان کی خدمات حاصل کی جاسکیں۔ چارلس کا خیال تھا کہ اس مرتبہ وہ روم پر حملہ آور ہوں گے۔

ٹیکسی پر ایئرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے چارلس، ڈرائیور پر برس پڑا کیونکہ اس کے خیال میں ڈرائیور کرایہ بڑھانے کے لیے جان بوجھ کر لمبا راستہ اختیار کر رہا تھا ممکن ہے وہ ڈرائیور پر ہاتھ بھی چھوڑ بیٹھتا مگر آندرے نے اسے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دیا۔ ایئرپورٹ پہنچ کر چارلس نے جیب سے پانچ ہزار فرانک کے نوٹ نکال کر آندرے کے ہاتھ میں تھما دیے۔

"اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہمارے لیے رقم کا حصول کس قدر آسان ہے۔ میری ایک بات ذہن نشین کر لو۔ ہمیشہ اس درخت کا انتخاب کرنا چاہیے جس کا پھل پک چکا ہو۔ پکا ہوا پھل توڑنا آسان ہوتا ہے۔"

آندرے نے اگرچہ تائید میں گردن ہلا دی تھی لیکن ایئرپورٹ اور پھر پورے ہوائی سفر کے دوران وہ ایک ایک چہرے کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اسے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ قریب سے گزرنے والا کوئی شخص کسی بھی وقت ان پر ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ اس کے برعکس چارلس پورے اطمینان اور سکون سے بیٹھا مستقبل کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آندرے اس کو ہانگ کانگ کے کسی کالج میں داخلہ دلا دے گا تاکہ وہ ماسٹر کی ڈگری حاصل کر سکے۔ چونکہ آندرے کا پولیس میں کوئی ریکارڈ نہیں تھا، اسی لیے اسے جوئے خانے اور شراب خانے کا لائسنس بھی آسانی سے مل سکتا تھا۔ چارلس دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں اپنے کیسینو اور بار کا خواب اکثر دیکھا کرتا تھا۔ اس کے لیے وہ شروع ہی سے کسی قابلِ اعتماد مددگار کی ضرورت محسوس کرتا رہا تھا اور اسے خوشی تھی کہ اس کا بھائی اب اس کے ساتھ ہے۔ اس کا منصوبہ تو یہ تھا کہ اپنے تمام سوتیلے بہن بھائیوں کو اپنی اس تنظیم میں شامل کرے گا جو دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں اس کے جوئے خانوں اور نائٹ کلبوں کو کنٹرول کرے گی۔ اس نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ اس کی ماں سونگ اگر اپنے معذور فرانسیسی شوہر کو چھوڑنے پر تیار ہو جائے تو وہ اسے بھی مارسلز میں ایک اعلیٰ درجے کا نائٹ کلب کھول کر دے سکتا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ اس طرح میرے تمام بہن بھائی مجھ سے محبت کرنے لگیں گے۔" چارلس نے کہتے ہوئے آندرے کی طرف دیکھا۔

"میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

آندرے نے خاموشی سے تائید میں گردن ہلا دی جبکہ اپنے بارے میں اس کا خیال تھا کہ بھائی کی محبت نے نہیں، کسی شیطانی قوت نے انہیں یکجا کر دیا تھا۔

استنبول میں قیام پذیر کرسٹا کی بہن نے انہیں دوپہر کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب وہ انہیں لینے کے لیے خود ہلٹن پہنچ گئی۔ دو تین دفعہ گھنٹی دبانے کے بعد بھی دروازہ نہ کھلا تو وہ نیچے لابی میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ آدھے گھنٹے بعد اس نے کرسٹا کے کمرے میں فون کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی تب اسے تشویش پیدا ہوئی کہ دونوں میاں بیوی کہاں غائب ہو گئے حالانکہ یہ پروگرام پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ وہ ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ انہیں لینے کے لیے ہوٹل پہنچ جائے گی۔ اور اب بلا اطلاع کہیں غائب ہو جانے والی بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ انہوں نے استقبالیہ کاؤنٹر پر اس کے لیے کوئی پیغام بھی نہیں چھوڑا تھا۔ مزید ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد کرسٹا کی بہن کو تشویش لاحق ہو گئی۔ اس نے انتظامیہ کو صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے اصرار کیا کہ ان کے کمرے کا دروازہ کھولا جائے۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے دروازہ کھولا تو کمرہ خالی تھا۔ اس کے فوراً ہی بعد پولیس کو کرسٹا اور اینٹن کی پُراسرار گمشدگی کی اطلاع کر دی گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد پورے شہر میں ان کی تلاش شروع ہو گئی۔

اس واقعہ کے تقریباً چھتیس گھنٹے بعد ہوٹل کے کمروں کی صفائی کرنے والی ایک ملازمہ نے کاؤنٹر پر اطلاع دی کہ کمرہ نمبر چار سو دس کے دروازے کے ہینڈل پر گزشتہ دو دن سے "ڈو ناٹ ڈسٹرب" کا کارڈ آویزاں ہے۔ فوراً ہی اس کمرے کا دروازہ کھولا گیا۔ کرسٹا اور اینٹن کمرے کے فرش پر بے ہوشی کی حالت میں پڑے ہوئے ملے۔ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے اور ہونٹوں پر ٹیپ چپکے ہوئے تھے۔ انہیں فوری طور پر اسپتال پہنچا دیا گیا جہاں ڈاکٹر انتھک کوشش کے بعد ان کی جانیں بچانے میں کامیاب ہو سکے۔ ہوش میں آنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ کس طرح مسٹر اوکاڈا نامی ایک جاپانی تاجر نے انہیں بے ہوش کر کے لوٹا تھا۔

اس دوران جاپانی تاجر اوکاڈا اپنی شناخت تبدیل کر چکا تھا۔ چارلس نے اینٹن کے فرانسیسی پاسپورٹ پر اپنی تصویر لگا کر اسے بڑی کامیابی سے استعمال کیا تھا۔ اس پاسپورٹ پر یونان میں داخل ہونے میں اسے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

ایتھنز کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے چارلس سوچ رہا تھا کہ وہ یہاں چند روز آرام کریں گے اور مکمل یکسوئی سے مستقبل کی منصوبہ بندی کے بعد ہی کوئی نیا قدم اٹھائیں گے۔

چارلس دن بھر باتھ روم کے نیم گرم پانی کے ٹب میں بیٹھا چائے کی چسکیاں لیتا اور فلسفے کے موضوع پر مختلف کتابیں پڑھتا رہتا۔ آندرے نے محسوس کیا تھا کہ استنبول والی واردات کے اثرات ابھی تک چارلس کے ذہن سے پوری طرح محو نہیں ہوئے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ کسی بھی وقت گفتگو کے دوران اس واردات کا حوالہ نہیں دیا۔ یوں بھی اسے سختی سے ہدایت تھی کہ جب چارلس مطالعہ میں منہمک ہو تو اسے بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ آندرے، چارلس کو اس کے حال پر چھوڑ کر ایتھنز کی آوارہ گردی کرتا رہا۔ اس کی جیبیں گرم تھیں اور اس کا وقت ان شراب خانوں، ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں میں گزرتا جہاں صنفِ نازک کی بہتات ہوتی۔ تیسرے دن جب وہ ایک یونانی ویٹریس کے ساتھ دلچسپ شام گزارنے کے بعد اپنے کمرے میں داخل ہوا تو چارلس کو کسی نئے منصوبے کے تانے بانے بنتے دیکھ کر اسے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔

چارلس سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں اپنی بیٹی شوبھرا کو ہر قیمت پر اپنی تحویل میں لینا چاہتا تھا اور اس کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ وہ پیرس کے ایک وکیل کو مقدمہ لڑنے پر آمادہ کر چکا تھا اور اس نے اخراجات کا جو تخمینہ بنایا تھا اس سے چارلس کے ہوش اڑ گئے تھے۔ اس وقت اس کے پاس صرف دس ہزار ڈالر موجود تھے جو ظاہر ہے وکیل کے مطالبے سے بہت کم تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی شوبھرا اسے مل جائے اور اگر ممکن ہو تو ہیلن کو بھی کسی قانونی پیچیدگی میں الجھا کر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا جائے۔ ان تمام مقاصد کے حصول کے لیے اسے کم از کم مزید پندرہ بیس ہزار ڈالر کی ضرورت تھی اور وہ کسی جگہ بیٹھ کر جلد سے جلد یہ رقم جمع کر لینا چاہتا تھا۔

چارلس کے سامنے میز پر دنیا کا نقشہ پھیلا ہوا تھا۔ بہت سے ممالک پر سُرخ پنسل سے کراس کا نشان بنا ہوا تھا۔ یہ وہ ممالک تھے جہاں چارلس سوبھراج پولیس کو مطلوب تھا۔ ہانگ کانگ، ہندوستان پاکستان، افغانستان، ایران اور استنبول میں تو وہ قتل، رہزنی اور ڈکیتی کی کئی وارداتوں کے سلسلے میں مفرور قرار دیا جا چکا تھا اور ان ممالک کی پولیس بڑی سرگرمی سے اسے تلاش کر رہی تھی۔ فرانس بھی اس کے لیے علاقہ ممنوعہ بن چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی اسے آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا جائے گا۔

"میرے خیال میں آئندہ سرگرمیوں کے لیے یورپ سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔" آندرے نے تجویز پیش کی۔

"نہیں۔ یورپ کا رُخ کرنا بہت بڑی حماقت ہو گی۔" چارلس نے کہتے ہوئے نقشہ اٹھایا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گولا سا بنا کر کمرے کے ایک کونے میں رکھی ہوئی ردی کی ٹوکری میں اچھال دیا۔

"ہمارے لیے مشرق کا رُخ کرنا ہی مناسب رہے گا۔"

اس سلسلے میں چارلس کا موقف یہ تھا کہ وسیع و عریض مشرق کے بڑے بڑے شہروں میں وہ بلا خوف و خطر اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکتے تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنے چہروں کے مشرقی نقوش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو مشرق کے کسی بھی ملک میں کھپا سکتے تھے۔ جبکہ یورپ میں خطرات نسبتاً زیادہ تھے۔ مشرق کے مقابلے میں یورپی ممالک کی پولیس جرائم کی بیخ کنی کے لیے جدید ترین ٹیکنالوجی استعمال کر رہی تھی جرائم پیشہ افراد کو گرفت میں لینے کے لیے وہ لوگ سائنس سے بھرپور فائدہ اٹھا رہے تھے۔ کمپیوٹر کے ذریعے چند منٹ کے اندر اندر ملک بھر کی پولیس کو کسی مجرم کے بارے میں تفصیلات فراہم کی جاسکتی تھیں۔ مغربی ممالک کی پولیس کو رشوت پر آمادہ کر لینا بھی آسان نہیں تھا جبکہ مشرقی ممالک میں رشوت سے بڑے سے بڑے کام نکلوائے جاسکتے تھے۔ چارلس کے لیے اگرچہ مشرق میں بڑی کشش تھی لیکن اس کے باوجود وہ فی الحال ادھر کا رُخ کر کے کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ دوسرے دن وہ جنوبی امریکہ کا نقشہ لے آیا اور سارا دن اس کے مطالعہ میں مصروف رہا۔

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی چارلس تیار ہو کر اپنے ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ آندرے کو اس نے بتایا تھا کہ وہ شہر کا جائزہ لینے جا رہا ہے۔ وہ مختلف سڑکوں پر گھومتا ہوا ایتھنز ہلٹن میں نکل آیا جہاں اس کی ملاقات کلاسیکی ادب کے ایک ایسے جاپانی پروفیسر سے ہوئی جو سقراط کی اس سرزمین یونان کو سلامِ عقیدت پیش کرنے آیا تھا۔ تعارف کے بعد چارلس جلد ہی اس سے بے تکلف ہو گیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ وہ دنیا کا بہترین اداکار تھا۔ اپنے آپ کو ہر رنگ میں رنگ لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

"عجیب اتفاق ہے!" چارلس نے بڑی خوبصورتی سے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔ "میں بھی کلاسیکی ادب کا شیدائی ہوں اور وقتاً فوقتاً اس موضوع پر سوربون یونیورسٹی میں لیکچر دیتا رہتا ہوں۔ ان دنوں یونان کے قدیم کلاسیکی ادب پر ایک کتاب لکھنے کے سلسلے میں یہاں آیا ہوا ہوں۔"

جاپانی پروفیسر ینگاشی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ مخصوص جاپانی انداز میں جھک کر اپنے اس ادب پسند دوست کو تعظیم دے رہا تھا۔ وہ لابی سے اٹھ کر بار روم میں آگئے جہاں ہلکی یونانی شراب کی چسکیوں کے ساتھ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک یونان کے قدیم و جدید کلاسیکی ادب پر بحث کرتے رہے۔ فرانسیسی اور انگریزی ادب بھی زیرِ بحث آیا۔ چارلس ایک ماہر نقاد کی طرح اپنی رائے کا اظہار کرتا رہا۔ پھر اس نے اچانک ہی موضوع بدل دیا اور جاپانی پروفیسر کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"پروفیسر ینگاشی! اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو یونان کی نیشنل لائبریری کے ان حصوں کی سیر بھی کرا سکتا ہوں جہاں عام لوگوں

کو داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ نیشنل لائبریری کے اس حصّے میں یونان کے قدیم ادبی شہ پاروں کے علاوہ ارسطو اور سقراط کے کچھ قلمی نسخے بھی محفوظ ہیں۔"

"کیا ایسا ممکن ہے؟" پروفیسر ہیگاشی کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ وہ اسے اپنی انتہائی خوش نصیبی تصوّر کر رہا تھا کہ اس جیسے شخص سے ملاقات ہو گئی تھی۔ حالانکہ اس نے سوچا تھا کہ رات کا کھانا کھاتے ہی سو جائے گا۔ پھر کسی خاص وجہ کے بغیر ہی کمرے سے نکل کر لابی میں آ گیا تھا اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ لابی میں نہ آتا تو ادب کے اس اسکالر کی مفید باتوں اور دیگر بہت سی معلومات سے محروم رہ جاتا۔

"کیوں نہیں پروفیسر!" چارلس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اپنی کتاب کے سلسلے میں کئی بار یہاں آ چکا ہوں۔ نیشنل لائبریری کا ایک گائیڈ میرا دوست ہے جو آپ کی یہ مشکل حل کر سکتا ہے۔"

"میں بہت مشکور ہوں گا۔" پروفیسر ہیگاشی ایک بار پھر اس کے سامنے جھک گیا۔

"میرا خیال ہے آپ نے پلاکا کی سیر نہیں کی ہوگی۔ ایکروپولس کی گود میں سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی اونچی نیچی گلیاں، جن کے فرش گول پتھروں کے بنے ہوئے ہیں، ریسٹورنٹ، شراب خانے، نائٹ کلب، دراصل یہی وہ علاقہ ہے جہاں یونانی تہذیب اپنے اصل رنگ میں موجود ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آج کی رات آپ کے لیے وقف کر سکتا ہوں۔"

پروفیسر ہیگاشی کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ہلٹن سے نکل کر گول پتھروں کے فرش والی ان بل کھاتی ہوئی اونچی نیچی گلیوں میں گھوم رہے تھے، جہاں ریسٹورنٹس سے گونجنے والے موسیقی کے شور سے کان پڑی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سیّاحوں کے ہجوم میں راستہ چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ دونوں مختلف جگہوں پر گھومتے ہوئے ایک ریسٹورنٹ میں آ گئے جہاں ایک بھاری بھرکم رقاصہ یونانی موسیقی پر اپنے "فن" کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ چارلس نے ایک اچھا میزبان ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بھیڑ کی بھُنی ہوئی ران اور یونان کی مخصوص شراب کا آرڈر دے دیا۔

پروفیسر ہیگاشی بہت خوش تھا۔ وہ اس کھانے سے پوری طرح لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ یونانی رقاصہ جب ان کی میز کے گرد چکر لگاتے ہوئے پروفیسر کو اپنے مذاق کا نشانہ بناتی تو یہ لُطف دو بالا ہو جاتا لیکن دفعتاً وہ اپنے آپ میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ دماغ میں ہلکی سی سنسناہٹ کے احساس کے ساتھ اس کی آنکھیں بوجھل سی ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ بمشکل چارلس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"شاید میں وقت سے پہلے بوڑھا ہو رہا ہوں۔ اس معمولی سی چہل قدمی نے بری طرح تھکن طاری کر دی ہے۔"

"اس میں آپ کی عمر کا کوئی قصور نہیں پروفیسر!" چارلس ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ "یہ اس اجنبی ملک کی آب و ہوا کا اثر ہے۔ میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔ آپ کو نیند آ رہی ہے اور میں بھی تھکن سی محسوس کر رہا ہوں۔ کل صبح ہم نیشنل لائبریری کی سیر کو چلیں گے۔ چلیے، میں آپ کو ہوٹل پہنچا دوں۔"

پروفیسر ہیگاشی ریسٹورنٹ سے نکل کر ٹیکسی تک تو اپنے قدموں پر ہی آیا تھا لیکن راستے بھر وہ اونگھتا رہا۔ ہلٹن کے دروازے پر ٹیکسی سے اترتے ہوئے چارلس نے پروفیسر کو اس طرح تھام لیا جیسے اسے سہارا دے کر چلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ آدھی رات کے وقت بھی ہلٹن کی لابی کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ اگر کسی نے دیکھا بھی ہو گا تو یہی سمجھا ہو گا کہ جوان بیٹا اپنے بوڑھے باپ کو سہارا دے کر لے جا رہا تھا۔

دوسرے دن دوپہر کے قریب پروفیسر ہیگاشی کی آنکھ کھلی تو جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ سر بوجھل ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں مچ مچا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہ اسی کا کمرہ تھا لیکن اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ وہ یہاں کب اور کیسے آیا تھا۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ گزشتہ رات وہ اپنے نئے اسکالر دوست کے ساتھ ریسٹورنٹ میں شراب کی چسکیوں کے ساتھ بھیڑ کی بھُنی ہوئی ران سے بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہا تھا اور اس کے اسکالر دوست نے وعدہ کیا تھا کہ کل وہ نیشنل لائبریری دیکھنے جائیں گے۔ یہ خیال آتے ہی وہ سر جھٹکتے ہوئے اٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا دوست آ کر واپس نہ چلا گیا ہو لیکن دوسرے ہی لمحہ جب اس نے اپنے سامان کا جائزہ لیا تو یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ اس کا پاسپورٹ، نیکن کیمرہ، بٹوہ، گھڑی، ٹوکیو کا واپسی ہوائی ٹکٹ دس ہزار ین (جاپانی کرنسی) اور آٹھ سو بیس ڈالر مالیت کے ٹریولرز چیک غائب تھے۔

اس رات آندرے نے چارلس کی آنکھوں میں وہ چمک محسوس کی جو اس کی زندگی کی علامت بن گئی تھی۔ استنبول کے فرار سے آج شام تک اس پر ایک عجیب سی قنوطیت طاری رہی تھی۔ اس دوران وہ ایک بے نام سی کیفیت میں مبتلا رہا۔ بالکل خالی خالی۔ اس کا یہ کھوکھلا پن آندرے سے بھی چھپا نہیں رہ سکا تھا لیکن اس وقت وہ پھر اپنی اصلیت کی طرف لوٹ آیا تھا۔ اس کے تمام حواس پوری طرح بیدار ہو چکے تھے اور وہ میدانِ عمل میں کود پڑنے کو تیار نظر آتا تھا۔ جاپانی پروفیسر کے ساتھ دھوکا دہی واقعی ایک کلاسیکی واردات تھی۔ جس میں شروع سے آخر تک اسے کسی قسم کے خطرے کا سامنا نہیں

کرنا پڑا تھا اور صرف چار گھنٹوں کے اندر اندر یہ مشن بڑی خوبصورتی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔

چند روز بعد جب چارلس کو یقین ہو گیا کہ پروفیسر ہیگاشی جاپان واپس جا چکا ہو گا اور اسے لوٹنے والے نوجوان اسکالر کو شناخت کرنے والا کوئی نہیں ہو گا تو وہ ایک بار پھر میدانِ عمل میں اتر آیا اور ٹہلتا ہوا ہلٹن ہوٹل پہنچ گیا جس کی لابی میلے کا سا منظر پیش کر رہی تھی یہاں دنیا کے مختلف ممالک سے آنے والے سیّاح موجود تھے۔ چارلس ایک صوفے پر بیٹھا بظاہر سرسری نگاہوں سے لابی میں آنے والے سیّاحوں کو دیکھ رہا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ان کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نظر بہت گہری تھی۔ بالآخر اس نے کمال نامی ایک مصری سیّاح کو منتخب کر لیا۔ وہ ایک بھاری بھرکم آدمی تھا۔ عمر کا اندازہ چالیس سال تک لگایا جا سکتا تھا۔ اس کے جسم پر اگرچہ قیمتی لباس تھا لیکن لباس کے استعمال کا سلیقہ غالباً اسے چھو کر نہیں گیا تھا۔ اس کے طور طریقوں سے چارلس کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ لیکن کئی گھنٹوں کی نگرانی کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس پر ہاتھ ڈالنے کے لیے اسے ایک اور ساتھی کی مدد کی ضرورت تھی۔ آندرے نے اگرچہ یہ پیشکش کی تھی کہ دو سو پچاس پونڈ وزنی کمال کو وہ گھسیٹ کر اپنے ہوٹل کے کمرے تک لے جانے کو تیار تھا لیکن کمال کے نفسیاتی تجزیے کے بعد اس نے آندرے کی یہ تجویز مسترد کر دی تھی۔ کمال دن بھر لابی میں ایک ایسے صوفے پر بیٹھا رہتا جہاں سے دروازے سے آنے جانے والے ہر فرد پر نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ چارلس نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ اس کی نظریں آنے جانے والی عورتوں کا خصوصاً تعاقب کرتیں۔ چارلس کے خیال میں اس وھیل مچھلی کے شکار کے لیے کسی ایسے ہی چارے کی ضرورت تھی۔ خوش قسمتی سے یہ چارہ بھی دستیاب تھا۔ ایک روز پہلے پلاکا میں ٹہلتے ہوئے چارلس کی ملاقات میری کلیئر نامی ایک ایسی ہپی لڑکی سے ہوئی تھی جو کچھ عرصہ پہلے سنگاپور میں بھی اس سے مل چکی تھی۔ میری کلیئر بہت حسین تھی۔ اور کمال جیسے شخص کے لیے اس میں کشش ہو سکتی تھی۔ ان دنوں میری کلیئر کی حالت بڑی خستہ تھی۔ بے ترتیب الجھے ہوئے بالوں اور میلے چکٹ لباس نے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ایک ایک پیسے کو محتاج ہو رہی تھی۔ اگر صبح کا ناشتہ نصیب ہو جاتا تو دوپہر اور رات کے کھانے کی فکر دامنگیر رہتی۔ اگر کوئی ہمدرد مل جاتا تو اسے کھانا نصیب ہو جاتا ورنہ فاقہ ہی رہتا۔ چارلس نے چند گھنٹوں کے کام کے بدلے اسے ڈھائی سو ڈالر کی پیشکش کی تو اس نے کسی حیل و حجت کے بغیر قبول کر لیا۔ چارلس نے سب سے پہلے اس کے لیے سستا لیکن نفیس تراش کا اچھا سا لباس خریدا۔ اس کے بالوں کی سیٹنگ پر رقم خرچ کرنے کے بجائے چارلس نے خود ہی اس کے بال کاٹ کر اس طرح سیٹ کر دیے کہ وہ برے نہیں لگ رہے تھے۔

میری کلیئر اور آندرے کو اس مشن پر بھیجنے کے بعد چارلس بھی دور رہ کر ان کی نگرانی کرتا رہا تاکہ کسی ہنگامی صورتِ حال میں ان کی مدد کو پہنچ سکے لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ میری اور آندرے ہلٹن کے بار روم میں داخل ہوئے تو کمال ایک میز پر بیٹھا یونانی شراب کی ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہا تھا۔ میری نے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ سجاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ جواب میں کمال کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ آندرے اس وقت میری سے لاتعلق ہو گیا تھا۔ میری کلیئر ایک میز پر تنہا بیٹھی کمال کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراہٹ کے تیر برسا رہی تھی۔ کمال کے لیے اب ٹھٹکنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر کسی بھاری بھرکم ڈرم کی طرح لڑھکتا ہوا میری کی میز پر پہنچ گیا۔

ایک ایک جام پینے کے بعد کمال نے باہر چلنے کی پیشکش کی تو میری نے فوراً ہی کرسی چھوڑ دی۔ وہ ہلٹن سے نکل کر کچھ دیر سڑکوں پر ٹہلتے رہے۔ کمال اسے کنوسس پیلیس کے صدیوں پرانے کھنڈرات کی طرف لے جانا چاہتا تھا لیکن میری نے اسے اپنے ہوٹل چلنے کی پیشکش کی جہاں تقریباً دو گھنٹے کے بعد کمال کے حواس رخصت ہو چکے تھے۔ میری کو یقین تھا کہ اسے شراب میں جو خواب آور گولیاں دی گئی تھیں وہ اسے صبح سے پہلے آنکھ کھولنے کی اجازت نہیں دیں گی۔

میری کلیئر کا اشارہ ملتے ہی چارلس کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے کمال کی جیب سے چابی نکالی اور میری کو کچھ ہدایات دیتا ہوا آندرے کو ساتھ لے کر ہلٹن ہوٹل پہنچ گیا جہاں کمال کا کمرہ تلاش کرنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی چارلس نے اس کے سامان کی تلاشی لے کر تین ہزار فرانسیسی فرانک، دو سو پچاس امریکن ڈالر، چند جرمن مارک اور اس کا مصری پاسپورٹ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اس دوران قریب کھڑا ہوا آندرے کسی اور قیمتی چیز کی تلاش میں چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ دفعتاً اس کی نگاہ پلنگ پر پڑی ہوئی پلاسٹک کی ایک گڑیا پر ٹک گئی۔ کمال نے یہ گڑیا غالباً نوادرات فروخت کرنے والی کسی دکان سے خریدی تھی۔ چہرے کے یونانی نقوش کی حامل اس گڑیا کو دبانے سے وہ اس طرح قہقہے لگانے لگتی جیسے نشے میں بدمست کوئی عورت بے قابو ہو رہی ہو۔ آندرے نے غیر ارادی طور پر وہ گڑیا جیب میں ڈال لی۔ چارلس کے خیال میں یہ چیزیں اگرچہ وقت ضائع کرنے کے مترادف تھیں لیکن اس نے آندرے کو ٹوکا نہیں۔ ظاہر ہے اس کا چھوٹا بھائی اگر گڑیوں سے کھیلنا چاہتا تھا تو اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

ان دو مسلسل کامیابیوں کے بعد آندرے کا خیال تھا کہ ایتھنز

میں چارلس کا قیام طوالت اختیار کر جائے گا کیونکہ یہاں نہ صرف دنیا بھر کے دولتمند سیاحوں کی آمد و رفت جاری تھی بلکہ ہلٹن کی طرح اعلیٰ معیار کے ایسے لاتعداد ہوٹل بھی موجود تھے جہاں وہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکتے تھے. لیکن نومبر کے تیسرے ہفتے کے آغاز کے ساتھ ہی یہاں قیامت خیز بارشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جس نے شہری زندگی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا. اس کے ساتھ ہی فوج نے یونانی شہنشاہ جارج پاپاڈوپولس کا تختہ الٹ کر حکومت پر قبضہ کر لیا تھا. پولیس اور فوج شہر کی سڑکوں پر گشت کر رہی تھی. اس کے علاوہ چارلس اس روز دو پولیس والوں کی نظروں میں بھی آ چکا تھا جب اس نے ایک ریسٹورنٹ میں میری کلیئر سے ملاقات کی تھی. حالات کو ناموافق سمجھتے ہوئے چارلس نے ایتھنز سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا. اس کی اگلی منزل بیروت تھی. چارلس کا خیال تھا کہ سردیوں کا موسم بیروت کی رنگینیوں میں گزارے گا جہاں عربوں کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی. یوں بھی دنیا کے امیر ترین لوگ اپنی چھٹیاں گزارنے کے لیے بیروت ہی کا رخ کرتے ہیں. چارلس کو یقین تھا کہ بیروت کا سیزن اس کے لیے بہت کامیاب ثابت ہو گا. (یہ کہانی ۱۹۷۲ء کی ہے. بیروت اس وقت تک تباہ نہیں ہوا تھا.)

چارلس کے اٹیچی کیس کی خفیہ تہ میں لاتعداد چوری کے کریڈٹ کارڈ موجود رہتے تھے. ایسے ہی ایک کریڈٹ کارڈ کو استعمال کرتے ہوئے اس نے اپنے اور آندرے کے لیے بیروت کی فلائٹ پر نشستیں بک کروالیں. امیگریشن اور کسٹمز کاؤنٹروں سے گزرتے ہوئے انہیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا. ان مراحل سے بخیر و عافیت گزرتے ہوئے وہ بالآخر ان بسوں تک پہنچ گئے جو مسافروں کو ہوائی جہاز تک لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں. ایتھنز سے رخصت ہوتے ہوئے آندرے نے قدرے اطمینان کا سانس لیا تھا. اب تک کے تجربات شاہد تھے کہ چارلس کا ہر کام باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ہوتا تھا اور اسے کہیں کوئی جھول نظر نہیں آیا تھا لیکن ایئرپورٹ پر پاسپورٹ کی چیکنگ کے دوران آندرے نے ہمیشہ اپنے آپ میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کی تھی. اسے ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ جعلی پاسپورٹ استعمال کرنے کے جرم میں کسی بھی وقت اسے گرفت میں لیا جا سکتا تھا لیکن اس کے یہ خدشات ہمیشہ بے بنیاد ثابت ہوئے تھے.

بس میں بیٹھتے ہوئے آندرے نے اطمینان کا سانس لیا تھا. وہ اس بچی کو دیکھ رہا تھا جو اس کے آگے تیسری سیٹ کے قریب کھڑی اپنی ماں کا ہاتھ تھامے آگے پیچھے جھول رہی تھی. آندرے بچی کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا. جواب میں اس تین سالہ بچی کے ہونٹوں پر بھی معصوم سی مسکراہٹ آ گئی. چند لمحے دونوں میں اشاروں کا تبادلہ ہوتا رہا

پھر آندرے اپنے فلائٹ بیگ کی زپ کھول کر اس میں کچھ ٹٹولنے لگا. بیگ میں بھری ہوئی کتابوں اور کپڑوں کے نیچے سے اس نے وہ گڑیا نکال لی جو مصری سیاح کمال کے کمرے سے چرائی گئی تھی. وہ بچی کو گڑیا دکھاتے ہوئے اسے آہستہ آہستہ دبانے لگا. گڑیا کے منہ سے نکلنے والی قہقہوں کی آواز نے بس کے تمام مسافروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا. گڑیا کو اس طرح قہقہے لگاتے دیکھ کر بچی کی آنکھوں میں حیرت ابھر آئی. وہ اپنی ماں کا ہاتھ چھوڑ کر آندرے کے قریب آ گئی. آندرے نے ایک بازو بچی کے گرد حائل کر دیا اور اسے سمجھانے لگا کہ گڑیا کو کس طرح دبانے سے وہ قہقہے لگاتی ہے. بچی نے گڑیا لے کر اسے دونوں ہاتھوں سے دبایا. اس مرتبہ گڑیا کا قہقہہ خاصا زوردار ثابت ہوا تھا.

بس کی محدود فضا میں گڑیا کے قہقہے کی بازگشت ابھی پوری طرح ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ کسی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک لحیم شحیم مصری اٹھ کر چیختا ہوا آندرے کی طرف دوڑا. وہ کمال تھا. کسی اندرونی کیفیت سے اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو رہی تھی.

"یہی ہے...... یہی ہے وہ لیٹرا......" وہ آندرے کی طرف دوڑتے ہوئے چیخا.

ایئرپورٹ کی بسیں انتظار گاہ سے ہوائی جہازوں تک دن میں بیسیوں چکر لگاتی تھیں لیکن یہ محض اتفاق تھا کہ کمال کو بھی اسی بس میں بیٹھنا تھا. اس نے آندرے کی گردن پر گرفت جما دی اور مدد کے لیے چیخنے لگا. آندرے نے اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کی لیکن کمال کی گرفت خاصی مضبوط تھی. آندرے بے بس ہو کر رہ گیا. اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اگر گرفت ڈھیلی نہ ہوئی تو اس کی گردن کی ہڈی چٹخ جائے گی.

ڈرائیور نے صورتحال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ریڈیو کنٹرول کو اطلاع دیتے ہوئے بس کا رخ ٹرمینل کی طرف موڑ دیا. بس کے ٹرمینل پر پہنچتے ہی پولیس نے اسے گھیرے میں لے لیا اور شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے آندرے اور چارلس جیل میں پہنچ چکے تھے.

فرار کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے.

پولیس اسٹیشن پر چارلس کے سامان کی تلاشی کے دوران چار واکی ٹاکی سیٹ، کئی قیمتی گھڑیاں، جن میں ایک کمال کی تھی، ایک طلائی ڈن ہل سگریٹ لائٹر، ایک ریڈیو، دو سنہری پارکر پین، مختلف ممالک کی کرنسی، چوری شدہ کریڈٹ کارڈز اور تقریباً نصف درجن پاسپورٹ برآمد ہوئے تھے. ان میں ایک پاسپورٹ کمال کا تھا اور ایک اینٹن کے نام کا جس پر چارلس کی تصویر چسپاں تھی.

استنبول میں اینٹن اور کرسٹا کے لٹنے کی خبر اخبارات کے ذریعے ایتھنز تک بھی پہنچ چکی تھی جس سے چارلس سوبھراج کا اس واردات سے تعلق ثابت کرنا یونان کی پولیس کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا. ان کی گرفتاری کی خبر استنبول پہنچتے ہی ترک پولیس نے ان مجرموں کی واپسی کا مطالبہ کر دیا تاکہ انہیں ترکی کی سیاحت کی صنعت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے کے جرم میں سخت ترین سزا دی جا سکے.

ایتھنز کی جیل میں بند چارلس صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر انہیں ترک پولیس کے حوالے کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ قانون کا سہارا لے کر آخری لمحوں تک مزاحمت کی کوشش کرے گا. ترک پولیس کے بارے میں وہ بہت کچھ جانتا تھا. اس جرم کی سزا کسی طرح بھی بیس سال سے کم نہیں ہو سکتی تھی. بشرطیکہ وہ پولیس کے تشدد سے زندہ بچ جاتا. ترک پولیس ملزموں سے اعترافِ جرم کرانے کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال کرتی تھی ان کے تصور ہی سے چارلس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے. اس کے برعکس یونانی پولیس کا رویہ قدرے مختلف تھا. اسے یقین تھا کہ اگر وہ ایتھنز ہی میں رہا تو وہ یونانی قانون میں کوئی نہ کوئی ایسا خلا تلاش کر لے گا جس سے وہ طویل سزا سے بچ سکے گا. جب انہیں پولیس کیپٹن کے سامنے پیش کرنے کے لیے دفتر میں لے جایا جانے لگا تو راہداری میں چارلس نے آندرے کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی. "کسی بات کا اعتراف مت کرنا. بہتر ہے کہ تم مکمل خاموشی اختیار کیے رکھو. میں یونانی قانون سے واقف ہوں. خود ہی نمٹ لوں گا."

چارلس یونانی کوڈ آف جسٹس کی کم از کم ایک خامی سے آگاہ تھا. کسی مجرم کو ایک سال ایک دن تک پولیس کی حراست میں رکھا جا سکتا تھا لیکن اس دوران اگر مجرم کے خلاف عدالت میں باقاعدہ مقدمہ شروع نہ ہو سکے تو مجرم کو رہا کر دیا جاتا تھا. مقدمہ چلائے بغیر پولیس کسی قاتل کو بھی اس مقررہ مدت سے زیادہ جیل میں نہیں رکھ سکتی تھی. ایک دن زیادہ ہونے کی صورت میں الٹا پولیس پر حبسِ بیجا کا کیس ہو سکتا تھا. اگرچہ اس ایک سال ایک دن کی مدت کے بارے میں کوئی پیشگوئی نہیں کی جا سکتی تھی لیکن چارلس نے یہ جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا. اسے جب تفتیش کے لیے پولیس کیپٹن کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ ہر الزام کی صحت سے انکار کرتا چلا گیا. پولیس کے بار بار پوچھنے پر اس کا یہی جواب تھا کہ نہ تو اس نے مصری سیاح کمال کو لوٹا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی اینٹن کا پاسپورٹ استعمال کیا تھا. اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ اس پاسپورٹ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جو نجانے اس کے اٹیچی کیس میں کس طرح پہنچ گیا تھا. اس نے الٹا پولیس پر الزام عائد کیا کہ پولیس نے اسے پھنسانے کے لیے یہ تمام جعلی کاغذات اس کے اٹیچی کیس میں رکھے تھے جن کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا. اس طرح چارلس پولیس کے لیے زیادہ سے زیادہ دشواریاں پیدا کرتا رہا تاکہ پولیس اس کے خلاف کیس تیار کر کے عدالت میں پیش نہ کر سکے.

چارلس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی. وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو چکا تھا لیکن وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ پولیس کو رہوڈز آئی لینڈ میں کیسینو اور ہوٹل سے فراڈ اور ایک برطانوی سیاح کو لوٹنے کے کیس کا پتا نہ چل سکے جس میں اسے اس کی عدم موجودگی میں...... سزا کا حکم سنایا گیا تھا. اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کیس میں اسے کم از کم تیرہ ماہ یا اس سے زیادہ سزا بھی ہو سکتی تھی. چارلس کو امید تھی کہ اس کی اس پرانی واردات کا انکشاف نہیں ہو سکے گا کیونکہ حال ہی میں یونان کی حکومت تبدیل ہو چکی تھی. نئی حکومت ابھی پوری طرح اپنے قدم نہیں جما سکی تھی اور عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ہی اکثر سرکاری محکموں، خصوصاً عدالتوں اور پولیس کا بیشتر ریکارڈ ادھر ادھر ہو جاتا ہے. چارلس اب یہی دعا مانگ رہا تھا کہ اس کے پرانے کیس کا ریکارڈ ضائع ہو چکا ہو.

ایک مجسٹریٹ کے حکم پر چارلس سوبھراج اور آندرے کو اس وقت تک کوری ڈالوس جیل بھیج دیا گیا جب تک کہ پولیس اس کے خلاف کیس مکمل کر کے عدالت میں پیش نہ کر سکے. چارلس نے اطمینان کا سانس لیا. زیرِ زمین حلقے سے حاصل ہونے والی اطلاعات کے مطابق یہ جیل قیدیوں کے لیے اتنی بری نہیں تھی. کم از کم کابل کی جیل کے مقابلے میں اسے لگژری جیل کہا جا سکتا تھا. چارلس کا خیال تھا کہ اس جیل میں رہتے ہوئے بھی وہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکتا تھا تاکہ جیل کے حکام کے لیے زیادہ سے زیادہ مشکلات پیدا کی جاتی رہیں.

پولیس کی وین میں جیل کی طرف جاتے ہوئے چارلس کو آندرے سے بات کرنے کا موقع مل گیا. ان دونوں کو ایک ہی ہتھکڑی میں جکڑا گیا تھا. اتفاق سے وین میں ان کے علاوہ کوئی اور قیدی نہیں تھا. اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چارلس نے آندرے کو کچھ باتیں سمجھا دینا ضروری سمجھا تھا.

"پولیس والے ہمیں جیسے ہی جیل کے حکام کے حوالے کریں گے، صورتحال تبدیل ہو جائے گی." چارلس نے آندرے کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی. "پولیس ہمارے بارے میں جانتی ہے کہ ہم کون ہیں لیکن جیل کے حکام کچھ نہیں جانتے." آندرے نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن چارلس کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی. اس کی آنکھوں میں الجھن دیکھ کر چارلس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا. "جیل کے افسران یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم میں کوئی رشتہ بھی ہے. ہماری شکلیں اگرچہ ایک دوسرے سے بہت ملتی ہیں لیکن یورپین سمجھتے ہیں

کہ مشرق میں رہنے والوں کے چہرے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ جیل میں قدم رکھتے ہی ہم اپنی شناخت تبدیل کرلیں گے۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

آندرے نے اثبات میں سر ہلادیا لیکن چارلس کی یہ منطق اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی کہ جیل میں داخل ہوتے ہی وہ اپنے آپ کو آندرے اور آندرے کو چارلس سوبھراج کیوں بنانا چاہتا تھا۔ آندرے سوچ رہا تھا کہ شاید وہ اپنے اس بڑے بھائی پر ضرورت سے زیادہ ہی اعتماد کرنے لگا تھا۔ چند ماہ پہلے وہ پیرس میں بڑے اطمینان وسکون کی زندگی بسر کررہا تھا۔ اس کے پاس ایک معقول ملازمت تھی، رہائش کے لیے مختصر سا فلیٹ تھا۔ اس کی دوستی کے حلقے میں منتخب لڑکیاں شامل تھیں۔ اس کی ہر شام خوشگوار ہوتی اور رات کو وہ سکون کی نیند سوتا تھا لیکن آج وہ ایک اجنبی ملک میں پولیس وین میں بیٹھا جیل کی طرف جارہا تھا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اسے زندگی کے کتنے سال اس جیل میں بسر کرنا تھے۔ یہاں سزا پوری ہونے کے بعد اسے ترک پولیس کے حوالے کردیا جاتا جو اسے گرفت میں لینے کے لیے سرحد پر تیار کھڑی تھی۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلادیا۔ وہ کسی ایسے شخص کا روپ دھارنے کو تیار نہیں تھا جو بیسیوں وارداتوں میں کم از کم چھ ممالک کی پولیس کو مطلوب تھا۔

"میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔" چارلس نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اس نے یہ منصوبہ بہت سوچ سمجھ کر بنایا تھا۔ "جیل کے حکام چند روز ہی میں یہ دریافت کرلیں گے کہ یونان میں آندرے ڈارپو کے خلاف کوئی مجرمانہ ریکارڈ نہیں ہے۔ ایسی صورت میں آندرے کے خلاف پولیس کا کیس کمزور ہوجائے گا اور اسے معمولی سی ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہ کے بعد یونان سے نکل جانے کا حکم دیتے ہوئے چھوڑ دیا جائے گا۔"

بات اب آندرے کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اگر چارلس جیل کے حکام کے سامنے اپنے آپ کو آندرے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے تو ظاہر ہے آزادی بھی اسی کو ملے گی۔

"پھر میرا کیا ہوگا؟ کیا میں سزا بھگتنے کے لیے جیل میں پڑا رہوں گا؟" اس نے چارلس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ منصوبہ بنایا ہے۔" چارلس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ "جیل سے رہا ہونے کے بعد کسی دوسرے ملک میں پہنچتے ہی میں جیل کے پتے پر تمہیں خفیہ الفاظ میں ٹیلیگرام دے دوں گا۔ اس کے فوراً ہی بعد تم جیل کے ذمہ دار افسران سے رابطہ قائم کرکے یہ انکشاف کردو گے کہ آندرے ڈارپو تو تم ہو۔ جیل والوں نے غلط آدمی کو آندرے سمجھ کر رہا کردیا ہے۔"

آندرے فوری طور پر جواب دینے کے بجائے خاموشی سے سوچتا رہا۔ چند منٹ بعد وہ جیل پہنچنے والے تھے اور اس وقت کسی لمبی چوڑی بحث کی گنجائش نہیں تھی لیکن وہ ایک خدشے کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"شاید تم نے اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ اس انکشاف کے بعد جیل والوں کا سارا غصّہ مجھ پر ہی اترے گا۔"

"بالکل نہیں۔" چارلس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہاری طرف سے یہ دھمکی کہ تم فرانسیسی سفارتخانے کو ان کی لاقانونیت سے آگاہ کردو گے، ان کا غصّہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی ہوگی۔ یونان کی نئی حکومت فرانس سے کسی کشیدگی کا خطرہ مول نہیں لے سکتی اور وہ بھی اس فرانسیسی شہری کے لیے جو خود ان کی غلطی کا خمیازہ بھگت رہا ہو۔"

ان کی یہ گفتگو جاری نہ رہ سکی کیونکہ وین جیل کے قریب پہنچ چکی تھی۔ قلب ایتھنز سے صرف بیس منٹ کے فاصلے پر پائریوسی کی بندرگاہ کے قریب ایک پہاڑی پر واقع کوری ڈالوسی کی جیل کی دیواریں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ جیل کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں پھیلی ہوئی تھیں اور بادی النظر میں دور سے اس جیل پر بھی کسی فیکٹری ہی کا گمان ہوتا تھا۔

وین سے اترتے ہی چار مسلح محافظوں نے انہیں نرغے میں لے لیا اور ایک خوبصورت وسیع وعریض لان سے گزرتے ہوئے جیل کے اس حصے میں پہنچادیا گیا جو سیکشن فور کہلاتا تھا۔ یہ سیکشن ان قیدیوں کے لیے مخصوص تھا جو اپنے مقدمات عدالت میں پیش ہونے کے منتظر تھے۔ اس سیکشن کا فرش سبز رنگ کی چکنی ٹائلوں کا بنا ہوا تھا۔ ٹائلوں ہی کی بنی ہوئی دیواریں بھی وقتاً فوقتاً دھوئی جاتی تھیں تاکہ ان پر میل کے دھبے نہ رہیں۔ قیدیوں کی تفریح کے لیے ایک ہال بھی تھا جس میں ریڈیو اور ٹیلی وژن کے علاوہ تفریح کی دوسری سہولتیں بھی مہیا تھیں۔

اس روز جب جیل کا ایک افسر قیدیوں کی حاضری لینے کے لیے آیا تو وہ ہال کے دروازے ہی میں رک کر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کلپ بورڈ پر دیکھ کر قیدیوں کے نام پکارنے لگا۔ "چارلس سوبھراج!"

آفیسر کی آواز سن کر آندرے نے کن انکھیوں سے چارلس کی طرف دیکھا اور پھر ایک لمحہ کی ہچکچاہٹ کے بعد دو قدم آگے بڑھ کر حاضری دے دی۔ اس کے بعد جیسے ہی آندرے ڈارپو کا نام پکارا گیا چارلس نے بلاجھجک قدم آگے بڑھا کر "یس سر" کا نعرہ لگادیا۔ یہ آندرے کی زندگی کا وہ لمحہ تھا جس نے اس کی شناخت بدل دی تھی۔

چند ہفتے گزر گئے۔ وقت ایک ہی ڈگر پر چل رہا تھا۔ خوش قسمتی سے چارلس اور آندرے کو دوسری منزل پر ایک ہی کوٹھری میں رکھا گیا تھا۔ جیل کا یہ حصّہ صرف غیر ملکی قیدیوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس جیل میں قیدیوں کو صبح سوا سات بجے سے پہلے جاگنے پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا۔

"میں ایسی جیل میں بھی رہ چکا ہوں جہاں قیدیوں کو صبح پانچ بجے بستر سے اٹھا کر میدان میں کھڑا کردیا جاتا تھا۔" چارلس نے آندرے کو بتایا۔

اس جیل میں قیدیوں کو دی جانے والی خوراک بھی قابلِ تعریف تھی۔ صبح ناشتے میں انڈہ، ڈبل روٹی اور چائے جبکہ دوپہر اور رات کے کھانے میں مچھلی، گوشت، سبزیاں اور پھل وغیرہ شامل تھے۔ وہاں قیدیوں سے کسی قسم کا کام بھی نہیں لیا جاتا تھا۔ انہیں لکھنے پڑھنے اور ہال میں تفریحی سرگرمیوں کی پوری اجازت تھی۔ ان دونوں نے اپنے آپ کو ویتنامی ظاہر کیا تھا۔ یوں تو قیدیوں کو ایک دوسرے سے ملنے پر کوئی پابندی نہیں تھی لیکن چارلس صرف انہی قیدیوں سے ملتا جو کسی وقت اس کے کام آسکتے تھے۔ اس نے آندرے کو بھی یہی مشورہ دیا تھا۔

"جیل میں پہلا اصول یہ ہے کہ کسی دوست کے انتخاب میں احتیاط سے کام لینا چاہیے کیونکہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کون سا قیدی جیل کے افسروں کا ایجنٹ ہوسکتا ہے۔"

کوئی اور قیدی چونکہ ویتنامی زبان نہیں سمجھ سکتا تھا، اس لیے دوسرے لوگ بھی ان دونوں سے دور دور ہی رہنے لگے تھے۔ مستزاد یہ کہ وہ دونوں دن بھر کراٹے کی مشق کرتے رہتے۔ ان کے منہ سے ایسی بھیانک آوازیں نکلتیں کہ دوسرے قیدی کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے۔ ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا اور پھر اس روز وہ دونوں جیسے ہی کراٹے کی مشق کے لیے تیار ہوئے، ایک بھاری بھرکم یونانی قیدی چارلس کے راستے میں آگیا۔ اس کا وزن تین سو پونڈ سے کم تو کسی طرح نہیں ہوگا۔ وہ ریچھ کی طرح بانہیں پھیلا کر چارلس کی طرف بڑھا تھا۔ چارلس اس کے تیور دیکھتے ہوئے سنبھل گیا۔ اور پھر اس نے اچانک ہی اس بھینسے نما یونانی پر حملہ کردیا۔ پہلے ایک چوپ اور پھر فلائنگ کک! یونانی وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اس کے بعد کسی اور قیدی کو ان دونوں بھائیوں میں سے کسی کے راستے میں آنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

فارغ اوقات میں چارلس یونانی قانون کے مطالعہ میں مصروف رہتا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن عدالت کو ایک تفصیلی خط بھی لکھتا جس میں اپنے آپ کو آندرے ظاہر کرتے ہوئے رہائی کی استدعا کی جاتی۔ اس کی تحریر انتہائی متاثر کن تھی۔ وہ اپنی ان درخواستوں میں سقراط اور افلاطون کے بعض اقوال کے حوالے بھی دیتا۔ اس نے اعتراف کرلیا تھا کہ وہ انجانے طور پر بعض شیطانی قوتوں کے زیرِ اثر آگیا تھا لیکن اگر اسے رہا کردیا جائے تو وہ فوری پر اس ملک سے نکل جائے گا اور آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ عدالت کو یہ خط بھیجتے ہوئے چارلس آندرے کو تسلی دیتا کہ عدالت کو خط ملنے کے پندرہ دن کے اندر اندر وہ دونوں اس جیل سے رہا ہوجائیں گے۔

دو ماہ گزر گئے۔ چارلس کو عدالت کی طرف سے اپنے خط کا بھی جواب نہیں ملا۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ آندرے کی مایوسی بڑھتی رہی جبکہ چارلس کے ذہن میں منفی جذبات پرورش پاتے رہے۔ آندرے نے ایک مرتبہ یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ انہیں اپنی اصلیت ظاہر کردینا چاہیے لیکن چارلس نے اس تجویز کو سختی سے مسترد کردیا تھا کیونکہ وہ اسی پوزیشن سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

"میرے ذہن میں ایک اور تجویز ہے۔" چارلس نے اس کی طرف جھکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے ہم یہاں سے فرار ہوسکتے ہیں۔"

آندرے حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ چارلس مزید کوئی بات کہے بغیر اپنی کوٹھری سے نکل کر ریکریشن ہال میں آگیا اور دن بھر مختلف قیدیوں اور جیل کے محافظوں سے گپیں لڑاتا رہا۔ اس رات کوٹھری میں واپس آتے ہی چارلس نے قمیص کے بٹن کھول کر قمیص کے اندر چھپا ہوا جیل کا ایک نقشہ نکالا تو آندرے کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"یہ...... یہ نقشہ تم نے کہاں سے لیا؟" آندرے ہکلایا۔

"ارادہ پختہ ہو تو کسی چیز کا حصول ناممکن نہیں رہتا۔" چارلس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس رات وہ دونوں موم بتی کی روشنی میں نقشے کا تفصیلی جائزہ لیتے رہے۔ چارلس نے بہت جلد سیکشن فور کے نیچے ایک ایسا زیرِ زمین نالہ دریافت کرلیا جو اس سیکشن کی ایک سو بیس کوٹھریوں کی غلاظت اور گندے پانی کی نکاسی کے لیے بنایا گیا تھا۔ یہ زیرِ زمین نالہ جیل کی دیوار کے باہر مین گٹر لائن میں جاملتا تھا۔ جس کا پانی پائریوسی کی بندرگاہ کے قریب سمندر میں جاگرتا تھا۔

"جیلوں میں گندے پانی کی نکاسی کے لیے عام طور پر چھوٹے پائپ استعمال کیے جاتے ہیں۔" چارلس، آندرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "لیکن اس جیل میں گٹر لائن کے لیے جو پائپ استعمال کیے گئے ہیں وہ اتنے کشادہ ہیں کہ ہم جیسے آدمی نہایت آسانی سے اس میں داخل ہوکر دوسری طرف نکل سکتے ہیں۔ اگر ہم اس زیرِ زمین نالے تک کھدائی میں کامیاب ہوجائیں تو فرار کا راستہ نکل سکتا ہے۔"

وہ کھدائی کے بارے میں غور کرتے رہے لیکن اس وقت سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ ان کی کوٹھری دوسری منزل پر تھی۔ فرار کے اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ نچلی منزل کی کسی کوٹھری میں منتقل ہوجاتے مگر اپنی مرضی سے کوٹھری تبدیل کرنا ممکن نہیں تھا۔ چارلس نے اس کا حل بھی تلاش کرلیا۔ دوسرے دن انہوں نے

آپس میں دھینگا مشتی شروع کردی۔ دوسری کوٹھریوں میں رہنے والے قیدی ایک دو روز تک تو ان کی یہ دن رات کی ہنگامہ آرائی برداشت کرتے رہے لیکن پھر ان کے خلاف شکایات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تین روز بعد جیل کے دو محافظ انہیں گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے اور بتایا کہ اب انہیں نچلی منزل کی ایک کوٹھری میں رکھا جائے گا جہاں ان کی بہتر نگرانی ہو سکے گی۔ اگر وہاں بھی وہ لوگ اس ہنگامہ آرائی سے باز نہ آئے تو ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے قیدِ تنہائی میں ڈال دیا جائے گا۔ چارلس نے محافظوں کی زیادتی پر احتجاج کیا لیکن کوٹھری سے نکلتے ہوئے اس نے آندرے کو آنکھ ماردی۔

انہیں نچلی منزل کی کوٹھری میں منتقل کرنے کے بعد ایک محافظ ہر وقت کوٹھری کے سامنے ٹہلتا رہتا تاکہ وہ کسی قسم کی ہنگامہ آرائی نہ کر سکیں لیکن یہاں آتے ہی ان کی تیزی طراری رخصت ہو گئی۔ وہ دن بھر اپنی کوٹھری میں کتابیں پڑھتے رہتے۔ محافظ ان کی شرافت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور بہت جلد دوسرے قیدیوں کے سامنے ان کی مثالیں پیش کی جانے لگیں۔ چند روز بعد ان کی نگرانی بھی ختم کردی گئی۔

نگرانی ختم ہوتے ہی چارلس نے نقشے کی مدد سے ایک بار پھر کوٹھری کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس کے خیال میں اس کام کے لیے کم از کم دو اور آدمیوں کی ضرورت تھی کیونکہ کوٹھری کے فرش میں تقریباً ایک فٹ کی گہرائی تک کنکریٹ کی تہ بچھی ہوئی تھی اور اس کے اوپر ماربل کی ٹائلوں کا فرش تھا۔

چارلس چاہتا تھا کہ سرنگ کسی اور کوٹھری میں لگائی جائے کیونکہ اس کے خیال میں اس کام میں کم از کم چھ ہفتے لگ سکتے تھے۔ اور اس دوران سرنگ کے دریافت کر لینے کے خطرے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور چارلس چاہتا تھا کہ اگر بدقسمتی سے سرنگ کا راز فاش ہو بھی جائے تو سرنگ ان کی اپنی کوٹھری میں دریافت نہ ہو۔ اس طرح وہ سنگین الزام سے بچ جائیں گے۔

چارلس نے اسی روز سے جیل کے سیکشن چار میں رہنے والے قیدیوں کا گہری نظروں سے جائزہ لینا شروع کر دیا لیکن یہ جان کر اسے سخت مایوسی ہوئی کہ تقریباً ایک سو قیدیوں میں کوئی فرانسیسی نہیں تھا۔ بالآخر چارلس نے دو امریکی نوجوانوں پر اپنی توجہ مبذول کردی جنہیں حشیش کی معمولی سی مقدار رکھنے کے جرم میں پکڑا گیا تھا۔ پیٹ اور سینسپر کا خیال تھا کہ یونانی پولیس نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ وہ دونوں دوسرے قیدیوں سے الگ تھلگ رہتے۔ لیکن جب چارلس اور آندرے نے ان سے ہمدردی کا اظہار کیا تو وہ بہت جلد ان سے مانوس ہو گئے۔ پیٹ اور سینسپر کا شمار امریکہ کے ان نوجوانوں میں ہوتا تھا جو ویتنام کی جنگ میں اپنے ملک کی پالیسیوں کی مخالفت کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اور اتفاق سے جیل میں ان کی ملاقات دو ویتنامیوں یعنی چارلس اور آندرے سے ہو گئی تھی جو امریکہ کی جنگجویانہ حکمتِ عملی سے اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ وہ گھنٹوں اس موضوع پر باتیں کرتے رہتے۔ چارلس امریکی پالیسی کی مخالفت پر اکثر ان دونوں کا شکریہ ادا کرتا۔

ان لوگوں کی کوٹھریاں بھی آمنے سامنے تھیں۔ دن کے وقت کوٹھریوں کے دروازے کھلے رہتے اور قیدیوں کو ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے کی پوری اجازت تھی بشرطیکہ ان کی آمد و رفت سے کسی قسم کا ہنگامہ نہ ہو۔ ان دونوں امریکی نوجوانوں سے ان کی دوستی بہت گہری ہو گئی تھی لیکن چارلس نے ابھی تک انہیں اپنے فرار کے منصوبے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔

"میرا خیال ہے وہ دونوں ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد ہیں۔ اب ان سے بات کر لینی چاہیے۔" ایک رات آندرے کو چارلس نے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ دونوں قابلِ اعتماد ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ ان کے دل میں فرار کی خواہش میں اتنی شدت پیدا کر دی جائے کہ جب ہم ان کے سامنے یہ تجویز پیش کریں تو وہ انکار نہ کر سکیں بلکہ بہتر ہوگا کہ فرار کی تجویز انہی کی طرف سے پیش ہو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" آندرے نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہو جائے گا تم خاموشی سے دیکھتے رہو۔" چارلس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری باتیں کبھی میری سمجھ میں نہیں آسکتیں۔" آندرے کہتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

امریکی نوجوانوں سے اگلی ملاقات کم از کم آندرے کے لیے خاصی سنسنی خیز ثابت ہوئی تھی۔ چارلس نے بڑی خوبصورتی سے گفتگو کا موضوع بدل دیا تھا۔

"تم لوگوں سے کتنی حشیش برآمد ہوئی تھی؟" چارلس نے سوالیہ نگاہوں سے سینسپر کی طرف دیکھا۔

"صرف بارہ گرام۔" سینسپر نے جواب دیا۔ وہ دراز قامت اور صحت مند نوجوان تھا۔ مختصر سی داڑھی اس کے چہرے پر خوب سج رہی تھی۔ اس کا تعلق ٹیکساس سے تھا۔

"اور تمہارے پاس کتنی حشیش تھی؟"

"آدھے اونس سے زیادہ نہیں رہی ہوگی۔" پیٹ کے لہجے میں تلخی تھی۔ اوکلاہاما کا رہنے والا یہ نوجوان فوج میں بھرتی ہونے سے بچنے کے لیے امریکہ سے کینیڈا فرار ہو گیا تھا جہاں سے وہ یورپ چلا گیا۔

یورپ ہی میں اس نے ایک لڑکی سے شادی کر لی لیکن چند ہی روز بعد انکشاف ہوا کہ وہ لڑکی پہلے سے شادی شدہ ہے اور اس کا شوہر بزنس کے سلسلے میں طویل عرصہ سے مالٹا میں مقیم ہے۔

"مجھے تم لوگوں سے پوری ہمدردی ہے۔" چارلس نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "بارہ گرام حشیش اگرچہ زیادہ بڑی مقدار نہیں لیکن میں ایک ایسے نوجوان کو بھی جانتا ہوں جس سے صرف ایک گرام حشیش برآمد ہوئی تھی اور یونانی قانون نے اسے چھ سال قید بامشقت کی سزا دی تھی۔"

دونوں امریکی نوجوان سکتے میں آگئے۔ گرفتاری کے بعد ایک یونانی وکیل نے بتایا تھا کہ انہیں زیادہ سے زیادہ ایک سال کی سزا ہو سکتی ہے اور ممکن ہے اس میں بھی کوئی تخفیف کر دی جائے۔

"یہ محض طفل تسلی ہے۔" چارلس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "منشیات کے سلسلے میں یہ یونانی بڑے حساس واقع ہوئے ہیں۔ بلکہ انہیں جنونی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ موجودہ فوجی حکومت تو منشیات کے اسمگلروں کو کسی صورت میں بھی معاف کرنے کو تیار نہیں۔ عدلیہ بھی ان کے دباؤ میں ہے اور نئے فوجی قوانین کے تحت یہاں کئی ایسے لوگوں کو بھی موت کی سزا دی جا چکی ہے جن کے قبضے سے صرف چند گرام حشیش برآمد ہوئی تھی۔" چارلس نے بتایا۔

پیٹ اور سینسپر کے چہرے دھواں ہو گئے۔ انہیں اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔

"سزائے موت!" سینسپر نے غیر یقینی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"ہاں، اور شاید ہمیں بھی ڈکیتی اور رہزنی کی سزا بھگتنے کے لیے اپنی پوری زندگی اسی جیل میں گزارنا پڑے۔" چارلس نے جواب دیا۔ وہ دونوں امریکیوں کو بتانے لگا کہ کس طرح ویتنام میں امریکہ کے جنگی جنون کے باعث اپنے ملک سے فرار ہونا پڑا تھا۔ وہ مختلف ملکوں میں بھٹکتے ہوئے یونان پہنچ گئے جہاں پیٹ کا جہنم بھرنے کے لیے انہوں نے چوری کی اور پکڑے گئے۔ اور اب زندگی کا باقی حصہ ان یونانیوں کے رحم و کرم پر گزرے گا۔

دونوں امریکی نوجوان حواس باختہ ہو رہے تھے۔ معمولی سی چوری کے لیے عمر قید کی سزا۔ واقعی ظلم و ناانصافی کی انتہا تھی۔ چارلس گہری نظروں سے ان کے چہروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ انسانی نفسیات کا ماہر تھا۔ ان دونوں کے چہروں کے تاثرات دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ لوہا گرم ہو چکا ہے اور اب اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے لیے چوٹ لگا دینا چاہیے۔ وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بتانے لگا کہ کسی نے اسے اس جیل کا نقشہ فراہم کر دیا تھا جس کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ سیکشن فور کے نیچے گٹر لائن کا پائپ اتنا کشادہ ہے کہ ہم جیسا درمیانے جسم کا آدمی اس میں داخل ہو کر رینگتا ہوا آسانی سے دوسری طرف نکل سکتا ہے لیکن فرار کی خواہش کے باوجود اسے سرنگ کھودنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ وہ کچھ ایسے معصومانہ انداز میں باتیں کر رہا تھا کہ دونوں امریکی اپنے آپ میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ انہیں فرار کے سلسلے میں ان مظلوم ویتنامیوں کی مدد کرنی چاہیے۔ اور بالآخر انہوں نے یہ پیشکش کر دی کہ وہ دونوں فرار میں نہ صرف ان کی مدد کرنے کو تیار ہیں بلکہ اگر وہ چاہیں تو سرنگ انہی کی کوٹھری سے کھودی جا سکتی ہے۔

اپنی کوٹھری میں پہنچ کر چارلس اور آندرے ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔ چارلس نے اس وقت جس قدر اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا وہ آندرے کے لیے واقعی انتہائی حیرت انگیز تھا۔

"اب تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ کسی کی کمزوری سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اسی لیے میں تم سے بھی ہمیشہ یہی کہتا ہوں کہ انسانی نفسیات کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اگر تم کسی شخص کی نفسیات کا صحیح تجزیہ کر سکو تو اس کی کوئی نہ کوئی دکھتی ہوئی رگ تمہارے ہاتھ ضرور آجائے گی۔" چارلس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

آندرے سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ چارلس جمائی لیتا ہوا اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ اس نے آندرے کو بھی جلد سونے کو کہا۔ کیونکہ کل صبح انہیں کھدائی کا کام شروع کر دینا تھا۔

چند زنگ آلود کیل، ایک کھانا کھانے والا چمچہ اور ایک کانٹا، یہ وہ اوزار تھے جن سے وہ سرنگ کھودنا چاہتے تھے۔ سب سے پہلے کنکریٹ کی ایک فٹ دبیز تہ کو ادھیڑنا تھا پھر مٹی میں کم از کم چھ فٹ کی گہرائی تک پہنچنے کے بعد سرنگ کا رخ موڑنا تھا اور اس سے آگے کتنا فاصلہ طے کرنا تھا، اس کے بارے میں فی الحال کوئی بات یقینی طور پر نہیں کہی جا سکتی تھی۔ چارلس کے محتاط اندازے کے مطابق اس کام کے لیے کم از کم آٹھ ہفتے درکار تھے۔ ان آٹھ ہفتوں کے دوران انہیں آرام کیے بغیر صبح سے رات تک کام کرنا تھا جبکہ محافظوں کی صورت میں خطرہ ان سے صرف بیس فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ کوئی محافظ کسی بھی وقت ٹہلتا ہوا اس طرف آسکتا تھا لیکن یہ خطرہ مول لیے بغیر وہ اپنے منصوبے پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔

کنکریٹ کی ایک فٹ دبیز تہ اُدھیڑنے میں دو ہفتے لگ گئے لیکن جیسے ہی وہ کچی مٹی تک پہنچے ان کا کام قدرے آسان ہو گیا۔ چارلس اور آندرے کا زیادہ وقت اس گڑھے ہی میں گزرنے لگا۔ چارلس نے یہ سرنگ صرف اتنی چوڑی رکھی تھی کہ دُبلے پتلے ہونے کی وجہ سے صرف وہی دونوں اس میں سما سکتے تھے۔ چوڑے شانوں اور کسرتی جسم کے مالک پیٹ اور سینسپر کے لیے اس سرنگ میں گھسنا

ممکن نہیں تھا۔ ان دونوں کو حیرت بھی تھی کہ چارلس نے سرنگ کی چوڑائی اتنی کم کیوں رکھی تھی۔ سینسپر نے اس طرف توجہ دلائی تو چارلس نے بڑی خوبصورتی سے اسے سمجھا دیا تھا۔

"اس وقت زیادہ چوڑی سرنگ کھودنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ مناسب وقت پر سرنگ کو ضرورت کے مطابق کشادہ کر لیا جائے گا۔"

سرنگ کچھ اور گہری ہوئی تو چارلس نے فیصلہ کیا کہ اب صرف ایک آدمی کو سرنگ میں کام کرنا چاہیے۔ اس تجویز پر فوراً ہی عمل شروع ہوگیا۔ ان میں سے ایک آدمی سرنگ کے اندر کھدائی میں مصروف رہتا جبکہ باقی تینوں کمرے میں بیٹھے اطمینان سے باتیں کرتے، تاش یا کراٹے کھیلتے رہتے تاکہ محافظ وہاں کوئی غیر معمولی بات محسوس نہ کرسکیں۔ سرنگ کے اس راز کو چھپانے کے لیے چارلس نے شروع ہی میں کچھ حفاظتی اقدامات کر لیے تھے۔ اس نے ایک بڑے سے کاغذ پر فرش کی ٹائلوں کا نقشہ بنا لیا تھا۔ یہ نقشہ اس قدر مہارت سے تیار کیا گیا تھا کہ اگر اسے فرش پر بچھا دیا جاتا تو دور سے یہ اندازہ لگانا دشوار ہوتا کہ فرش کی اصل ٹائلیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں اور کاغذ کہاں ختم ہوتا ہے۔ کوری ڈالوسی جیل کا قاعدہ تھا کہ اگر قیدی پسند کریں تو اپنی کوٹھریوں کی صفائی کر سکتے تھے۔ دوسری صورت میں انہیں مجبور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا نہ ہی جیل کی طرف سے کوٹھریوں کی صفائی کا کوئی انتظام تھا۔ اگر کسی کوٹھری کے قیدی غلاظت میں رہنا پسند کرتے تھے تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ دونوں امریکی نوجوان، پیٹ اور سینسپر یوں بھی اس معاملے میں خاصے بدنام تھے۔ ان کی کوٹھری میں اکثر گندگی بکھری رہتی اس لیے چارلس کو یقین تھا کہ فرش پر سرنگ کا دہانا چھپانے کے لیے ٹائلوں کے نقشے والا جو کاغذ استعمال کیا گیا تھا اس پر دھول مٹی کی تہ کسی کے لیے شبہے کا باعث نہیں بنے گی۔

ان کے لیے سب سے اہم مسئلہ سرنگ سے برآمد ہونے والی مٹی اور پتھروں کو ٹھکانے لگانے کا تھا۔ اس کا چارلس نے یہ حل دریافت کیا کہ وہ سب باری باری اپنی قمیص میں مٹی بھر کر کھیل کے میدان میں چلے جاتے جہاں ٹہلتے ہوئے وہ قمیص میں بھری ہوئی مٹی کو آہستہ آہستہ زمین پر پھیلاتے رہتے۔ ان میں سے ہر ایک کو دن میں کئی چکر لگانے پڑتے اور اس وقت پکڑے جانے کے خوف سے ان کے دلوں کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو جاتی۔ اگر اس موقع پر انہیں کوئی محافظ یا کوئی قیدی بھی ٹوک دیتا تو ان میں سے کوئی نہ کوئی یقیناً پھٹ پڑتا۔ ان کے اعصاب میں اس حد تک تناؤ آچکا تھا کہ کوئی معمولی سی بات بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتی تھی لیکن یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ابھی تک ایسا کوئی اتفاق پیش نہیں آیا تھا۔

تاریکی اور گھٹن کے باعث سرنگ میں زیادہ دیر رکنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ چارلس اور آندرے باری باری سرنگ میں اترتے۔ اس وقت چارلس سرنگ میں تھا۔ کھدائی کرتے ہوئے چمچہ کسی پتھر سے ٹکرا گیا۔ چارلس کے اندازے کے مطابق یہ پتھر ڈیڑھ فٹ کے لگ بھگ ضرور رہا ہوگا۔ پسینے میں تر ہونے کے باعث چمچہ اس کے ہاتھ سے بار بار پھسل رہا تھا۔ گھٹن کی وجہ سے سینے میں سانس رکنے لگا لیکن وہ چونکہ اپنے آپ کو گینگ لیڈر سمجھ رہا تھا اس لیے اپنے ساتھیوں کے سامنے کمزوری کی کوئی مثال قائم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس وقت تک سرنگ سے باہر نہیں نکلا جب تک کہ اس نے پتھر کو راستے سے نہیں ہٹا دیا۔

چھ فٹ کی گہرائی تک پہنچنے کے بعد چارلس نے سرنگ کا رخ اس طرف موڑ دیا جہاں اس کے خیال میں گٹر کا پائپ ہو سکتا تھا لیکن نویں ہفتے کے شروع میں، جبکہ آندرے سرنگ میں کھدائی کر رہا تھا، اسے انتہائی غیر متوقع طور پر اینٹوں کی ایک دیوار کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ اس نے باہر آکر جب چارلس کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"نقشے میں اس طرف کوئی دیوار نہیں ہے۔"

"لیکن زمین میں دفن صدیوں پرانے کسی کھنڈر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" سینسپر نے تبصرہ کیا جسے آثارِ قدیمہ سے بھی کچھ دلچسپی تھی۔ وہ کچھ عرصہ تک مصر میں آثارِ قدیمہ تلاش کرنے والی ایک پارٹی میں بھی شامل رہا تھا لیکن ایک موقع پر جب پارٹی کے لیڈر کو پتا چلا کہ وہ منشیات کا عادی ہے تو اسے پارٹی سے نکال دیا گیا تھا۔

لیکن چارلس کا خیال تھا کہ یہاں کوئی کھنڈر بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے سرنگ میں جا کر اس دیوار کا معائنہ کیا اور حکم صادر کر دیا کہ دیوار کو توڑ کر راستہ بنایا جائے کیونکہ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک کھدائی کرتے ہوئے آندرے کا جسم بری طرح دکھ رہا تھا مگر اسے دوبارہ سرنگ میں اترنا ہی پڑا تھا۔ وہ دیوار کی اینٹوں کے جوڑوں کو کرید کر انہیں الگ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن دو گھنٹے کی کوشش کے باوجود اسے کوئی کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ اس کی جگہ چارلس نے لے لی اور تقریباً تین گھنٹے بعد جب وہ سرنگ سے باہر آیا تو اس نے بتایا کہ وہ اینٹوں کے جوڑ میں ایک دراڑ پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اس کے فوراً ہی بعد آندرے سرنگ میں اتر گیا۔ اسے اپنی کوشش جاری رکھے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہوگیا۔ اس مرتبہ اسے ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ ایک اینٹ کو اس کی جگہ سے ہلانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

دفعتاً گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ دیوار ٹوٹ گئی اور پانی کا ایک زبردست ریلا بہہ نکلا۔ سرنگ میں پانی اس قدر تیزی سے بھرا تھا کہ آندرے کو سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔ اسے ہوش آیا تو پانی اس کی گردن تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے بری طرح چیخنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سرنگ سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا لیکن نہ تو سرنگ کی دیوار پر اس کی گرفت جم رہی تھی اور نہ ہی اس کے پیر زمین کو پکڑ رہے تھے۔ اب وہ پانی میں باقاعدہ ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے موت کے بھیانک سائے رقص کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سرنگ سے باہر نکلنے کا چھ فٹ کا یہ فاصلہ کبھی طے نہ کر سکے گا۔

سرنگ کے دہانے کے قریب فرش پر بیٹھا چارلس سرنگ کے اندر سے پانی اور آندرے کی چیخوں کی آواز سن کر بری طرح بدحواس ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحہ وہ فرش پر لیٹ کر سرنگ کے اندر جھک گیا۔ سینسپر نے اس کے پیر پکڑ لیے اور چارلس نے مزید نیچے جھک کر آندرے کو اوپر کھینچ لیا اور اسے فرش پر لٹا کر پیٹ اور سینسپر کو حکم دیا کہ وہ سرنگ کے اوپر والے حصے پر جمع مٹی اور پتھر سرنگ میں پھینک کر اوپر آتے ہوئے پانی کو روکنے کی کوشش کریں۔ سینسپر اور پیٹ کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وہ بڑی عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مٹی اور پتھر سرنگ میں پھینکنے لگے لیکن ان کی یہ کوشش بارآور ثابت نہ ہو سکی اور سرنگ میں پانی بھرتا رہا۔

وہ چاروں پتھر کے مجسموں کی طرح بے حس و حرکت بیٹھے سرنگ میں بھرتے ہوئے پانی کو دیکھتے رہے۔ ان کے ذہنوں پر سناٹا سا طاری تھا۔ البتہ صرف ایک خیال بار بار گونج رہا تھا کہ صرف چند لمحوں بعد ان پر کیا قیامت ٹوٹنے والی تھی۔ پانی اب سرنگ کے کنارے تک پہنچ چکا تھا لیکن شاید تقدیر کو ان پر رحم آگیا۔ بجائے اس کے کہ یہ سیلاب کوٹھری کے فرش پر بہہ نکلتا، معجزانہ طور پر پانی وہیں رک گیا۔ ایک قطرہ بھی فرش پر نہیں آسکا تھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سرنگ میں پانی کی سطح کم ہونے لگی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ چارلس کے علاوہ ہر ایک کا چہرہ مایوسی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ چارلس نے مایوس ہونا نہیں سیکھا تھا۔

"ہم کل دوبارہ کھدائی شروع کریں گے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "مٹی نرم ہو جانے کی وجہ سے اب ہمیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

لیکن اسی رات وہاں سے تیسری کوٹھری کے فلش سے پانی بہہ نکلا۔ یہ پانی کوٹھری میں اس قدر تیزی سے بھرا تھا کہ اس کوٹھری کا لبنانی قیدی بدحواس ہو کر بری طرح چیخنے لگا۔ محافظوں نے کسی نہ کسی طرح فلش بند کر دیا۔ اس وقت کسی قیدی سے اس سلسلے میں بازپرس نہیں کی گئی لیکن صبح ہوتے ہی تمام کوٹھریوں کو چیک کیا جانے لگا کہ کہیں کسی قیدی نے اپنی کوٹھری کا فلش تو بند نہیں کر دیا جس سے پانی آگے بڑھنے کے بجائے لبنانی قیدی کی کوٹھری سے بہہ نکلا۔ چار مسلح محافظوں پر مشتمل ایک دستہ جب سینسپر اور پیٹ کی کوٹھری میں داخل ہوا تو ان سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دماغ میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں لیکن تقدیر نے یہاں بھی ان کا ساتھ دیا اور اسے ناقابلِ یقین معجزہ ہی کہا جا سکتا تھا کہ کسی محافظ کی نظر ٹائلوں کے نقشے والے کاغذ پر نہیں پڑی جو سرنگ کے منہ پر بچھا ہوا تھا۔

تمام کوٹھریوں کی تلاشی اور چیکنگ کے بعد محافظ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ لبنانی قیدی کی کوٹھری کے فلش سے بہنے والے پانی سے کسی قیدی کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی جیل کی سرگرمیاں معمول پر آگئیں لیکن ایک قباحت یہ ہوئی کہ ایک محافظ کو سینسپر اور پیٹ کی کوٹھری کے سامنے ڈیوٹی پر تعینات کر دیا گیا جہاں سے وہ اس راہداری کی تمام کوٹھریوں پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورتحال میں چارلس وغیرہ کے لیے کھدائی کا کام جاری رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔

سینسپر اور پیٹ کو اب سرنگ کی کھدائی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی کیونکہ دوسرے ہی ہفتے ان کے وکیل نے اطلاع دی تھی کہ سینسپر کے والدین نے رقم بھیج دی ہے جس سے وہ ان کی رہائی کا انتظام کر رہا ہے۔ اس اطلاع کے چوتھے دن ان دونوں امریکی نوجوانوں کو رہائی کا مژدہ سنا دیا گیا۔ رخصت ہونے سے پہلے وہ چارلس کی کوٹھری میں آئے اور دونوں بھائیوں کو بڑی گرمجوشی سے الوداع کہہ کر چلے گئے۔

چارلس سوبھراج اس صورتحال سے ذرا بھی پریشان نہیں ہوا۔ سینسپر اور پیٹ کے جیل سے رخصت ہوتے ہی اس کے شاطرانہ ذہن نے ایک اور منصوبے کے تانے بانے بننے شروع کر دیے تھے۔ دو تین دن کے انتظار کے بعد جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ دونوں یونان کی حدود سے نکل چکے ہوں گے تو اس نے چیخ چیخ کر ایک محافظ کو بلا لیا اور امریکی نوجوانوں کی کوٹھری کے فرش میں سرنگ کا انکشاف کر دیا۔ اس نے محافظوں کو بتایا کہ وہ بہت پہلے اس سرنگ کا انکشاف کر چکا ہوتا لیکن لحیم شحیم امریکی نوجوانوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے کسی کو اس سرنگ کے بارے میں اطلاع دینے کی کوشش کی تو اسے ہلاک کر دیا جائے گا۔ وہ خود چونکہ کمزور سا آدمی ہے اس لیے ان کے خوف سے اب تک خاموش رہا تھا۔ چارلس کا خیال تھا کہ اس مخبری کے انعام کے طور پر اس کی خواہش کے

مطابق اسے اسپتال میں اردلی کی حیثیت سے کام کرنے کی اجازت دے دی جائے گی جہاں سے اسے فرار ہونے کا موقع مل جائے گا۔ لیکن انعام اس کی توقع سے بہت کم نکلا۔ ایک ہفتہ کے لیے اس کے راشن کی مقدار دگنی کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے صبح کے ناشتے میں ایک کپ دودھ بھی ملنے لگا۔

لیکن چارلس پر جیل حکام کا یہ اعتماد زیادہ عرصہ تک برقرار نہ رہ سکا اور نہ ہی وہ زیادہ دنوں تک زائد مقدار میں ملنے والے راشن سے لطف اندوز ہو سکا تھا۔ کسی قیدی نے اس کے خلاف مخبری کر دی تھی کہ امریکی قیدیوں کی کوٹھری میں سرنگ کی کھدائی میں دراصل اسی کا ہاتھ تھا۔ کوشش کے باوجود چارلس معلوم نہیں کر سکا کہ مخبری کرنے والا کون تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ کوئی ایسا قیدی ہی ہو سکتا تھا جو کسی موقع پر اس کے ہاتھوں پٹ چکا ہو گا۔ بہرحال اپریل ۱۹۷۴ء کی ایک صبح کو چند مسلح محافظ چارلس کی کوٹھری میں داخل ہوئے اور اسے سرنگ کے ذریعے جیل سے فرار ہونے کا منصوبہ بنانے کے الزام میں پکڑ کر عدالت میں پیش کر دیا۔

دونوں بھائیوں میں ایک خاموش سمجھوتے کے تحت شخصیتوں کی تبدیلی کے باعث چارلس کو اب بھی آندرے ڈارلو ہی سمجھا جا رہا تھا۔ عدالت نے اسے یونانی قانون اور جیل کے قوانین کی خلاف ورزی کے جرم میں آٹھ ماہ قید کا حکم سنا دیا۔ یہ سزا چارلس کے لیے حیرت انگیز نہیں تھی لیکن جب مجسٹریٹ نے اس سزا کے اعلان کے ساتھ اسے ایجینا کے جزیرے پر واقع جیل میں منتقلی کا حکم دیا تو وہ سرتاپیر لرز اٹھا۔

گہرے سمندر میں واقع ایجینا کا یہ چھوٹا سا جزیرہ یونان میں عام طور پر شیطانی جزیرے کے نام سے مشہور ہے۔ جزیرے پر واقع جیل سے فرار ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ عمودی چٹان جس پر جیل واقع تھی، سمندر کی سطح سے سیکڑوں فٹ بلند تھی اور اس سے ٹکرانے والی سمندر کی طوفانی لہروں کا شور دل پر ہر وقت دہشت طاری کیے رکھتا تھا۔

ایتھنز سے صرف سولہ میل کے فاصلے پر واقع اس شیطانی جزیرے کی اپنی ایک تاریخ تھی۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں اس سے ایک مضبوط قلعے کا کام لیا جاتا تھا لیکن اس سے پہلے یہ چھوٹا سا جزیرہ سمندر کے راستے آنے والے حملہ آوروں کی دیکھ بھال کے لیے استعمال ہوتا رہا تھا۔ مختلف ادوار میں یہ جزیرہ مختلف قوموں کے تصرف میں رہا تھا۔ ایک زمانے میں یہ یونان کا پایۂ تخت بھی رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ جزیرہ سیاحوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ایتھنز آنے والا کوئی بھی غیر ملکی سیاح صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع اس چھوٹے سے جزیرے کو دیکھے بغیر واپس نہیں جاتا جہاں افایا کا قدیم معبد اب بھی جوں کا توں موجود ہے۔

اس جزیرے پر منتقل ہونے کے چند روز بعد ہی چارلس جزیرے کا حدود اربعہ، ایتھنز کی بندرگاہ سے اس کا فاصلہ اور دیگر ضروری معلومات حاصل کر چکا تھا۔ اس نے جیل کے محافظوں اور ان پولیس والوں کی صحیح تعداد بھی معلوم کر لی تھی جو جزیرے کی نگرانی کے لیے مستقل طور پر یہاں رہائش پذیر تھے لیکن ان معلومات سے وہ کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا کیونکہ یہ جیل اس وقت تعمیر کی گئی تھی جب یہاں کسی کو باقاعدہ آبادی کا خیال نہیں آیا تھا۔ قیدیوں کو ڈبہ نما ان چھوٹی چھوٹی تاریک کوٹھریوں میں رکھا جاتا جن کے دروازے بھی تاریک راہداریوں میں کھلتے تھے۔ تفریح جیسی کسی سہولت کا تصور ہی احمقانہ تھا۔ یہاں لائے جانے والے قیدیوں کو مرنے کے بعد ہی کوٹھریوں سے نکالا جاتا تھا۔ چارلس اگر یہاں سرنگ لگانے کے بارے میں سوچتا تو اسے سنگلاخ چٹانوں میں کم از کم پانچ سو فٹ تک کھدائی کرنا پڑتی جس کے لیے کئی سال درکار ہوتے اور بالآخر سرنگ کا دوسرا سرا اس جگہ نکلتا جہاں سمندر کی منہ زور موجیں اسے اپنی آغوش میں لینے کو تیار ہوتیں۔ چارلس دن رات فرار کے بارے میں سوچتا رہتا لیکن یہاں سے نکلنے کی کوئی ترکیب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ کوٹھری کی سنگلاخ دیواریں اسے ان قیدیوں کی داستانیں سناتی ہوئی نظر آتیں جو اس سے پہلے یہاں سے فرار کی کوشش میں سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں گر کر یا محافظوں کی گولیوں کا نشانہ بن کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ جیل کا اپنا کوئی اسپتال نہیں تھا۔ اگر کوئی قیدی زیادہ ہی بیمار ہوتا تو اس جزیرے پر رہنے والے ایک ڈاکٹر کو بلا لیا جاتا۔ قیدیوں کے نام آنے والی ڈاک کو بڑی سختی سے سنسر کیا جاتا۔ اس جیل کی اونچی دیواروں کے باہر دنیا کس حال میں تھی؛ قیدیوں کو اس کا کوئی علم نہیں ہو پاتا تھا۔ یہاں آنے والے قیدیوں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ بہت جلد اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتے تھے۔ اور یہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ رات کے سناٹے میں چارلس کو جیل کے مختلف حصّوں سے چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دیتیں تو وہ لرز اٹھتا۔

چارلس کو اگرچہ آٹھ مہینے کی سزا ہوئی تھی مگر اسے یہاں آئے ہوئے تقریباً ایک سال ہو چکا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ جیل کے اعلیٰ حکام سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنی سزا پوری کر چکا ہے، اسے رہا کیا جائے یا عدالت میں پیش کیا جائے۔ مگر جیل کے افسروں نے ہر مرتبہ اسے یہی جواب دیا تھا کہ وہ فی الحال رہائی کا خیال ذہن سے نکال دے کیونکہ آٹھ ماہ کی سزا پوری ہونے کے بعد جب تک اس کا اصل کیس عدالت میں پیش نہیں ہو گا اسے کسی دوسری جیل میں بھی منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لاقانونیت پر چارلس تلملا کر رہ گیا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ زیادہ دن تک اس جیل میں نہیں رہے گا۔ اس کے چند ہی روز بعد اتفاق سے اس کی طبیعت خراب ہو گئی چارلس اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

مناسب خوراک نہ ہونے کی وجہ سے اسے دست آنے لگے، یہ اگرچہ کوئی ایسی خطرناک بیماری نہیں تھی کہ اس کی درخواست پر ڈاکٹر دوڑا آتا لیکن وہ اپنی اس بیماری کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ کھانا لینے سے صاف انکار کر کے وہ کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس وہ اپنا کھانا خاموشی سے لے لیتا اور اسے کھانے کے بجائے کوٹھری کے ایک تاریک گوشے میں ڈھیر کر دیتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ آنکھیں اور رخسار اندر کو دھنس گئے۔ چہرے پر زردی چھا گئی اور ہر وقت بخار رہنے لگا۔ اسے کوٹھری میں ایک نوکدار پتھر مل گیا جسے وہ زور زور سے اپنے پیٹ پر رگڑتا اور ضربیں لگاتا رہتا جس کی خراشوں سے خون رِس رِس کر پیٹ پر جمنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگتا کہ پتھر کی ضربوں سے اسے اندرونی طور پر بھی کوئی نقصان پہنچا ہو تاکہ اس کے کیس کو سیریس قرار دیا جا سکے۔ بالآخر جب اس میں اپنے قدموں پر کھڑے رہنے کی سکت بھی نہ رہی تو اس نے جیل کے حکام سے درخواست کی کہ اسے ڈاکٹر کو دکھایا جائے۔

ڈاکٹر نے چارلس کا معائنہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ اسے فوری طور پر ایتھنز کے اسپتال بھیج دیا جائے تاکہ ایکسرے وغیرہ کے علاوہ اس کا تفصیلی چیک اپ کیا جا سکے۔ جیل کی اپنی ایک کشتی تھی جو بیمار قیدیوں کو لانے اور لے جانے کے لیے ہفتے میں صرف ایک بار شیطان جزیرے سے ایتھنز کا چکر لگاتی تھی۔ جس روز دو محافظوں نے چارلس کو اسٹریچر پر ڈال کر کشتی پر منتقل کیا تو جسمانی طور پر بےحد کمزور ہونے کے باوجود اس کا دماغ پوری طرح کام کر رہا تھا۔ سنگلاخ دیواروں والی اس جیل کی طرف دیکھتے ہوئے وہ عہد کر رہا تھا کہ اب اس جہنم میں واپس نہیں آئے گا۔

ایتھنز اسپتال کے ایک نوجوان ڈاکٹر نے چارلس کا خون اور یورین وغیرہ لینے کے بعد محافظوں کو ہدایت کی کہ قیدی کو جزیرے میں واپس لے جائیں کیونکہ خون وغیرہ کی ٹیسٹ رپورٹ ملنے میں ایک دو دن لگیں گے اس کے بعد مزید معائنے کے لیے اسے بلا لیا جائے گا۔ اس کے خیال میں مریض کے پیٹ میں معمولی سی تکلیف کے علاوہ کوئی بیماری نہیں تھی اور ظاہر ہے پیٹ کی اس معمولی سی تکلیف کی وجہ سے اسے اسپتال میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ چارلس کے لیے یہ صورتحال تشویشناک تھی۔ وہ ہر صورت میں اسپتال میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ اس نے پیٹ کی ان خراشوں کو بہانہ بنانا چاہا جن سے مسلسل خون رِس رہا تھا لیکن ڈاکٹر نے بتایا کہ یہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔ ممکن ہے وہ بےخیالی میں کہیں گر گیا ہو لیکن اسے یاد نہ رہا ہو۔ اگر ایکسرے اور دوسری رپورٹوں سے ظاہر ہوا کہ بلیڈنگ پیٹ کے اندر ہو رہی ہے تو اسے واپس بلا لیا جائے گا۔ چارلس کا دل بھر آیا اور وہ بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا لیکن ڈاکٹر نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور محافظوں کو بلانے کے لیے کمرے سے باہر نکل گیا۔ چارلس کو تنہائی کے چند لمحے مل گئے اور اس موقع سے اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ڈاکٹر کی میز پر کسی نرس یا مریضہ کا پرس پڑا ہوا تھا۔ جو غالباً بھول میں یہاں رہ گیا تھا چارلس پرس کی تلاشی لینے لگا اور بالآخر اسے ایک ایسی چیز مل ہی گئی جو اس کے فرار کا ذریعہ بن سکتی تھی۔

محافظ جب کمرے میں داخل ہوئے تو چارلس نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ البتہ وہ دل ہی دل میں دعا مانگتا رہا کہ اس کی تلاشی نہ لی جائے۔ اس نے اپنے آپ پر ایسی کیفیت طاری کر لی تھی جیسے قریب المرگ ہو۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر محافظوں نے اسے ہتھکڑی لگانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور اسے اسپتال کے باہر کھڑی ہوئی اس چھوٹی پولیس گاڑی میں بٹھا دیا جس میں چار قیدی پہلے ہی سے موجود تھے۔ گاڑی پائیریوس کی بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گئی جہاں انہیں کشتی کے ذریعے شیطانی جزیرے کی طرف روانہ کیا جانے والا تھا۔

جیل کی کشتی صبح انہیں بندرگاہ پر چھوڑ کر دوسرے قیدیوں کو لے کر جزیرے پر چلی گئی تھی اور اس کے واپس آنے میں تقریباً ایک گھنٹہ باقی تھا۔ چارلس وین کی چھوٹی سی کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ بندرگاہ پر خاصی چہل پہل تھی۔ ایک طرف چند بوڑھی عورتیں دن بدن بڑھتی ہوئی مہنگائی کو رو رہی تھیں۔ یہ عورتیں ایتھنز میں سودا سلف خریدنے کے بعد اپنے جزیرے میں واپس جا رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی سفید وردیوں میں ملبوس چند یونانی ملاح ٹہل رہے تھے۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر غیر ملکی سیاحوں کی ایک ٹولی زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ یہ سب وہ لوگ تھے جنہیں مختلف کشتیوں سے مختلف جزیروں پر جانا تھا۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وین کے اردگرد تقریباً دو سو افراد جمع ہو چکے تھے۔

یہی وہ موقع تھا جس سے چارلس فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے دائیں طرف بیٹھے ہوئے قیدی سے ماچس مانگی۔ قیدیوں کو عام طور پر ایسی چیزیں رکھنے کی اجازت نہیں تھی لیکن سگریٹ پینے والے قیدی اپنے لباس میں کسی نہ کسی طرح ماچس چھپا ہی لیتے تھے۔ خوش قسمتی سے چارلس کو اپنے ساتھی قیدی سے بھری ہوئی ماچس مل گئی۔ چارلس ماچس ہاتھ میں آتے ہی ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ اس نے قمیص میں چھپی ہوئی فرانسیسی سینٹ کی وہ بوتل نکالی

جواس نے ڈاکٹر کے کمرے میں نرس یا کسی مریضہ کے پرس میں سے پار کی تھی۔ بوتل کی گردن توڑ کر وہ وین میں ایک طرف رکھی ہوئی خالی بوریوں پر سینٹ چھڑکنے لگا۔ اس کے فوراً ہی بعد اس نے ماچس کی تیلی جلا کر بوریوں کی طرف اچھال دی۔ بھک کی خوفناک آواز کے ساتھ آگ بھڑک اٹھی جو چاروں طرف چھڑکے ہوئے سینٹ کی وجہ سے بڑی تیزی سے پھیلنے لگی۔

چارلس کی اس حرکت پر قیدی بوکھلا اٹھے۔ پھیلتی ہوئی آگ نے انہیں بری طرح بدحواس کر دیا تھا۔ وہ وین کی دیوار پر گھونسے برساتے ہوئے چیخنے لگے۔ قریب کھڑے ہوئے ایک محافظ نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور اندر بھڑکتی ہوئی آگ کو دیکھ کر اس نے جلدی سے وین کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ قیدی کھانستے اور چیختے ہوئے وین سے چھلانگیں لگانے لگے۔ چیخوں کی آواز سن کر آس پاس موجود بیسیوں لوگ وین کی طرف متوجہ ہو گئے۔ غیر ملکی سیاحوں نے کیمرے سنبھال لیے اور بڑی عجلت سے اس منظر کی تصویریں اتارنے لگے۔ دو قیدیوں کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ چیختے ہوئے پانی میں کود گئے۔

چارلس سوبھراج گاڑی سے کودنے کے بعد لوگوں کے ہجوم میں گھس کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ پہلے وہ محتاط انداز میں اپنے اور وین کے درمیان فاصلہ بڑھانے کی کوشش کرتا رہا پھر موقع ملتے ہی بھاگ نکلا۔ مسلسل فاقوں سے اگرچہ وہ خاصا کمزور ہو چکا تھا لیکن اس وقت وہ اپنے جسم کی تمام تر قوت دوڑنے میں استعمال کر رہا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ کسی محافظ کی نظر اس پر نہیں پڑی اور نہ ہی بندرگاہ پر موجود کسی اور شخص نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔

محافظوں کو ہوش آیا تو چارلس غائب ہو چکا تھا۔ وہ اس کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑتے رہے۔ ایک محافظ وہاں موجود لوگوں پر برس پڑا کہ انہوں نے ایک انتہائی خطرناک قیدی کو فرار ہونے سے روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی۔ محافظ کی اس ڈانٹ پر ایک بوڑھی عورت نے بڑا دلچسپ جواب دیا۔

”ہم تو سمجھے تھے کہ شاید وہ کوئی اداکار ہے اور یہاں کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔“

بڑھیا کے اس جواب پر محافظ تلملا کر رہ گیا۔

اس واقعے کے چند روز بعد پیرس میں فیلکس کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ اس کے لیے بیروت سے کال تھی۔ چند لمحوں کے بعد ریسیور پر چارلس سوبھراج کی آواز سنائی دی۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے پوچھا۔

”میں ہیلن کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ وہ کہاں ہے؟“

فیلکس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی لیکن چارلس، ہیلن اور شوبھرا کے بارے میں جاننے کے لیے بضد رہا۔

”میرا خیال ہے کہ اب تم ہیلن کو بھول ہی جاؤ تو بہتر ہے۔“ بالآخر فیلکس نے حقیقت کا انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ”ہیلن تمہیں طلاق دے کر ایک امریکی سے شادی کر چکی ہے۔ ان دنوں وہ امریکہ میں ہے۔ شوبھرا بھی اس کے ساتھ ہے۔ اب شاید تم انہیں کبھی نہ دیکھ سکو۔“

”اوہ!“ چارلس اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

”میرا پُرخلوص مشورہ ہے کہ ہیلن کا خیال دل سے نکال دو۔ اس کی پُرسکون زندگی میں زہر گھولنے کی کوشش مت کرنا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ اب بھی تم سے محبت کرتی ہے لیکن بہتر ہے کہ تم اس سے دور ہی رہو۔“ فیلکس نے جواب دیا۔

چارلس نے فون بند کر دیا۔ اس کے بعد کئی روز تک اس پر اُداسی طاری رہی۔ وہ ہر وقت اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا تاحدِ نگاہ پھیلے ہوئے سمندر کو گھورتا رہتا۔ بیروت میں اگرچہ دولت کی کمی نہیں تھی۔ ہوٹل اور کیسینو ایسے لوگوں سے بھرے ہوئے تھے جن کی جیبوں سے نوٹوں کی گڈیاں جھانک رہی تھیں لیکن چارلس کو شاید کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس پر عجیب سی قنوطیت طاری تھی۔

ایک روز ساحل کے قریب فلک بوس عمارتوں کے سائے میں ٹہلتے ہوئے وہ اپنی موجودہ صورتحال کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی جیبیں خالی ہو چکی تھیں لیکن وہ بیروت میں اپنے آپ کو بالکل مفلوج محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار خیال اُبھر رہا تھا کہ اس کا مقدر مشرق ہی سے وابستہ ہے۔ اس کا خمیر مشرق سے بنا تھا، وہ مشرق ہی میں رہ کر کچھ کر سکتا تھا۔ ابھی بہت سے ممالک ایسے بھی تھے جہاں کی پولیس اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ بعض ممالک ایسے بھی تھے جہاں متعدد کیسز میں پولیس کو مطلوب ہونے کے باوجود اپنے آپ کو کھپا سکتا تھا۔ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں اس کے لیے اب بھی بڑی گنجائش تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ دہلی میں جو کچھ ہوا تھا اس کی تفصیل ایک ہزار میل دور بمبئی میں رہنے والوں کو بھی معلوم ہو۔ یہ سوچ کر اس نے دوسرے ہی روز جہاز پر ہانگ کانگ کے لیے سیٹ بک کروالی۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر داؤ لگا تو راستے ہی میں کسی ایئرپورٹ پر غائب ہو جائے گا بصورتِ دیگر ہانگ کانگ پہنچنے کے بعد کسی اور طرف کا رخ کرے گا۔

ادھر کوری ڈالوسی جیل میں جب آندرے کو چارلس کے فرار کی خبر ملی تو اس نے وقت ضائع کیے بغیر جیل کے افسران پر انکشاف کیا کہ قیدیوں کی شناخت کے سلسلے میں ان سے ایک بہت

بڑی غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ بندرگاہ پر جلتی ہوئی پولیس وین سے فرار ہونے والا قیدی آندرے ڈارپو نہیں چارلس سوبھراج تھا۔ جبکہ اصل آندرے ڈارپو وہ خود ہے۔

آندرے کے اس انکشاف نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ جیل حکام کا خیال تھا کہ ان کے زخموں پر اس طرح نمک پاشی کبھی نہیں کی گئی تھی۔ آندرے اس انکشاف کے بعد اپنی کوٹھری میں رہائی کے احکامات کا منتظر تھا۔ چارلس نے اسے یہی بتایا تھا کہ اس کے فرار کے بعد ناموں کی غلطی کا احساس ہونے پر یونانی پولیس آندرے کو رہا کر دے گی لیکن نتائج اس کی توقع کے برخلاف نکلے۔ ایتھنز کی عدالت نے آندرے کو رہائی کا مژدہ سنانے کے بجائے اسے ترک پولیس کے حوالے کر دیا۔

استنبول کی ایک عدالت کے تین سینئر ججوں پر مشتمل بینچ نے آندرے کو اٹھارہ سال قید بامشقت کی سزا کا حکم سنا دیا۔ سزا کا حکم سنتے ہی آندرے اپنے وکیل کے بازوؤں میں جھول گیا۔ بے ہوش ہوتے ہوئے اس کے منہ سے صرف چند الفاظ نکلے تھے۔

”چارلس! بچاؤ..... اپنے بھائی کو بچاؤ۔“

جنیفر

ماریا لوبیور کا قد اگرچہ بمشکل پانچ فٹ رہا ہوگا لیکن اس کا شمار لاس اینجلس کے جنوب میں کابریلو بیچ کی چند خوبصورت ترین لڑکیوں میں کیا جا سکتا تھا۔ جنیفر کے بارے میں عام لوگوں کا تاثر یہ تھا کہ وہ اپنے محور سے ذرا کھسکی ہوئی ہے، کمر سے نیچے تک لہراتے ہوئے سیاہ ریشمی بال پورے شہر میں اس کی شناخت بن چکے تھے لیکن جب دوسری لڑکیوں نے بال بڑھانا شروع کیے تو جنیفر نے بال کٹوا کر انہیں آتشی رنگ میں رنگوا لیا۔ لڑکیاں لمبے اسکرٹ پہنتیں تو جنیفر کا اسکرٹ گھٹنوں سے اوپر پہنچ جاتا۔ لاابالی پن اس کی طبیعت کا خاصّہ تھا۔ وہ جس محفل میں جاتی وہاں صرف اسی کے تذکرے ہوتے لیکن جنیفر بہت جلد اس محفل سے اکتا کر کہیں اور پہنچ جاتی اور جب ان ہنگاموں سے طبیعت اُکتا جاتی تو اپنے کمرے میں بند ہو کے ایڈگر ایلن پو اور عمر خیام کی شاعری کا مطالعہ شروع کر دیتی لیکن جلد ہی وہ ان کتابوں کو طاق میں سجا دیتی۔ وہ ہر وقت اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرتی۔ اس کی طبیعت میں کوئی ٹھہراؤ نہیں تھا۔ بعض اوقات وہ سوچتی کہ وہ وقت سے پہلے اس دنیا میں آ گئی تھی یا سولہ سال کی عمر میں ہی وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے نارمل ثابت کرنے کے لیے اسے اپنے چہرے پر طرح طرح کے نقاب سجانے پڑ رہے تھے۔

جنیفر کا باپ رالف لوبیور ایک ماہر غوطہ خور تھا جو اپنے کام کے سلسلے میں بعض اوقات کئی کئی مہینے گھر سے غائب رہتا۔ ماں سینڈرا، ایک جفاکش عورت تھی جسے گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے دن رات کام کرنا پڑتا۔ جنیفر اس وقت آٹھ نو سال کی تھی جب ایک مرتبہ رالف اسے اپنے ساتھ گہرے سمندر میں لے گیا۔ دو دن تک جنیفر نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھائے رکھا۔ اس کے باپ کو اپنا مشن ادھورا چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد جنیفر پانی سے خوفزدہ رہنے لگی۔ اس کے چند ہی روز بعد اتفاق سے کسی بچے نے اسے تالاب میں دھکا دے دیا۔ جنیفر کو اگرچہ فوراً ہی پانی سے نکال دیا گیا تھا لیکن حواس بحال ہونے پر اس نے بتایا کہ وہ جتنی دیر پانی میں رہی، اپنے آپ کو ایک انوکھی دنیا میں محسوس کرتی رہی، جیسے وہ کئی جنم پہلے کی زندگی میں پہنچ گئی ہو۔

پانی سے جنیفر کے خوف کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اس پانی نے اس کے اور باپ کے درمیان جدائی کی ایک وسیع خلیج حائل کر رکھی تھی۔ باپ کی عدم موجودگی میں اس کا واسطہ اپنی ماں سے ہی رہتا جو دن رات کی محنت مشقت کے باعث ہر وقت غصّے سے بھری رہتی۔ جنیفر کے دو چھوٹے بہن بھائی اور بھی تھے لیکن وہ ان سے بالکل الگ تھلگ رہتی۔ گھریلو حالات نامساعد ہونے کے باعث جنیفر کو بارہ سال کی عمر ہی میں ملازمت اختیار کر لینا پڑی۔ اسکول سے چھٹی ہوتے ہی وہ ایک دولتمند پڑوس کے گھر پہنچ جاتی جہاں شام تک چھوٹے چھوٹے گھریلو کاموں کے علاوہ ان کے شیرخوار بچّے کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی۔

جنیفر ابھی نوعمر ہی تھی کہ اس کے والدین میں علیحدگی ہو گئی۔ رالف کینیڈا چلا گیا جبکہ سینڈرا ایک اور شخص سے شادی کر کے ٹیکساس منتقل ہو گئی۔ اس اجنبی ماحول میں جنیفر اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرنے لگی لیکن چند ماہ بعد اس نے سینڈرا کو آمادہ کر لیا کہ اسے تعلیم مکمل کرنے کے لیے کابریلو بیچ واپس بھیج دیا جائے۔

جنیفر کا نانا کیپ اور نانی میگی، ماہی گیری سے اپنا پیٹ پال رہے تھے۔ انہوں نے جنیفر کی ذمّہ داری قبول کر لی لیکن کچھ ہی عرصہ بعد میگی نے محسوس کیا کہ وہ زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر چکی ہے۔ کابریلو بیچ واپس آتے ہی جنیفر کو کھُل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اب وہ گھر میں بند رہنے کے بجائے پرانے دوستوں کی محفلوں کی رونق بڑھانے لگی۔ حشیش کا استعمال اور پاپ موسیقی پر والہانہ رقص کو اس نے اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔ باقاعدگی سے چرچ جانے والی لڑکی کو اب مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس کے باغیانہ خیالات نے میگی کو پریشان کر دیا۔

۱۹۷۰ء کے اوائل میں امریکہ کی نوجوان نسل میں حشیش کا استعمال عام ہو چکا تھا۔ اسکولوں میں بھی اس کا دھواں اُڑتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ سنجیدہ طبقے نے اگرچہ ۱۹۶۰ء کے آغاز ہی میں

اس چیز کو محسوس کر لیا تھا اور اگرچہ ذاتی اور سرکاری سطح پر اس کی روک تھام کے اقدامات شروع کر دیے گئے تھے لیکن یہ کوششیں قطعی ناکام ثابت ہوئیں. البتہ یہ ضرور ہوا کہ منشیات کے سلسلے میں نوجوانوں کا ٹریڈ بدل گیا. اب وہ بھنگ اور حشیش کے بجائے ایل. ایس. ڈی، کوکین، باربی چوریٹ اور ہیروئن استعمال کرنے لگے. جنیفر بھی ان تمام منشیات کی عادی ہو چکی تھی. سولہ سال کی عمر میں وہ منشیات فروخت کرنے والوں کی آلۂ کار بن چکی تھی. وہ کمیشن پر منشیات فروخت کرتی. اس طرح نہ صرف اس کی اپنی ضرورت پوری ہو جاتی بلکہ دن بھر میں دو تین ڈالر بھی کما لیتی. وہ ان منشیات کی اس حد تک عادی ہو چکی تھی کہ تھوڑی بہت مقدار اس پر بے اثر ثابت ہوتی. ایک مرتبہ اس نے مٹھی بھر گولیاں نگل لیں اور ایک دوست کے گیراج میں دو دن تک بے ہوش پڑی رہی جبکہ میگی اس کی تلاش میں شہر بھر کی خاک چھانتی رہی.

انہی دنوں سن شائن ایسڈ نامی ایک اور گولی امریکہ کے نشہ بازوں میں متعارف ہوئی. یہ چھوٹی سی ایک گولی انسان کو کئی گھنٹوں کے لیے دنیا سے غافل کر دینے کے لیے کافی تھی. اس کے استعمال سے ان دنوں امریکہ کی نوجوان نسل کی شرح اموات میں کئی گنا اضافہ ہو گیا. جنیفر کی ایک دوست کارمن نے پہلی مرتبہ اسے ایسڈ کی یہ گولی استعمال کرائی تو وہ دوسرے نشے چھوڑ کر یہی گولی استعمال کرنے لگی. یہ گولی اگرچہ زیادہ مہنگی نہیں تھی لیکن اس کے حصول کے لیے جنیفر کو کئی مرتبہ اپنے کپڑے تک فروخت کرنے پڑے. کارمن منشیات کے استعمال اور آوارگی میں جنیفر کی استاد تھی. وہ منشیات کے سلسلے میں اسے نت نئے رموز سے آگاہ کرتی رہتی.

میگی نے جنیفر کا جیب خرچ بند کر دیا. وہ اپنے نشے کی عادت پوری کرنے کے لیے اپنے کپڑے فروخت کرتی رہی. بالآخر یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا. اس کے پاس لباس کا صرف ایک جوڑا رہ گیا تھا. اس روز وہ صبح سے شام تک ایسڈ کی ایک گولی کے لیے دوستوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتی رہی لیکن اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی. بالآخر رات کو ایک اجنبی نے اس کی یہ مشکل حل کر دی ......

جنیفر کے خیال میں منشیات کے حصول کا یہ سہل ترین ذریعہ تھا. بعض اوقات باربی چوریٹ کی محض ایک گولی کے لیے وہ اپنی عزت کو نیلام کرنے میں بھی عار نہ سمجھتی.

اسی دوران جنیفر کی ملاقات کارمن کے توسط سے کوپ نامی ایک ایسے نوجوان سے ہوئی جو ضرورت مندوں کو منشیات فراہم کرنے کے علاوہ ہپناٹزم کا بھی ماہر تھا. جنیفر کے اصرار پر اس نے جنیفر پر اپنے اس فن کا مظاہرہ کیا. اس مظاہرے کے بعد جنیفر نے بتایا کہ وہ جتنا وقت ٹرانس میں رہی اپنے آپ کو بادلوں میں تیرتے ہوئے محسوس کرتی رہی.

ان تینوں کی دوستی گہری ہو گئی. وہ روزانہ رات کو جنیفر کے کمرے میں جمع ہوتے جہاں کوپ انہیں اپنے آپ کو ہپناٹائز کرنے کی تربیت دیتا. وہ گھنٹوں بے جان مجسموں کی طرح بے حس و حرکت بیٹھے خلا میں گھورتے رہتے. میگی اس صورتِ حال سے پریشان ہو گئی. ایک روز جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو فضا حشیش کی بُو سے بوجھل ہو رہی تھی. جنیفر اور کارمن بے حرکت بیٹھی خلا میں گھور رہی تھیں.

"یہ کیا ہو رہا ہے. تم لوگ یہاں بیٹھے کیا کرتے رہتے ہو؟" میگی نے باری باری ان کے چہروں کو گھورا.

"کچھ نہیں نانی! ہم لوگ اپنے آپ کو پانے کی کوشش کر رہے ہیں" جنیفر نے جواب دیا.

اس روز کے بعد جنیفر میں بتدریج تبدیلی آتی گئی. وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی جیسے واقعی اپنے آپ کو تلاش کر رہی ہو. اسی ہفتے جنیفر کی ملاقات میڈیکل کے ایک اسٹوڈنٹ سے ہوئی جس نے انکشاف کیا کہ ہپناٹزم کے ذریعے اپنے گزشتہ کئی جنموں تک کو کھنگالا جا سکتا ہے. اب جنیفر نے اس کی شاگردی اختیار کر لی. جنیفر کے اصرار پر میڈیکل اسٹوڈنٹ نے اسے ٹرانس میں لیا. تقریباً دو گھنٹے تک وہ اس سے مختلف باتیں پوچھتا رہا پھر وہ پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی ٹرانس سے نکل آئی. اس نے بتایا کہ "میں نے کچھ ایسی چیزیں دیکھی ہیں جو نہیں دیکھنا چاہیے تھیں. مجھے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ڈوب رہی ہوں".

اس واقعے کے بعد وہ ایک بار پھر منشیات کی طرف لوٹ آئی. اس کی صحت برباد ہو چکی تھی. چند روز بعد اس کا حلیہ ہی بدل گیا. ہندو سادھوؤں کی طرح الجھے ہوئے بال، بازو میں لوہے کا کڑا، گلے میں بے شمار مالائیں اور اسکرٹ بلاؤز کی جگہ دھوتی اور چادر نے لے لی تھی. منشیات کا حصول اس کے لیے اب کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ وہ اسکے حصول کیلیے انتہائی پستی تک چلی جاتی تھی. اس رات جنیفر اور کارمن کئی گھنٹوں سے کمرے میں بند حشیش پی رہی تھیں. بوڑھی میگی جب گھر میں داخل ہوئی تو یہ صورتِ حال دیکھ کر بدحواس ہو گئی. وہ جنیفر کو گھسیٹ کر دوسرے کمرے میں لے گئی اور کارمن کو حکم دیا کہ وہ فوراً سے پیشتر اس کے گھر سے نکل جائے مگر کارمن نے صاف انکار کر دیا. میگی کے غصّے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا. میگی نے دوسرے کمرے میں آ کر پولیس کو فون کیا لیکن پولیس کا جواب سن کر اس کے دیوتا کوچ کر گئے. وہ ریسیور پٹخ کر کمرے سے نکل گئی اور چیختے ہوئے اپنے شوہر کو بتانے لگی.

"سن رہے ہو. پولیس والے کہتے ہیں کہ تم اس لڑکی کو زبردستی

گھر سے نہیں نکال سکتیں. اسے پیار و محبت سے گھر سے رخصت کرنے کی کوشش کرو. اگر میں نے اس لڑکی کو کوئی نقصان پہنچایا تو پولیس اس لڑکی کی طرف سے میرے خلاف کارروائی کر سکتی ہے. یہ ہمارا قانون ہے. میں کسی نشہ باز لڑکی کو اپنے گھر سے نہیں نکال سکتی کیونکہ اس طرح میرے خلاف قانونی کارروائی ہو سکتی ہے."

دوسرے دن میگی نے نتائج سے بے نیاز ہو کر جنیفر کو بھی گھر سے نکال دیا. جنیفر شہر کے گلی کوچوں میں ماری ماری پھرنے لگی. بالآخر وہ پرنس نامی ایک سیاہ فام کے ہتھے چڑھ گئی جو آسان شرائط پر ضرورت مند لڑکیوں کو منشیات فراہم کرتا تھا. پرنس، جنیفر کو اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے آیا جہاں اس جیسی اور بھی بہت سی لڑکیاں موجود تھیں. یہاں جنیفر کو اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے پرنس کا ہر حکم ماننا پڑتا تھا۔

اسے یہ بات پسند نہیں تھی کچھ ہی عرصہ بعد جنیفر، پرنس کے خفیہ ٹھکانے سے بھاگ نکلی. اسی دوران اس کی ملاقات کرسٹوفر سے ہوئی جو ان دنوں سیٹل کے نووا اسکول میں نفسیات کا استاد تھا لیکن جلد ہی اس نے یہ ملازمت چھوڑ دی. وہ یوگا، مراقبہ اور نفس کشی کا ماہر تھا. جنیفر پہلی ہی ملاقات میں اس کے سامنے جھک گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی زندگی ایک بار پھر راستہ بدلنے لگی. منشیات کا استعمال اگرچہ جاری رہا لیکن اس کی صحت ٹھیک ہونے لگی. کڑا اور مالائیں اتار پھینکیں اور دھوتی اور شال اتار کر ڈھنگ کا لباس پہننے لگی.

وہ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے. اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ دونوں کا بچپن محرومیوں میں گزرا تھا. وہ دونوں والدین کی محبت و شفقت کو ترستے رہے تھے. کرسٹوفر کے والدین ایک ہوائی حادثے میں ہلاک ہو چکے تھے. وہ اگرچہ والدین کی اکلوتی اولاد تھا لیکن جائیداد کے حصول میں جو قانونی دشواریاں پیش آ رہی تھیں انہیں دیکھتے ہوئے اس نے جائیداد کا خیال ذہن سے نکال دیا اور تمام تر توجہ نفس کشی کی طرف مبذول کر دی. اب جنیفر بھی اس کے ساتھ شامل ہو چکی تھی. وہ بے غرض دوستوں کی طرح ساتھ رہنے لگے لیکن عشق و محبت سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی. یوگا اور نفس کشی نے جنیفر کو بھی اس راہ پر ڈال دیا اور وہ نروان کی تلاش میں اس راہ پر آگے بڑھتے رہے.

ایک روز کرسٹوفر نے اعلان کیا کہ وہ نروان کی تلاش میں دنیا کے دور دراز خطوں تک جانا چاہتا ہے. جنیفر بھی اس کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گئی اور وہ دن رات محنت کر کے رقم جمع کرنے لگے. بالآخر ایک روز وہ ایک نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے.

وہ ایک سال تک آوارہ گردی کرتے رہے. ایک روز مالٹا کے ساحل پر جنیفر کو ایک ایسا پتھر ملا جس پر انسانی نقش بنے ہوئے تھے. کرسٹوفر نے اس پتھر کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ یہ نقش مہاتما بدھ کے ہیں. بدھ کا نام سنتے ہی وہ چھوٹا سا پتھر جنیفر کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا اور سمندر کی لہریں اسے اپنے ساتھ بہا کر لے گئیں. اس واقعہ کے بعد سے جنیفر پر ایک عجیب سی کیفیت طاری رہنے لگی. اس کے تیسرے دن وہ استنبول کے لیے روانہ ہو گئے.

استنبول میں چند روز قیام کے بعد وہ بس، ٹرین اور ہچ ہائیکنگ کے ذریعے دنیا کی خاک چھانتے ہوئے ایران پہنچ گئے. برفباری کی وجہ سے افغانستان کے راستے بند ہو چکے تھے. انہیں تقریباً ایک ماہ ایران میں رکنا پڑا پھر ہرات کے راستے افغانستان میں داخل ہوئے جہاں ایک ٹرک ڈرائیور نے انہیں لفٹ دے دی اور وہ درۂ خیبر سے گزر کر پاکستان سے ہوتے ہوئے ہندوستان کی حدود میں داخل ہو گئے. ہندوستان نے جنیفر کو بہت متاثر کیا لیکن جب ایک ہندو تاجر نے جنیفر کی قیمت لگانا چاہی تو وہ.... بوریا بستر سمیٹ کر گوا کی طرف روانہ ہو گئے. ۱۹۶۰ء میں بیٹلز اور میا فیرو کی آمد کے بعد گوا کا ساحلی علاقہ دنیا بھر کے نوجوانوں کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا. گیان اور نفس کشی کے رسیا جوق در جوق اس طرف آنے لگے. دس سال کے عرصے میں گوا کے ساحلی علاقے ہپیوں کی چھوٹی چھوٹی بستیوں سے آباد ہو چکے تھے. بعض ہپیوں نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی. گھاس پھونس کا جھونپڑا نما مکان دس ڈالر ماہانہ کرائے پر آسانی سے دستیاب ہو جاتا لیکن جن دنوں جنیفر اور کرسٹوفر گوا پہنچے وہ شدید گرمی کا موسم تھا. ساحل کی تپتی ہوئی ریت پر چند قدم چلنا مشکل ہو رہا تھا.

ایک رات ایک ساحلی ریسٹورنٹ میں ان کی ملاقات ایک ایسے امریکی نوجوان سے ہوئی جو نیپال کے دارالحکومت کھٹمنڈو میں ایک مہینہ رہ کر آیا تھا. اس نے بتایا کہ کھٹمنڈو میں بدھ مت کے پیروکاروں کی ایک ایسی خانقاہ بھی موجود ہے جہاں یورپین نوجوانوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے. اس امریکی نوجوان نے بتایا کہ وہ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر امریکہ واپس جا رہا ہے لیکن وہ ایک نہ ایک دن واپس آئے گا تاکہ ہمالیہ کی ان ترائیوں میں نفس کشی میں کھو کر نروان حاصل کر سکے.

جنیفر، امریکی نوجوان کی باتوں میں اس طرح کھو گئی کہ وہ اپنے آپ کو ہمالیہ کی ترائیوں میں بھٹکتے ہوئے محسوس کرنے لگی. وہ نیند میں بھی یہی خواب دیکھتی رہتی مگر کرسٹوفر نے وہ رات جاگتے ہوئے گزاری. وہ اب تک کسی الہیاتی چیز کی تلاش میں بھٹکتا رہا تھا اور اب اس امریکی نوجوان کی باتیں سننے کے بعد اسے نجانے یہ

یقین کیوں ہو چلا تھا کہ اسے جس چیز کی تلاش تھی وہ اسے بدھ مت ہی میں مل سکے گی۔ دوسرے روز جب اس نے بتایا کہ وہ کھٹمنڈو بھی جائیں گے تو جنیفر کی گویا دلی مراد بر آئی لیکن بہت جلد اس نے محسوس کر لیا کہ کرسٹوفر اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اگرچہ اب بھی جنیفر سے محبت کا اعتراف گاہے بگاہے کرتا رہتا لیکن جنیفر اس کے قول و فعل کا تضاد بڑی شدّت سے محسوس کر رہی تھی۔ اب کرسٹوفر اس سے دور رہنے کی کوشش کرتا۔ جنیفر جب اسے متوجہ کرنے کی کوشش کرتی تو وہ بہانہ بنا دیتا کہ اسے ذہنی یکسوئی کی ضرورت ہے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ کرسٹوفر آدھی رات کو کمرے سے نکل کر باہر چلا جاتا اور ساحل کی ریت پر تنہا بیٹھا خلا کو گھورتا رہتا۔ جنیفر نے اپنے آپ کو کبھی اتنا تنہا اور ایسا بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔ کرسٹوفر جب کبھی آواگون، نروان اور تبت کے لاماؤں کی تعلیمات کا ذکر چھیڑتا تو جنیفر اس کی باتوں میں بھرپور دلچسپی کا اظہار کرتی۔ اس کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا کہ وہ اس کی توجہ حاصل کر سکے۔

ایک رات جب کہ نوجوانوں کا ایک گروہ پام کے ایک درخت کے نیچے بیٹھا حشیش کا دھواں اڑا رہا تھا، کرسٹوفر اور جنیفر بھی وہاں پہنچ گئے۔ کرسٹوفر تو جلد ہی دو تین نوجوانوں سے نروان کی بحث میں الجھ گیا اور جنیفر حشیش پینے والے نوجوانوں کی ٹولی میں شامل ہو گئی۔ بہت عرصہ بعد اسے حشیش پینے کو ملی تھی۔ آدھی رات تک وہ نشے میں دُھت ہو چکی تھی اور پھر والہانہ انداز میں رقص کرتے ہوئے دفعتاً اُس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اسکے قہقہے سب میں نمایاں تھے۔ صبح جب ہوش میں آئی تو اپنے آپکو ایک ہپی نوجوان کے جھونپڑے میں پا کر گڑبڑا سی گئی۔

اپنے جھونپڑے میں پہنچ کر اس نے اپنی اس حرکت پر ندامت کا اظہار کیا تو کرسٹوفر افسردہ سے لہجے میں بولا۔

"جب تک تم بدھ فلسفہ کو نہیں سمجھ سکو گی اس وقت تک ایسی حرکتیں کرتی رہو گی۔"

گوا سے واپسی پر دہلی میں صرف ایک روز قیام کے بعد وہ بذریعہ طیارہ کھٹمنڈو روانہ ہو گئے۔ ہمالیہ کی چوٹی پر پرواز کرتے ہوئے وہ اپنے آپ میں کچھ عجیب سی کیفیت محسوس کر رہے تھے۔ کھٹمنڈو پہنچتے ہی کرسٹوفر نے ایئرپورٹ ہی سے کچھ معلومات حاصل کیں اور کوپان خانقاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہمالیہ کے دامن میں واقع اس وادی کا شمار دنیا کی حسین ترین وادیوں میں کیا جا سکتا تھا۔ کوپان کی یہ خانقاہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں زینا نامی ایک روسی شہزادی نے تعمیر کرائی تھی تاکہ نروان کی تلاش میں آنے والے یورپی نوجوان یہاں قیام کر سکیں۔ خانقاہ تک صرف پیدل پہنچا جا سکتا تھا۔ راستہ انتہائی دشوار گزار اور خطرناک تھا۔ کئی لوگ وہاں تک پہنچنے کی کوشش میں اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

کھٹمنڈو کے نواح میں واقع ایک بدھ اسٹوپا میں چند گھنٹے قیام کے بعد جنیفر اور کرسٹوفر پہاڑی چٹانوں میں بل کھاتی ہوئی اس خطرناک پگڈنڈی پر چل پڑے جس پر دو تین آدمی بمشکل پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے۔ وادی میں تاحدِ نگاہ دھان کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ فضا میں دھان کی مہک رچی ہوئی تھی۔ اس تنگ سی پگڈنڈی پر کاشتکاروں کے مویشیوں کی بھی آزادانہ آمد و رفت تھی۔ کبھی کوئی بھینس یا بیل وغیرہ سامنے سے آتا ہوا نظر آ جاتا تو انہیں چٹان کے ساتھ چپک جانا پڑتا۔ جگہ جگہ انہیں کاشتکاروں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی نظر آئیں جہاں قریب ہی کھیتوں میں کام کرنے والی عورتیں انہیں دیکھ کر خیرسگالی کے انداز میں ہاتھ ہلا دیتیں۔

کوپان کی خانقاہ ایک پہاڑی چوٹی پر واقع ہے جو چوبیس گھنٹے دبیز دھند اور بادلوں میں ڈھکی رہتی ہے۔ دور سے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے جیسے یہ عمارت فضا میں معلق ہو۔ قرب و جوار کی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہائشی انتظامات کی وجہ سے خانقاہ میں آنے والوں کو کم از کم رہائش کے مسئلے سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ ڈیڑھ روپے یومیہ پر رہائش کے لیے جگہ دستیاب ہو جاتی ہے لیکن چونکہ جنیفر اور کرسٹوفر کو اخراجات میں خاصی دشواریاں پیش آ رہی تھیں اس لیے انہوں نے کوئی جھونپڑا کرائے پر حاصل کرنے کے بجائے کھلی جگہ میں چھولداری لگانے کا فیصلہ کیا۔

جنیفر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ دنیا کی چوٹی پر پہنچ چکی ہے۔ جہاں اسے کم از کم تیس دن قیام کرنا تھا۔ اس دوران انہیں بدھ مت کے فلسفے کی تعلیم اور نفس کشی کے طریقوں اور فوائد سے آگاہ کیا جانے والا تھا لیکن پہلے دن کے لیکچر پر وہ پوری طرح توجہ نہ دے سکی کیونکہ اس کا زیادہ وقت سر اور کپڑوں سے جوئیں نکالتے ہوئے گزرا تھا۔

وہ صبح پانچ بجے اٹھ جاتے۔ ایک گھنٹہ گیان اور منتروں کی تربیت کے بعد وہ مخصوص انداز میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے اور صبح کی طلوع ہوتی ہوئی روشنی میں مہاتما بدھ کی شبیہہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔ ناشتے میں صرف جو کا دلیہ اور دہی ملتا۔ اس کے بعد ان کی کلاسیں شروع ہو جاتیں۔ پہلے لاما یاشی کلاس لیتا پھر لاما تبتسن زوپا رنپوشی انہیں بدھ مت کی تعلیمات پر لیکچر دیتا۔ لاما رنپوشی کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ تین سال کی عمر میں اس کے اندر ایک مرحوم لاما کی روح حلول کر گئی تھی۔

لاما ہال کے وسط میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا۔ اس کے سامنے شیشے کا وہ کیس رکھا ہوا تھا جس میں مہاتما بدھ کے چھوٹے چھوٹے لاتعداد مجسمے سجے ہوئے تھے۔ وہ مہاتما بدھ کی تعلیمات کا

پرچار کرتے اور یہی سبق دیتے کہ کرم (بدھ مت کا فلسفہ) کو سمجھ لینے کے بعد نروان حاصل کر لینا زیادہ مشکل نہیں۔

مہینے کے اختتام تک یہ حیرت انگیز تبدیلی دیکھنے میں آئی کہ کرسٹوفر تو مہاتما بدھ کی تعلیمات سے دور ہوتا گیا لیکن جنیفر اپنے آپ کو گویا اس کے لیے وقف کر چکی تھی۔ اسے اب اس کی بھی پروا نہیں تھی کہ کرسٹوفر اس سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ زندگی بھر بھٹکنے کے بعد اسے ایک ایسا راستہ مل گیا تھا جس پر چلتے ہوئے وہ منزل پر پہنچ سکتی تھی۔

جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ سے روانہ ہونے والی پین امریکن ایئرلائن کی پرواز نمبر ۲۱ کے بوئنگ ۷۴۷ کے پہیوں نے ۱۴ مئی ۱۹۷۵ء کو جس وقت تہران ایئرپورٹ کے رن وے کو چھوا اس وقت تہران میں شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ یہ پرواز اپنے مقررہ وقت سے بہت لیٹ ہو چکی تھی اس لیے طیارے کے مائیک سسٹم سے ٹرانزٹ مسافروں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ جہاز سے نیچے نہ اتریں کیونکہ یہ پرواز یہاں زیادہ دیر نہیں رکے گی۔

اس طویل سفر نے مسافروں کو بری طرح تھکا دیا۔ وہ جہاز کے کپتان کی اس ہدایت پر عمل کرنے پر مجبور تھے لیکن وہ نوجوان فرانسیسی لڑکی اور اس کا دوست ان ہدایات کو نظرانداز کرتے ہوئے ٹانگیں سیدھی کرنے اور تازہ ہوا میں سانس لینے کے لیے اپنی سیٹوں سے اٹھ کر دروازے میں آ گئے جہاں موجود ایئرہوسٹس نے مسکراتے ہوئے انھیں دیکھا۔ وہ فرانسیسی لڑکی جین چومیر تھی۔ ملک کے دور افتادہ قصبے میں پرورش پانے والی جین ایئرہوسٹس بننے کی خواہش لے کر پیرس آئی تھی۔ وہ ایئرہوسٹس تو نہ بن سکی البتہ ایک ایئرلائن کے ٹکٹنگ کے شعبہ میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کا ساتھی کرسٹن روشر اسی شعبے سے وابستہ تھا۔ وہ دونوں دس دن کی چھٹیاں منانے کے لیے ہندوستان جا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کم از کم ایک ہفتہ کشمیر کی وادی میں گزاریں گے جس کے بارے میں انہوں نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔

وہ دونوں سیڑھی کے پلیٹ فارم پر کھڑے اس سفر کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ کسی کی آواز سن کر پیچھے مڑ گئے۔ وہ دُبلا پتلا سا آدمی تھا۔ سر پر گولف کیپ، آنکھوں پر تاریک شیشوں والی عینک اور فرنچ کٹ داڑھی نے اسے خاصا مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ وہ دروازے میں کھڑی ایئرہوسٹس سے کسی بات پر بحث کر رہا تھا۔ اس کے چہرے کے بگڑے ہوئے تاثرات اس کی اندرونی کیفیت کا اظہار کر رہے تھے۔ جین اور کرسٹن اپنی باتیں چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس کا اصرار تھا کہ وہ اپنی پسند کے سگریٹ خریدنے کے لیے نیچے اترنا چاہتا تھا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنی بات منوانے کا عادی ہے۔ ایئرہوسٹس نے اس سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اسے ٹرمنل تک جانے کی اجازت دے دی لیکن اس شرط پر کہ وہ زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں واپس آ جائے گا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کرسٹن نے بھی ٹرمنل تک جانے کی اجازت طلب کر لی اور ظاہر ہے ایئرہوسٹس کے لیے انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

جہاز سے اترنے والے یہ دونوں مسافر ٹرمنل میں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ اس سلسلے میں پہل اس ہپی نے ہی کی تھی جو زبردستی جہاز سے اترا تھا۔ اس نے ایلین گوتھر کے نام سے اپنا تعارف کرایا تھا لیکن ظاہر ہے یہ ہپی چارلس سوبھراج کے سوا کون ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو پیرس سے شائع ہونے والے اخبار "پیرس میچ" کا فوٹوگرافر ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اخبار کے لیے ایک خصوصی تصویری فیچر کی تیاری کے سلسلے میں دہلی جا رہا ہے کیونکہ فرانس کے باشندے ان دنوں ہندوستان کی سیاحت میں خاصی دلچسپی لے رہے تھے اور اسے یقین تھا کہ اس کا یہ تصویری فیچر نہ صرف فرانس کے لوگوں کے لیے بلکہ اس کے اخبار کے لیے بھی منافع بخش ثابت ہو گا۔

بیس منٹ بعد جہاز تہران سے دہلی کے لیے روانہ ہو گیا۔ پرواز ہموار ہوتے ہی چارلس اپنی سیٹ سے اٹھ کر ٹہلتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا جہاں کرسٹن اور جین بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر اجازت طلب کیے بغیر وہ نہایت بے تکلفی کا مظاہرہ کرتا ہوا سیٹ کے بازو پر ٹک گیا اور انہیں ہندوستان کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کرنے لگا۔ گفتگو کے دوران جب چارلس کو معلوم ہوا کہ وہ دونوں کشمیر جا رہے ہیں تو وہ زور زور سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"عجیب اتفاق ہے۔ میرا بھی پہلے کشمیر ہی جانے کا پروگرام ہے، تم لوگوں کے ساتھ اچھی خاصی تفریح رہے گی۔"

چارلس نے انہیں بتایا کہ وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ کشمیر جا چکا تھا اگر دونوں اس کے ساتھ رہے تو وہ ان کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہو گا۔ کسی سیاح کے لیے اجنبی ملک میں رہائش کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم اور سنگین ہوتا ہے۔ چارلس نے بتایا کہ سری نگر میں وہ ان کے لیے ہاؤس بوٹ کا انتظام کر سکتا ہے۔

جہاز کے دہلی پہنچنے تک چارلس انہیں پوری طرح متاثر کر چکا تھا۔ اس کی اب تک کی باتوں سے جین اس نتیجہ پر پہنچی تھی کہ فرانس کا یہ ہپی فوٹوگرافر ان کے لیے واقعی بہترین اور سودمند راہنما ثابت ہو سکتا ہے۔ دہلی ایئرپورٹ کے ٹرمنل میں داخل ہوتے وقت جین اور کرسٹن کچھ عجیب سا محسوس کر رہے تھے۔ امیگریشن اور کسٹمز کاؤنٹر کے سامنے سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی مسافروں کی طویل

قطاروں کو دیکھ کر جین پریشان سی ہوگئی۔ اس کا خیال تھا کہ ان قطاروں میں ان کی باری صبح سے پہلے نہیں آئے گی لیکن اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ایلین گوتھر آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں کسٹمز اور امیگریشن سے نمٹ چکا تھا۔

دہلی کی رینگتی ہوئی سڑکوں پر ٹیکسی میں سفر کرتے ہوئے ایلین گوتھر انہیں راستے میں آنے والی مختلف عمارتوں کے بارے میں معلومات فراہم کر رہا تھا۔ کبھی وہ ٹیکسی ڈرائیور کو ٹوک دیتا کہ گاڑی آہستہ چلائے تاکہ وہ اپنے دوستوں کو مختلف سڑکوں اور عمارتوں کے بارے میں بتا سکے اور کبھی وہ ڈرائیور پر برس پڑتا کہ وہ اپنا کرایہ بڑھانے کے لیے جان بوجھ کر طویل راستہ اختیار کر رہا ہے۔

"اس ملک کا ہر شخص چور ہے۔" ایلین گوتھر نے جین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب اگر اس ڈرائیور نے اپنا کرایہ بڑھانے کے لیے ٹیکسی کو کسی غلط راستے پر موڑا تو میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔"

جین اور کرسٹن ہوٹل میں پہنچتے ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے تھے۔ صبح ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ جین نے حیرت سے کرسٹن کی طرف دیکھتے ہوئے ریسیور اٹھا لیا۔ وہ ایلین گوتھر تھا جو لابی میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ جب نیچے پہنچے تو ایلین گوتھر نے اس طرح ان کا استقبال کیا جیسے بچپن کے دوست طویل عرصے بعد ملے ہوں۔ اس نے دوستی کی یادگار کے طور پر ایک طلائی انگوٹھی جین کو اور کرسٹن کو ایک چھوٹا سا خنجر تحفے میں پیش کیا جس کے دستے پر مصنوعی نگینے جڑے ہوئے تھے۔ وہ جب ہوٹل سے باہر نکلے تو دروازے پر ایک کار ان کی منتظر تھی جو ایلین گوتھر نے انہیں شہر کی تفریح کرانے کے لیے کرائے پر حاصل کی تھی۔

لال قلعہ، جامع مسجد اور ہمایوں کا مقبرہ دیکھتے ہوئے وہ چاندنی چوک پہنچ گئے۔ جین، ایلین گوتھر کی معلومات پر بار بار حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔ وہ ایک ماہر گائڈ کی طرح ہر چیز کے بارے میں تفصیل سے بتا رہا تھا۔ چاندنی چوک پر انہیں لنگڑے لولے بھکاریوں نے گھیر لیا لیکن ایلین گوتھر انہیں بھکاریوں کی یلغار سے بچاتا ہوا لے جا رہا تھا۔ اس نے ان دونوں کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ کسی بھکاری پر ترس نہ کھائیں کیونکہ یہ لوگ پیشہ ور بھکاری ہیں اور دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اپنے ہاتھ پیر توڑ لیتے ہیں۔ اس نے انہیں خوانچے والوں سے کوئی چیز خریدنے سے بھی منع کر دیا تھا۔

شہر کی مختلف سڑکوں پر گھماتا ہوا ایلین گوتھر انہیں موتی محل ریسٹورنٹ لے آیا۔ تندوری نان اور مرغ مسلم کھاتے ہوئے جین کی نظریں ہال میں بھٹکتی رہیں۔ زیورات سے لدی پھندی ایک بھاری بھرکم رقاصہ موسیقی کی دھنوں پر گاہکوں کا دل بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پیرس کے نائٹ کلبوں میں بھی اگرچہ ایسی لغویات کی کمی نہیں تھی لیکن جین کو یہ مشرقی رقص کچھ زیادہ ہی پسند آیا تھا اور وہ بار بار سوچ رہی تھی کہ اگر ایلین گوتھر سے ملاقات نہ ہوتی تو وہ ایسی چیزوں سے یقیناً محروم رہ جاتی۔ کھانے کے دوران وہ وقتاً فوقتاً ایلین کی طرف بھی دیکھ لیتی۔ ایلین میں اگرچہ اس کے لیے کوئی جاذبیت نہیں تھی لیکن اس کے چہرے کے مشرقی نقوش میں کوئی ایسی کشش ضرور تھی جو اسے اس میں دلچسپی لینے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس کے لب و لہجے میں بھی کوئی ایسا تاثر تھا کہ گفتگو کے دوران اگر ایلین بات شروع کر دیتا تو وہ دونوں اپنی بات ادھوری چھوڑ کر پوری توجہ سے اس کی بات سننے لگتے۔ اس رات سونے سے پہلے جین نے اپنی ڈائری میں صرف چند جملے لکھے۔

"خوش قسمتی سے میری ملاقات پیرس کے ایک معروف صحافی اور صفِ اوّل کے فوٹو گرافر سے ہوگئی، اس کا نام ایلین گوتھر ہے اور وہ ہندوستان کی ہر چیز کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ دوسرے موضوعات پر بھی اس کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ اسے چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ کل ہم اس کے ساتھ کشمیر جا رہے ہیں۔"

دوسرے دن سرینگر روانہ ہونے سے پہلے ایلین کو جین سے تنہائی میں ملاقات کا موقع مل گیا۔ وہ جیب سے کاغذ اور قلم نکالتے ہوئے بولا۔

"اچھا ہوا تم اکیلی ہو۔ میں تم سے ایک چھوٹا سا کام لینا چاہتا ہوں۔"

"کیسا کام؟" جین نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے کچھ ضروری ٹیلیگرام دینے ہیں لیکن میری انگلش کچھ کمزور ہے۔ اگر تم فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ کر سکو تو مشکور ہوں گا۔"

جین کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ہر ٹیلیگرام کے پیغام سے ظاہر ہوتا تھا جیسے ایلین گوتھر کا بزنس پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہو۔

"رقم بھجوا رہا ہوں۔"

"بنکاک کے لیے نیا پروجیکٹ تیار کر لیا گیا ہے۔"

"رقم ہانگ کانگ کے پتے پر بھیج دو۔"

یہ ٹیلیگرام پیرس، مارسلز، ایتھنز، استنبول اور ہانگ کانگ کے مختلف لوگوں کے نام بھیجے گئے تھے لیکن جین کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس نے کسی ٹیلیگرام پر ایلین گوتھر کا نام لکھوایا تھا اور کسی پر چارلس! اس نے جب اس سلسلے میں دریافت کیا تو ایلین گوتھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"تمہارے لیے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔ ہم فرانسیسی اکثر دو دو اور بعض اوقات کئی کئی ناموں کی عرفیت

استعمال کرتے ہیں۔ بعض لوگ مجھے ایلین کہہ کر پکارتے ہیں اور بعض چارلس۔ ویسے میرے قریبی دوست مجھے جیری بھی کہتے ہیں۔"

ایلین کی اس وضاحت پر جین نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

ہمالیہ کی گود میں پھیلی ہوئی کشمیر کی وادی کو جنّتِ ارضی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ پُرپیچ اور خطرناک راستوں کے باعث یہ جنّت نظیر وادی طویل عرصہ تک دنیا کی نگاہوں سے اوجھل رہی لیکن سولہویں صدی میں جب پہلی مرتبہ مغل شہنشاہ اکبرِ اعظم آگرے کی گرمی سے گھبرا کر کشمیر پہنچا تو اس کے ساتھ ہی اس وادی کی قسمت بھی جاگ اٹھی۔ اکبر کے بعد بیشتر مغل فرمانروا کشمیر کو رونق بخشتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے امراء اور دولتمند لوگ گرمیاں گزارنے کے لیے کشمیر کا رخ کرنے لگے۔

کشمیر کے اصل باشندے مسلمان ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے ساتھ ہی کشمیر بھی دو حصّوں میں بٹ گیا۔ آدھا حصّہ پاکستان میں شامل ہوگیا اور باقی نصف پر بزورِ طاقت ہندوستان نے قبضہ جما لیا لیکن مسلمان ہونے کے ناتے ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کے باشندوں کی وفاداریاں پاکستان سے وابستہ ہیں۔ یہ معصوم اور سیدھے سادے لوگ ہندوستان کے چنگل سے نکلنے کے لیے آج بھی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

کشمیر کی بلند پہاڑی چوٹیاں سال کے بارہ مہینے برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ موسم بہار میں یہ وادی عجیب سماں پیش کرتی ہے۔ ڈھلوانوں پر سبزے اور رنگ برنگے پھولوں کا فرش اور خوشبو سے لدی ہوئی ہوائیں فضا میں ایسا سحر طاری کرتی ہیں کہ ان کے حصار سے نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ وادی کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے والی سرحد کے دونوں طرف پاکستانی اور بھارتی فوجی دستے گشت کرتے رہتے ہیں لیکن ان سے سیّاحوں کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

سرینگر کا ایئرپورٹ زیادہ بڑا نہیں ہے۔ سردیوں میں یہ ہوائی اڈہ عام طور پر ویران ہی رہتا ہے لیکن سیزن شروع ہوتے ہی یہاں کی رونق لوٹ آتی ہے۔ پھولوں کے ہار فروخت کرنے والی لڑکیاں، ہوٹلوں اور ہاؤس بوٹس کے ایجنٹ اور پیشہ ور پنڈت جہاز سے اترنے والے مسافروں کو اس طرح گھیر لیتے ہیں جیسے ان سے کوئی پرانا قرضہ وصول کرنا چاہتے ہوں۔ اس صورتِ حال نے جین اور کرسٹن کو بدحواس سا کر دیا تھا۔ وہ ایک طرف سے اپنا دامن چھڑاتے تو دوسری طرف سے کوئی اور انہیں اپنی طرف کھینچنے لگتا۔ اس موقع پر بھی ایلین گوتھر ہی ان کے کام آیا تھا۔

"کوئی چیز خریدنے یا کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے ساتھ چلتے رہو۔"

ایلین گوتھر انہیں لے کر ایک طرف بڑھتا رہا پھر ایک جگہ رکنے کا اشارہ کر کے ہجوم میں غائب ہوگیا۔ جین پسینہ پونچھتی ہوئی ایک بنچ پر بیٹھ کر بدحواس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ دفعتاً اس کی نظریں ایک اور غیر ملکی لڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ شکل و صورت بس واجبی سی تھی، چہرے پر بدحواسی کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے لباس سے جین کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اس کا تعلق برطانیہ کے نچلے طبقے سے تھا۔ ممکن ہے وہ لندن یا مانچسٹر کی کسی تجارتی کمپنی کی معمولی سی کلرک یا کوئی سیلز گرل رہی ہو۔ ناک پر ٹکی ہوئی نظر کی عینک کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ جین کے اندازے کے مطابق اس کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس لڑکی نے بھی جین کو دیکھ لیا تھا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں خفیف سے انداز میں مسکرا دی تھیں۔ اسی وقت ایک دراز قامت شخص پسینہ پونچھتا ہوا لڑکی کے قریب آگیا۔ اس کی صورت بھی بس واجبی سی تھی، عمر کا اندازہ پینتیس اور چالیس کے درمیان لگایا جا سکتا تھا۔ جین دل ہی دل میں مسکرا دی۔ وہ غالباً میاں بیوی تھے اور جین کے خیال میں ایک دوسرے کے لیے بہت مناسب تھے۔ مرد نے لڑکی کا ہاتھ تھام لیا اور وہ دونوں ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے ایک طرف نکل گئے۔ چند ہی سیکنڈ بعد ایلین گوتھر بھی کرسٹن کو کھینچتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

"سرینگر کی سب سے اچھی ہاؤس بوٹ کے دام آسمان کو چھو رہے ہیں۔ اگر کوئی دوسری پارٹی ہمارے ساتھ شامل ہو جائے تو ہم وہ ہاؤس بوٹ کرائے پر لے سکتے ہیں۔" ایلین گوتھر کہتے ہوئے متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"اوہ۔" جین اچھل پڑی۔ "ابھی ابھی میں نے ایک غیر ملکی جوڑے کو دیکھا تھا۔ وہ غالباً برطانوی ہیں۔ میرا خیال ہے وہ بھی رہائش ہی کے سلسلے میں پریشان ہیں اگر ان سے بات کی جائے تو ممکن ہے وہ ہمارے ساتھ مل کر ہاؤس بوٹ لینے پر آمادہ ہو جائیں۔"

"گڈ۔ انہیں تلاش کرو۔ میں ان سے بات کر دوں گا۔" ایلین گوتھر نے کہا۔

جین لوگوں کو دھکیلتی ہوئی تیزی سے اس طرف بڑھ گئی جس طرف وہ دونوں غیر ملکی گئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اس لڑکی اور اس کے ساتھی کو لے کر آگئی۔ جین نے اس لڑکی سے انگریزی میں بات کی تھی جس نے جواب بھی اگرچہ انگریزی میں ہی دیا تھا مگر لہجہ انگریزی نہیں تھا۔ ناموں کی حد تک مختصر سا تعارف وہیں کھڑے کھڑے ہوگیا۔ وہ کنیڈا کے ایک چھوٹے سے شہر کیوبک کی رہنے والی میری آندرے تھی اور اس کے ساتھی برنارڈ کا تعلق بھی کنیڈا ہی سے تھا۔

ایلین گوتھر نے کسی جھجک کا مظاہرہ کیے بغیر میری آندرے کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور اس طرح گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا جیسے کوئی جوہری کسی ہیرے کو پرکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ زیرِ لب کچھ... بڑبڑایا بھی تھا جس کا مفہوم قریب کھڑی ہوئی جین نے یہ لیا کہ میری آندرے، ایلین گوتھر کی سابق بیوی سے بہت حد تک ملتی جلتی تھی۔ وہ ابھی آپس میں پوری طرح متعارف بھی نہ ہو پائے تھے کہ ایک ہاؤس بوٹ کا ایجنٹ ایلین گوتھر کو بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا ایک طرف لے گیا۔ چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان ابل رہا تھا۔

"چور، لٹیرے۔ ان کا بس چلے تو یہاں آنے والے سیاحوں کے کپڑے تک اتار لیں!"

ہاؤس بوٹ کا ایجنٹ ایک بار پھر اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ واپس آکر اس نے اپنے ساتھیوں کو سامان اٹھانے کو کہا لیکن پھر سامان رکھوا دیا۔ تین مرتبہ ایسا ہوا۔ ہاؤس بوٹ کا ایجنٹ انہیں آمادہ دیکھ کر ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی اور مطالبہ پیش کر دیتا۔ بالآخر ایلین گوتھر نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تمہاری شرائط ہمیں منظور ہیں لیکن اگر ہاؤس بوٹ ہماری مرضی کے مطابق ثابت نہ ہوئی تو تمہیں جھیل میں اتنے غوطے دوں گا کہ آئندہ کسی سیاح کو دھوکا دینے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

سلطان نامی نوّے فٹ لمبی اور پندرہ فٹ چوڑی وہ کشتی انیسویں صدی کے آخر میں اس وقت بنائی گئی تھی جب انگریز سیاحوں کے ایک گروہ کو مقامی باشندوں نے اپنی زمینوں پر مکان کی تعمیر سے روک دیا تھا۔ البتہ یہ اجازت دے دی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو ڈل جھیل میں کشتی تعمیر کر کے اس پر رہائش اختیار کر سکتے ہیں۔ اس کشتی کی تعمیر میں ٹیک اور مہاگنی لکڑی سے کام لیا گیا تھا جس پر خوبصورت کندہ کاری کی گئی تھی۔ تقریباً سو سال گزرنے کے بعد بھی کشتی ابھی بہترین حالت میں تھی۔ اس میں ہر وہ چیز موجود تھی جو رہائش کے لیے ضروری ہو سکتی تھی۔ تین کشادہ کمرے، جنہیں بیڈ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ کشتی کا ایک بیڈ روم میری آندرے اور برنارڈ، دوسرا جین اور کرسٹن کے حصے میں آیا جبکہ تیسرے بیڈ روم پر ایلین گوتھر نے قبضہ جما لیا۔ ایلین ان دونوں جوڑوں کا مشترکہ میزبان تھا اور کشتی پر آتے ہی اس نے کمان سنبھال لی۔

اسی رات ہاؤس بوٹ کے عرشے پر جب وہ لوگ کھانے کے لیے جمع ہوئے تو جین، میری آندرے کو دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔ جین نے جب پہلی مرتبہ اسے ایئرپورٹ پر دیکھا تھا تو وہ بڑی مجہول سی لڑکی لگی تھی۔ میلا سا لباس، پریشان سا چہرہ اور اداس اداس سی لیکن اس وقت وہ قطعی مختلف نظر آ رہی تھی۔ سلیقے سے آراستہ بال اور سمر ڈریس میں وہ اپنی عمر سے کہیں کم نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اس وقت نہ تو اداسی نظر آ رہی تھی اور نہ پریشانی، جین کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میری آندرے میں یہ تبدیلی ایلین گوتھر کی وجہ سے آئی تھی۔ وہ یقیناً ایلین سے متاثر ہو چکی تھی لیکن ایلین کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسکی طرف مائل نہیں تھا۔ کھانے کی میز پر اس نے سب کا استقبال ایک ہی انداز میں کیا تھا۔ اس کی کسی بھی حرکت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ میری آندرے میں خصوصی دلچسپی لے رہا ہے۔

ہاؤس بوٹ کے خانساماں نے کھانے میں مرغی پکائی تھی۔ لیکن پہلا لقمہ کھاتے ہی ایلین گوتھر کا چہرہ بگڑ گیا اور اس نے سالن کی پلیٹیں اٹھا کر جھیل میں پھینک دیں۔

"بوٹ کے ایجنٹ نے تمہارے کھانے کی بڑی تعریف کی تھی۔" ایلین خانساماں کو گھورتے ہوئے بولا۔ "لیکن ایسا بدذائقہ کھانا میں نے کبھی نہیں کھایا۔ جاؤ اور ہوٹل سے چکن روسٹ لاؤ۔"

اس رات جب وہ سونے کے لیے اپنے کمروں میں پہنچے تو جین، ایلین گوتھر ہی کی باتیں کرتی رہی۔ کھانے کے دوران ایلین گوتھر مسلسل بولتا رہا تھا۔ اس کی باتیں جین کے لیے بڑی حیرت انگیز ثابت ہوئی تھیں۔ ایلین کے کہنے کے مطابق وہ مسلسل کئی برس تک فرانس کا کراٹے چیمپئین رہ چکا تھا۔ فوجی خدمات کے دوران وہ بہادری کے کئی اعزازات حاصل کر چکا تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے کورس کی مقررہ مدّت کے نصف عرصہ میں سار بون یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی تھی اور فوٹو گرافر کی حیثیت سے اس نے کینیا کے خوفناک جنگلوں میں اتنے قریب سے شیروں اور چیتوں کی تصویریں کھینچی تھیں کہ دیکھنے والے اَش اَش کر اٹھے تھے اور ویتنام کی جنگ میں اگلے محاذ پر وہ بہترین کارنامے انجام دے چکا تھا۔ جین اس کی باتوں سے حقیقتاً متاثر ہوئی تھی لیکن کرسٹن کے خیال میں وہ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹا تھا۔

"اس کے بارے میں سوچ کر اپنی انرجی ضائع مت کرو۔" کرسٹن نے کہا۔ "میرے لیے اس کی کوئی بات بھی قابلِ یقین نہیں۔ البتہ اسے تم بہت بڑا بہروپیا کہہ سکتی ہو۔"

جین نے سر جھٹک کر ان خیالات کو ذہن سے نکالنا چاہا پھر اس کی ذہنی رو میری آندرے کی طرف مڑ گئی۔ بیچاری آندرے، اگر وہ واقعی ایلین گوتھر کی باتوں میں آ گئی تھی تو آگے چل کر نجانے اس کا کیا حشر ہو۔

دوسرے کمرے میں میری آندرے بھی ایلین گوتھر ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی لیکن اس کی سوچ کا رُخ قدرے مختلف تھا۔

ایلین گوتھر میں اگر واقعی یہ تمام تر صلاحیتیں موجود تھیں، جن کا اس نے کھانے کے دوران تذکرہ کیا تھا تو یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ آگے چل کر وہ دنیا کا بہت بڑا اور نامور آدمی ثابت ہوگا۔ ایلین گوتھر سے اس کی ملاقات ایک اتفاق کا نتیجہ تھی اور فی الحال وہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی تھی کہ آگے چل کر ان کی اس ملاقات کا نتیجہ کیا نکلے گا۔

میری آندرے کا بچپن کنیڈا کے ایک خوبصورت شہر کیوبک سٹی سے تقریباً بیس میل دور دریا کے دوسرے کنارے پر واقع لیوئس نامی ایک چھوٹے سے قصبے میں گزرا تھا۔ اس کا باپ ریلوے میں گارڈ تھا جو ڈیوٹی کے سلسلے میں بعض اوقات تین تین دن گھر سے غیر حاضر رہتا۔ محدود تنخواہ میں نو بچّوں کی پرورش ماں باپ کے لیے بہت بڑا مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ ڈیوٹی کے علاوہ باپ اوور ٹائم کرنے کی کوشش بھی کرتا تاکہ تنخواہ کے ساتھ کچھ فاضل رقم مل سکے۔

میری آندرے چھ بھائیوں سے چھوٹی اور تین بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ اس کا ناک نقشہ بہن بھائیوں سے بہت مختلف تھا جس سے وہ ہمیشہ احساسِ کمتری کا شکار رہی۔ دبلی پتلی، آنکھوں پر موٹے عدسوں کی عینک جسے لگانے کے بعد وہ اپنی عمر سے کہیں بڑی نظر آتی۔ حالات نے اسے بہت حسّاس بنا دیا تھا۔ ایک تو وہ یوں بھی کم گو تھی دوسرے گھر کے دیگر افراد اس پر توجہ بھی کم ہی دیتے۔ وہ خاموش بیٹھی دوسروں کی باتیں سنتی رہتی۔ اتفاق سے وہ خاصی رومان پسند واقع ہوئی تھی۔ میڈم بویری کے رومانس کی داستان اسے تقریباً زبانی یاد ہو چکی تھی۔ یہ کتاب ہر وقت اس کے تکیے کے نیچے موجود رہتی اور وقتاً فوقتاً اس کے مختلف ابواب کا مطالعہ کر کے اپنا جی بہلانے کی کوشش کرتی پھر اچانک کتاب چھوڑ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو جاتی اور اپنے چہرے پر وہ نقوش تلاش کرنے کی کوشش کرتی جن سے وہ میڈم بویری سے اپنا موازنہ کر سکے لیکن اس سلسلے میں اسے ہمیشہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس کا احساسِ کمتری اور بھی شدید تر ہو جاتا۔

میری آندرے میں کسی کے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔ اس نے قصبے کے ایک دو نوجوانوں سے رومان لڑانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ اپنا دامن جھٹک کر آگے بڑھ گئے تھے۔ بالآخر میری آندرے نے چرچ کی نن بننے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا خیال تھا کہ عبادت کے ساتھ ساتھ دنیا والوں کی نگاہوں سے اوجھل رہ کر اسے کچھ تسکین مل سکے گی۔ لیکن جب اس نے چرچ کے قوائد و ضوابط کا مطالعہ کیا تو پتا چلا کہ اس طرح وہ ہمیشہ کے لیے باقی دنیا سے کٹ جائے گی۔ اس کی دنیا صرف اور صرف چرچ کی چار دیواری تک محدود رہے گی۔ یہ سوچ کر اس نے نن بننے کا خیال ذہن سے نکال دیا۔

میری آندرے اٹھارہ سال کی تھی جب اس کے دل میں فلمی اداکارہ بننے کا خیال آیا۔ اس نے جب اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو گھر والوں نے اس کا خوب مذاق اڑایا اور میری آندرے نے اداکارہ بننے کا خیال بھی ذہن سے نکال دیا۔ انہی دنوں اس کے باپ پر دل کا دورہ پڑا اور اس کے ساتھ ہی اسے ملازمت سے ریٹائرمنٹ لینا پڑی۔ میری آندرے کو تعلیم چھوڑ کر گھر کے اخراجات میں ہاتھ بٹانے کے لیے ملازمت کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ ایک سال تک میڈیکل سیکریٹری کا کورس مکمل کرنے کے بعد اسے اپنے ہی قصبے کے آرتھو پیڈک اسپتال میں ملازمت مل گئی۔ وہ دن بھر استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھی اسپتال میں آنے والے مریضوں سے مغز ماری کرتی رہتی۔ اسپتال سے گھر اور گھر سے اسپتال، اس کے علاوہ میری آندرے کے لیے زندگی میں اور کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔

وہ اٹھائیس سال کی ہو چکی تھی۔ گھر کے اخراجات کا بوجھ اس کے بھائیوں نے سنبھال لیا تھا۔ میری آندرے کو اب اپنے گھر میں گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ دو بھائیوں کی شادی کے بعد ان کے بچّے چوبیس گھنٹے ہنگامہ مچائے رکھتے۔ میری آندرے کو تنہائی اور سکون کی تلاش تھی۔ اس نے اسی گلی میں ایک مختصر سا فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ ماں سے ملنے کے لیے وہ دن میں ایک چکر گھر کا بھی ضرور لگا لیتی۔

سینٹ لیوئس میں زندگی ایک ہی ڈگر پر چل رہی تھی۔ صبح چھ بجے اٹھنا، پندرہ منٹ عبادت، آدھے گھنٹے تک بائیبل کا مطالعہ اور پھر ناشتہ اور دفتر کے لیے تیاری۔ دن بھر دفتر اور شام کو گھر۔ قصبے میں اس کے لیے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کبھی وقت ملتا تو دریا کے کنارے آکر بیٹھ جاتی جس کے دوسرے کنارے چند میل کے فاصلے پر کیوبک سٹی کی رونقیں تھیں۔ کئی مرتبہ میری آندرے کے ذہن میں خیال آیا تھا کہ وہ کیوبک سٹی چلی جائے لیکن ہر مرتبہ اس نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

میری آندرے بری طرح احساسِ کمتری اور تنہائی کا شکار تھی۔ اس کا زیادہ وقت کتابیں پڑھنے یا گٹار بجانے میں گزرتا۔ اس کی کیفیت اس معصوم جانور کی سی تھی جو کسی شکاری کے جال میں پھنس گیا ہو اور اسے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہ آ رہا ہو۔ وہ باقاعدگی سے چرچ بھی جا رہی تھی لیکن اسے ایک لمحہ کو بھی کبھی سکونِ قلب نصیب نہیں ہوا۔

میری آندرے کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ وہ کوئی گاڑی خرید لے۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ اپنی اداسی اور تنہائی کسی حد تک کم کرنے میں کامیاب ہو سکے گی لیکن گاڑی خریدنے کے لیے رقم کی ضرورت تھی اور اسپتال کی ملازمت میں بچت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے اسپتال کی نوکری چھوڑ کر میری

انٹونی ریسٹورنٹ میں ویٹریس کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرلی، ہائی وے پر واقع اس ریسٹورنٹ میں ہر وقت گاہکوں کا ہجوم رہتا۔ میری آندرے رقم جمع کرنے کے خیال سے اپنی استطاعت سے زیادہ کام کرتی جس سے اس کی صحت متاثر ہونے لگی اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑگئے لیکن ایک سال بعد اس کے پاس اتنی رقم جمع ہوچکی تھی کہ اس نے ایک پرانی فاکس ویگن خرید لی لیکن وہ زیادہ عرصہ تک اس گاڑی سے فائدہ نہ اٹھا سکی۔

گاڑی خریدنے کے چند ہی روز بعد میری آندرے ایک دکان سے ضرورت کی چند چیزیں خریدنے کے بعد باہر نکل ہی رہی تھی کہ اچانک دروازہ ٹوٹ کر اس کے اوپر آن گرا۔ شیشے کی کرچیاں اس کے مختلف حصّوں میں پیوست ہوچکی تھیں لیکن سب سے زیادہ ضرب بائیں گھٹنے پر آئی تھی، دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ اکھڑنے والی ایک اینٹ اس کے گھٹنے پر لگی تھی اور شیشے کی لاتعداد کرچیاں گوشت کو چیرتی ہوئی ہڈی تک پہنچ گئی تھیں۔ خون کا فوارہ بہہ نکلا تھا۔ میری آندرے کو بے ہوشی کی حالت میں اسی اسپتال میں پہنچا دیا گیا جہاں اس نے اپنی زندگی کے دس سال ملازمت کرتے ہوئے گزارے تھے۔ ہوش آنے پر میری آندرے کو بتایا گیا کہ شیشے کی کرچیوں سے اس کی ٹانگ کی وہ نس کٹ گئی تھی جو ایڑی تک پہنچ کر پیر کو حرکت کرنے میں مدد دیتی ہے اور اب شاید اسے زندگی بھر بیساکھی کے سہارے پیر گھسیٹ کر چلنا پڑے لیکن میری آندرے نے تقدیر کا یہ فیصلہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

”میں اپاہج بن کر زندگی نہیں گزار سکتی،“ اس نے پُرعزم لہجے میں کہا ”میں اسی پیر پر چل کر یہ ثابت کر دوں گی کہ اگر قوّتِ ارادی ہو تو تقدیر بھی اسے نہیں جھکا سکتی۔“

اور واقعی میری آندرے نے یہ ثابت کر دکھایا کہ اگر قوتِ ارادی مضبوط ہو تو انسان تقدیر کے فیصلے بدل سکتا ہے۔ مسلسل ایک سال تک اسپتال کے علاج کے ساتھ وہ اپنے طور پر بھی کوشش کرتی رہی۔ وہ کرسی پر بیٹھی پیر کو حرکت دیتی رہتی اور بالآخر وہ اٹھ کر چلنے لگی۔ اس کے پیر میں اگرچہ ہلکی سی لنگڑاہٹ آگئی تھی لیکن بہرحال یہ اپاہج پن سے بہتر تھی۔ رفتہ رفتہ یہ لنگڑاہٹ بھی کم ہوگئی اور وہ اپنی زندگی کے معمولات پر لوٹ آئی۔ اس نے ایک بار پھر اسپتال کی ملازمت کرلی تھی۔ وہ دن بھر مریضوں کی دیکھ بھال کرتی اور فارغ اوقات میں اپنی کار ڈرائیو کرتی ہوئی شہر سے دور نکل جاتی۔

اور پھر میری آندرے کی زندگی میں وہ دن بھی آگیا جس کا اسے بڑی مدّت سے انتظار تھا۔ برنارڈ سے ملاقات نے اسے زندگی کے بارے میں از سرِ نو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ برنارڈ عمر میں اس سے چند سال بڑا تھا جس کے سر کے بال بڑی تیزی سے گر رہے تھے۔ وہ ایک سرکاری دفتر میں بک کیپر تھا۔ اس کی گفتگو بھی زیادہ تر اپنے کاروباری امور ہی سے متعلق ہوتی۔ برنارڈ اگرچہ میری آندرے کے خوابوں کا شہزادہ نہیں تھا لیکن وہ پہلا شخص تھا جس نے اس کے دروازے پر دستک دی تھی۔

ان کی دوستی کو دو تین سال گزر گئے۔ اب وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے لگے تھے۔ بالآخر انہوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا اور تاریخ بھی طے ہوگئی لیکن صرف ایک ہفتہ پہلے باہمی مشورے سے انہوں نے شادی کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد جب دوبارہ شادی کا مسئلہ اٹھا تو میری آندرے نے بلاجھجک کہہ دیا کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی کیونکہ برنارڈ سے اسے سرے سے محبت ہی نہیں تھی۔ اس کا یہ جواب سن کر برنارڈ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔

”میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں،“ اس نے میری آندرے کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

سینٹ لیوئس کے ہر شخص کو توقع تھی کہ وہ دونوں بہت جلد ازدواجی رشتے میں بندھ جائیں گے لیکن میری آندرے اور برنارڈ نے یہ زنجیریں پہننے کے بجائے بے لوث دوستی کو ترجیح دی تھی۔ ایک رات وہ دونوں میری انٹونی نامی اسی ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہلکی شراب کی چسکیاں لے رہے تھے جہاں میری آندرے ویٹریس کی حیثیت سے ملازمت بھی کرچکی تھی۔ یہ اس علاقے کا واحد ریسٹورنٹ تھا جہاں تفریح کے چند لمحات میسّر آسکتے تھے۔ مشروب کی چسکیاں لیتے ہوئے میری آندرے کے ذہن میں اچانک ہی خیال آیا تھا کہ کیوں نہ وہ لمبی تفریح کے لیے کچھ عرصہ کے لیے شہر سے باہر چلے جائیں۔ برنارڈ نے بھی اس کے اس خیال کی تائید کرتے ہوئے تجویز پیش کی تھی کہ انہیں نہ صرف شہر بلکہ ملک سے باہر جانا چاہیے۔ دنیا کی سیاحت کے خیال سے میری آندرے کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ اس کے پاس دس ہزار ڈالر کی وہ رقم محفوظ تھی جو دکان میں پیش آنے والے حادثے کے بعد عدالت کے توسط سے اسے ملی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کم از کم آدھی رقم بچا کر بھی وہ اپنی سیاحت کا شوق پورا کرلے گی۔ وہ بہت عرصہ سے مشرق کے بارے میں پُراسرار قصے کہانیاں پڑھتی رہی تھی۔ اسے ہندوستان دیکھنے کا زیادہ شوق تھا۔ تاج محل کے بارے میں بہت کچھ سن چکی تھی۔ محبت کی اس لافانی یادگار کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی۔

”ٹھیک ہے،“ برنارڈ نے تائید کرتے ہوئے کہا ”ہم سب سے پہلے ہندوستان چلیں گے اس کے بعد ہانگ کانگ اور بنکاک۔“

ان کا وہ ایک ہفتہ بہت مصروفیت کے عالم میں گزرا۔۔۔

میری آندرے نے جب اپنے گھر والوں کو بتایا کہ وہ ہندوستان کی سیاحت کے لیے جا رہی ہے تو سننے والے دنگ رہ گئے۔ اس کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد جب مونٹریال کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے ان کے جہاز نے ٹیک آف کیا تو میری آندرے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے دل

میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔

اور اب وہ دنیا کی اس حسین ترین وادی کی آغوش میں تھی۔ کشمیر کے بارے میں اس نے کسی میگزین میں پڑھا ضرور تھا لیکن یہ خطہ تو اس کے خوابوں سے بھی زیادہ حسین ثابت ہوا تھا۔ وہ رات بھر اپنے بستر پر لیٹی یہی سب کچھ سوچتی رہی۔ اس نے برنارڈ کی طرف دیکھا جو بے خبر سو رہا تھا۔ میری آندرے چپکے سے اٹھ کر کمرے سے باہر آگئی۔ چاندنی رات میں جھیل کا منظر بہت پُراسرار تاثر دے رہا تھا۔ خوشبو سے لدی ہوئی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ سردی سے اس کے جسم پر کپکپی سی طاری ہونے لگی اور وہ زیادہ دیر تک اس منظر سے لطف اندوز نہ ہوسکی۔

کمرے میں واپس آکر بھی وہ بہت دیر تک اس پُرفسوں وادی کے بارے میں سوچتی رہی۔ پھر اچانک اس کے تصوّر میں ایلین گوتھر کا چہرہ ابھر آیا لیکن وہ ایلین کے بارے میں زیادہ دیر تک نہ سوچ سکی۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

شور کی آواز سے جین کی آنکھ کھل گئی۔ وہ خوابیدہ ذہن سے ان آوازوں کے بارے میں سوچنے لگی جو چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے لپک کر کھڑکی کھول دی۔ برف پوش پہاڑ کی مشرقی چوٹی کی اوٹ سے سورج طلوع ہو رہا تھا۔ جھیل کے نیلگوں پانی میں نرم دھوپ کی مچلتی ہوئی کرنیں عجیب دلفریب منظر پیش کر رہی تھیں۔ وہ ان چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی طرف متوجہ ہوگئی جو ہاؤس بوٹ سلطان اور اس جیسی دوسری رہائشی کشتیوں کو گھیرے میں لیے ہوئے تھیں۔ ایک کشتی میں تازہ پھولوں کے گلدستے لدے ہوئے تھے اور پھول بیچنے والی بوڑھی کشمیری عورت کا جھریوں بھرا چہرہ پھولوں کے پیچھے تقریباً چھپ کر رہ گیا تھا۔ دوسری کشتی میں تازہ تندوری نان بھرے ہوئے تھے۔ نوعمر لڑکی ہر بجرے کے قریب پہنچ کر بڑے دلکش انداز میں آواز لگا رہی تھی۔ اس کے قریب ہی دوسری کشتی پر سبز چائے، تلی ہوئی مچھلی، پکوڑے اور کباب وغیرہ کی دکان سجی تھی۔ ایک اور کشتی پر ادویات وغیرہ نظر آرہی تھیں جبکہ لانڈری کی ایک کشتی بھی موجود تھی۔ جین کے لیے یہ منظر خاصا دلچسپ ثابت ہوا۔ یہ گویا تیرتا ہوا بازار تھا جو بجروں پر مقیم سیاحوں کو ان کی ضرورت کی اشیا فراہم کرنے کے لیے لگایا گیا تھا۔

جین ابھی یہ سب کچھ دیکھ ہی رہی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایلین گوتھر اندر گھس آیا۔ اس کے جسم پر نیکر کے سوا کچھ نہیں تھا البتہ گردن پر نیلے رنگ کا تولیہ لپیٹ رکھا تھا۔ جین اسے اس حلیے میں دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔

”میرے کمرے کے باتھ روم کا نل خراب ہے۔ اگر اجازت ہو تو تمہارا باتھ روم استعمال کرلوں؟“ ایلین گوتھر نے جین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر باتھ روم میں گھس گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد جب وہ باہر نکلا تو اس کے چہرے سے داڑھی غائب تھی۔ اس نے نہ صرف کرسٹن کا شیونگ کا سامان اور آفٹر شیو لوشن بے تکلفی سے استعمال کیا تھا بلکہ جین کے استعمال کی ایک دو چیزوں پر بھی ہاتھ صاف کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب لوگ بجرے کے عرشے پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ میری آندرے بار بار کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن ایلین گوتھر کی توجہ جین پر تھی۔ وہ ہر بات میں اسی کو مخاطب کر رہا تھا۔

”مجھے تو لگتا ہے یہ تم پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے“، کرسٹن نے جین کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

جین کے حلق سے بے اختیار قہقہہ ابل پڑا اور پھر اگلے چند روز میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ کرسٹن نے غلط نہیں کہا تھا۔ ایلین گوتھر واقعی جین پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ میری آندرے ایلین میں دلچسپی لے رہی تھی اور برنارڈ خاموش تماشائی کی طرح یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

ناشتے کے کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ وادی کی تفریح کو نکل گئے۔ کرائے کے خچروں پر تقریباً ایک گھنٹہ چلتے رہنے کے بعد وہ ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ایک طرف سلسلۂ ہمالیہ کی فلک بوس چوٹیاں تھیں اور دوسری طرف نشیب میں تاحدِ نگاہ کشمیر کی جنّت نظیر وادی پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے دائیں طرف سطحِ سمندر سے آٹھ ہزار سات سو فٹ کی بلندی پر گولف کا وہ میدان تھا جسے دنیا کا سب سے بڑا گولف کورس ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ایلین گوتھر زیادہ تر جین ہی سے مخاطب رہا تھا۔ اسی دوران ایک دو مرتبہ میری آندرے نے اس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔

ایلین گوتھر کی شخصیت ان سب کے لیے خاصی پُراسرار ثابت ہو رہی تھی۔ وہ اکثر کئی کئی گھنٹے غائب رہتا اور جب واپس آتا تو کسی کے پوچھے بغیر خود ہی بتا دیتا کہ وہ بزنس کے سلسلے میں مصروف تھا۔ ایک رات، جبکہ ایلین گوتھر غائب تھا، جین اور میری آندرے وغیرہ بازار میں سیر کرتے ہوئے جیسے ہی ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے ایلین گوتھر کو دیکھ کر وہ سب چونکے بغیر نہیں رہے تھے۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ تین لڑکیاں بھی تھیں۔ دو برطانوی اور ایک چینی۔ تینوں کا تعلق نوجوان نسل کے اس بگڑے ہوئے طبقے سے تھا جنہیں حشیش اور دیگر منشیات کی طلب مشرق کی طرف کھینچ لاتی ہے۔ وہ چاروں اپنی اپنی جگہ پر آگے کو جھکے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ میری آندرے نے ایلین کو آواز دی تو وہ اس طرح چونک گیا تھا جیسے ان کی آمد اس کے لیے قطعی غیر متوقع نہ رہی ہو۔ جین اور کرسٹن وغیرہ کے لیے ایلین کا اس طرح

دوسری لڑکیوں کے ساتھ نظر آنا کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی لیکن میری آندرے کے چہرے پر کرب کے تاثرات صاف دیکھے جاسکتے تھے۔

جین کے لیے ایک اور بات حیرت کا باعث بنی ہوئی تھی۔ دادی کی تفریح کے دوران اس نے کئی مرتبہ صرف ایلین گوتھر یا گروپ کی تصویر کھینچنا چاہی تھی لیکن ہر مرتبہ ایلین یا تو بڑی خوبصورتی سے کیمرے کی آنکھ سے اوجھل ہوگیا تھا یا اس نے لپک کر جین سے کیمرہ لے لیا تھا کہ پیشہ ور فوٹو گرافر ہونے کی حیثیت سے وہ بہتر تصویریں لے سکتا ہے۔ ایک موقع پر جین نے بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے ایلین گوتھر کی ایک تصویر کھینچ لی تھی لیکن جب فلم دھلی تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ اس رول کی تمام تصویریں بالکل ٹھیک تھیں مگر ایلین والی تصویر اس طرح خراب ہوگئی تھی کہ اس کے چہرے کو شناخت کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔

وہ بجرے پر ان کی آخری رات تھی۔ کھانا لگ چکا تھا صرف ایلین کا انتظار تھا کچھ دیر بعد جب وہ نمودار ہوا تو جین اسے دیکھ کر ششدر سی رہ گئی .... اس نے اسکاچ وھسکی کی ایک بوتل میز پر رکھتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ آج رات وہ جشن منائیں گے۔ سب لوگوں نے ایک ایک دو دو گھونٹ پیے مگر میری آندرے جام پر جام چڑھاتی چلی گئی۔ وھسکی نے جلد ہی رنگ دکھانا شروع کردیا اور میری آندرے اٹھ کر ناچنے لگی۔ اس نے پاگلوں کی طرح رقص شروع کردیا تھا۔ برنارڈ نے اسے بازو سے پکڑ کر کمرے میں لے جانا چاہا مگر میری آندرے ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی۔ اس نے برنارڈ کے منہ پر تھپڑ رسید کردیا۔ برنارڈ چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر پیر پٹختا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جین اور کرسٹن بھی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ جین کو امید تھی کہ صبح انہیں ان تینوں میں سے کسی کی لاش ضرور نظر آئے گی مگر اس کے یہ خدشات بے بنیاد نکلے۔ ان دونوں کے آنے کے کچھ ہی دیر بعد ایلین گوتھر بھی میری آندرے کو چھوڑ کر کشتی سے چلا گیا تھا۔ جین اپنے کمرے میں بیٹھی میری آندرے کے رونے اور چیخنے کی آواز سنتی رہی۔

"اس شخص کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔" کرسٹن نے جین کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ "وہ میری آندرے کے گرد ایک ایسا حصار قائم کررہا ہے جس سے نکلنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔"

دوسرے دن سہ پہر کو جب وہ سری نگر سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے تو ائیرپورٹ کی عمارت کے باہر ایک چھوٹے سے بک اسٹال کے سامنے سے گزرتے ہوئے جین بری طرح چونک گئی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر وہ اخبار اٹھالیا جس کے پہلے ہی صفحہ پر اس چینی لڑکی کی تصویر نظر آرہی تھی جسے دو تین روز قبل وہ ایلین گوتھر کے ساتھ ریسٹورنٹ میں دیکھ چکی تھی۔ اخبار کی اطلاع کے مطابق یہ چینی لڑکی اپنے کمرے میں مردہ پائی گئی تھی اور اس کے سامان سے اس کا پاسپورٹ، ٹریولرز چیک اور نقدی وغیرہ غائب تھی۔ جین نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، وہ کافی آگے نکل چکے تھے۔ اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہورہی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنے ساتھیوں سے جا ملی۔

ایک رات دہلی میں گزارنے کے بعد وہ صبح سویرے تاج محل ایکسپریس سے آگرہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ راستے میں ایلین گوتھر انہیں تاج محل کے بارے میں بتاتا رہا۔ میری آندرے کے لیے اس کا ایک ایک لفظ حیرت انگیز تھا۔ آگرے میں تاج محل کی سیر کے دوران بھی میری آندرے، ایلین گوتھر سے چپکی رہی۔ جین کو اس کے پاگل پن پر افسوس بھی ہورہا تھا جو کسی پتھر سے سر ٹکرا رہی تھی۔

دو دن آگرہ میں رہنے کے بعد وہ پھر دہلی آگئے۔ اگلے دن جین اور کرسٹن کو ہندوستان سے رخصت ہوجانا تھا۔ اس رات جب ایلین گوتھر نے اس سے تنہائی میں ملاقات کی درخواست کی تو جین کے لیے یہ بات خلاف توقع نہیں تھی۔

"میں ایک کاروباری معاملے میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں لیکن کرسٹن کو ہماری اس ملاقات کا علم نہیں ہونا چاہیے۔" ایلین نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

جین کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آگئی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ایلین گوتھر اس سے سری نگر اور آگرے میں اپنی خدمات کا معاوضہ وصول کرنا چاہتا تھا۔ اس نے جب کرسٹن کو اس صورت حال سے آگاہ کیا تو اس کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔

"محتاط رہنا۔ یہ شخص انتہائی گہرا اور بہت خطرناک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ موقع سے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔" کرسٹن نے کہا۔

"مطمئن رہو۔" جین کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آگئی "پیرس کی میٹرو میں سفر کے دوران صبح سے شام تک ایسے بیسیوں اوباش ٹکراتے ہیں۔ اگر اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو ایسا سبق سکھاؤں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔"

اسی رات جین دہلی کے قلب کناٹ پیلس میں واقع سیلر نائٹ کلب میں داخل ہورہی تھی۔ تیسرے درجے کا یہ نائٹ کلب ان غیرملکی سیاحوں میں خاصی شہرت رکھتا ہے جو سیاحت سے زیادہ منشیات کے حصول کے لیے دہلی کا رخ کرتے ہیں۔ نیم تاریک ماحول میں دہلی کے شرفا بھی اس کلب کی خدمات سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس میں ایسے مختصر کیبن بھی موجود ہیں جو ضرورت مندوں کو بھاری معاوضے پر دو تین گھنٹوں کے لیے دے دیے جاتے ہیں۔ کلب کی انتظامیہ اپنے گاہکوں کا بہت خیال رکھتی ہے۔ ان کی ملی بھگت سے اوّل تو پولیس اس طرف کا رخ ہی نہیں کرتی اور اگر کبھی پولیس آ بھی جائے تو معزز گاہکوں کو خفیہ دروازے سے نکال دیا

جاتا ہے۔

جین ہال میں داخل ہو کر متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ ایلین گو تھر جلد ہی اس کی نظروں میں آگیا جو ایک میز پر بیٹھا ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ لمبے بالوں والے دو فرانسیسی ہپی بھی تھے۔ جین جیسے ہی قریب پہنچی ان کی نظریں ایک ہپی کے ہاتھ پر جم گئیں۔ ہپی نے وہ ہاتھ ایلین کے سامنے پھیلا رکھا تھا اور اس کی ہتھیلی پر سرخ رنگ کے چند چھوٹے چھوٹے قیمتی پتھر چمک رہے تھے۔ جین کے قریب پہنچتے ہی ایلین نے ہپیوں سے کچھ کہا۔ لہجہ تحکمانہ ہی تھا۔ دونوں ہپی اٹھ کر دوسری میز پر چلے گئے۔ جین نے جیسے ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھنا چاہا ایلین اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"میرا خیال ہے یہ جگہ تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔ ہم یہاں اطمینان سے بات نہیں کر سکیں گے۔"

وہ دونوں نائٹ کلب سے باہر نکل گئے۔ گیٹ کے سامنے ہی خالی ٹیکسی دیکھ کر ایلین نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور جین کے بیٹھنے کے بعد خود بھی سیٹ پر دھنستے ہوئے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔

"اوبرائے ہوٹل۔"

اوبرائے کا نام سن کر جین چونکے بغیر نہیں رہی تھی۔ اس کا مقابلہ یورپ کے کسی بھی بڑے سے بڑے ہوٹل سے کیا جا سکتا تھا اور یہاں صرف وہی لوگ جا سکتے تھے جن کی جیبیں نوٹوں کی گڈیوں سے بوجھل ہوں۔ اوبرائے اگرچہ سیلر سے چند منٹ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا لیکن ڈرائیور نے اپنا کرایہ بڑھانے کے لیے لمبا راستہ اختیار کیا۔ ایلین نے پہلے تو توجہ نہیں دی لیکن جیسے ہی اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا، ڈرائیور کی بد دیانتی پر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے آگے جھک کر ڈرائیور کی گردن پکڑ لی اور زوردار جھٹکا دیتے ہوئے چیخا۔

"کہاں جا رہے ہو بے ایمان! تم سمجھتے ہو ہم اس شہر میں اجنبی ہیں۔ بند کرو میٹر۔"

ڈرائیور کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اسے اپنے مسافر کی آہنی گرفت سے اس وقت تک نجات نہیں ملی جب تک کہ اس نے میٹر بند نہیں کر دیا۔ باقی راستہ بغیر میٹر ہی کے طے ہوا تھا۔

"ان جیسے چوروں اور بے ایمانوں کے ساتھ یہی سلوک کرنا چاہیے۔ دوسروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنے والے یہ لوگ کسی طرح بھی ہمدردی اور نرمی کے مستحق نہیں ہیں۔" ایلین نے جین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اسی موضوع پر بات کرنے لگا جس پر پہلے گفتگو ہو رہی تھی لیکن جین اب اس کی باتیں نہیں سن رہی تھی۔ وہ تو اس کے اس رویے پر سوچ رہی تھی۔ دفعتاً چینی لڑکی کا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا جس کی تصویر سرینگر سے روانہ ہوتے وقت اس نے اخبار میں دیکھی تھی۔ کسی نامعلوم خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے لیکن اس نے جلد ہی سر جھٹک کر اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔

اوبرائے کے ٹیرس میں وہ ایک ایسی میز پر بیٹھے تھے جہاں سے سوئمنگ پول صاف نظر آ رہا تھا۔ یورپین عورتیں اور مرد پیراکی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وسیع لان کے پرلی طرف ہمایوں کے مقبرے کے اس پار آسمان پر بار بار بجلی چمک رہی تھی۔ اگرچہ یہ مون سون کا موسم نہیں تھا لیکن مئی کے مہینے میں آسمان پر چھانے والی گھٹا خاصی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ ایلین شراب کی چسکیاں لیتا ہوا اپنی کرسی سے اٹھ کر جین کی پشت پر آگیا اور دونوں کہنیاں کرسی کی پشت پر ٹکاتے ہوئے بولا۔

"تم شاید اسے مذاق ہی سمجھو لیکن میں یہ ضرور بتاؤں گا کہ میں قسمت پر غیر متزلزل ایمان رکھتا ہوں۔ ہر چیز زندگی میں کوئی نہ کوئی مقصد رکھتی ہے۔"

"مثلاً؟" جین نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"مثلاً یہ کہ میں پیرس سے کسی اور جہاز پر ہندوستان آنے والا تھا مگر نجانے کیا سوچ کر میں نے وہ سیٹ منسوخ کروا کر پین ایم کے جہاز پر بکنگ کرا لی۔ اسے تم قسمت کا کھیل ہی کہو کہ اس سفر کے دوران میری تم سے ملاقات ہو گئی۔"

"یہ محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔" جین نے کہا۔

"اتفاقات اور حادثات، یہ بے معنی سی چیزیں ہیں۔ اگر اتفاق کی بات ہوتی تو جہاز کے سفر کے دوران میں کسی اور مسافر سے بھی متعارف ہو سکتا تھا مگر تین سو مسافروں میں سے صرف تم دونوں سے ملاقات ہوئی، یہ قسمت کی بات ہے اتفاق کی نہیں۔"

جین کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ایلین کی اس گفتگو کا کیا مطلب ہو سکتا تھا۔ اس کے خیال میں وہ ابھی کچھ ہی دیر میں اظہارِ عشق کرنے والا تھا لیکن اسے اس کا موقع دینے سے پہلے ہی وہ یہاں سے اٹھنے کے لیے عذر تلاش کرنے لگی مگر ایلین کا اگلا جملہ اس کے لیے چونکا دینے والا تھا۔

"میں اور تم۔" ایلین نے اس کے سامنے آ کر چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "پہلی مرتبہ تمہیں دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میری بچھڑی ہوئی بہن مدتوں بعد مجھے مل گئی ہو۔ اس ایک ہفتے کی رفاقت میں مجھے جو ذہنی سکون ملا ہے تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔"

جین کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ایلین کے بارے میں اس کا کم از کم یہ خدشہ بے بنیاد نکلا تھا کہ وہ اس کے عشق میں آہیں بھرنے لگے گا۔ ایلین چند لمحے اس کے چہرے کے

تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر مدھم لہجے میں بولا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تم سے کوئی کاروباری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسا کاروبار؟" جین نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا کاروبار غیر قانونی ہے۔" ایلین نے بلا جھجک کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "بلیک مارکیٹ میں کرنسی کی خرید و فروخت، ہیروں کی اسمگلنگ، جعلی پاسپورٹ اور چوری شدہ کاروں کی خرید و فروخت میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ میرے گاہک مجھ پر مکمل اعتماد رکھتے ہیں اور دراصل گاہکوں کا یہ اعتماد ہی میرے کاروبار کی بنیاد ہے۔"

جین کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ اسے ایلین کی باتوں کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ ان کی واقفیت کو صرف ایک ہفتہ ہوا تھا اور ایلین اس کے سامنے اپنے راز اس طرح اگل رہا تھا جیسے برسوں کی جان پہچان ہو اور وہ ایک دوسرے پر مکمل اعتماد رکھتے ہوں۔ ایلین نے آگے جھک کر کوٹ کی جیب میں رکھے ہوئے تین جعلی پاسپورٹ بھی اسے دکھائے تھے اور جین سوچ رہی تھی کہ کسی طرح اب اس سے جان چھڑا لینا چاہیے۔ وہ صبح سویرے ہانگ کانگ کی فلائیٹ کا بہانہ بناتے ہوئے اٹھ گئی اور قدم آگے بڑھانا ہی چاہتی تھی کہ ٹھٹھک گئی۔

"رکو۔" ایلین کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ تھی۔ "بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے کام لینا چاہتا ہوں۔"

"مجھ سے۔" خوف کے باوجود جین کے حلق سے ہلکا سا قہقہہ نکل گیا۔

"تمہاری طرح اکڑ فوں دکھانے والے بہت سے لوگ نہایت آسانی سے میرے سامنے جھک جاتے ہیں۔ تم نے سرینگر میں ان تین لڑکیوں کو دیکھا ہوگا۔"

"ہاں۔ دو انگریز اور ایک چینی لڑکی تھی۔ وہ چینی لڑکی...."

جین کہتے کہتے اچانک رک گئی۔

"وہ تینوں بھی میری ایجنٹ تھیں۔ وہ نہ صرف میرے لیے ہیروں، کرنسی اور جعلی پاسپورٹس کی اسمگلنگ کا کاروبار کرتی تھیں بلکہ میری ہدایات پر محبت کا ڈراما رچا کر مجھے ان لوگوں کے بارے میں معلومات بھی فراہم کرتی تھیں جن سے ہم کچھ حاصل کر سکتے ہوں اور وہ دونوں فرانسیسی ہپی، جو سیلر میں نظر آئے تھے، وہ بھی میرے ایجنٹ ہیں جو ہیروں کی ایک بہت بڑی مقدار کل یہاں سے اسمگل کر کے روم لے جانے والے ہیں۔"

"مجھ سے تم کیا چاہتے ہو؟" جین نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ایک ہفتے تک میں بلا وجہ ہی تم پر رقم نہیں لٹاتا رہا۔" ایلین نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "میں نے بہت چھان بین کے بعد ہی تمہارا انتخاب کیا تھا تاکہ تم سے کام لے سکوں۔ تم ایئر لائن کی ملازمہ ہو۔ کسی بھی ایئر پورٹ پر کسٹمز والے تمہارے سامان کی تفصیلی تلاشی نہیں لیں گے۔ اگر تم میرے لیے آج ہی سے کام شروع کر دو تو پہلے ہی سال کم از کم پچاس ہزار ڈالر کما سکتی ہو۔ اور اگر کرسٹن کو بھی آمادہ کر لو تو وہ بھی اتنی ہی رقم کما سکتا ہے۔"

جین بری طرح چونک گئی۔ ایلین کی اصلیت کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ اس کے چہرے سے وہ نقاب سرک گئی تھی جو دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے اس نے چڑھا رکھی تھی۔ جین نے اس معاملے پر سوچنے کے لیے وقت ضائع کرنے کے بجائے اسی وقت دو ٹوک لہجے میں اس کی یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر ایلین نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کندھے اچکا کر رہ گیا۔ کسی لڑکی نے پہلی مرتبہ اس کی پیش کش کو اس طرح مسترد کیا تھا لیکن وہ مایوس نہیں تھا۔ وہ جواری تھا اور جوئے میں جیت کے ساتھ ہار کے امکانات کو بھی ہمیشہ ذہن میں رکھتا تھا۔ جین کا یہ انکار اس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے وہ رولٹ میں سو فرانک ہار گیا ہو لیکن اسے اپنے آپ پر اعتماد تھا کہ یہ نقصان وہ اگلی بازی میں پورا کر لے گا۔ اس نے پانسہ پھینکا تھا اور اس کے خیال میں جین کا انکار اس بازی کا حتمی نتیجہ نہیں تھا۔ دوسری طرف جین کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ایلین نے اپنے آپ کو اس کے سامنے اس طرح بے نقاب کیوں کیا تھا؟ بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ وہ پہلی عورت نہیں تھی جسے ایلین نے اس قسم کی پیش کش کی تھی۔ وہ ایلین کو بہت سے لوگوں سے پُر اسرار انداز میں ملاقاتیں کرتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ ان میں لڑکیوں کی تعداد یقیناً زیادہ تھی۔ سرینگر کے ریسٹورنٹ میں ملنے والی وہ تین لڑکیاں اور اس چینی لڑکی کا چہرہ تو ابھی تک اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ جین کے خیال میں ایلین ایک ایسا شخص تھا جو بہت سے لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لینا چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ ہر معاملے میں سب اسی سے رجوع کریں اور اسے اپنا محور سمجھتے رہیں۔ جین کو اپنے شہر کی وہ بوڑھی عورت یاد آ گئی جس نے اپنی تنہائی مٹانے کے لیے لاتعداد جانور پال رکھے تھے اور انہیں اپنے خاندان کے ان افراد کے ناموں سے پکارا کرتی تھی جو اسے چھوڑ کر جا چکے تھے۔

ایلین گوتھر نے کاغذ پر کوئی نمبر لکھ کر جین کی طرف بڑھا دیا اور سیدھے سے اٹھ کر اس کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"تم ہانگ کانگ جا رہی ہو۔ اگر وہاں تمہیں کسی پریشانی

کا سامنا کرنا پڑے یا رقم کی ضرورت ہو تو اس نمبر پر فون کر دینا۔"

"شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔" جین کا لہجہ تاثرات سے عاری تھا۔

"گزشتہ ہفتے کے دوران شاید تم نے میری آندرے کے بارے میں ایک بات نوٹ نہیں کی۔" ایلین موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "وہ مجھ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن مجھے اس سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔ انتہائی بور لڑکی ہے۔"

جین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ جو شخص اسے مجرمانہ زندگی اپنانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا ایک دوسری لڑکی کے بارے میں اس کے خیالات جین کے لیے حیرت انگیز ہی ثابت ہوئے تھے۔ وہ میری آندرے کی وکالت کرتے ہوئے بولی۔

"لیے دیے رہنے اور بور ہونے میں بڑا فرق ہے۔ میرا خیال ہے اگر تم اس کی طرف توجہ دو تو وہ تمہارے لیے بہترین ثابت ہو سکتی ہے۔"

"شاید۔" ایلین کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ تاریک شیشوں والی عینک کی وجہ سے جین اس کی آنکھوں کی چمک نہیں دیکھ سکی تھی۔ ہوٹل سے باہر نکلتے ہی وہ ایلین کی طرف دیکھے بغیر خدا حافظ کہتی ہوئی ایک ٹیکسی کی طرف بڑھ گئی۔

دوسرے روز صبح سویرے ہی جین اور کرسٹن دہلی سے رخصت ہو گئے۔ ایلین گوتھر سے تعارف کے بعد یہ ہفتہ ان کے لیے نہایت سنسنی خیز ثابت ہوا تھا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ آنے والے لمحات اپنے دامن میں کس کے لیے کیا لے کر آنے والے تھے۔

جین اور کرسٹن کے رخصت ہوتے ہی ایلین گوتھر نے میری آندرے اور برنارڈ پر حاکمانہ تسلط جما لیا۔ وہ مشوروں کے بجائے انہیں احکامات دینے لگا۔ وہ دونوں ہندوستان سے کسی اور طرف جانا چاہتے تھے لیکن ایلین کے مشورے پر وہ نیپال جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ کھٹمنڈو میری آندرے کے خوابوں کی تعبیر سے بھی زیادہ حسین ثابت ہوا۔ ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کے دامن میں واقع یہ خوبصورت شہر وہ نہ دیکھتی تو اسے یقیناً افسوس ہوتا۔ ایلین جیسے فراخدل میزبان نے اس سیاحت میں اور بھی دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ فرسٹ کلاس ہوٹلوں میں قیام، تھری اسٹار ریسٹورنٹ میں کھانا اور ہوٹل سولٹی کیسینو میں جوئے کی بازیاں۔ میری آندرے خواب میں بھی ان چیزوں کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ ایلین کے مہمان کی حیثیت سے وہ شاہانہ انداز میں تفریحات سے لطف اندوز ہو رہی تھی کھٹمنڈو میں چند روز قیام کے بعد ایلین انہیں بنکاک لے آیا یہاں پہنچتے ہی میری آندرے نے ایلین میں ایک زبردست تبدیلی محسوس کی۔ کھٹمنڈو میں اس کا انداز تحکمانہ تھا لیکن بنکاک میں مختلف نظر آنے لگا۔ اپنی بات منوانے کے بجائے وہ ان دونوں سے مشورہ لیتا اور پھر عمل بھی انہیں کے مشوروں پر کیا جاتا۔ وہ ان دونوں کے سامنے بچھا جا رہا تھا۔ میری آندرے کا خیال تھا کہ ایلین کسی لالچ میں یہ سب کچھ کر رہا ہے لیکن اب تک اس کی طرف سے کسی ایسی خواہش کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ عشق کے معاملے میں وہ قطعی بے حس ثابت ہوا تھا۔ میری آندرے سے اظہارِ عشق تو کجا اس نے میلی آنکھ سے بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

بنکاک میں دو تین دن قیام کے بعد ہی برنارڈ کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اس کا معدہ ابھی تک مشرقی غذاؤں کا عادی نہیں ہو سکا تھا۔ کھانوں میں مسالے وغیرہ کے استعمال سے اس کے پیٹ میں گڑبڑ شروع ہو گئی اور اس نے کہیں آنا جانا بند کر دیا۔ ایلین بہت دیر تک اسے مشرقی غذاؤں پر لیکچر دیتا رہا پھر جیب سے چند گولیاں نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"مشرق کے کھانے اگرچہ بیحد لذیذ اور خوش ذائقہ ہوتے ہیں لیکن یہ اجنبیوں کو راس نہیں آتے۔ لو، یہ گولیاں کھا لو ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

برنارڈ نے تشکرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گولیاں نگل لیں۔ جس کے کچھ ہی دیر بعد اس پر نیند کا غلبہ ہونے لگا اور پھر اگلے چوبیس گھنٹے تک وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر گہری نیند کی آغوش میں دبکا رہا۔ دوسرے دن بیدار ہوا تو وہ اپنے آپ میں عجیب سی کمزوری محسوس کرنے لگا۔ میری آندرے نے تفریح کا پروگرام بنا رکھا تھا لیکن برنارڈ کی وجہ سے اسے اپنا یہ پروگرام کھٹائی میں پڑتا ہوا نظر آنے لگا۔

"تم میری وجہ سے اپنی تفریح غارت مت کرو۔" برنارڈ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کمزور سے لہجے میں کہا۔ "کمزوری کی وجہ سے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا لیکن تم اپنے پروگرام جاری رکھو ایسے مواقع زندگی میں بار بار نہیں آتے۔ کون جانے آئندہ کبھی بنکاک آنا نصیب ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ اگر تم میرے پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھی وقت ضائع کرتی رہیں تو مجھے واقعی افسوس ہو گا۔"

"میں نے آج رائل پیلس دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس لیے میں نے یہ پروگرام ملتوی کر دیا ہے۔ تم اچھے ہو جاؤ گے تو ہم دونوں اکٹھے چلیں گے۔" میری آندرے نے اس کی طرف دیکھے بغیر مدھم لہجے میں کہا۔

"دیکھو۔" برنارڈ نے اسے گھورا۔ "میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اگر تم یہاں بیٹھی وقت ضائع کرتی رہیں تو مجھے افسوس ہو گا جاؤ تم گھوم آؤ۔"

"ٹھیک ہے۔" میری آندرے گہرا سانس لیتی ہوئی اٹھ گئی۔ "اگر تم اصرار کرتے ہو تو میں چلی جاتی ہوں لیکن زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی جلد ہی لوٹ آؤں گی۔ لو یہ دو گولیاں کھا لو۔ صبح ایلین دے گیا تھا۔"

برنارڈ نے گولیاں نگل لیں اور اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ میری آندرے نے اس کی طرف دیکھا اور مطمئن انداز میں سر ہلاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

میری آندرے کے دل میں رائل پیلس دیکھنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ ہوٹل سے نکلتے ہی وہ ایک سائیکل رکشا پر سوار ہو گئی اور رکشا والے کو وہ پتا بتا دیا جہاں وہ جانا چاہتی تھی۔ تقریباً بیس منٹ بعد رکشا نے اسے دریا کے کنارے ایک چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ یہ شہر کا وہ علاقہ تھا جہاں نچلے درجے کے سیاحوں کا ہجوم رہتا تھا۔ منشیات اور اسمگلنگ کا مال یہاں کھلے عام فروخت ہوتا تھا۔ مقامی باشندے چیلوں کی طرح غیر ملکی سیاحوں پر جھپٹتے اور زبردستی اپنی چیزیں ان کے ہاتھ فروخت کرنے کی کوشش کرتے میری آندرے انہیں ایک طرف دھکیلتی ہوئی ہوٹل میں داخل ہو گئی۔ ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اس کے ساتھ ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ایک لمحہ کو اس کے دل میں خیال آیا کہ واپس لوٹ جائے۔ بھاگ جائے یہاں سے لیکن اسی لمحہ دروازہ کھلا اور ایلین گوتھر کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔

ایلین گوتھر کو دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ اسکی داڑھی غائب تھی کلین شیو، سلیقے سے بنے ہوئے بال، قیمتی لباس اور کولون کی مہک نے اس پر ایک سحر سا طاری کر دیا۔ وہ میری آندرے کو پہلے سے کہیں زیادہ خوبرو نظر آ رہا تھا۔

"آؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" ایلین نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ "اس لمحہ کا انتظار تو مجھے اس وقت سے تھا جب پہلی مرتبہ میں نے تمہیں سرینگر ایئرپورٹ پر دیکھا تھا۔ یہ انتظار اگرچہ خاصا اذیت دہ اور طویل ثابت ہوا لیکن میں ایسے معاملات میں صبر کا قائل ہوں۔"

میری آندرے وطن واپس پہنچی تو ہوائی اڈے پر افرادِ خانہ کے علاوہ اس کے بے شمار دوست احباب بھی اسے خوش آمدید کہنے کے لیے موجود تھے۔ اپنے آپ کو دوبارہ اپنوں میں پا کر اس کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا گھر پہنچتے ہی اس نے وہ تحائف تقسیم کرنے شروع کر دیے جو مشرق سے اپنے والدین، بہن بھائیوں اور دوستوں کے لیے لے کر آئی تھی۔ اس کی چھوٹی بہن ڈینس اسے دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔ اسے اپنی بہن کی خوشی عزیز تھی لیکن ایک عورت کی حیثیت سے اس کا ادراک بتا رہا تھا کہ اس کی بہن اپنا بہت کچھ مشرق میں کھو آئی ہے۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میری آندرے اور برنارڈ ایک دوسرے سے بہت دور نکل چکے تھے۔ دوسروں کے سامنے وہ دونوں آپس میں اگرچہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے لیکن ان کی باتوں میں محبت کا وہ عنصر نہیں تھا جو کچھ عرصہ قبل دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا باعث بنا تھا۔ ڈینس کے ذہن میں شبہ سر ابھار رہا تھا کہ ممکن ہے اس کی بہن کو مشرق کی سیاحت کے دوران کوئی اور محبت مل گئی ہو اور جب ڈینس کو تنہائی میں بہن کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملا تو اس کے اس شبہے کی تصدیق ہو گئی۔

"کشمیر پہنچتے ہی میری ملاقات ایک آدمی سے ہوئی تھی۔" میری آندرے نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ وہ بہت خوبرو، نہایت باوقار اور بہت دولتمند ہے۔" ایلین گوتھر کے ساتھ بیتے ہوئے لمحات میری آندرے کو تصورات کی دنیا میں لے گئے۔ وہ خوابیدہ لہجے میں ان یادگار لمحات کی تفصیل بتانے لگی جو ایلین گوتھر کی رفاقت میں گزرے تھے۔ کشمیر کی جنت نظیر وادی کے مرغزاروں کی سیر، تاج محل، کھٹمنڈو کی خانقاہیں، ہمالیہ کی ترائیاں۔ اس کے ہر جملے میں ایلین کا نام تھا۔ کبھی وہ اسے چارلس کے نام سے مخاطب کرتی۔ ایک ہی شخص کے دو ناموں سے ڈینس کچھ الجھ سی گئی۔

"اس کا نام کیا تھا؟ ایلین گوتھر یا چارلس؟" اس نے الجھی ہوئی نگاہوں سے میری آندرے کی طرف دیکھا۔

"دونوں۔" میری آندرے نے جواب دیا۔ "وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ اس کا کاروبار پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ لوگ اسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔" میری آندرے اسے اور بھی بہت کچھ بتانا چاہتی تھی..... لیکن اس نے برنارڈ کا خیال ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ "وہ چاہتا ہے کہ میں کچھ عرصہ اپنے عزیزوں میں گزارنے کے بعد اس کے پاس بنکاک واپس آ جاؤں۔ وہ میرے بغیر اپنے آپ کو ادھورا سمجھتا ہے۔"

"ہوں۔" ڈینس نے معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا تم واپس چلی جاؤ گی۔" وہ جانتی تھی کہ اس کی بہن زندگی بھر محبت کو ترستی رہی ہے۔ اس نے برنارڈ کا سہارا لینا چاہا تھا لیکن غالباً برنارڈ سے اسے وہ محبت نہیں مل سکی تھی جس کا اظہار چارلس نے کیا ہو گا۔

"نہیں۔" میری آندرے نے افسردگی سے جواب دیا۔ "دنیا کی آوارہ گردی پر میں پہلے ہی بہت سی رقم خرچ کر چکی ہوں۔ اب میں آرتھیوپیڈک اسپتال میں اپنی ڈیوٹی سنبھال کر باقی زندگی

یہیں گزار دوں گی ۔"

"لیکن شاید کبھی ....."

"نہیں ۔" میری آندرے نے اُس کی بات کاٹ دی۔ اُسے یقین تھا کہ اب وہ کبھی چارلس سے نہیں مل سکے گی۔ اس کی یادوں ہی کو سینے سے لگائے زندگی گزار دے گی ۔

میری آندرے کو اپنے گھر پہنچے ہوئے بمشکل ایک ہفتہ ہوا ہوگا کہ چارلس کا پہلا خط ملا۔ لفافے پر بنکاک کی مہر تھی۔ اندر سے برآمد ہونے والے کاغذ پر ایک مختصر سی نظم کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس نظم کا ایک ایک لفظ میری آندرے کے دل میں اُتر گیا۔ چارلس نے لفظوں کی آڑ میں بڑی خوب صورتی سے اپنے جذبات کی عکاسی کی تھی۔ ان خوب صورت لفظوں کی حلاوت ابھی میری آندرے کے ذہن سے محو نہیں ہوئی تھی کہ چارلس کا دوسرا خط پہنچ گیا۔

"دل کی دھڑکن ۔ میری آندرے!

تمہارے جانے کے بعد زندگی کا ایک ایک لمحہ محال ہو رہا ہے۔ یہ جدائی جانگسل ثابت ہو رہی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے، اپنی محبت پر اعتماد ہے کہ یہ جدائی دیرپا ثابت نہیں ہوگی۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ میری زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے، اُسے صرف اور صرف تم ہی پُر کر سکتی ہو۔ اب اور انتظار مت کراؤ۔ آجاؤ۔"

چارلس !

میری آندرے کے نام آنے والے خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ ایک ایک دن میں بارہ بارہ خطوط آنے لگے جن پر مختلف ممالک کے ڈاک خانوں کی مہر ثبت ہوتی اور پھر ٹیلی فون کالز کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دفتر یا گھر، وہ کہیں بھی ہوتی اُسے فون مل جاتا۔ ایک دن بنکاک سے کال ملتی تو دوسرے دن آپریٹر ہندوستان سے کال کی اطلاع دیتی۔ پھر سری لنکا، کھٹمنڈو اور کبھی ہانگ کانگ۔ دُنیا کے ان دور دراز خطوں سے سُنائی دینے والی چارلس کی آواز اس پر سحر سا طاری کر دیتی۔ میری آندرے نے اپنی تمام تر سرگرمیاں ختم کر دی تھیں۔ چارلس کے نام کے علاوہ اُسے دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اسپتال سے چھٹی ہوتے ہی وہ سیدھی گھر بھاگتی جہاں لاتعداد خطوط اُس کے منتظر ہوتے۔ وہ ٹیلی فون کے پاس بیٹھی خطوط پڑھتی رہتی اور جیسے ہی فون کی گھنٹی بجتی، وہ لپک کر ریسیور اٹھا لیتی۔ چارلس کی فون کالز اور خطوط اُس کی زندگی کا محور بن کر رہ گئے تھے۔

"میرے خوابوں کی حسین تعبیر، میری آندرے!

تم ابھی تک شاید میری محبت کی شدت کا اندازہ نہیں لگا سکیں۔ تمھیں یہ بھی علم نہیں ہوگا کہ میں کس طرح جدائی کے انگاروں پر لوٹ رہا ہوں۔ میرے صبر کا پیمانہ اب چھلکنے ہی والا ہے۔ اگر تم جلدی آجاؤ تو ہم فلپائن کے خوب صورت ترین جزیرے پر چھٹیاں گزارنے چلیں گے۔ جزیرے کے ساحل پر درختوں کے جُھنڈ میں خوب صورت ولا ہمارا منتظر ہے۔ ہم ناریل کے اُونچے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر مستقبل کے منصوبے بنائیں گے۔ تم جب تک نہیں آؤ گی میں اسی طرح فراق کے الاؤ میں جلتا رہوں گا۔

چارلس !"

اُس کے تیسرے ہی دن میری آندرے کو ایک اور خط ملا۔

"دل کی دھڑکن، میری آندرے !

تنہائی اب کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ تمہارے بغیر ایک لمحے کو بھی سکون نہیں ملتا۔ میں تمھیں کس طرح ٹوٹ کر چاہتا ہوں، اس کا اندازہ تمھیں یہاں آنے کے بعد ہی ہوگا۔ تم دیکھو گی کہ میں کس طرح تمھیں اپنے سامنے بٹھا کر تمہاری پوجا کرتا ہوں، اور ہاں، میں نے تمہارے لیے تھائی لینڈ کے خالص ریشم کے گاؤن بنوانے کا آرڈر دے دیا ہے۔ سُرخ اور فیروزی رنگ کے یہ گاؤن تمہارے حسن میں چار چاند لگا دیں گے۔ آج میں ایک جوہری کے پاس جا رہا ہوں تاکہ تمہارے لیے قیمتی پتھروں کے جڑاؤ نیکلس بریسلیٹ، انگوٹھی اور ایئر رنگز کا آرڈر دے سکوں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے آنے تک یہ ساری چیزیں تیار ہوں گی۔ بس تمہارے آنے کی دیر ہے۔

چارلس ۔"

میری آندرے کی زندگی اتھل پتھل ہو کر رہ گئی۔ وہ دریا کے کنارے گھنٹوں بیٹھی چارلس کے بارے میں سوچتی رہتی۔ جس نے اُسے ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اُسے سری نگر میں بجرے پر گزرے ہوئے وہ لمحات یاد آ رہے تھے۔ اس ایک ہفتے کے دوران چارلس نے ایک مرتبہ بھی اس کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھا

تھا۔ اس کے برعکس وہ جین کے آگے پیچھے پھر تا رہا تھا یا اُس کی توجہ کی مرکز وہ تین ہپی لڑکیاں تھیں جنھیں وہ ایک مرتبہ ریسٹورنٹ میں چارلس کے ساتھ دیکھ چکی تھی۔ سری نگر سے دہلی آنے کے بعد بھی چارلس نے کبھی اُسے قابلِ توجہ نہیں سمجھا تھا لیکن جیسے ہی جین ہندوستان سے رُخصت ہوئی، چارلس غیر متوقع طور پر اُس کی طرف جھکتا چلا گیا۔ برنارڈ کی موجودگی کے باوجود وہ موقع پا کر اس کے کان میں کوئی نہ کوئی میٹھی سرگوشی کر دیتا یا ٹیکسی وغیرہ میں بیٹھتے ہوئے جان بوجھ کر اس کے ہاتھ یا جسم کے کسی حصّے کو چھو لیتا اور ظاہر یہ کرتا کہ ایسا محض اتفاقی طور پر ہوا ہے۔ پھر کھٹمنڈو کی سیاحت کے دوران چارلس کو اس کے اور قریب آنے کا موقع مل گیا تھا۔........ اُس سہانی شام کے ایک ایک لمحے کی تفصیل اس کے ذہن پر نقش تھی لیکن اُسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس شام چارلس نے اُس کی محبت کے اعتراف میں زبان سے بھی کچھ کہا تھا یا نہیں لیکن اب اُس کے خطوط کا ایک ایک لفظ محبت کی چاشنی میں لپٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چارلس کی اس تبدیلی کی کوئی منطقی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کا ذہن اس قدر اُلجھا ہوا تھا کہ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

دوسرے روز میری آندرے کو چارلس کا ٹیلیگرام ملا جس میں پیش کش کی گئی تھی کہ اگر وہ بنکاک آنے کے لیے تیار ہو تو چارلس اُسے ہوائی جہاز کا دو طرفہ ٹکٹ بھیج سکتا ہے۔ اسی رات حسبِ توقع کال آ گئی۔ میری آندرے نے لپک کر ریسیور اُٹھا لیا۔

"تم ٹیلی گرامز اور ٹیلی فون کالز پر اتنی رقم برباد کیوں کر رہے ہو؟" چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میری آندرے نے کہا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں میری! یہ دولت میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔" چارلس نے جواب دیا۔ "میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔ میں تنہائی کے جس کرب میں مبتلا ہوں تم اندازہ نہیں لگا سکتیں۔"

تقریباً پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد لائن کٹ گئی میری آندرے عجیب سی اُلجھن کا شکار تھی۔ اس کی قوّتِ فیصلہ جواب دے چکی تھی۔ اس نے دوسرے دن ڈینس کو اپنے فلیٹ پر بلا لیا اور کچھ کہے بغیر چارلس کے تمام خطوط اس کے سامنے ڈھیر کر دیے۔ خطوط پڑھتے ہوئے ڈینس کے چہرے کے تاثرات ہر لحظہ تبدیل ہو رہے تھے۔

"یہ خطوط پڑھ کر دُنیا کی کوئی بھی عورت اپنے چاہنے والے کی صداقت سے انکار نہیں کر سکتی۔" ڈینس اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ "تم نے کیا سوچا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" شدتِ جذبات سے میری آندرے کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ "میں عجیب سی اُلجھن کا شکار ہوں۔ کوئی فیصلہ کرنا میرے بس میں نہیں رہا۔"

ڈینس کسی حد تک اُس کی اندرونی کیفیت سے آگاہ تھی، لیکن فوری طور پر وہ بھی کوئی مشورہ نہ دے سکی۔ اس سے اگلے دن میری آندرے نے ایک پُرانے دوست سے رابطہ قائم کیا۔ بوون وکیل تھا اور کئی سال پہلے جب میری آندرے دُکان کا دروازہ گرنے سے زخمی ہوئی تھی تو بوون معاوضے کے حصول کے سلسلے میں اس کی مدد کر چکا تھا۔ دراصل یہ بوون ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ میری آندرے کو اس حادثے کے نتیجے میں معاوضے کے طور پر دس ہزار ڈالر مل گئے تھے۔ اس واقعے کے بعد سے ان دونوں میں دوستی کا ایک ناتا قائم ہو گیا تھا اور وہ وقتاً فوقتاً ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے، اور میری آندرے کے خیال میں اس وقت بھی بوون ہی اُسے کوئی بہتر مشورہ دے سکتا تھا۔ وہ دونوں اسی ریسٹورنٹ میں آ گئے جہاں تقریباً دس سال پہلے میری آندرے ویٹریس کی حیثیت سے کام کر چکی تھی۔

بوون کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی تھی کہ میری آندرے کسی خاص موضوع پر بات کرنا چاہتی ہے لیکن وہ کریدنے کے بجائے اُسے خود اپنے الفاظ میں بات کرنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ بوون کے خیال میں وہ ایک سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اس نے آج تک جو کمایا تھا کھا کر دکھایا تھا۔ وہ باقاعدگی سے چرچ جاتی اور ماں باپ کی خدمت میں کسر نہ اٹھا رکھتی۔ اس کے جاننے والوں میں بھی اُسے اچھی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ بوون کے خیال میں میری آندرے کی زندگی میں صرف شوہر کی کمی تھی۔ وہ تیس سال کی ہو چکی تھی۔ اور گزرنے والا ہر دن اُسے بڑھاپے کی طرف لے جا رہا تھا۔

رم کی چسکیوں کے دوران میری آندرے اُسے اپنی سیاحت کے حالات سُناتی رہی وہ چند لمحے خاموش رہی اور پھر غبارے کی طرح پھٹ پڑی۔ اس نے چارلس کے تمام خطوط بوون کے سامنے رکھ دیے اور اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"تمھاری کیا رائے ہے۔ اگر میں بنکاک کے لیے چارلس کی پیش کش قبول کر لوں تو مجھے کیا نقصان ہو سکتا ہے؟" وہ چند لمحے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتی رہی پھر خود ہی اپنے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے بولی "میری نوکری ہی جائے گی نا۔

لیکن مجھے یقین ہے کہ واپس آ کر مجھے کوئی نہ کوئی اور نوکری مل جائے گی۔ میرے پاس دو ہزار ڈالر کی رقم موجود ہے اور چارلس کا بھیجا ہوا واپسی کا ٹکٹ بھی موجود ہوگا۔ اگر اس کے یہ سارے دعوے غلط نکلے تو میں خاموشی سے واپس چلی آؤں گی۔"

بوون سکون و اطمینان سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ جواب میں کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چارلس کی محبت کے بارے میں میری آندرے کا یہ انکشاف اس کے لیے چونکا دینے والا نہیں تھا۔ یہ کہانی تو جنگل کی آگ کی طرح پورے قصبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہر محفل میں اُسی کا تذکرہ تھا۔ مختلف زبانوں پر مختلف باتیں تھیں۔ کوئی کہتا میری آندرے مشرق کے ایک کروڑ پتی کو گھائل کر کے تڑپتا چھوڑ آئی ہے۔ ایک طرف سے یہ آواز بھی سُننے میں آئی تھی کہ ہندوستان کا ایک مہاراجہ میری آندرے کی محبت کا اسیر ہو چکا ہے اور اب وہ اسے اپنی مہارانی بنانا چاہتا ہے۔

بوون اُس کے چہرے پر نظریں جمائے سوچ رہا تھا کہ چارلس کو میری آندرے میں ایسی کون سی چیز پسند آ گئی تھی، جو اس کے لیے اس طرح بے چین ہو رہا تھا۔ حالاں کہ میری آندرے کا شمار ان لڑکیوں میں ہوتا تھا جو کسی لحاظ سے بھی جنسِ مخالف کو متاثر نہیں کر سکتیں۔ ڈھلتی ہوئی عمر اور شکل و صورت بھی ایسی واجبی سی کہ کوئی مرد ایک مرتبہ دیکھنے کے بعد اس کے چہرے پر دوسری نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، اگر اس کی صورت ہی اچھی ہوتی تو اب تک اسی قصبے کا کوئی نہ کوئی نوجوان اسے پسند کر چکا ہوتا مگر وہ راندۂ درگاہ تھی اور اُسے حیرت تھی کہ چارلس نے اُسے کیسے پسند کر لیا تھا مگر بوون میری آندرے کے سامنے ان خیالات کا اظہار کر کے اس کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اتنا وہ جانتا تھا کہ وہ جو بھی مشورہ دے گا میری آندرے اس پر بلا چون و چرا عمل کر ڈالے گی۔

"ہاں واقعی تمھارا کیا نقصان ہو سکتا ہے۔" وہ بالآخر مسکراتے ہوئے بولا۔ "البتہ یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ بنکاک پہنچنے کے بعد اگر تمھیں چارلس کے بارے میں ذرا بھی شبہ ہو کہ وہ منشیات کے کاروبار یا کسی اور غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہے جس سے تمھارا نام بھی پولیس کے ریکارڈ پر آنے کا احتمال ہو تو پہلی فرصت میں اس سے پیچھا چھڑا کر واپس آنے کی کوشش کرنا۔ تھائی لینڈ میں فوج کی حکمرانی ہے۔ سول قانون بھی فوجی قوانین کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔ کسی گڑبڑ کی صورت میں وہاں کا کوئی وکیل بھی تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔"

"لیکن ــ چارلس کو منشیات یا غیر قانونی سرگرمیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔" میری آندرے نے اس کے خاموش ہونے پر مسکراتے ہوئے کہا۔ "اُس کا بزنس پوری دُنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ کروڑ پتی ہے۔ اُسے یقیناً ایسی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی جو اُس کے کاروبار میں اُلجھن کا باعث بنتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" بوون بھی مسکراتے ہوئے بولا۔ "اگر ایسا ہے تو میں تمھیں مبارک باد دیتا ہوں۔"

میری آندرے کو مبارک باد دیتے ہوئے بھی بوون سوچ رہا تھا کہ کروڑ پتی چارلس کو میری آندرے میں ایسی کیا دلچسپی نظر آئی تھی کہ وہ دنیا کی حسین ترین لڑکیوں کو چھوڑ کر اس جیسی لڑکی کے فراق میں آہیں بھر رہا تھا۔

اگلے کئی ہفتے میری آندرے زندگی کے اس دوراہے پر کھڑی رہی جس کا ایک راستہ تو جانی پہچانی منزل کی طرف جاتا تھا۔ اس طرف زندگی کے وہی جانے پہچانے راستے تھے جن پر وہ گزشتہ تیس برسوں سے چلتی آ رہی تھی جب کہ دوسرا راستہ بالکل اجنبی تھا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ نیا راستہ اُسے کس منزل پر لے جائے گا۔

چارلس کے خطوط بدستور آتے رہے۔ ان خطوط کے لیے دنیا کے چند بڑے بڑے ہوٹلوں کے مونوگرام والے لیٹر پیڈ استعمال کیے گئے تھے۔ اس ضمن میں پہلا خط بمبئی کے تاج محل ہوٹل کے لیٹر پیڈ پر، دوسرا بنکاک کے اورینٹل ہوٹل، تیسرا ہانگ کانگ کے پینن سولا ہوٹل اور چوتھا کھٹمنڈو کے سولٹی ہوٹل کے مونوگرام والے خوب صورت لیٹر پیڈ پر لکھا گیا تھا۔ یہ لیٹر پیڈ دُنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے شخص کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھے۔ ان خطوط کی تحریر بھی دل کی گہرائیوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ۲۹ جون ۱۹۷۵ء کی تاریخ کے لکھے ہوئے دو خطوط پڑھ کر تو میری آندرے تڑپ اُٹھی۔

"مائی ڈارلنگ!

میری محبت سمندر سے زیادہ گہری اور آسمان کی بلندیوں سے زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ میری آنے والی نسل تمھاری کوکھ سے جنم لے تاکہ میرے نام کے ساتھ تمھارا نام بھی زندہ رہے۔

چارلس"

دوسرا خط بھی اُسی تاریخ کو لکھا گیا تھا۔

"دو دن پہلے کاروبار کے سلسلے میں مجھے کولمبو جانے کا اتفاق ہوا، جہاں میری ملاقات جنیوا سے آنے والے ایک حسین جوڑے سے ہوئی۔ وہ دونوں میاں بیوی اولاد کی نعمت سے محروم تھے اور کسی سیلونی بچّے کو گود... لینے کے لیے کولمبو آئے تھے۔ اُن کی باتیں سُن کر نجانے میں کیوں سوچنے لگا کہ کاش میرا بھی کوئی بچّہ ہو۔ اگر ہم شادی کر لیں تو ۱۹۷۶ء کے آخر تک اس نعمت سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ اُس وقت تک ہم کسی نہ کسی جگہ سیٹل ہو چکے ہوں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ تمھارے دل میں بھی اولاد کی خواہش مچلتی ہوگی۔ میں بے چینی سے تمھاری آمد کا منتظر ہوں۔

چارلس"

جولائی کے آخری ہفتے، میری آندرے کی تیسویں سالگرہ کے چند روز بعد رات کے کھانے کے دوران گھر کے افراد حسبِ معمول خوش گپیوں میں مشغول تھے لیکن میری آندرے اپنے معمول کے مطابق خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ کھانے کے بعد اُس نے برتن سمیٹنے اور دھونے میں اپنی ماں کی مدد کی اور کچھ دیر بعد جب کافی کا دور چلا تو میری آندرے نے جو اعلان کیا، اُس کے الفاظ بم کا دھماکا ثابت ہوئے۔ ہر شخص اپنی جگہ پر بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ میری آندرے چند لمحے اُن کے چہروں کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"میں اپنی ملازمت چھوڑ کر چارلس کی دعوت پر بنکاک جا رہی ہوں۔"

میری آندرے کی ماں میری پال کی بوڑھی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ اُس کا باپ آگسٹن اس طرح خاموش ہو گیا تھا جیسے اُس کی قوّتِ گویائی سلب ہو چکی ہو۔ ڈینس کے لیے میری آندرے کا یہ فیصلہ اگرچہ غیر متوقع نہیں تھا لیکن وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں اس کے باپ کی حرکتِ قلب رُک نہ جائے۔ فضا پر بوجھل سا سکوت طاری تھا۔ بالآخر ماں ہی نے خاموشی کو توڑا۔

"چارلس سے تمھاری ملاقات ایک ہفتے سے زیادہ کی نہیں۔ اس مختصر سے عرصے میں کسی کے بارے میں مطمئن ہو جانا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ میرا خیال ہے تمھیں اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔"

"یہ فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔" میری آندرے نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "اگر چارلس قابلِ اعتماد ثابت نہ ہوا تو میں فوری طور پر واپس آ جاؤں گی۔"

"لیکن، ہم تمھیں اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔ تمھارا باپ بسترِ مرگ پر ہے۔ کوئی معمولی سا صدمہ بھی اس کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔" ماں نے احتجاج کیا۔

میری آندرے پہلے ہی جانتی تھی کہ اس کے اس فیصلے کے خلاف بھرپور احتجاج کیا جائے گا۔ اُسے اپنے افرادِ خانہ سے محبت تھی۔ اپنے گھر سے محبت تھی۔ اس نے ہمیشہ اپنے گھر کا مفاد پیشِ نظر رکھا تھا۔ اُس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، گھر کی خدمت کی تھی اور اب اپنے معاملات میں اپنی مرضی کے استعمال کو اپنا حق سمجھتی تھی۔

"میں نے اس گھر کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔" وہ تلخ لہجے میں بولی۔ "آپ لوگوں کو احساس ہونا چاہیے کہ میں تیس سال کی ہو چکی ہوں اور اب مجھے بھی اپنی زندگی سنوارنے کا حق ملنا چاہیے۔ اگر ایک اچھا موقع مل رہا ہے تو اس سے فائدہ نہ اُٹھانا بہت بڑی حماقت ہوگی۔ میں جو فیصلہ کر چکی ہوں، اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔"

بالآخر میری آندرے کی اس ضد کے سامنے سب کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور پھر اگست ۱۹۷۵ء کی ایک صبح میری آندرے اپنے عزیزوں اور دوستوں سے رُخصت ہو کر بنکاک کے لیے پرواز کر گئی۔ اس مرتبہ وہ اکیلی تھی اور سفر طویل تھا لیکن اس کے باوجود اُسے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ چند ماہ پہلے جب وہ برنارڈ کے ساتھ دنیا کی آوارہ گردی کے لیے نکلی تھی تو دل میں طرح طرح کے خدشات نے سر اُبھارا تھا۔ اجنبی زمین اجنبی لوگ۔ لیکن اب جہاں وہ جا رہی تھی، وہاں ایک ایسا شخص موجود تھا جو اس کے انتظار میں بیٹھا گھڑیاں گن رہا تھا۔ وہ اس پر اعتماد کر سکتی تھی۔ جہاز پر سوار ہونے سے پہلے اس نے برنارڈ کی طرف مڑ کر دیکھا تھا۔ برنارڈ نے اُس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر بنکاک میں بھی میری آندرے اُس کی ضرورت محسوس کرے تو اُسے اطلاع کر دے۔ وہ فوراً اس کی مدد کو پہنچ جائے گا۔ ایسا کہتے ہوئے اگرچہ برنارڈ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات میری آندرے کی نگاہوں سے چھپے نہیں رہ سکے تھے۔

بنکاک کی طرف پرواز کرتے ہوئے میری آندرے نے

پہلی مرتبہ اپنی ڈائری میں چند جملے درج کیے۔ لکھتے ہوئے اس کی اُنگلیاں کپکپا رہی تھیں۔

" میں بنکاک پہنچنے والی ہوں جہاں چارلس میرا منتظر ہوگا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی ہے۔ میرے جذبات اس دُلھن سے ذرا بھی مختلف نہیں جو پہلی مرتبہ حجلۂ عروسی میں جا رہی ہو۔ میرے اعصاب اگرچہ بے قابو ہو رہے ہیں لیکن مجھے خوشی ہے کہ میں ایک ایسے شخص کے پاس جا رہی ہوں جو مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے۔"

ڈائری بند کر کے وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی جہاں ہزاروں فٹ نیچے دریائے شاؤ فیریا بل کھاتی ہوئی سرمئی لکیر کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے دونوں طرف "تا حدِ نگاہ دھان کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ چٹانوں پر جگہ جگہ بنے ہوئے بدھ اسٹوپا کی سنہری چھتیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ سبزہ زاروں کے وسط میں شہر کی فلک بوس عمارتوں کے جھرمٹ تھے جو ٹریفک سے اُٹھنے والے سیاہ دھوئیں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ بنکاک دنیا کا واحد شہر تھا جہاں چوبیس میں سے اٹھارہ گھنٹے ٹریفک جام رہتا تھا۔

اپنے آپ کو لبِ بام پا کر میری اندرے پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ یکایک اُس کے دل میں خواہش اُبھری کہ اسے بنکاک میں چند روز تنہا رہنے کا موقع مل جائے تاکہ وہ اس طویل سفر کی تھکن اتارنے کے ساتھ اپنے آپ کو چارلس کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر سکے۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی کہ کاش، چارلس اُس کے استقبال کے لیے ایئرپورٹ پر موجود نہ ہو۔ اس کے بجائے چارلس کا یہ پیغام اس کا منتظر ہو کہ اُسے ایک ضروری کاروباری سلسلے میں ہانگ کانگ جانا پڑ گیا ہے۔ وہ دو تین دن بعد واپس آئے گا لیکن اُسے یقین تھا کہ اُس کی یہ دعا قبول نہیں ہوگی اور جیسے ہی وہ جہاز سے اُتر کر لاؤنج میں داخل ہوگی، اُسے چارلس کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آ جائے گا۔

چارلس سوبھراج ڈونگ مانگ ایئرپورٹ پر اُس کا منتظر تھا۔ وہ طیارے کی آمد سے صرف چند سیکنڈ پہلے ہی ایئرپورٹ پہنچا تھا۔ صبح سے اب تک اُس کا ایک ایک لمحہ مصروفیت اور بھاگ دوڑ میں گزرا تھا۔ اس کا زیادہ وقت بنکاک کے وسط میں واقع امریکی طرز کے اس شاپنگ سینٹر میں گزرا تھا جہاں جوہریوں کی بڑی بڑی دُکانیں تھیں۔ وہ بظاہر اپنی اس محبوبہ کے لیے کوئی قیمتی تحفہ خریدنا چاہتا تھا جو دُنیا کے دوسرے سرے سے اُس کے پاس آ رہی تھی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ عظیم الشان ہوٹل کے قریب جوہریوں کی ان دُکانوں میں گھومنے کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔

یہاں یہ بتادینا ضروری ہے کہ چند ماہ قبل جب میری اندرے بنکاک سے برنارڈ کے ساتھ اپنے وطن کے لیے روانہ ہوئی تھی اور اس کے بعد چارلس کے محبت بھرے خطوط کا تانتا بندھ گیا تھا، اس دوران چارلس چاروں طرف سے دولت سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہندوستان کے برعکس بنکاک میں دولت کی فراوانی تھی اور مختلف ذرائع سے اس دولت کو نہایت آسانی سے سمیٹا جا سکتا تھا۔ یہاں غیر ملکی سیاحوں کی آمد و رفت ہندوستان کی نسبت زیادہ تھی جنھیں سستے داموں قیمتی پتھروں کا لالچ دے کر بے وقوف بنایا جا سکتا تھا۔ یہاں دُنیا بھر کے لیے ہوائی رابطے بھی موجود تھے اور کسی بھی وقت کسی بھی ملک کے لیے پرواز حاصل کی جا سکتی تھی۔ چارلس کے کاروبار کے لیے یہ ایک آئیڈیل شہر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بنکاک کو اپنا عارضی ہیڈ کوارٹر بنا لیا تھا۔ اس کی ایک سب سے بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ تھائی لینڈ کی پولیس کو نہایت آسانی سے رشوت پر آمادہ کیا جا سکتا تھا۔ غالباً تھائی لینڈ دنیا کا واحد ملک ہے جس کی پولیس کے پاس جرائم پیشہ افراد کا ریکارڈ سیاحت کی معلومات فراہم کرنے والے کسی کتابچے سے زیادہ ضخیم نہیں ہے۔ بنکاک پولیس کے ریکارڈ میں اگرچہ چارلس سوبھراج کا نام بھی موجود تھا لیکن اُسے یقین تھا کہ اس کا فائل گرد کی دبیز تہہ میں کسی ایسی جگہ دبا ہوگا کہ مقامی حکام اب اُسے بھول بھی چکے ہوں گے لیکن اس کے باوجود وہ یہاں اپنا اصل نام استعمال کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ اس مرتبہ وہ ایلین گوتھر کے نام سے اس ملک میں داخل ہوا تھا۔ اور بالفرض اس نام سے بھی کوئی مسئلہ پیدا ہوا تو وہ کوئی دوسرا نام اختیار کر سکتا تھا۔ بار بار نام تبدیل کرنا اس کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔

وہ ایک ماہر شکاری کی طرح شہر کے اُن تجارتی مراکز میں گھومتا رہا جہاں عالی شان ہوٹل اور جواہرات کی بڑی بڑی دُکانیں واقع تھیں۔ بالآخر اُس روز اُس نے ایک عظیم الشان ہوٹل کے آرکیڈ میں واقع ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور کو ...... اپنی سرگرمیوں کے لیے منتخب کر لیا۔ یہاں ریشمی ملبوسات و جیولری کے علاوہ ہر وہ چیز موجود تھی جو غیر ملکی سیاحوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں غیر ملکی سیاحوں کی آمد و رفت بکثرت تھی۔ چارلس جیسے ہی دُکان میں داخل ہوا ایک خوبصورت تھائی لڑکی ہونٹوں پر کاروباری مسکراہٹ سجائے اُس کی طرف بڑھی۔ امریکی لباس میں لڑکی کا حسن کچھ اور بھی نکھر آیا تھا۔ اُس کا نام نہ صرف خاصا طویل بلکہ بہت مشکل بھی تھا۔ چارلس نے اپنی سہولت کے لیے اُسے نکوشی کے نام سے مخاطب کیا تو اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

ویت نامی، برمی، تھائی اور جاپانی باشندوں کے چہروں کے نقوش عام طور پر ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ نکوشی بھی پہلے اُسے تھائی ہی سمجھی تھی لیکن جب اُس نے تھائی زبان میں چارلس کو خوش آمدید کہا تو وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس کے برعکس اُس نے فرانسیسی زبان میں بات کی تھی۔ فرانسیسی زبان کے بارے میں نکوشی کی معلومات چند الفاظ سے زیادہ نہیں تھیں۔ لہٰذا وہ دونوں انگریزی پر آ گئے جو دنیا کے ہر خطے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

نکوشی اس دُکان کی حسین ترین سیلز گرل تھی۔ اس سے ملنے والا کوئی بھی گاہک کوئی چیز خریدے بغیر نہیں لوٹتا تھا مگر چارلس ان گاہکوں سے بہت مختلف ثابت ہوا۔ اس پہلی ملاقات میں اس نے کوئی چیز نہیں خریدی۔ اس کے برعکس وہ تقریباً ایک گھنٹے تک نکوشی سے مختلف قیمتی پتھروں کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتا رہا۔ نکوشی کو دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ اس سلسلے میں چارلس کی معلومات خاصی وسیع تھیں۔ چارلس نے اُسے بتایا کہ وہ خود بھی اس شہر میں قیمتی پتھروں کی خرید و فروخت کا بزنس شروع کرنے کا پروگرام بنا رہا ہے۔ اس کا منصوبہ تھا کہ وہ کمبوڈیا کی سرحد کے قریب واقع شانتا بری کی کانوں سے قیمتی پتھر خرید کر بنکاک میں غیر ملکی سیاحوں کے ہاتھ فروخت کر کے کئی فی صد منافع کمائے گا۔ گفتگو کے دوران اُس نے نکوشی کو یہ بھی بتایا تھا کہ قیمتی پتھروں کے موضوع پر اُس نے یورپ کی ایک یونیورسٹی سے باقاعدہ ڈگری حاصل کی ہے۔ لیکن یونیورسٹی کا نام نکوشی کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ گفتگو کے دوران چارلس کی عقابی نظریں شوکیسوں میں سجے ہوئے جواہرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کی ان نظروں نے نکوشی کو کسی حد تک پریشان بھی کر دیا تھا اور جب وہ کچھ خریدے بغیر اچانک ہی دُکان سے باہر نکل گیا تو نکوشی نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

"کون تھا یہ؟" چارلس کے جانے کے بعد ایک اور سیلز گرل نے نکوشی سے پوچھا۔

" ہوگا کوئی اُچکا۔" نکوشی نے بُرا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ " ہانگ کانگ کے بعد اب یہ لوگ بنکاک کا رُخ کرنے لگے ہیں۔"

اس واقعہ کو کئی روز گزر گئے۔ نکوشی، چارلس کو تقریباً بھول چکی تھی۔ دُکان میں آنے والے ہر گاہک کو یاد بھی تو نہیں رکھا جا سکتا لیکن ایک روز جب وہ دُکان میں داخل ہوا تو نکوشی اُسے دیکھ کر چونک سی گئی۔ سفاری سوٹ میں وہ خاصا پُر وقار نظر آ رہا تھا۔ اس مرتبہ اُس نے یاقوت اور ہیرے کی چار انگوٹھیاں خریدیں۔ انگوٹھیوں میں جڑے ہوئے یہ پتھر معمولی نوعیت کے تھے جن کی کُل قیمت ڈھائی سو ڈالر سے زیادہ نہیں تھی۔

" میں یہ انگوٹھیاں آج رات ہی بیچ دوں گا۔" چارلس نکوشی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ " اس سودے میں مجھے کم از کم تین گنا منافع کی توقع ہے۔"

نکوشی حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ اصولی طور پر انگوٹھیاں خریدنے کے بعد چارلس کو چلے جانا چاہیے تھا لیکن پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی اس نے نکوشی کو باتوں میں اُلجھا لیا اور جب تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ دکان سے رخصت ہوا تو نکوشی اس کی طرف سے رات کے کھانے کی دعوت قبول کر چکی تھی۔

اس رات شیرٹن کے ریسٹورنٹ میں کھانے کے دوران ہونے والی گفتگو سے نکوشی کو اس کے بارے میں اور بھی بہت کچھ جاننے کا موقع ملا۔ چارلس اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے اپنے کسی محرمِ راز سے مخاطب ہو اور نکوشی کو حیرت تھی کہ وہ اپنے ذاتی اور کاروباری راز اس پر ظاہر کیوں کر رہا ہے۔

"میں پورے وثوق اور اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ غیر ملکی سیاح بنکاک میں صرف اور صرف اچھی جیولری ہی خریدنے کے لیے آتے ہیں لیکن یہاں جواہرات سے بھری ہوئی لاتعداد دُکانوں کو دیکھ کر وہ بُری طرح بدحواس ہو جاتے ہیں جس سے انھیں اپنی پسند کے انتخاب میں خاصی دشواری پیش آتی ہے اور بالآخر وہ کوئی نہ کوئی ایسی چیز خرید لیتے ہیں جو درحقیقت اس قیمت کی نہیں ہوتی جو وہ ادا کرتے ہیں۔" اُس نے خاموش ہو کر ریسٹورنٹ کے بار کاؤنٹر کی طرف اشارہ کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ " اگر میں اس بار کاؤنٹر پر چلا جاؤں تو پانچ منٹ کے اندر اندر کسی بھی مالدار سیاح کو دوست بنا سکتا ہوں۔ پھر ایک آدھ دن قابلِ اعتماد گائیڈ کی طرح اُسے شہر کی سیر کراؤں گا۔ ممکن ہے اس دوران مجھے اپنی گرہ سے اُسے ایک وقت کا کھانا بھی کھلانا پڑے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

کوئی معمولی سی چیز منہ مانگے داموں اس کے ہاتھ فروخت کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ وہ بلا چون وچرا وہ چیز خرید لے گا۔ میرے کاروبار کی بنیاد اعتماد اور بھروسے پر قائم ہے۔ اگر کسی گاہک کو پوری طرح اعتماد میں لے لیا جائے تو وہ معمولی سی چیز کو چار گنا قیمت پر خریدنے پر بھی آمادہ ہو سکتا ہے۔"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد چارلس نے بتایا کہ نکوشی سے پہلی ملاقات کے بعد سے اب تک وہ ہانگ کانگ، ٹوکیو، دہلی اور تہران کے کئی چکر لگا چکا ہے۔ اس کے گاہک پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور محض اعتماد کی بنا پر وہ اس سے ہیرے جواہرات بازار سے کئی گنا زیادہ قیمت پر خرید لیتے ہیں۔ نکوشی منہ کھولے حیرت سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چارلس نے اُسے مزید متاثر کرنے کے لیے ایک اور تیر چھوڑا۔

"ایران میں میرا تیل کا بزنس بھی ہے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے بھی مجھے وقتاً فوقتاً تہران جانا پڑتا ہے۔"

نکوشی کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ پہلی مرتبہ جسے اُچکا سمجھی تھی وہ تو کچھ اور نکلا تھا۔ اپنے آپ کو اب کروڑپتی کے سامنے بیٹھے ہوئے پا کر اس کے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔ چارلس نے ہیرے، یاقوت اور نیلم کی چند انگوٹھیاں جیب سے نکال کر میز پر رکھ دیں اور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"ان میں سے جو انگوٹھی تمھیں پسند ہو اُسے بلا تکلف اٹھا کر انگلی میں ڈال لو۔ یہ ہماری دوستی کی یادگار ہوگی۔"

نکوشی اس پیش کش پر بھونچکا سی رہ گئی۔ وہ چند لمحے اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر نیلم کی انگوٹھی اٹھا کر انگلی میں پہن لی۔ یہ اُس کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ کوئی قیمتی پتھر اُس کی انگلی کی زینت بنا تھا۔

"اگلے چند روز میں میں تمھیں جو قیمتی تحفہ دینے والا ہوں، اس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔" چارلس نے مسکراتے ہوئے باقی انگوٹھیاں اٹھا کر جیب میں ڈال لیں۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے جب میری آندرے کینیڈا میں تھی اور چارلس اُسے محبت بھرے خطوط لکھ رہا تھا۔ وہ ہر خط میں تنہائی کا رونا روتا لیکن یہاں بنکاک میں اُس کا ہر لمحہ عیش و نشاط میں بسر ہو رہا تھا۔ اُس نے نکوشی کو محبت کا یقین دلا کر اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا تھا۔ اُن کی ہر رات بنکاک کے کسی نہ کسی ڈسکو نائٹ کلب میں گزرتی۔ چارلس کو رقص کا شوق تھا مگر نکوشی اُس کے ساتھ رقص کرتے ہوئے ڈرتی تھی۔ چارلس کئی مرتبہ غلطی سے اُس کا پیر کچل چکا تھا۔ رات کا کھانا وہ کسی چائنیز ریسٹورنٹ میں کھاتے۔ کھانے کے دوران گفتگو کا محور جواہرات سے کبھی نہ ہٹتا۔ بعض اوقات تو نکوشی بیزاری سی محسوس کرنے لگتی، لیکن ظاہر ہے وہ اُسے موضوع بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔

نکوشی کو یہ جان کر بھی حیرت ہوتی تھی کہ چارلس ہر دوسرے تیسرے دن اپنا رہائشی ہوٹل تبدیل کر لیتا تھا لیکن وہ کسی سیکنڈ کلاس ہوٹل سے آگے کبھی نہیں بڑھا تھا۔ اس جیسے کروڑپتی کا کسی سیکنڈ کلاس ہوٹل میں قیام کرنا نکوشی کے لیے اچنبھے کی بات تھی اور جب ایک روز اُس نے اس سلسلے میں دریافت کر ہی لیا تو چارلس نے ہنستے ہوئے بتایا کہ اُسے دراصل کسی لگژری پینٹ ہاؤس کی تلاش ہے۔ وہ جیسے ہی اپنی اس تلاش میں کامیاب ہوا ہوٹلوں کی رہائش چھوڑ دے گا۔

۲ راگست ۱۹۷۵ء کے دن چارلس جب نکوشی کی دُکان میں داخل ہوا تو اُس کا سانس پھولا ہوا تھا جیسے بہت دور سے دوڑتا ہوا آیا ہو۔

"خیریت؟ لگتا ہے تم پولیس کی حراست سے بھاگ کر آئے ہو؟" نکوشی نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

"میں ایئرپورٹ جا رہا ہوں۔ کینیڈا سے میرا ایک دوست آرہا ہے جو میرا بزنس پارٹنر بھی ہے۔" چارلس نے اپنے بے ربط تنفس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اپنے پارٹنر کی موجودگی سے تم اپنے بزنس پر زیادہ توجہ دے سکو گے۔ تمھارا کم از کم آدھا بوجھ تو ہلکا ہو ہی جائے گا۔" نکوشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اس حقیقت سے قطعی بے خبر تھی کہ کینیڈا سے آنے والا چارلس کا وہ دوست کون تھا۔ اگر اُسے معلوم ہو جاتا تو شاید وہ اتنی خوشی کا اظہار نہ کرتی۔

میری آندرے کو کسٹمز کاؤنٹر پر اپنا سامان چیک کراتے ہوئے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس کے پاس کوئی . . . . قابلِ اعتراض چیز نہیں تھی۔ یوں بھی بنکاک ایئرپورٹ پر یورپی سیاحوں پر کسٹمز کے معاملات میں زیادہ سختی نہیں کی جاتی تھی۔ میری آندرے نے شیشے کی دیوار کے دوسری طرف چارلس کو دیکھ لیا تھا۔ گیٹ سے نکل کر وہ بانہیں پھیلائے والہانہ انداز میں اُس کی طرف دوڑی، لیکن چارلس کا رویّہ اُس کی توقعات سے قطعی برعکس ثابت ہوا۔ چارلس نے گرم جوشی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اُس کی پیشانی پر بوسہ دینے پہ ہی اکتفا کیا تھا۔ میری آندرے کے

دل پر گھونسا سا لگا مگر وہ یہ سوچ کر رہ گئی کہ ممکن ہے بے شمار لوگوں کی موجودگی میں چارلس نے اپنی محبت کے اظہار کو مناسب نہ سمجھا ہو۔

ٹرمینل سے نکل کر چارلس نے اُسے ایک ایسی ٹیکسی میں بٹھا دیا جس کی سیٹوں کے کشن اُدھڑے ہوئے تھے۔ وہ ٹیکسی دیکھنے میں مجموعی طور پر کھٹارہ ہی لگ رہی تھی اور دھوپ میں کھڑی رہنے کے باعث تنور کی طرح تپ رہی تھی۔ شہر تک کے طویل راستے میں چارلس اُسے مختلف چیزوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ میری آندرے منتظر تھی کہ وہ اپنے یا اُس کے بارے میں کچھ کہے گا۔ ان جذبات کا اظہار کرے گا جن کی عکاسی خطوط میں ہوتی تھی لیکن اس سلسلے میں چارلس کی زبان بندہی رہی۔

بالآخر ٹیکسی ایک عالی شان ہوٹل کے سامنے رُک گئی۔ میری آندرے کا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔ یہ سوچ کر ہی وہ مسرت سے جھوم اُٹھی کہ چارلس نے ہنی مون کے لیے اس ہوٹل کا انتخاب کیا تھا جہاں صرف کروڑپتی ہی قدم رکھنے کی سوچ سکتے تھے لیکن ہوٹل کے استقبالیہ کاؤنٹر یا لفٹ کی طرف جانے کے بجائے چارلس نے ہوٹل کے شاپنگ آرکیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے جب اُسے بتایا کہ وہ اُسے اپنے ایک خاص دوست سے ملانا چاہتا ہے تو میری آندرے کی خوشیوں پر ایک بار پھر اوس پڑ گئی۔

"میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔" میری آندرے نے احتجاج کیا۔ "میری حالت ایسی نہیں کہ تمھارے کسی دوست سے ملاقات کر سکوں۔ سب سے پہلے میں ٹھنڈے پانی سے نہانا چاہتی ہوں۔ اپنا حلیہ دُرست کرنے کے بعد ہی تمھارے کسی دوست سے ملنا چاہوں گی۔" اس کا احتجاج بے جا نہیں تھا۔ اس کے جسم پر نہایت معمولی سا لباس تھا جو ٹیکسی میں شدید گرمی کے باعث پسینے سے اس کے جسم سے چپک کر رہ گیا تھا۔ بال بھی بُری طرح اُلجھے ہوئے تھے اور حقیقت تو یہ تھی کہ اُس کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ اس حلیے میں وہ اپنے کسی بے تکلف دوست سے بھی ملنا پسند نہ کرتی۔ چہ جائیکہ چارلس اُسے اپنے کسی دوست سے ملانے لے جا رہا تھا۔

لیکن چارلس اُس کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک دُکان میں داخل ہو گیا۔ اندر گھستے ہی میری آندرے کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ تنور سے نکل کر کسی سرد خانے میں پہنچ گئی ہو۔ دُکان کا ایئرکنڈیشنر غالباً آخری پوائنٹ پر چل رہا تھا۔ پسینے میں بھیگا ہوا لباس برف کی طرح میری آندرے کے جسم سے چپک گیا اور وہ بے اختیار جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔

دُکان میں آراستہ ریشمی ملبوسات اور جگمگاتے ہوئے جواہرات دیکھ کر میری آندرے کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اُسی لمحہ ایک نہایت خوب صورت لڑکی، جس کی عمر بمشکل بیس سال رہی ہو گی، اُن کے قریب آگئی۔ چارلس کو دیکھ کر اُس لڑکی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آئی تھی۔ وہ دونوں جس انداز میں ایک دوسرے سے ملے تھے اُسے دیکھ کر میری آندرے کا دل کٹ کر رہ گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے چارلس نے جو حرکت کی وہ میری آندرے کے ہوش اُڑا دینے کے لیے کافی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے خوبصورت لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور میری آندرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ میری دوست ہے نکوشی۔" پھر وہ میری آندرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نکوشی سے مخاطب ہوا۔ "اور نکوشی! یہ میری آندرے ہے جو میری سیکرٹری کے فرائض سنبھالنے کے لیے کینیڈا سے آئی ہے۔"

میری آندرے نے رسماً کوئی جملہ کہنا چاہا مگر اُس کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب و اذیت کے تاثرات دیکھ کر نکوشی کو بھی اصل صورت حال سمجھنے میں دیر نہ لگی۔

چارلس نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کا کوئی دوست آ رہا ہے جو اُس کا بزنس پارٹنر بھی ہو گا لیکن وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ دوست کوئی لڑکی بھی ہو سکتی ہے۔ میری آندرے کے بارے میں اُسے یقین تھا کہ وہ اپنے آپ کو چارلس کی سیکرٹری سے آگے کچھ اور سمجھ رہی ہے۔ میری آندرے نے نکوشی کی طرف دیکھتے ہوئے دوستانہ انداز میں مسکرانے کی کوشش کی لیکن اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور چہرے کے تاثرات چھپانے کے لیے وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ چارلس اگر ان دونوں کی کیفیت سے آگاہ تھا تو اُس نے اظہار کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اس رات اُن تینوں نے اکٹھے ہی کھانا کھایا۔ میری آندرے اور نکوشی تو محض ہاتھوں اور منہ کو حرکت دے رہی تھیں، ورنہ حقیقت یہ تھی کہ ان دونوں میں سے کسی کے حلق سے بھی لقمہ نہیں اُتر رہا تھا۔ میری آندرے کو حلق میں کانٹے سے پڑتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ بنکاک میں اُس کی یہ پہلی رات اُس کے لیے قیامت ثابت ہو رہی تھی۔ چارلس نے اپنے خطوط میں اکثر لکھا تھا کہ وہ اُسے سامنے بٹھا کر دیوی کی طرح اُس کی پوجا کرے گا اور میری آندرے نے اس کے ان الفاظ کا یقین کر لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ بنکاک پہنچے گی تو اُس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے گا اور پہلی رات اُس کی زندگی

کی یادگار رات ہوگی۔ چارلس رات بھر اُس کے کانوں میں میٹھی میٹھی سرگوشیاں کرتا رہے گا لیکن توقع کے برعکس یہ رات اُس کی زندگی کی بدترین رات ثابت ہوئی۔ چارلس وہ درندہ ثابت ہوا تھا جو اپنے شکار کو زخمی کرکے اس کی بےبسی کا تماشہ دیکھ کر محظوظ ہوتا ہے۔

گھٹیا سے ہوٹل کے اس کمرے میں صرف ایک پلنگ تھا جس کے وسط میں چارلس گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے خراٹے کمرے کی خاموش فضا میں ارتعاش سا پیدا کر رہے تھے —— میری آندرے ایک صوفے پر لیٹی ہوئی تھی اور نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی —— وہ تاریک خلا میں گھور رہی تھی۔ میری آندرے کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ سوچنے سمجھنے کی قوت جواب دے چکی تھی۔ صبح سے کچھ پہلے بالآخر اس نے فیصلہ کرلیا کہ صبح وہ پہلے جہاز سے کینیڈا واپس چلی جائے گی لیکن پھر اُس نے یہ خیال ذہن سے نکال دیا۔ وہ ہر رکاوٹ کو توڑتی ہوئی کس طمطراق سے بنکاک آئی تھی لیکن جب دوسرے ہی دن واپس پہنچ جائے گی تو اس کے عزیز و اقارب کیا سوچیں گے۔ کیسے کیسے طعنے دیں گے۔ اُس کا جینا حرام ہوجائے گا۔ اور وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ اس نے طے کرلیا کہ اب وہ واپس نہیں جائے گی۔ وہ یہاں اپنے اس محبوب کی دعوت پر آئی تھی جو اُس کے فراق میں آہیں بھرتا رہا تھا لیکن یہاں آکر صورتِ حال اس کے برعکس نکلی۔ وہ چارلس پر اپنا حق سمجھتی تھی اور اُس کا یہ حق کسی اور عورت نے چھین لیا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ اگر وہ واقعی عورت ہے تو اس چڑیل سے اپنا حق چھین کر رہے گی۔

اس کا نام اینا بیلا تھا۔ ڈک اور اسیل کو اپنی اس اکلوتی اولاد پر بجا طور پر فخر تھا۔ اینا بیلا ۱۹۴۶ء میں اس وقت پیدا ہوئی تھی جب کمپیوٹر پہلی بار دنیا میں متعارف ہوا تھا اور برطانیہ کے وزیراعظم ونسٹن چرچل نے پہلی مرتبہ روس کے لیے آئرن کرٹین کا نام استعمال کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری جنگِ عظیم دنیا کو تباہی کے دہانے پر پہنچا کر اختتام کو پہنچ چکی تھی اور بےشمار مائیں ایسی اولادوں کو جنم دے رہی تھیں جن کی ولدیت کا خود اُنھیں بھی علم نہیں تھا۔

کیلی فورنیا کا وہ دور اُفتادہ قصبہ اس لحاظ سے پورے امریکہ میں منفرد حیثیت رکھتا تھا کہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس کے باشندے اپنے خون کا خالص پن برقرار رکھے ہوئے تھے۔ اس قصبے کے چاروں طرف بلند پہاڑوں کا قدرتی حصار تھا جن کے دامن میں شاداب وادیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اینا بیلا کا بچپن انہی مرغزاروں میں گزرا تھا۔ یہیں اُس نے جوانی کی دہلیز میں قدم رکھا تھا اور یہیں تعلیم حاصل کی تھی۔ نصابی تعلیم کے ساتھ مشرقی مذاہب کا مطالعہ کرتے ہوئے اینا بیلا بالآخر اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ دُنیا میں آنے والا ہر بچّہ اپنے والدین کا انتخاب خود کرتا ہے۔ اگر یہ دُرست تھا تو اُسے خوشی تھی کہ پیدائش سے پہلے اُس نے ڈک اور اسیل جیسے مشفق والدین کا انتخاب کیا تھا۔

اینا بیلا کی پیدائش سے پہلے ڈک کی آمدنی محدود تھی۔ وہی لگی بندھی تنخواہ تھی جس میں اُنھیں گزارا کرنا پڑتا تھا لیکن اینا بیلا کی آمد کے چند ہی روز بعد اُس نے ملازمت چھوڑ کر کاروبار شروع کردیا۔ جس سے اُس کی آمدنی میں روزافزوں اضافہ ہوتا رہا۔ ڈک کو بہت سے بچّوں کی خواہش تھی لیکن اینا بیلا کی پیدائش کے بعد اسیل اُس کی مزید خواہش پوری نہ کرسکی اس طرح صرف اور صرف اینا بیلا اُن کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ اس کے چہرے کے نقوش ماں سے مشابہ تھے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ستواں ناک اور گلاب کی پنکھڑیوں سے نازک ہونٹ۔ اینا بیلا نہ صرف والدین بلکہ قصبے کے دیگر باشندوں کے لیے بھی ایک ایسی گڑیا کی حیثیت رکھتی تھی جسے ہر کوئی اپنے دل میں سجانا چاہتا تھا۔ ذرا بڑی ہوئی تو اُسے دعوتوں میں مدعو کیا جانے لگا۔ کوئی بھی سالگرہ پارٹی اس کے بغیر ادھوری سمجھی جاتی۔ وہ شروع ہی سے احکامات صادر کرنے کی عادی تھی لیکن اس کا لہجہ ایسا دھیما اور اثرانگیز ہوتا کہ کوئی بھی اُس کے احکامات کی تعمیل سے انکار نہ کرسکتا۔ وہ اپنا ہر کام سلیقے سے کرتی۔ دوسرے بچّوں کی طرح اس میں تخریب یا توڑ پھوڑ کا عنصر نہیں تھا۔ اسکول کی ٹیچرز اُس کی ذہانت کی معترف تھیں۔ اسکول کے بعد وہ دن بھر اپنے مکان کے عقب میں واقع جنگل میں تتلیوں کے پیچھے دوڑتی رہتی۔ اس کے قہقہے قصبے کے باشندوں کو اس قصبے میں بھرپور زندگی کا احساس دلاتے رہتے۔

اسیل کو یاد تھا کہ اینا بیلا کی زندگی میں پہلی تبدیلی اس وقت آئی تھی جب وہ دس سال کی تھی۔ اسیل کے بوڑھے والد کارلو کا اصرار تھا کہ اب اینا بیلا کو اپنے آبائی وطن اٹلی کی سیر بھی کرنی چاہیے تاکہ اس کے دل میں بچپن ہی سے اپنے آبائی وطن کی محبت جگہ بنا سکے۔ اسیل کا خیال تھا کہ اینا بیلا ابھی بہت کم عمر ہے۔ اُسے نہ تو رشتے داروں کی شناخت ہوسکتی ہے اور نہ ہی کسی اور چیز کا احساس۔ لیکن باپ کی ضد کے سامنے اسیل کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑے اور بالآخر اینا بیلا کو تین ہفتوں کے لیے اٹلی بھیج دیا گیا۔

کارلو کی زندگی سنگِ مرمر کی کانوں میں کھدائی کرتے ہوئے گزری تھی۔ اُسے فخر تھا کہ اس نے اس کان کی کھدائی میں بھی حصّہ لیا تھا جہاں چار سو سال پہلے مائیکل اینجلو نے ڈیوڈ کے مجسمے کی تیاری کے لیے سنگِ مرمر کا انتخاب کیا تھا لیکن اب کارلو ریٹائر ہوچکا تھا۔ اس کا زیادہ وقت اپنے انگور کے باغ کی دیکھ بھال اور گاؤں کے لوگوں سے گپیں ہانکنے میں گزرتا۔ اینا بیلا کے آنے کے بعد اُس کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ وہ اُسے لے کر وادی میں گھومتا رہتا۔ کبھی سنگِ مرمر کی وہ کانیں دکھانے کے لیے لے جاتا جہاں اُس نے زندگی کا بہترین وقت گزارا تھا اور کبھی اس شہرِ خموشاں میں لے جاتا جہاں اس کے اسلاف ابدی نیند سو رہے تھے۔

کارلو اور اینا بیلا میں دوستی کا ایک ایسا رشتہ استوار ہوچکا تھا جس کی مثال کم از کم اس دنیا میں ملنا بہت مشکل ہے۔ کارلو اُسے ایک لمحے کو بھی اپنی نگاہوں سے اُوجھل نہ ہونے دیتا۔ گاؤں کی کوئی دوسری عورت جب اینا بیلا کے قریب آنے کی کوشش کرتی تو کارلو اُسے اس طرح بھگا دیتا جیسے اُسے خدشہ ہو کہ یہ عورت اینا بیلا پر قبضہ نہ جمالے۔ وہ اینا بیلا کے ہر کام کی دیکھ بھال خود کرتا۔ صبح جب اینا بیلا کی آنکھ کھلتی تو باورچی خانے سے آنے والی خوشبو اُسے بتا دیتی کہ نانا اُس کے لیے بہترین ناشتا تیار کر رہا ہے۔

تین ہفتے پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ کارلو اب بھی اینا بیلا کو واپس بھیجنے کے لیے تیار نہیں تھا اور نہ ہی اینا بیلا واپس جانا چاہتی تھی۔ بالآخر کارلو نے اپنی بیٹی کو فون کیا کہ بچّی کو کچھ عرصہ اور اٹلی میں رہنے دیا جائے۔ اسیل آمادہ نہیں تھی لیکن باپ کی ضد کے سامنے اُسے ایک بار پھر ہتھیار ڈالنے پڑے۔

چند ہفتے اور گزر گئے۔ اینا بیلا حسبِ معمول دوپہر کے کھانے کے بعد سو گئی۔ ایک دو گھنٹوں کی نیند کے بعد وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگتی۔ پھر ہلکے سے ناشتے کے بعد وہ اپنے نانا کے ساتھ وادی کی سیر کو نکل جاتی جہاں سے واپسی غروبِ آفتاب کے وقت ہی ہوتی۔

اس روز دوپہر کے بعد اینا بیلا کی آنکھ کھلی تو اُسے گھر میں غیر فطری سی خاموشی کا احساس ہوا۔ عام طور پر گھر کی فضا میں بوڑھے کارلو کی گنگناہٹ سنائی دیتی رہتی تھی۔ لیکن اس روز عجیب سا سناٹا طاری تھا۔ اینا بیلا اُٹھ کر آنکھیں ملتی ہوئی کارلو کے کمرے میں پہنچی تو اُس کا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ کارلو فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کا چہرہ سفید ہورہا تھا اور ایک ہاتھ مدد طلب انداز میں آگے کو پھیلا ہوا تھا۔ دوسرا ہاتھ سینے پر تھا جیسے وہ اپنے دل کو مٹھی میں بھینچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اینا بیلا کو دیکھ کر کارلو نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی اُس کے جسم کو ہلکا سا جھٹکا لگا اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے بےحس و حرکت ہوکر رہ گیا۔

یہ ننھی اینا بیلا کی زندگی کا خوف ناک ترین تجربہ تھا۔ اُس نے اپنے نانا کو مرتے ہوئے دیکھا تھا اور کارلو کی تدفین کے وقت گاؤں کے بیسیوں لوگوں کے ساتھ آنسو بہائے تھے۔ فورٹ ڈی مارمی سے رخصت ہونے سے پہلے وہ اکیلی نانا کی قبر پر گئی۔ پھول چڑھائے اور بہت دیر تک قبر کے اُن سفید پتھروں کو دیکھتی رہی جن کے بارے میں کارلو نے بتایا تھا کہ سنگِ مرمر کی یہ سلیں اُس نے خود اپنے ہاتھوں سے تراشی تھیں۔

اینا بیلا تقریباً تین ماہ بعد امریکہ واپس لوٹی تو وہ بہت بدل چکی تھی۔ وہ صرف اطالوی زبان بولتی اور اپنے آپ کو اطالوی کہلانے پر فخر محسوس کرتی۔ اس نئی صورتِ حال نے اسیل کو پریشان کردیا لیکن رفتہ رفتہ اینا بیلا اعتدال پر آگئی تو اُسے اطمینان سا ہوا۔

ہائی اسکول سے گریجویشن کرنے کے بعد اینا بیلا کو ایک بار پھر یورپ جانے کا موقع ملا۔ اس مرتبہ اسیل بھی ہمراہ تھی۔ وہ بظاہر اپنے عزیزوں سے ملنا چاہتی تھی لیکن اس سے زیادہ وہ اینا بیلا پر نگاہ رکھنے کے لیے اس کے ساتھ جارہی تھی۔ اسیل نے اپنے دفتر سے صرف ایک ماہ کی رُخصت لی تھی اور جب واپس جانے کا وقت آیا تو اینا بیلا نے ساتھ جانے سے صاف انکار کردیا۔ اُس کے لہجے میں درخواست کے بجائے تحکم کا عنصر غالب تھا۔ اسیل نے کسی بحث میں اُلجھنا مناسب نہیں سمجھا البتہ یہ ضرور کہا کہ وہ جہاں بھی ہو گھر سے رابطہ قائم رکھے اور اگر کسی معاملے میں کوئی دشواری پیش آئے تو فوراً ٹیلی فون پر اطلاع کردے۔ گھر واپس پہنچ کر اسیل نے جب شوہر کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ اُس پر اپنی مرضی مسلّط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتی ہے کرنے دو۔ یہ زندگی اس کی ہے اور اُسے اپنے طور پر زندگی گزارنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ ویسے میرا خیال ہے اس کے پاس جیسے ہی رقم ختم ہوگی وہ واپس لوٹ آئے گی۔“

ڈک کا خیال تھا کہ اینا بیلا زیادہ سے زیادہ ایک دو ہفتے بعد لوٹ آئے گی لیکن اُس کا یہ خیال غلط نکلا۔ اینا بیلا دو سال تک یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کی آوارہ گردی کرتی رہی۔ گزر اوقات

کے لیے اُسے کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا کام مل جاتا۔ ایتھنز میں ایکروپولس کے دامن میں وہ بہت معمولی کمیشن پر غیر ملکی سیاحوں کو یونانی مصنوعات فروخت کرتی رہی۔ میڈرڈ کے ایک اسپتال میں اس نے نرسنگ اردلی کی حیثیت سے کام کیا۔ پیرس میں اخبار بیچ کر گزارہ کرتی رہی اور استنبول میں مقامی باشندوں کو انگلش پڑھا کر دو وقت کی روٹی کماتی رہی۔ اس دوران اسیل اُسے بدستور خطوط لکھتی رہی۔ اس کے ہر خط میں صرف ایک ہی مطالبہ ہوتا' گھر واپس آجاؤ۔'

"خدا کے لیے کسی طرح اینا بیلا کو واپس بلا لو۔" ایک روز اسیل نے روتے ہوئے ڈک سے کہا۔ "وہ میری ایک ہی تو اولاد ہے۔ اور میں اس طرح اُس سے دور نہیں رہ سکتی۔"

"وہ میری بھی بیٹی ہے۔" ڈک نے جواب دیا۔ "لیکن وہ بالغ اور خود مختار ہے۔ ہم اس پر اپنی مرضی مسلط نہیں کر سکتے۔ اُسے اپنے طور پر زندگی گزارنے کا پورا حق حاصل ہے۔"

اینا بیلا ۱۹۶۶ء میں کیلی فورنیا واپس پہنچی۔ اُس وقت وہ بیس سال کی ہو چکی تھی۔ اس کے احباب اُسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کی آب و ہوا نے اُس پر خوشگوار اثرات مرتب کیے تھے۔ وہ ایک بھرپور دوشیزہ کے روپ میں سامنے آئی تھی اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس وقت قصبے میں اس جیسی حسین لڑکی اور کوئی نہیں تھی۔ وہ اطالوی، فرانسیسی اور اسپینی زبانیں روانی سے بول سکتی تھی جب کہ یونانی زبان بھی اس کے لیے اجنبی نہیں رہی تھی۔

"میں ان لوگوں میں سے ہوں جو نہایت آسانی سے اور بہت جلد دوسری زبانیں سیکھ لیتے ہیں۔" اینا بیلا نے ایک روز اسیل کو بتایا اور جب واپس جاؤں گی تو یہی زبانیں حصولِ روزگار کے سلسلے میں میری مددگار ثابت ہوں گی۔"

"واپس!" اسیل بُری طرح چونک گئی۔ "لیکن یہ تمہارا گھر ہے۔ یہاں سے واپس کہاں جاؤ گی؟"

"اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت میں یہاں موجود ہوں۔" اینا بیلا نے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں نے اپنے آپ کو اس خطۂ زمین کا اٹوٹ انگ کبھی نہیں سمجھا۔"

اس کے ارادے جان کر اسیل پریشان ہو گئی۔ اینا بیلا اسی ملک میں پیدا ہوئی تھی لیکن اپنے آپ کو اس ملک کا باشندہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اُسے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا کہ اینا بیلا کسی بھی وقت یہاں سے رُخصت ہونے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ اینا بیلا نے زادِ راہ جمع کرنے کے لیے ملازمت شروع کر دی۔ وہ کم از کم اتنے پیسے جمع کر لینا چاہتی تھی کہ کسی یورپی ملک کا ہوائی ٹکٹ خرید سکے۔ دن ہفتے اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے۔ ایک سال بیت گیا۔ اس دوران اینا بیلا نے اگرچہ ایک مرتبہ بھی اپنے اس ارادے کا اظہار نہیں کیا تھا مگر اسیل کے خدشات اپنی جگہ برقرار تھے۔ وہ ماں تھی اور اُس پر جو کچھ بیت رہی تھی اُسے وہی بہتر طور پر سمجھ سکتی تھی۔

ملازمت کے ساتھ ساتھ اینا بیلا نے آرٹ اسکول میں داخلہ لے لیا لیکن پھر نرسنگ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ میڈیکل کے شعبہ سے تعلق رکھنے والے کسی بھی شخص کو یورپ کے کسی بھی ملک میں آسانی سے ملازمت مل سکتی ہے۔ جونیئر کالج میں گریڈ بہتر ہونے کی بنا پر اُسے اسٹیفورڈ کے میڈیکل اسکول میں داخلہ حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے ایکسرے ٹیکنالوجی کا انتخاب کیا تھا، لیکن اُسے جلد ہی تجربہ ہو گیا کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبے میں بھی بددیانتی کا عمل دخل موجود ہے۔ اسپتال کا ایکسرے سیکشن کا عملہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے بجائے اِدھر اُدھر غائب رہتا اور بے چارے مریضوں کو گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا۔

ایک مرتبہ اینا بیلا نے ایکسرے مشین میں ایک ایسا معمولی سا نقص دریافت کیا جو آگے چل کر مریضوں اور اسٹاف کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس نے سپروائزر کو مشین کے اس نقص کی نشان دہی کی۔ وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ اینا بیلا نے اسپتال کے انچارج ڈاکٹر کو اس صورتِ حال سے مطلع کیا تو وہ بھی اُس کا شکریہ ادا کرنے سے زیادہ کچھ نہ کر سکا۔ ایکسرے مشین کی خرابی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ ڈاکٹروں کا یہ رویّہ دیکھ کر اینا بیلا نے اُسی روز اسپتال کی ملازمت چھوڑ دی اور اپنی ایک دوست سے شکوہ کرتے ہوئے بولی۔

"ڈاکٹروں کو تو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ وہ تو مسیحا ہیں لیکن بدقسمتی سے وہ اپنے آپ کو خدا سمجھ بیٹھے ہیں جو اپنی غلطی کو غلطی نہیں سمجھتے۔"

طویل عرصے تک اپنے قصبے سے غیر حاضری کے باعث اب انا بیلا اپنے لیے کچھ اجنبیت سی محسوس کر رہی تھی۔ ۱۹۶۳ء میں جب وہ یورپ کی سیاحت پر گئی تھی تو اس وقت امریکی نوجوان اپنے معاشرے میں ایک اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ ان کے کردار قابلِ رشک تھے لیکن اب جب کہ امریکی صدر کو ڈلاس میں گولی مار کر ہلاک کیا جا چکا تھا، یہ نوجوان نسل ایک نیا رنگ اختیار کر رہی تھی ۔۔ لمبے بال، بے تحاشا بڑھی ہوئی داڑھیاں

اور پیوند لگے کپڑے! ہپی ازم امریکی تہذیب کو نگل رہا تھا۔

...... بے راہ روی اور منشیات کا استعمال ایک عام سی بات ہو گئی تھی۔ اینا بیلا کو ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ایسے لوگوں سے بات کرتے ہوئے بھی کتراتی لیکن بالآخر اسے اپنے اسکول کے زمانے کا ایک دوست مل ہی گیا۔

زمانۂ تعلیم میں جمی کھیلوں اور باغبانی کا رسیا تھا لیکن اب اُس کا حُلیہ بھی بدل چکا تھا۔ لڑکیوں کی طرح لمبے بال اور چوہے کی دُم کی طرح لٹکتی ہوئی باریک مونچھیں، اُسے گٹار کے سوا دُنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ دوسرے نوجوانوں کی نسبت اس میں شرافت کا مادّہ ابھی کسی حد تک موجود تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں اینا بیلا نے محسوس کر لیا تھا کہ جمی کے پیشِ نظر زندگی کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ اُسے کام سے صرف اس حد تک دلچسپی تھی کہ اس آمدنی سے گٹار کی تاریں خریدنے کے علاوہ دو وقت کی روٹی کا انتظام ہو سکے۔ چند ملاقاتوں کے بعد اینا بیلا پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ جمی شراب نوشی کا بھی عادی ہے لیکن یہ عادت ابھی ابتدائی مراحل میں تھی۔

کئی مہینوں کی ملاقاتوں کے بعد اینا بیلا نے محسوس کیا کہ جمی کے لیے اس کے دل میں کچھ عجیب سے جذبات جنم لے رہے تھے۔ وہ اس کے لیے بے چین سی رہنے لگی، جس روز جمی سے ملاقات نہ ہوتی وہ کھوئی کھوئی سی رہتی۔

"میں جمی کو پسند کرنے لگی ہوں۔" ایک روز اُس نے اپنی ماں کو بتایا۔ "ہم چند روز بعد شادی کرنے والے ہیں۔"

انا بیلا کے اس فیصلے نے اسیل کو بدحواس کر دیا۔ اُسے بیٹی کی شادی پر کوئی اعتراض تھا لیکن اس نے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا تھا جس کا کوئی مقصدِ حیات نہیں تھا۔ جسے نہ تو کسی کام سے دلچسپی تھی اور نہ ہی اُس کے دل میں آگے بڑھنے کی خواہش تھی۔ جمی کا شمار تو اُن لوگوں میں کیا جا سکتا تھا جو خود تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا اُن کی ضروریات پوری کرتا رہے۔ اسیل نے اپنے شوہر کو اینا بیلا کے اس فیصلے کے بارے میں بتایا تو وہ اس پر کوئی تبصرہ نہ کر سکا۔

شادی بہت سیدھے سادے طریقے پر انجام پائی۔

اسیل کو یہ جان کر بہرحال خوشی ہوئی تھی کہ جمی بھی اینا بیلا کو ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اپنی نئی ذمّے داریاں محسوس کر کے وہ کوئی کام بھی کرنے لگے گا۔

گاؤں کے قریب ہی جنگل میں وہ چھوٹا سا مکان بہت معمولی کرائے پر مل گیا جس کے بارے میں اینا بیلا نے اکثر سوچا تھا۔ اینا بیلا نے ایک سُگھڑ خاتون کی طرح فوراً ہی گھر کا نظام سنبھال لیا۔ اُس نے کچھ مُرغیاں اور بکریاں بھی پال لی تھیں۔ گھر کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ اُن کی دیکھ بھال کرتی اور کچھ وقت باغبانی پر بھی صرف کرتی۔ جمی نے بھی ایک جگہ مالی کی حیثیت سے ملازمت کر لی تھی، لیکن حسبِ عادت بہت جلد اُس نے ملازمت چھوڑ دی اور دن بھر گھر میں بیٹھا اینا بیلا کو کام کرتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ کئی ماہ بعد جب ایک مرتبہ اسیل اُس کے گھر آئی تو اُس نے محسوس کیا کہ اینا بیلا بیوی سے زیادہ ماں کا کردار ادا کر رہی تھی اور جمی شوہر کے بجائے بچّہ بنا ہوا تھا۔ اینا بیلا کا زیادہ وقت اُس کی ناز برداریاں کرتے گزرتا۔ میاں بیوی اگر اسی انداز میں زندگی بسر کرنا چاہتے تھے تو اُسے کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن پریشانی کی بات یہ تھی کہ جمی نے بے تحاشا شراب نوشی شروع کر دی تھی۔ شراب بھی بے اثر ہونے لگی تو اُس نے اس سے بھی تیز منشیات کا استعمال شروع کر دیا۔ وہ اس حد تک بہتا کہ کبھی تو اُسے قے ہو جاتی اور کبھی وہ کرسی پہ بیٹھے بیٹھے لڑھک جاتا۔

اس موقع پر ایک اور کردار زندگی کے اس ڈرامے میں شامل ہو گیا جو کم از کم اینا بیلا کے لیے قدرے خوشگوار ثابت ہوا۔ وہ بمبئی کے ایک دولت مند وکیل کا بیٹا تھا، جو حصولِ تعلیم کے سلسلے میں امریکہ میں مقیم تھا اور ان دنوں چھٹیوں کی وجہ سے تلاشِ معاش کے سلسلے میں یہاں آیا ہوا تھا۔ اتفاق سے اُسے ڈک ہی کے دفتر میں ملازمت مل گئی۔ سنجے کی پہلی ہی ملاقات نے ڈک کو متاثر کیا تھا اور ڈک نے دوسرے ہی روز اُسے اپنے ہاں رات کے کھانے پر مدعو کر لیا۔ غیر ملکیوں کے لیے اینا بیلا کے دل میں بڑی کشش تھی۔ سنجے کی شخصیت اُسے کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی تھی۔ اس ہندو نوجوان کو امریکہ میں وارد ہوتے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ وہ یہاں کی اقدار اپنانے کی کوشش کر رہا تھا جس میں اُسے خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ اینا بیلا ان معاملات میں اُس کی مدد کرنے لگی۔

سنجے کو رہائش کا مسئلہ درپیش تھا۔ اینا بیلا کی شادی کے بعد اُن کا گھر کچھ خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ ڈک نے جب سنجے کو اپنے ہاں رہائش کی پیشکش کی تو وہ اُسی روز اُن کے ہاں منتقل ہو گیا۔ اینا بیلا کا زیادہ وقت اب سنجے کے ساتھ ہی گزرنے لگا تھا۔ اُن کے تعلقات میں اگرچہ محبت کو دخل نہیں تھا لیکن وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ اینا بیلا نے اس کا ہر کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کھانے اور لباس

کا انتخاب بھی وہ خود کرنے لگی۔ کبھی وہ لمبی ڈرائیو کے لیے نکل جاتے اور کبھی گھنٹوں کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ اینا بیلا ہندوستان کے بارے میں کرید کرید کر سوال کرتی۔ چھ سو ملین آبادی والے اس ملک کی ہر بات اُس کے لیے سنسنی خیز ثابت ہو رہی تھی۔

سنجے کی چھٹیاں ختم ہو گئیں اور وہ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے سینٹ لوئس روبسیو واپس چلا گیا جو اینا بیلا کے قصبے سے زیادہ دور نہیں تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سنجے کے جاتے ہی اینا بیلا پر افسردگی سی طاری رہنے لگی۔ اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات اُس کی اندرونی کیفیت کی غمازی کر رہے تھے۔ جمی نے بھی اس بات کو نوٹ کر لیا اور وہ بات بات پر اُسے سنجے کے طعنے دینے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اینا بیلا کو اپنے شوہر سے زیادہ اس ہندو نوجوان کا خیال تھا۔ اینا بیلا سب کچھ خاموشی سے سنتی رہی لیکن جب جمی نے اُسے بے حیائی کا طعنہ دیا تو اُس کی قوّتِ برداشت جواب دے گئی اور وہ بھی جمی پر طرح طرح کے الزامات عائد کرنے لگی۔

ان دونوں میں ایک سرد جنگ تھی جو طول کھینچتی جا رہی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے تک تو یہ کیفیت تھی کہ اگر جمی کو ذرا سی تکلیف بھی ہوتی تو اینا بیلا تڑپ اُٹھتی مگر اب صورتِ حال یہ تھی کہ اگر وہ کسی تکلیف سے تڑپ بھی رہا ہوتا تو اینا بیلا کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ وہ عام طور پر ہلکی آواز میں کلاسیکی موسیقی سُننے کی شوقین تھی لیکن جمی کو ذہنی اذیت پہنچانے کے لیے وہ پوپ میوزک کا کوئی کیسٹ لگا کر پوری آواز کھول دیتی کہ کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہونے لگتے۔

اینا بیلا نے ایک بار پھر اسٹیفورڈ کالج میں لٹریچر اور نفسیات کی کلاسوں میں داخلہ لے لیا۔ اسٹیفورڈ ٹاؤن کے قصبے سے ایک گھنٹے کے فاصلے پر تھا اور جمی کا خیال تھا کہ وہ اس آمدورفت میں محض وقت اور پٹرول ضائع کر رہی ہے۔ جمی کا اصرار تھا کہ وہ کالج جانا بند کر دے جس پر اینا بیلا نے دھمکی دی کہ اگر اُسے زیادہ پریشان کیا گیا تو وہ اٹلی یا ہندوستان چلی جائے گی۔ سنجے اُسے کئی مرتبہ ہندوستان کی سیاحت کی دعوت دے چکا تھا۔

"تم کہیں نہیں جاؤ گی۔" جمی نے فیصلہ سُنا دیا۔ "یہ تمھارا گھر ہے۔ تمھیں زندگی بھر یہیں رہنا ہے۔"

لیکن اینا بیلا تو اُسے ہر معاملے میں زک پہنچانے پر تُلی ہوئی تھی۔ وہ اذیت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ چند روز بعد ہی اُس نے سنجے کو اپنے ہاں دعوت پر مدعو کر لیا۔ وہ اس دعوت کو ایک خصوصی تقریب کا رنگ دینا چاہتی تھی جس کے لیے اُس نے کئی روز پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا۔ اُس نے کتاب سے پڑھ کر ہندوستانی کھانے تیار کیے تھے۔ جمی نے بھی شاید پہلے ہی سے کچھ سوچ رکھا تھا۔ اُس روز مہمانوں کے آنے سے پہلے اُس نے بے تحاشہ شراب نوشی کی اور نشے کی حالت میں فاکس ویگن چلاتے ہوئے ایکسیڈنٹ کر دیا جس سے گاڑی بالکل تباہ ہو کر رہ گئی۔ کھانے کے دوران بھی وہ شراب نوشی کرتا رہا۔ کھانے پر تنقید کرتے ہوئے اُس نے پلیٹ میز پر اُلٹ دی اور شراب کی بوتل اٹھا کر اُسے میز پر چھڑکنے لگا۔ اینا بیلا کی قوّتِ برداشت جواب دے گئی اور وہ اپنے کمرے میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سنجے اور اُس کے دوست جمی کو سمجھانے لگے لیکن وہ بپھرا جا رہا تھا۔ بالآخر جمی مدہوش ہو گیا۔ اور جلد ہی اُس کے خراٹے گونجنے لگے۔

سنجے نے رخصت ہوتے ہوئے اینا بیلا کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور ایک بار پھر اُسے ہندوستان کی سیاحت کی دعوت دی۔ اینا بیلا نے اگرچہ کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن اُس نے طے کر لیا کہ ایک نہ ایک روز ہندوستان ضرور جائے گی۔ اُس نے اب تک ایک وفاشعار بیوی کی طرح جمی سے تعلقات نبھانے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن اُسے یقین ہو چلا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکے گی۔

سیلی، اینا بیلا کی وہ واحد دوست تھی جسے وہ ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد سمجھتی تھی۔ اُس نے سیلی سے مل کر ہندوستان کی سیاحت کا پروگرام بنانا شروع کر دیا۔

"جمی کو اس کی بھنک نہیں ملنی چاہیے۔" اینا بیلا نے کہا۔ "میں جمی سے محبت کرتی ہوں لیکن ہر معاملے میں بچّوں کی طرح اس کی نگہداشت نہیں کر سکتی۔ اس کی حرکتیں اب میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہیں۔ اگر اُسے پتا چل گیا کہ میں ہندوستان جانے کا پروگرام بنا رہی ہوں تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔"

"اس صورتِ حال میں تم لوگوں کا نباہ واقعی بہت مشکل ہے۔ تم اُس سے طلاق کیوں نہیں لے لیتیں۔" سیلی نے واقعات کی تفصیل سُننے کے بعد کہا۔

"دو مرتبہ اس کی کوشش کر چکی ہوں لیکن ہر مرتبہ وہ میرے قدموں میں گر جاتا ہے۔" اینا بیلا نے افسردگی سے جواب دیا۔

وہ ۱۹۷۳ء کا سرد ترین دن تھا۔ برف باری کسی بھی لمحہ شروع ہو سکتی تھی۔ اینا بیلا اپنے والدین کے گھر آتش دان

کے سامنے بیٹھی ادب اور نفسیات کے موضوع پر باتیں کر رہی تھی۔ وہ اگرچہ اپنے آپ کو ہشاش بشاش رکھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اُس کی آنکھوں کا کرب ایسل کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔ اسی دوران ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ ڈک کال ریسیو کرنے کے لیے اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد واپس لوٹا تو اُس کا چہرہ اس طرح سفید ہو رہا تھا جیسے سارا خون نچڑ گیا ہو۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ایسل اور اینا بیلا بدحواس سی ہو گئیں۔

"سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ تمھیں کیسے بتاؤں۔" ڈک کا لہجہ کپکپا رہا تھا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ کہنے لگا۔ "آج شام سنجے اور اُس کے تین دوست ایک دعوت میں مدعو تھے۔ جہاں وہ بے تحاشا شراب نوشی کرتے رہے۔ ان میں سے ایک لڑکا پائلٹ تھا۔ اُس نے سنجے اور اُس کے دوستوں کو اپنے جہاز پر سیر کی پیش کش کی، جسے اُنھوں نے قبول کر لیا۔"

"پھر؟" اینا بیلا نے متوحش نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا۔

"وہ چاروں دوست جہاز میں سوار ہو گئے۔ طیارہ فضا میں بلند ہونے کے چند ہی منٹ بعد رن وے پر گر کر تباہ ہو گیا۔ دھماکے کی آواز دور تک سُنی گئی تھی۔ قرب و جوار کے لوگ جائے حادثہ کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ چاروں لڑکے جلتے ہوئے جہاز میں پھنس کر رہ گئے تھے۔"

"سنجے ....." اینا بیلا کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔

"سب ختم ہو گیا۔" ڈک نے رو دینے والے لہجے میں جواب دیا۔ "سنجے موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ کوئی مدد پہنچنے سے پہلے جلتے ہوئے جہاز میں ان چاروں کی لاشیں راکھ ہو چکی تھیں۔ اُنھیں محض اُن کی چیزوں کی وجہ سے شناخت کیا جا سکا تھا۔"

اینا بیلا کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ پہلی مرتبہ اُس نے اٹلی میں اپنے نانا کی موت پر آنسو بہائے تھے اور اب سنجے کی المناک موت سے وہ ایک بار پھر بکھر گئی۔

اس حادثے کے بعد جمی اور اینا بیلا کی ازدواجی زندگی قدرے پُرسکون ہو گئی۔ جھگڑے اور ہنگامے سنجے کی وجہ سے شروع ہوئے تھے یا کم از کم جمی نے اُسے اس سارے فساد کی جڑ قرار دیا تھا اور اب وہی اس دنیا میں نہیں رہا تھا تو جمی نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ اُس نے اینا بیلا سے وعدہ کیا تھا کہ شراب نوشی چھوڑ دے گا۔ وقتاً فوقتاً وہ قسمیں بھی کھاتا کہ اب کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگائے گا لیکن چند روز بعد ہی تمام وعدوں اور قسموں کو بھول کر پھر شراب نوشی شروع کر دیتا۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ شراب اُس کی زندگی کا ایک ایسا جزو بن چکی تھی جس کے بغیر اُس کی زندگی محال تھی۔ جن دنوں وہ شراب سے دور رہتا، وہ ان کی ازدواجی زندگی کے بہترین دن سمجھے جاتے۔ وہ اپنے آپ کو مثالی شوہر ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ اینا بیلا کا خیال تھا کہ اگر وہ دل لگا کر کام کرے تو کم از کم فرنیچر کے شعبے میں وہ اپنی ماہرانہ حیثیت منوا سکتا تھا۔ کیوں کہ کچھ پُرانے فرنیچر کو اُس نے اس خوب صورتی سے مرمت کیا تھا کہ اُس پر نیا ہونے کا گمان ہونے لگا تھا۔ اینا بیلا نے تو یہاں تک سوچ لیا کہ اگر وہ اسی طرح سلیقے اور ڈھنگ سے کام کرتا رہے تو وہ فرنیچر کی دکان کھول سکتے ہیں۔

"میرا خیال ہے اب تو تمھاری زندگی خوش گوار ہو گی۔" یہ بات اُس کی دوست سیلی نے پوچھی تھی جو اس روز اینا بیلا سے ملنے آئی تھی۔

"یونہی سمجھ لو، لیکن جمی کا کوئی بھروسہ نہیں کہ وہ کب

پٹڑی سے اتر جاتے۔" اینا بیلا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ان دنوں اینا بیلا کی زندگی واقعی کسی حد تک خوشگوار تھی لیکن جب فریقین میں جنگ چھڑنا ہو تو اس کے لیے معمولی سا بہانہ ہی کافی ہوتا ہے۔ اس دوران دونوں طرف سے چھوٹی چھوٹی جو باتیں نظر انداز کی جاتی رہی تھیں اُبھر کر اچانک ہی سامنے آگئیں۔ اس روز بہت معمولی سی بات پر جمی نے اُسے آوارگی کا طعنہ دیا تھا۔ اینا بیلا بھی بھلا کب خاموش رہنے والی تھی۔

"تم شرابی ہو، جھوٹے، مکّار! میری زندگی کی بربادی کے ذمّے دار بھی تم ہو۔" وہ چیخی۔

جمی اس وقت نشے میں تھا۔ اس نے اینا بیلا کے تھپڑ رسید کر دیا اور پھر تو باقاعدہ محاذ کھل گیا۔ وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے پر پھینکنے لگے۔ گھر کباڑ خانہ بن گیا۔ جب ان میں مزید لڑنے کی تاب نہ رہی تو وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔ بالآخر انھوں نے طے کیا کہ اب اُنھیں ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لینی چاہیے۔

"ٹھیک ہے۔ میں اپنی ماں کے گھر جا رہا ہوں۔ بعد میں تم سے بات کروں گا۔" جمی پیر پٹختا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"تمھارے لیے وہی جگہ بہتر رہے گی کیونکہ تمھیں بیوی کی نہیں ماں کی ضرورت ہے۔" اینا بیلا نے چیختے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

جمی کے جانے کے فوراً ہی بعد اینا بیلا نے تمام کھڑکیوں اور روشن دانوں پر کیل ٹھونک دیے تاکہ جمی کسی طرح اندر گھسنے کی کوشش نہ کر سکے۔ اس رات سونے سے پہلے اُس نے دروازہ مقفّل کر کے اس کے سامنے بھاری فرنیچر جمع کر دیا اور یخ بستہ کمرے میں بستر پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہی.....

.... جمی کے بارے میں اُس کے خدشات دُرست نکلے جمی واپس آگیا۔ وہ رات بھر دروازہ پیٹتا رہا لیکن اینا بیلا اپنے بستر میں دبکی رہی۔

ان کی علیحدگی کو دو تین مہینے بیت گئے۔ اس دوران ایک مرتبہ بھی اُن کی ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن ایک روز جمی نے فون پر بتایا کہ اب وہ راہِ راست پر آچکا ہے اور اس سے ملنا چاہتا ہے۔ اُس کی آواز قدرے ہموار تھی۔ اس نے جس انداز میں بات کی تھی، اینا بیلا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اینا بیلا اس شرط پہ اُس سے ملاقات کے لیے آمادہ ہو گئی کہ اس موقع پر اس کی دوست سیلی بھی موجود ہو گی۔

ملاقات ایک ہوٹل میں طے ہوئی تھی۔ کھانے کے دوران وہ جلد ہی اصل موضوع پر گفتگو کرنے لگے۔ جمی بہرحال اینا بیلا کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ اب شراب نوشی ترک کر چکا ہے۔ اینا بیلا کو ہتھیار ڈالتے دیکھ کر اُس نے ویٹریس کو اسکاچ کی بوتل کا آرڈر دے دیا۔

"ابھی تم نے کہا تھا کہ شراب نوشی سے توبہ کر چکے ہو لیکن یہ......"

"یہ ہماری صلح اور نئی زندگی کا جشن منانے کے لیے ہے۔" جمی اُس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "آج کے بعد تم میرے منہ سے کبھی شراب کا نام بھی نہیں سنو گی۔"

اینا بیلا اور سیلی تو ایک ہی گلاس سامنے رکھے ہلکی ہلکی چسکیاں لیتی رہیں جب کہ پوری بوتل جمی نے خالی کر دی۔ دوسری بوتل بھی آدھی سے زیادہ وہی چڑھا گیا۔ اس دوران وہ دو مرتبہ باتھ روم جا چکا تھا اور اینا بیلا کو یقین تھا کہ اُس نے کوٹ میں چھپی ہوئی بوتل بھی حلق میں انڈیل لی تھی۔

شراب نے جلد ہی اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ جمی بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔ ایک گھنٹے بعد ہوٹل سے نکل کر جب وہ تینوں اینا بیلا کی گاڑی میں تنا تنا کر دز کی طرف جا رہے تھے تو جمی نے چیخ چیخ کر آسمان سر پہ اٹھا رکھا تھا۔

"مجھے گھر لے چلو... پلیز مجھے گھر لے چلو۔"

"میں تمھیں گھر ہی لے جا رہی ہوں۔" اینا بیلا نے دانت بھینچتے ہوئے جواب دیا۔ "تمھاری اماں کے گھر۔"

"نہیں۔ خدا کے لیے مجھے وہاں مت لے جاؤ۔" جمی چیخا اور ساتھ ہی اسٹیئرنگ پر گرفت جما کر گاڑی کا رُخ موڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ "میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔ ہمارے گھر۔ جہاں صرف ہم دونوں ہوں۔ صرف ایک رات کے لیے۔ تم خود ہی دیکھ لو گی کہ میں کتنا بدل گیا ہوں۔"

"وہ تو تمھاری حالت ہی بتا رہی ہے۔" اینا بیلا کے لہجے میں تلخی تھی۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی سیلی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ جمی کی منّت سماجت سے اُس کا دل پسیج رہا تھا لیکن اس کے خیال میں دنیا کا کوئی بھی مرد قابلِ اعتماد نہیں تھا۔ اس کا تجربہ اُسے خود بھی ہو چکا تھا۔ اپنے شوہر سے وہ دو تین مرتبہ علیحدگی اختیار کر چکی تھی۔ اُس کا شوہر ہر مرتبہ اُس کے قدموں پہ گر گیا تھا لیکن اس کے اطوار نہیں بدلے تھے۔ اور بالآخر سیلی کو عدالت کے ذریعے طلاق حاصل کرنا پڑی تھی اور اب جمی اپنی بیوی سے محبت کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کے خیال میں دُنیا کے تمام مرد ایک ہی جیسے تھے۔

جمی بدستور منّت سماجت کر رہا تھا۔ اینا بیلا کے چہرے کے تاثرات بگڑ رہے تھے۔ دفعتاً اُس نے ایک جگہ گاڑی روک لی اور جمی کی طرف دیکھتے ہوئے درشت لہجے میں بولی۔

"میں تمھیں اُس وقت اپنے گھر میں قدم رکھنے کی اجازت دوں گی جب تم شراب پینا چھوڑ دو گے۔ بالکل، ہمیشہ کے لیے۔"

جمی چند لمحے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس نے آگے جھک کر اینا بیلا کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"میں واقعی تم سے محبت کرتا ہوں اینا بیلا، دل کی گہرائیوں سے تمھیں چاہتا ہوں۔"

اور پھر اچانک دروازہ کھول کر گاڑی سے چھلانگ لگا دی اور ٹریفک کے سیلاب میں دوڑتا ہوا سڑک پار کر کے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس وقت تو اینا بیلا نے اطمینان کا سانس لیا تھا لیکن اُسے رات بھر نیند نہیں آسکی تھی۔ وہ جمی ہی کے بارے میں سوچتی رہی۔ اُسے اپنے رویّے پہ دُکھ ہوا تھا لیکن اُسے یقین تھا کہ اس کا یہ سلوک جمی کو راہِ راست پر لے آئے گا۔ دوسرے دن بھی وہ جمی کے بارے میں پریشان رہی شام کے وقت اُس نے جمی کی والدہ کو فون کیا لیکن پتا چلا کہ جمی وہاں نہیں پہنچا تھا۔ اینا بیلا کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہ باری باری جمی کے دوستوں کو فون کرنے لگی لیکن ہر شخص نے اس کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔

اینا بیلا اپنے والدین کے گھر میں تھی اور نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ اپنے گھر جاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ ایک نامعلوم سا خوف تھا جو اُسے اس ارادے سے روکے ہوئے تھا۔ پیر کے دن دوپہر کے بعد وہ اپنے والد کو ساتھ لے کر اپنے گھر روانہ ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر جمی وہاں موجود ہوا تو والد کی مدد سے اُسے وہاں سے نکال سکے گی۔

درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوتے ہی اُنھیں غیر فطری سی خاموشی کا احساس ہوا۔ اینا بیلا کی چھٹی حس اُسے کسی اَنہونی بات کا احساس دلا رہی تھی۔ اس نے تالا کھولنے کے لیے جیسے ہی چابی استعمال کرنا چاہی تو احساس ہوا کہ تالا مقفّل نہیں تھا۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہی اینا بیلا کا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ جمی فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ مدد طلب انداز میں سامنے کو پھیلا ہوا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ اس کے معدے میں بھری ہوئی باربی چوریٹ کی گولیوں نے اُس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔

اینا بیلا کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور وہ تیورا کر جمی کی لاش کے قریب ہی فرش پر گر گئی۔

ہوش میں آنے کے بعد کئی روز تک اس کا ذہن ماؤف رہا۔ یہ تیسری موت تھی جس نے اس کا دماغ پلٹ دیا تھا۔ بوڑھے نانا نے اس کی آنکھوں کے سامنے دم توڑا تھا اور وہ اس کی کوئی مدد نہ کر سکی تھی۔ ہندو نوجوان سنجے جہاز کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جل کر بھسم ہو گیا تھا اور اب جمی اذیّت ناک موت کا شکار ہوا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے بھی مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا لیکن وہ اس کے کسی کام نہ آسکی تھی۔ وہ تین ہستیاں، جنھوں نے اس کے قریب آنے کی کوشش کی تھی، اذیت ناک موت کا شکار ہوئی تھیں۔ گویا وہ ان تینوں کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوئی تھی۔ موت کا ہرکارہ۔ اینا بیلا نے اپنے آپ کو یہی نام دیا تھا۔ اور کم از کم جمی کے معاملے میں وہ اپنے آپ کو موردِ الزام ٹھہرا رہی تھی۔ اگر وہ سنگدلانہ رویّہ نہ اپناتی تو شاید جمی کے ساتھ یہ المناک حادثہ پیش نہ آتا۔

اینا بیلا درختوں کے جھنڈ میں گھرے ہوئے اس گھر میں واپس جانے کی ہمت نہ کر سکی جہاں جمی نے اپنے آپ کو موت کے حوالے کیا تھا۔ وہ اپنے والدین کے گھر آگئی جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بند دن بھر یا تو کتابیں پڑھنے کی کوشش کرتی رہتی یا ٹی وی کے سامنے بیٹھی اسکرین پر متحرک تصویروں کو گھورتی رہتی۔ ایک ماہرِ نفسیات اگرچہ باقاعدگی سے اس کا علاج کر رہا تھا مگر وہ جرم کے اس احساس کو ذہن سے نہ جھٹک سکی جسے اس نے اپنی سوچ کا محور بنا لیا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ اگر وہ جمی کے ساتھ سنگدلانہ سلوک نہ کرتی تو آج وہ زندہ ہوتا۔

اسیل اس کی توجہ بٹانے کی بھرپور کوشش کرتی رہی۔ کبھی اس کی دوستوں کو بلا لیتی اور کبھی اسے زبردستی باہر بھیج دیتی لیکن اس کی کوشش بھی اینا بیلا کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہ لا سکی۔

۱۹۷۵ء کے موسمِ بہار کے اوائل میں، جب میری آنڈرے کو چارلس کے بے شمار محبت بھرے خطوط مل رہے تھے اور جنیفر، کرسٹوفر سے دور رہ کر سٹیل میں ایک نئی زندگی کی ابتدا کے لیے قدم جمانے کی کوشش کر رہی تھی، اسیل نے اینا بیلا کو اس کی ایک پرانی دوست کے ہمراہ چھٹیاں گزارنے کے لیے سان فرانسسکو بھیج دیا۔ جہاں اینا بیلا اپنے ماضی کو بھلانے کی کوشش کرتی رہی لیکن جمی کی موت کا وہ منظر اس کے ذہن

سے چیک کر رہ گیا تھا۔ وہ کسی تفریح میں کھو کر اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش بھی کرتی تو اس کا تصور اسے ایک بار پھر اسی مکان میں لے جاتا جہاں جمیؔ کی بھیانک موت کا منظر اس کے رونگٹے کھڑے کر دیتا۔ اینا بیلا کو چُپ سی لگ جاتی۔

مارشیا نفسیات کی پوسٹ گریجویٹ اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ گہری نظروں سے اینا بیلا کا مطالعہ کرتی رہی۔ بالآخر ایک روز وہ اسے ایک پُرسکون ریسٹورنٹ میں لے گئی اور کھانے کے دوران وہ کھل کر باتیں کرتی رہیں۔

"دیکھو اینا!" مارشیا اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی "تم نے جمیؔ کی موت کو بلاوجہ اپنے ذہن پر مسلّط کر رکھا ہے۔ تم اس کی موت کے لیے اپنے آپ کو موردِ الزام کیوں سمجھتی ہو۔ آخر اس سے تمھیں کیا حاصل ہوگا؟"

"بات کچھ حاصل کرنے کی نہیں ہے" اینا بیلا نے نفی میں سر ہلایا "میں زندگی کے ... آخری لمحوں تک اس المناک منظر کو ذہن سے نہیں نکال سکتی۔ تم ان جذبات کو نہیں سمجھ سکتیں۔ میرے شوہر نے مدد کے لیے ہاتھ پھیلایا تھا لیکن میں اس کی کوئی مدد نہ کر سکی۔"

"یہ سب جذباتی باتیں ہیں۔ بعض اوقات یہی جذبات زندگی کے لیے مستقل روگ بن جاتے ہیں جن کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔" مارشیا نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اپنے نفسیاتی اسپتال کے تجربات بتانے لگی۔

وہ ان دنوں لاس اینجلس کے اسپتال میں تھی جہاں بیسیوں مریضوں سے اس کا واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک سہمی ہوئی عورت اس کے پاس آئی۔ اس کی عمر انتیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس عورت کو شکایت تھی کہ اس کا شوہر اس پر توجہ نہیں دیتا۔ اسے اپنے ساتھ کبھی سماجی تقریبات میں لے کر نہیں گیا۔ یہاں تک کہ گھر میں بھی وہ اس کے قرب کو پسند نہیں کرتا۔ وہ جب علیحدگی کی بات کرتی تو شوہر خودکشی کر لینے کی دھمکی دیتا۔ اینا بیلا توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ اب تک نہیں جان سکی تھی کہ مارشیا اسے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"حقیقت یہ تھی" مارشیا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "کہ اس بدقسمت عورت نے اپنی قبر خود کھود دی تھی۔ اس نے اپنے پیروں میں زنجیریں خود پہنی تھیں۔ اس نے اپنے شوہر کی زیادتیوں کے بارے میں ایک فرضی داستان گھڑ لی تھی۔ محض اس لیے کہ اس طرح اعترافِ جرم سے اپنے آپ کو تسکین پہنچانا چاہتی تھی۔ وہ بزدل تھی۔ اس میں حقائق کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ احساسِ جرم دراصل وہ انسانی جذبہ ہے جو اسے دیمک کی طرح اندر ہی اندر چاٹ کر کھوکھلا کر دیتا ہے۔ جہاں تک تمھارا معاملہ ہے، یہ درست ہے کہ آخر میں جمیؔ سے تمھارا رویّہ درست نہیں تھا لیکن اس سے پہلے تم زندگی بھر اس کی محبّت کا دم بھرتی رہیں، اسے راہِ راست پر لانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اسے برائیوں کی دلدل سے نکالنے کے لیے اس کی ہر ممکن مدد کی لیکن وہ نہیں سنبھلا۔ تمھارے آخری عمل سے مایوس ہو کر اس نے خواب آور گولیاں کھالیں۔ یہ گولیاں تم نے اس کے حلق میں نہیں ٹھونسی تھیں۔ اس میں اس کی اپنی مرضی کو دخل تھا اور اس حرکت کا ذمّے دار وہ خود تھا۔ اس نے تمھیں احساسِ جرم میں مبتلا کرنے کی کوشش کی اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی رہا۔"

مارشیا کی باتیں اگرچہ حقائق سے قریب تر تھیں مگر اینا بیلا نے ان کا زیادہ اثر قبول نہیں کیا۔ سان فرانسسکو میں قیام کے باقی دنوں کے دوران بھی وہ خاموش سی رہی۔ وہاں سے واپس آنے کے چند ہی روز بعد ایک دن اس نے ماں کو بتایا کہ اب یہاں اس کی طبیعت اکتا چکی ہے۔ وہ اس بیزار کن ماحول سے نکلنا چاہتی ہے جہاں ہر لمحہ اسے کچوکے لگاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس نے ملک سے باہر جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو اسیل پریشان سی ہو گئی۔ اسے اینا بیلا کے وہ الفاظ یاد آگئے جو اس نے دس سال کی عمر میں اٹلی سے واپسی پر کہے تھے "یہ درست ہے کہ میں اس وقت اس خطۂ زمین پر موجود ہوں لیکن میں اپنے آپ کو اس کا حصّہ نہیں سمجھتی۔"

اسیل نے اینا بیلا کے اس فیصلے پر کوئی احتجاج نہیں کیا کیوں کہ ماں ہونے کے ناتے وہ بیٹی کی فطرت سے اچھی طرح آگاہ تھی کہ اینا بیلا کو اس کا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسیل کے دریافت کرنے پر اینا بیلا نے اپنے پروگرام کی وضاحت میں کوئی ہرج محسوس نہیں کیا۔ اوّل تو اس کا کوئی باقاعدہ پروگرام تھا ہی نہیں۔ ویسے اس کا خیال تھا کہ سب سے پہلے یورپ جائے گی جہاں چند پرانے دوستوں سے ملاقات کے بعد مشرقِ وسطیٰ سے ہوتی ہوئی ہندوستان کا رُخ کرے گی جہاں بمبئی میں سنجے کے والدین سے ملاقات کر کے سنجے کی المناک موت کے بارے میں اپنی دلی تاثرات کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔ اس نے سنجے سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی ہندوستان ضرور جائے گی۔ اب وہ اپنا یہ وعدہ اس کی موت کے بعد پورا کرنا چاہتی تھی۔

"اگر تمھیں کبھی رقم کی ضرورت ہو یا کوئی اور دشواری محسوس کرو تو وقت ضائع کیے بغیر ہمیں اطلاع کر دینا" اسیل نے اسے تاکید کی۔

"شاید اس کی ضرورت نہ پڑے" اینا بیلا نے جواب دیا۔ "میرے پاس پوری دنیا میں ہوائی سفر کے ٹکٹ کے علاوہ تین ہزار ڈالر کے ٹریولرز چیک بھی موجود ہیں۔ بالفرض کسی وقت رقم کی ضرورت پڑی بھی تو میں کسی کو زحمت نہیں دوں گی۔ میں کوئی بھی کام کر کے اتنی رقم کما سکتی ہوں کہ گزارہ ہو سکے۔"

"پھر بھی ہم سے رابطہ قائم رکھنا" اسیل نے ملتجی لہجے میں کہا "گھر سے تمھارا رابطہ قائم رہے گا تو ہمیں تسلّی رہے گی۔"

وہ اینا بیلا پر کسی قسم کا دباؤ ڈال کر اس کے جذبات کو مجروح نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ وہ اینا بیلا کو اب بھی بیٹی سے زیادہ دوست سمجھتی تھی۔

اینا بیلا نے اثبات میں سر ہلا دیا اور جمیؔ کی موت کے بعد سے پہلی مرتبہ اس کے ہونٹوں پر حقیقی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ ایک بار پھر اپنے آپ کو زندہ انسانوں کی اس صف میں کھڑی محسوس کر رہی تھی جو زندگی کی خوشیاں سمیٹنے کو بے چین تھے۔

جنیفر نے دنیا کی آوارگی کا خیال ذہن سے نکال کر اب ایک نئی زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے سیٹل کے ایک پُرسکون علاقے میں ایک مختصر سا فلیٹ حاصل کر لیا جس کا ایک کمرہ اس کے ان نوادرات کے لیے مخصوص تھا جو وہ مشرق سے لے کر آئی تھی۔ ان میں زیادہ تعداد بدھ کے مجسموں اور ہندو مورتیوں کی تھی۔ اس نے بیالوجی اور میڈیسن نرسنگ کی تربیت کے لیے کالج میں داخلہ لے لیا تاکہ ڈگری لے کر باقاعدہ پریکٹس شروع کر سکے۔ وہ اب بھی مہاتما بدھ کی تعلیمات پر عمل پیرا رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مہینے میں کم از کم ایک مرتبہ اڑتالیس گھنٹے کا فاقہ ضرور کرتی تاکہ نفس کشی کی عادت برقرار رہے۔ گلے میں بدھ کا مخصوص نشان اور سُرخ موتیوں کی مالائیں پہنے رکھتی۔ اس کا یہ خیال تھا کہ یہ چیزیں اسے بلاؤں سے بچائے رکھیں گی۔

اکیسویں سالگرہ پر جنیفر نے اپنے ان تمام دوستوں کو مدعو کیا جو اب اپنی زندگی کے راستے بدل چکے تھے۔ کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری اور پھیلاؤ کے خلاف نعرے بلند کرنے والے یہ لوگ اب سب کچھ بھول چکے تھے۔ کیس، جسے کسی زمانے میں ہر محفل کی جان سمجھا جاتا تھا، دو شادیوں کی ناکامی کے بعد اب ایک ڈیپارٹمنٹ اسٹور کے اشتراک سے ریڈی میڈ گارمنٹس کا کاروبار شروع کرنے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ مارگریٹ جس نے ماضی میں سیاہ فاموں کو بغاوت پر آمادہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا اب بوڑھوں کے ہوسٹل کی نگراں تھی۔ سابیلا جو شہر کے خوبرو نوجوانوں کو غلط راہ پر ڈالنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی، اب حقوقِ نسواں پر دھواں دار تقریروں کے ساتھ آزادانہ زندگی گزار رہی تھی اور جنیفر کی پرانی دوست کارمن شادی کے بعد مکمل طور پر گھریلو زندگی اپنا چکی تھی۔

اس دعوت میں کرسٹوفر بھی شامل تھا جو دنیا کی آوارہ گردی میں جنیفر کا رفیقِ سفر رہا تھا۔ وہ دونوں جب بھی ملتے جنیفر اس سے ضرور پوچھتی کہ ان کی محبت اس طرح اختتام کو کیسے پہنچ گئی جبکہ دنیا کی سیاحت پر جانے سے پہلے وہ کم از کم دو مرتبہ شادی کا پروگرام بھی بنا چکے تھے۔

"میرے خیال میں ایسی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی جس کی نشاندہی کر سکوں" کرسٹوفر جواب دیتا "اس میں میرا یا تمھارا کوئی قصور نہیں۔ صرف اس حقیقت کو مدِنظر رکھنا چاہیے کہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو چکے ہیں اور میرے خیال میں کچھ عرصے کے لیے ہمیں ایک دوسرے سے الگ ہی رہنا چاہیے۔"

جنیفر کو کرسٹوفر کے ان خیالات سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ وہ تنہائی میں اکثر اسی کے بارے میں سوچتی۔ بعض اوقات اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے لیکن آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اب اسے کرسٹوفر سے محبت نہیں رہی۔ اس نے جس کرسٹوفر کو چاہا تھا وہ ہمالیہ کی ترائیوں میں کہیں کھو چکا تھا۔

جنیفر اگرچہ پوری سنجیدگی سے زندگی کی ان نئی راہوں پر چلنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ منفی قوتیں ایک بار پھر اس پر غالب آنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کے لیے ان قسموں کو قائم رکھنا مشکل ہو رہا تھا جو اس نے کوپان کی خانقاہ میں بدھ کے مجسّمے کے سامنے کھائی تھیں۔ اس نے بدھ کے مجسّمے کے سامنے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ زندگی میں شراب نہیں پیے گی، تمباکو نوشی نہیں کرے گی، جھوٹ نہیں بولے گی، کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گی اور بے راہ روی کا شکار نہیں ہوگی لیکن اکیس سال کی عمر میں ان وعدوں پر قائم رہنا اس کے لیے ممکن نہ رہ سکا۔ اس نے مارگریٹ کے ساتھ ایک مخصوص نائٹ کلب میں بھی جانا شروع کر دیا تھا۔

کرسٹوفر سے اب وہ کچھ اور بھی دور ہو گئی اور جب اُسے پتا چلا کہ کرسٹوفر جمیکا کی آبنوسی رنگت والی فرانسس نامی ایک لڑکی سے محبت کی پینگیں بڑھا رہا ہے تو جنیفر کا خون

کھول اٹھا۔ اگرچہ اس کا دعویٰ تھا کہ کرسٹوفر سے اب اسے کوئی لگاؤ نہیں رہا لیکن کرسٹوفر کے ساتھ کسی اور لڑکی کا وجود اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ اس سلسلے میں کرسٹوفر سے دو ٹوک بات کرنا چاہتی تھی لیکن کرسٹوفر اس سے پہلے ہی اس لڑکی کے ساتھ جزیرہ ہوائی جاچکا تھا۔ جنیفر نے دل برداشتہ ہو کر منشیات میں پناہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ کوپان کی خانقاہ میں بدھ کے مجسمے کے سامنے کیے ہوئے تمام وعدے یکسر بھول چکی تھی۔

۱۹۷۵ء کے موسمِ بہار میں جنیفر کیلی فورنیا پہنچ گئی جہاں کوپان کی خانقاہ کے زیرِ انصرام ایک تربیتی درس گاہ قائم تھی۔ خانقاہ کے دولاما زوپا رینپوشی اور یاشی ان دنوں اس تربیت گاہ میں موجود تھے۔ جنیفر نے ان کے سامنے اپنے گناہوں کا... اعتراف کرتے ہوئے ان سے کوپان کی خانقاہ جانے کی اجازت طلب کی لیکن ان کا خیال تھا کہ جنیفر کو پہلے اس تربیت گاہ میں نفس کشی کی تربیت حاصل کرنی چاہیے۔ کیونکہ نروان بہت دور کی منزل تھی۔ تمام ابتدائی مراحل اور کٹھنائیوں کے بغیر وہ کسی صورت میں بھی اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

جنیفر نے ایک مرتبہ پھر نفس کشی شروع کر دی۔ منشیات کا استعمال چھوڑ دیا اور گوشۂ گمنامی میں راہباؤں کی سی زندگی گزارنے لگی۔ اس کے دوست اس کی اس تبدیلی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور پھر ایک روز جب جنیفر نے اعلان کیا کہ وہ دوبارا مشرق کی سیاحت کے لیے جانے والی ہے تو اس کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہ آسکی۔ وہ سٹیل سے کیلی فورنیا واپس آگئی جہاں اس نے سفر کے اخراجات جمع کرنے کے لیے محنت کرنے کے ساتھ اپنی گاڑی بھی فروخت کر دی۔ اسے وہ سو ڈالر بھی واپس مل گئے جو چند ماہ قبل ایک دوست نے اس سے قرض لیے تھے۔ کھٹمنڈو تک کے یکطرفہ ٹکٹ کے علاوہ اس کے پاس پندرہ سو ڈالر جمع ہو چکے تھے۔ اس نے اکتوبر ۱۹۷۵ء میں روانگی کا پروگرام بنا لیا۔

روانگی سے چند روز پہلے جنیفر اپنے نانا کیپ کے ساتھ نقشہ دیکھ کر اپنے سفر کے راستے کا تعین کر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ سٹیل سے سیدھی ہانگ کانگ جائے گی اور اگر جیب نے اجازت دی تو ایک بہت بڑی بدھ خانقاہ میں حاضری دینے کے لیے بنکاک بھی جائے گی۔ اس طرح اکتوبر کے آخر تک کھٹمنڈو پہنچ جائے گی۔

"بنکاک۔" اس کا پروگرام سن کر اس کی بوڑھی نانی میگی چونک گئی "نہیں، تم بنکاک مت جانا۔"

"کیوں؟ بنکاک میں کیا ہے؟" جنیفر نے سوالیہ نگاہوں سے میگی کی طرف دیکھا۔

"پتا نہیں۔" میگی کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی "یہ نام سنتے ہی مجھے کچھ عجیب سا لگا تھا۔ میں وہاں تمھارے لیے انجانا سا خطرہ محسوس کر رہی ہوں۔ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ..."

"میں بدھ کی پیروکار ہوں۔" جنیفر نے اس کی بات کاٹ دی "مجھے کہیں کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔"

روانگی سے ایک روز پہلے جنیفر نے اپنی دوستوں کو دعوت دی جس میں شراب اور دیگر منشیات کا بے تحاشا استعمال کیا گیا، لیکن جینی نے کسی چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اس نے اپنی دوستوں سے وعدہ کر لیا کہ ہر لڑکی وصیت کرے گی کہ مرنے کے بعد انھیں دفن نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ وہ خود بدھ مذہب کے مطابق مرنے کے بعد جلنا پسند کرتی ہیں تاکہ زمین پر اس کا وجود باقی نہ رہے۔ اس کی یہ خواہش اگرچہ حیرت انگیز تھی لیکن لڑکیوں نے بہرحال وعدہ کر لیا کہ وہ ایسی وصیت کر کے مریں گی۔

اس کے دوسرے دن صبح سویرے ہی جنیفر ائیر پورٹ پہنچ گئی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد منتظر طیارہ اسے لے کر کھٹمنڈو کی طرف پرواز کر گیا۔

✤

بنکاک کے راجہ ہوٹل میں گزرنے والا ایک ایک لمحہ میری آندرے کے لیے انتہائی کربناک ثابت ہو رہا تھا۔ چارلس سے ملاقات کے فوراً ہی بعد اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس نے خطوط میں جو کچھ بھی لکھا تھا سب جھوٹ تھا۔ اس کے وہ جذبات جھوٹے تھے جن کے اظہار کے لیے اس نے خوبصورت الفاظ کا سہارا لیا تھا۔ چارلس کے رویّے نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ بنکاک آنے کے دوسرے ہی روز اس نے بڑے دکھ بھرے انداز میں اپنے تاثرات ڈائری میں قلم بند کیے۔

"یہاں چارلس نے جس طرح میرا استقبال کیا ہے وہ میرے لیے انتہائی دل شکن ثابت ہوا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے پلکوں میں چھپا لے گا لیکن اس کی سرد مہری نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ میرے لیے اس کے دل میں ذرہ برابر بھی محبت نہیں۔ میرا خیال تھا کہ شاید کاروباری مصروفیات کی وجہ سے وہ زیادہ توجہ

نہیں دے سکا لیکن آج دوسرے دن بھی اس کے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس صورتحال کو میں مایوسی کے سوا کوئی نام نہیں دے سکتی۔ میں یہ بھی محسوس کر رہی ہوں کہ وہ میری طرف سے کبھی خوش نہیں ہو گا اور مجھے اس کی نظروں میں کبھی وہ مقام حاصل نہیں ہو گا جس کی توقع لے کر میں یہاں آئی تھی۔ میرے خواب بکھر رہے ہیں اور مجھے اس کی ایک ادنیٰ سیکرٹری کی حیثیت سے رہنا پڑے گا اور ساتھ ہی نکوشی نامی اس لڑکی کے نخرے بھی برداشت کرنے پڑیں گے جو ان دنوں چارلس کی آنکھوں کا تارا بنی ہوئی ہے۔"

ایک ہفتے کے اندر اندر چارلس نے میری آندرے کو بہلا پھسلا کر معلوم کر لیا کہ اس کے پرس میں ٹریولرز چیکس کی صورت میں دو ہزار ڈالر کی رقم موجود تھی۔ اس انکشاف کے فوراً ہی بعد چارلس کا رویّہ بدل گیا۔ وہ نہ صرف میری آندرے کی طرف مائل ہونے لگا بلکہ نکوشی بھی ڈرامے کے اس منظر سے غائب ہو گئی جسے چارلس بڑی ہوشیاری سے اسٹیج کر رہا تھا۔

"اسے تم میری کاروباری مجبوری سمجھ سکتی ہو۔" چارلس نے بتایا "تمھیں نکوشی کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس سے میرے تعلقات سو فیصد کاروباری نوعیت کے ہیں۔" کہنے کے ساتھ ہی چارلس نے چند چھوٹے چھوٹے پتھر جیب سے نکال کر میری آندرے کے سامنے ڈال دیے۔ میری آندرے کے اندازے کے مطابق ان کی مالیت ہزاروں ڈالر سے بھی اوپر تھی "یہ میرا بزنس ہے۔" چارلس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میں مقامی مارکیٹ سے یہ قیمتی پتھر خرید کر دُگنی تگنی قیمت پر غیر ملکی سیاحوں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہوں۔ نکوشی سے تعلقات بگاڑنا ہمارے لیے مفید نہیں ہو گا۔ وہ جواہرات کے کاروبار سے وابستہ ہے اور کسی بھی پتھر کو محض سرسری نگاہ سے دیکھ کر اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ہمارے لیے گاہک فراہم کر سکتی ہے۔ اسے میں نے ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد پایا ہے۔ وہ میرے اس کاروبار میں بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے بشرطیکہ میں اسے اپنی محبت کا یقین دلاتا رہوں۔"

میری آندرے حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ چارلس چند لمحے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر بولا "مجھے احساس ہے کہ میرے رویّے نے تمھیں دل برداشتہ کر دیا ہو گا۔ لیکن اس کی وجہ میں تمھیں بتا چکا ہوں۔ نکوشی اس کاروبار میں میرے لیے ترپ کے پتّے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسے برداشت کرنا ہو گا اور تمھیں بھی کم از کم اس وقت تک میری سیکرٹری کی حیثیت سے رہنا ہو گا جب تک کہ اس بزنس میں میرے قدم اچھی طرح جم نہیں جاتے۔ تمام رموز سے آگاہ ہونے کے بعد میں رفتہ رفتہ نکوشی سے قطع تعلق کر لوں گا اور پھر تمھیں کوئی شکایت نہیں ہو گی۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ اسے اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اس کی باتیں خاطر خواہ انداز میں میری آندرے پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ وہ لہجہ بدلتے ہوئے ایک بار پھر گویا ہوا "تمھیں شاید علم نہیں کہ ان دنوں میں مالی بحران کا شکار ہوں۔ میری رقم بہت سی جگہوں پر پھنسی ہوئی ہے اور سرِدست کہیں سے رقم کی وصولی کا امکان نہیں۔ جبکہ ایک منافع بخش سودے کے سلسلے میں مجھے فوری طور پر دو ہزار ڈالر کی ضرورت ہے۔ اگر تم دو ہزار ڈالر مستعار دے دو تو چند روز بعد دُگنے منافع کے ساتھ واپس لوٹا دوں گا۔"

چارلس کی چکنی چپڑی باتیں اگرچہ میری آندرے کو سنہرے جال میں پھنسانے کے لیے کافی تھیں لیکن رقم کے سلسلے میں اس نے صاف انکار کر دیا۔ چارلس کے اب تک کے رویّے نے اسے سخت مایوس کیا تھا اور اس نے طے کر رکھا تھا کہ اگر چند روز اور یہی صورتحال رہی تو وہ کنیڈا واپس چلی جائے گی اور دو ہزار کی یہ رقم اس نے کسی ایسے ہی بُرے وقت کے لیے سنبھال رکھی تھی۔ لیکن چارلس بھی اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ اسے محبت کے سبز باغ دکھاتا رہا اور بالآخر ایک ہزار ڈالر لے کر ہی ٹلا۔

چارلس نے اگرچہ وعدہ کیا تھا کہ نکوشی کو زیادہ منہ نہیں لگائے گا اور اس سے صرف کاروبار کی حد تک تعلق رکھے گا لیکن میری آندرے نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ یہ محض طفل تسلی ہے۔ چارلس کا یہ وعدہ برف کی اس ڈلی سے زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوا جو گرم پانی میں گرتے ہی اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے۔

اتوار کی وہ رات میری آندرے کے لیے انتہائی اذیت ناک ثابت ہوئی تھی۔ غالباً وہ موسم کی گرم ترین رات تھی۔ چھت پر جھولتے ہوئے پنکھے کی ہوا بھی گرمی کی شدت کو کم کرنے میں قطعی ناکام ثابت ہو رہی تھی۔ چارلس حسبِ معمول خراٹے لے رہا تھا لیکن میری آندرے کی آنکھوں میں نیند کا نام تک نہیں تھا۔ وہ رات بھر پلنگ کی پٹی سے لگی تاریک خلا میں گھورتی رہی۔

صبح ہوتے ہی چارلس، نکوشی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ اس نے میری آندرے کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی نہیں

کی تھی۔ ہوٹل سے نکلتے ہی وہ چور بازار میں پہنچ گئے۔ جہاں لاتعداد زرد رنگ کے چھوٹے چھوٹے خیمے نصب تھے جن میں اسمگلنگ کا مال بھرا ہوا تھا۔ دکاندار غیر ملکی سیاحوں کو گھیرنے کے لیے طرح طرح کے لالچ دے رہے تھے۔ بوڑھی عورتیں اور بچّے تازہ پھولوں کے گلدستے فروخت کر کے سیاحوں سے کچھ نہ کچھ بٹورنے کی کوشش میں تھے۔ لیکن چارلس کو ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ نکوشی کو کھینچتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور بالآخر اس علاقے میں پہنچ گیا جہاں کمبوڈیا کی سرحد کے قریب واقع کانوں سے لائے ہوئے غیر تراشیدہ ہیرے فروخت ہو رہے تھے۔

نکوشی کے چہرے کے تاثرات بگڑے ہوئے تھے۔ دراصل میری آندرے کی آمد کے بعد ہی سے اس کا موڈ آف رہنے لگا تھا۔ وہ چارلس پر صرف اور صرف اپنا حق سمجھتی تھی۔ لیکن اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ میری آندرے محض چارلس کی سیکرٹری بننے کے لیے کینیڈا سے یہاں نہیں آئی تھی۔ وہ اس سلسلے میں چارلس سے کھل کر بات کرنا چاہتی تھی لیکن ابھی تک اسے موقع نہیں مل سکا تھا۔ اس وقت چارلس جس طرح اسے جانور کی طرح ہانکتا ہوا لے جا رہا تھا اس سے اس کا موڈ کچھ اور بھی بگڑ گیا تھا۔

بالآخر وہ ایک چھوٹے سے اسٹال پر رک گئے۔ مخمل کی سطح والی طشتریوں میں مختلف رنگوں کے قیمتی پتھر سجے ہوئے تھے۔ چارلس نے گہرے سرخ رنگ کا ایک چھوٹا سا ہیرا پسند کیا اور اسے نکوشی کی نذر کر دیا تاکہ اس کا موڈ بحال کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی میری آندرے کے سلسلے میں اس سے معذرت کا اظہار بھی کیا تھا۔

”معمولی شکل و صورت والی یہ لڑکی میری سیکرٹری ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں،“ چارلس اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے بولا ”شادی میں تم سے ہی کروں گا لیکن اس کے لیے تمھیں چار سال انتظار کرنا ہوگا۔“

نکوشی کو اگرچہ اب اس کی باتوں کا یقین نہیں رہا تھا لیکن چار سال والی بات سن کر اس کی آنکھوں میں الجھن سی ابھر آئی۔

”چار سال تو بہت طویل مدّت ہوتی ہے۔ یہ وقت کیسے گزرے گا؟“ اس نے بالآخر دل کی بات کہہ ہی دی۔

”شادی تو میں تم سے آج بھی کر سکتا ہوں لیکن اس طرح میں اپنے یا تمھارے لیے مسائل پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے اپنا کاروبار جمانے کے لیے کم از کم چار سال کا عرصہ درکار ہوگا۔ اس کے بعد تمھیں مزید انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔“

چارلس نے یہ بات کچھ اس اعتماد سے کہی تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے یقین کر ہی لیا۔ اسی لمحے نکوشی کی توجہ ساتھ والی دکان کی طرف مبذول ہو گئی جہاں مختلف نسلوں کے کتّے فروخت کے لیے موجود تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر روئی کے گالے کی طرح ملائم بالوں والے ایک چھوٹے سے کتّے کو گود میں اٹھا لیا اور اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ چارلس کو اس کی نیّت بھانپنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

”تمھیں دو میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا ہوگا۔ وہ ہیرا یا یہ کتّا؟“

”یہ کتّا تم میری آندرے کے لیے کیوں نہیں خرید لیتے۔“ نکوشی نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس طرح اسے وقت گزاری کے لیے ایک دوست تو مل جائے گا۔“ چارلس کو اس کی یہ تجویز پسند آئی اور اس نے بھاؤ تاؤ کر کے یہ کتّا بھی خرید لیا۔

ریشمی بالوں والا یہ چھوٹا سا کتّا میری آندرے کو پسند آیا۔ وہ اسے فرینکی کے نام سے پکارنے لگی اور اس کے وجود میں وہ محبت تلاش کرنے لگی جو اسے چارلس سے نہیں مل سکی تھی۔ اس وقت اس کا شمار ان لوگوں میں کیا جا سکتا تھا جو اپنے چاہنے والوں سے مایوس ہو کر محبت کی تلاش میں مختلف راستوں پر بھٹکنے لگتے ہیں۔ لیکن چارلس کو شاید اس کی یہ خوشی بھی پسند نہیں آئی تھی۔ ایک روز جب وہ فرینکی کو گود میں لیے اس کی پیٹھ سہلا رہی تھی چارلس بھی پہنچ گیا۔ وہ چند لمحے فرینکی کو دیکھتا رہا پھر معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے یورپ میں اس کتّے کو کم از کم چار گنا منافع پر فروخت کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت تک اس کی دیکھ بھال کرنا تمھاری ذمّہ داری ہے۔“

چارلس کی یہ بات میری آندرے کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے کافی تھی۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی لیکن بولی کچھ نہیں۔

ایک ماہ گزر گیا۔ اس دوران چارلس ان دونوں لڑکیوں کو چکمے دیتا رہا۔ آج تک وہ کسی ایک ہوٹل میں ٹک کر نہیں رہا تھا ہر دوسرے تیسرے دن ہوٹل تبدیل کر لیتا۔ صبح کا ناشتا وہ عام طور پر میری آندرے کے ساتھ کسی چائنیز ریسٹورنٹ میں کرتا اور اس کے بعد ایسا غائب ہوتا کہ آدھی رات سے پہلے اس کی صورت دکھائی نہ دیتی۔ بعض اوقات اس کی واپسی دوسرے دن صبح ہوتی۔

چارلس کا زیادہ وقت شہر کے ان علاقوں میں گزرتا جو غیر ملکی سیاحوں کے مراکز سمجھے جاتے تھے۔ شام ہوتے ہی وہ نکوشی کو بھی اپنے ساتھ ملا لیتا۔ رات کا کھانا کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانے کے بعد وہ مختلف نائٹ کلبوں میں گھومتے رہتے۔ ان دونوں میں سے کوئی لڑکی اگر عدم توجہی کی شکایت کرتی تو چارلس الٹا اسی پر برس پڑتا کہ وہ اپنا زیادہ وقت اسی کو دے رہا ہے۔

اگست ۷۵ء کے آخر میں چارلس کسی طرح میری آندرے کے پرس سے مزید آٹھ سو ڈالر نکلوانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس طرح میری آندرے کے پاس صرف دو سو ڈالر رہ گئے تھے جس میں بمشکل کینیڈا کا ہوائی ٹکٹ خریدا جا سکتا تھا۔ مزید برآں تھائی لینڈ میں قیام کے ویزے کی مدّت بھی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے جب چارلس کو ویزے کے بارے میں آگاہ کیا تو وہ بے پروائی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

”یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر پریشان ہوا جائے۔ تمھیں شاید سرکاری محکموں میں میرے تعلقات کا اندازہ نہیں۔ پولیس میں بھی میرا اچھا خاصا رسوخ ہے۔ ویزے کی مدّت بڑھانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ بنکاک میں رشوت عام ہے۔ چند بھاٹ (تھائی کرنسی) [illegible] شخص کے ہاتھ میں تھما دیے جائیں تو کسی معاملے میں کوئی پریشانی نہیں رہتی۔“

چارلس نے اگرچہ میری آندرے کو ویزے کے بارے میں تسلّی دی تھی لیکن عملی طور پر وہ کچھ نہ کر سکا۔ تاریخ آئی اور گزر گئی۔ میری آندرے جب بھی چارلس کو یاد دلاتی وہ الٹا اسی پر برس پڑتا۔

”تم جیسی عورتوں کے ساتھ نباہ کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ مرد کے لیے عذاب ثابت ہوتی ہیں ایسی عورتیں۔ کسی کام کی طرف توجہ نہیں دی جا سکتی۔ آرام سے بیٹھی رہو، جب بھی موقع ملے گا ویزے کی تاریخ بڑھوا لوں گا۔“

میری آندرے کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ ہر وقت سہمی سہمی سی رہنے لگی۔ تھائی لینڈ میں اب اس کا قیام غیر قانونی تھا۔

چارلس کے اس رویّے کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے اور بھی باتیں یاد آ جاتیں۔ اس کے وہ وعدے یاد آنے لگتے جو اس نے اپنے خطوط میں کیے تھے۔ رنگون میں ہندوستان کے آخری مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر کے مقبرے کی سیر، فلپائن کے ساحل پر ناریل کے درختوں کے جھنڈ میں خوبصورت ولا میں قیام، سرخ ریشمی گون، ہیرے کے جڑاؤ والے نیکلس، بُندے اور انگوٹھیاں۔ یہ وہ سبز باغ تھے جو چارلس نے اسے دکھائے تھے۔ اس کے برعکس چارلس نے نہ صرف اس سے اٹھارہ سو ڈالر ہتھیا لیے تھے بلکہ آج تک معمولی سا لباس بھی خرید کر نہیں دیا تھا اور اسے بنکاک کے تھرڈ کلاس ہوٹلوں میں رکھا جا رہا تھا جہاں عام حالات میں وہ داخل ہونے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سفید بالوں والا وہ چھوٹا سا کتّا واحد تحفہ تھا جو اب تک چارلس نے اسے دیا تھا اور اسے بھی وہ یورپ جا کر بیچنا چاہتا تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود چارلس کے لیے اس کے دل میں اب بھی محبت کے جذبات موجزن تھے۔ جس کا اظہار اس کی ڈائری سے بھی ہوتا تھا۔

”زندگی کانٹوں پر گھسٹ رہی ہے۔ بنکاک میں اب تک کے قیام کے دوران مجھے چند لمحات بھی ایسے میسّر نہیں آئے جب مجھے چارلس کے پاس تنہائی میں بیٹھنے کا موقع ملا ہو ــ وہ شخص جس کے لیے میں نے اپنے عزیزوں سے منہ موڑ لیا، اپنا وطن چھوڑ دیا، اُسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن ــ میں اب بھی اسے اسی طرح چاہتی ہوں۔“

پتایا کو... تھائی لینڈ میں سیّاحوں کی جنّت کہنا غلط نہ ہوگا۔ سڑک کے راستے بنکاک سے صرف دو گھنٹے کی مسافت پر واقع یہ چھوٹا سا ساحلی شہر یورپ کے کسی بھی ماڈرن شہر سے پیچھے نہیں ہے۔ کسی زمانے میں اسے ماہی گیروں کی ایک چھوٹی سی بستی کی حیثیت حاصل تھی لیکن سیّاحوں کی توجہ کے باعث وقت کے ساتھ ساتھ یہ بستی ترقی کی منازل طے کرتی چلی گئی۔ جھونپڑوں اور گارے کے کچے مکانوں کی جگہ پختہ عمارتیں نمودار ہونے لگیں اور اب تو یہ شہر کئی میل تک پھیل گیا تھا جس کی جدید ترین عمارتیں آسمان سے باتیں کرتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ یہاں کے ہوٹل اور نائٹ کلب یورپ کے نائٹ کلبوں کو شرماتے تھے۔ ہوٹلوں اور ریسٹورنٹس میں عام طور پر امریکی، فرانسیسی اور جرمن کھانے سرو کیے جاتے تھے۔ شہر کے سڑکوں پر ہاتھی جھومتے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہاں سواری کے لیے عام طور پر ہاتھی بھی استعمال ہوتے تھے۔ جنھیں ٹیکسیوں کی طرح کرائے پر حاصل کیا جا سکتا تھا۔ سمندر میں تاحدِ نگاہ رنگ برنگے بادبانوں والی کشتیاں تیرتی ہوئی نظر آتیں۔ سمندر میں جگہ جگہ ایسی بلند چٹانیں بکھری ہوئی تھیں جنھیں جزیرے کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ غیر ملکی سیاح کرائے کی موٹر بوٹس پر ان جزیروں کی طرف نکل جاتے۔ انھی موٹر بوٹس کے درمیان سمندر میں ایسی لاتعداد کشتیاں بھی تیرتی ہوئی نظر آتیں

جن پر نوجوان تھائی لڑکیاں منشیات فروخت کرتی رہتیں۔

یہ یکم ستمبر ۱۹۷۵ کی بات ہے۔ آسٹریلیا کا رہنے والا پی۔ ایچ۔ ڈی کا ایک اسٹوڈنٹ اپنی انڈونیشین بیوی کے ساتھ پتایا کے ساحل پر بیٹھا تفریح سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ دونوں تازہ توڑے ہوئے ناریل کے شیریں پانی کے گھونٹ لیتے ہوئے اس شہر کے روزافزوں پھیلاؤ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔

رسل لیتھروِن اور اس کی بیوی ویرا بہت مختصر سے دورے پر تھائی لینڈ آئے تھے۔ پتایا ان کے پروگرام میں شامل نہیں تھا لیکن اس کی تعریف سن کر ویرا کے اسرار پر رسل نے یہاں آنے کا پروگرام بنالیا تھا۔ یہاں سے وہ ہواہن، ہات یائے، پی نانگ اور کوالالمپور ہوتے ہوئے ملبورن واپس چلے جاتے۔ جہاں رسل پولیٹکس اور سوشیالوجی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی تیاری کر رہا تھا۔

رسل اور ویرا ریت پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ دو سائیکل سوار ان کے پاس آکر رک گئے۔ ان میں ایک نوجوان مرد تھا اور دوسری ایک خوبصورت لڑکی۔ مرد کے چہرے کے نقوش کسی حد تک ایشیائی تھے۔ اس نے نیکر اور پولو شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ ہیلو کہتا ہوا ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ اور رسل کو مخاطب کرتے ہوئے دریافت کرنے لگا کہ انھوں نے ناریل کہاں سے خریدے تھے۔ اس نے اگرچہ انگریزی میں بات کی تھی لیکن اس کا فرانسیسی لہجہ رسل سے چھپا نہیں رہ سکا تھا۔ وہ اس کی ساتھی لڑکی کی طرف دیکھنے لگا جو اس گفتگو میں بہت کم حصہ لے رہی تھی۔ اس کی انگریزی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ سائیکل سوار نوجوان نے جین بلمونٹ کے نام سے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ اس کا تعلق پیرس سے ہے اور اس کی بیوی مونیکا کنیڈا کی رہنے والی ہے۔

چند منٹ بعد ہی وہ دونوں میاں بیوی رسل اور ویرا سے اس طرح بے تکلف ہو گئے جیسے ان کی دوستی بہت پرانی ہو۔ مونیکا بہت کم گو ثابت ہوئی تھی۔ جبکہ بلمونٹ مسلسل بول رہا تھا۔ گفتگو میں زیادہ حصہ وہی لے رہا تھا۔ ان لوگوں کا اس طرح بے تکلف ہوجانا اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ کسی اجنبی ملک میں غیر ملکی سیاح مقامی باشندوں کی نسبت اپنے آپ کو ایک دوسرے کے زیادہ قریب سمجھتے ہیں خواہ ان کا تعلق مختلف ممالک ہی سے کیوں نہ ہو۔

بلمونٹ نے انھیں اپنے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ لوگ پیرس سے بیروت جاتے ہوئے مختلف ممالک کی سیر کرتے ہوئے چار روز قبل یہاں پہنچے تھے۔ یہاں اگرچہ وہ صرف ایک دن کا پروگرام لے کر آئے تھے۔ مگر یہ جگہ ایسی پسند آگئی تھی کہ یہاں سے جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ یہاں سے وہ لوگ جزیرہ بالی جانے کا ارادہ رکھتے تھے جہاں چند روز قیام کے بعد فلپائن ہوتے ہوئے بیروت روانہ ہوجاتے۔ بیروت میں ان کا ایک ہفتے کا پروگرام تھا اور اس کے ساتھ ہی ان کا یہ تفریحی دورہ ختم ہوجاتا اور وہ پیرس واپس پہنچ کر اپنے معمولات میں مصروف ہوجاتے۔ بلمونٹ نے بتایا کہ وہ پیرس کی ایک خوشبویات تیار کرنے والی کمپنی کا سیلز ڈائرکٹر ہے جبکہ اس کی بیوی مونیکا ملبوسات کی صنعت سے وابستہ ہے۔

باتوں کے دوران بلمونٹ نے اپنی شرٹ اتار دی۔ کچھ دیر اپنے کسرتی جسم کی نمائش کرتا رہا پھر دوڑتا ہوا سمندر میں کود گیا لیکن چند منٹ بعد ہی واپس آگیا۔ کیونکہ پانی صاف نہیں تھا۔ جس سے کسی قسم کی جلدی بیماری لاحق ہونے کا اندیشہ ہوسکتا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں جب رسل نے بتایا کہ وہ لوگ یہاں سے تھائی لینڈ کے ایک اور ساحلی شہر ہواہن جانے والے ہیں تو بلمونٹ یوں۔۔۔ اچھل پڑا جیسے اس نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

"حیرت انگیز۔" وہ رسل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "عجیب اتفاق ہے کہ ہم بھی ہواہن جانے کا پروگرام بنا رہے تھے لیکن یہ سوچ کر ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پائے کہ اکیلے میں تفریح کا کیا لطف آئے گا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم لوگ اکٹھے ہی چلیں۔ مزہ آجائے گا۔"

"کیوں نہیں۔" رسل نے آمادگی کا اظہار کیا۔ "دو سے چار بھلے۔"

مونیکا اس دوران خاموش رہی تھی۔ وہ کبھی کبھار ہی زبان کھولتی۔ زیادہ تر وہ ریشمی بالوں والے اس چھوٹے سے کتے کی پیٹھ سہلاتی رہی تھی جو اس کی گود میں دبکا بیٹھا تھا۔ رسل اور ویرا نے محسوس کیا کہ مونیکا اپنے شوہر کی باتوں سے زیادہ اس کتے میں دلچسپی لے رہی تھی۔

اس شام وہ الگ الگ بنکاک پہنچ گئے۔ جہاں سے دوسرے دن ٹرین کے ذریعے ہواہن روانہ ہوگئے۔ تقریباً آٹھ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ہواہن پہنچے تو رہائش کا مسئلہ درپیش ہوا۔ رسل کسی بڑے ہوٹل کے اخراجات برداشت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ بلمونٹ انھیں ریلوے ہوٹل لے گیا جہاں دو ملحقہ کمرے مل گئے۔ ان دونوں کمروں کی بالکونی بھی مشترکہ تھی جہاں سے سمندر کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ ساحل ویران تھا۔ بنکاک

سے دور ہونے کی وجہ سے بہت کم لوگ اس طرف کا رُخ کرتے تھے۔ شہر کی سڑکیں اگرچہ کشادہ تھیں لیکن بے اصولیوں کی وجہ سے ٹریفک اکثر جام رہتا تھا۔

ہوٹل میں آنے کے کچھ ہی دیر بعد بلمونٹ اور مونیکا اکیلے ہی سیر کے لیے نکل گئے۔ شام کے دھندلکے میں جب واپس لوٹے تو بارش کی پھوار میں شرابور ہو رہے تھے۔ مونیکا کا موڈ آف تھا۔ وہ دونوں کسی بات پر آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ مونیکا کو ہواہن پسند نہیں آیا تھا۔ بلمونٹ بات بات پر اسے ڈانٹ رہا تھا۔ جس سے مونیکا سہمی سہمی سی نظر آرہی تھی۔

بارش نے اب طوفانی صورت اختیار کرلی تھی۔ وہ چاروں بالکونی میں بیٹھے سمندر کی اچھلتی ہوئی لہروں کو دیکھ رہے تھے۔ بلمونٹ نے میزبانی کے فرائض سنبھال لیے تھے اور یہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کے مہمانوں کو کسی معاملے میں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ رسل اور ویرا بارش کی وجہ سے خاصے پریشان تھے لیکن بلمونٹ بار بار انھیں یقین دلا رہا تھا کہ کچھ ہی دیر میں بارش رک جائے گی اور شہر کی زندگی معمول پر آجائے گی۔ بلمونٹ نے ہوٹل کی روم سروس کو کافی کا آرڈر دے دیا لیکن ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد بھی ویٹر کافی لے کر نہ آیا تو رسل، ویرا کو اشارہ کرتا ہوا اٹھ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں جاکر آرام کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کمرے میں داخل ہوکر دروازہ بند کرلیا لیکن آدھے گھنٹے بعد دستک کی آواز سن کر ویرا نے دروازہ کھولا تو مونیکا کو دیکھ کر راستے سے ہٹ گئی۔ مونیکا کافی لے کر آئی تھی۔ اس نے دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک کپ تھمادیا اور اس وقت تک وہاں کھڑی رہی جب تک کہ انھوں نے کپ خالی نہیں کردیے۔ پھر ٹوٹی پھوٹی انگلش میں انھیں بلمونٹ کی طرف سے شہر کے سب سے بڑھیا ریسٹورنٹ میں رات کے کھانے کی دعوت دیتی ہوئی خالی کپ اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ اس وقت اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ جیسے کسی انجانے خوف نے اسے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہو۔

بلمونٹ کی طرف سے جس بڑھیا ہوٹل میں کھانے کی دعوت ملی تھی وہ شہر کا سب سے گھٹیا ہوٹل ثابت ہوا۔ رسل اور ویرا کھانا بھی چند لقموں سے زیادہ نہ کھا سکے۔ کھانے کے بعد وہ لوگ فوراً ہی اپنے ہوٹل واپس آگئے کیونکہ بارش کی وجہ سے تفریح کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ہوٹل میں آتے ہی رسل اور ویرا کو متلی سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئے۔

وہ رات ان دونوں میاں بیوی کے لیے انتہائی تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ بار بار متلی کے ساتھ انھیں دست بھی شروع ہو گئے۔ انھوں نے کھانا اگرچہ زیادہ نہیں کھایا تھا لیکن رسل کو یقین تھا کہ یہ ساری خرابی اس ریسٹورنٹ کے ناقص اور بدمزہ کھانے ہی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔

"رات بھر تمھارے کمرے میں چلنے پھرنے اور باتھ روم میں پانی گرنے کی آواز آتی رہی۔ میرا خیال ہے یہاں کی آب و ہوا تمھیں راس نہیں آئی۔" صبح بلمونٹ نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔

"ریسٹورنٹ کا کھانا اچھا نہیں تھا۔ یہ ساری گڑبڑ اسی کی وجہ سے ہوئی ہے۔" رسل نے پیٹ دباتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے مہر بند ڈبے کا دودھ تمھارے لیے بہتر رہے گا۔ اس حالت میں تمھارے لیے اس سے بہتر اور کوئی خوراک نہیں ہوسکتی۔" بلمونٹ نے کہا۔

"نہیں فی الحال ہم کچھ بھی نہیں کھانا پینا چاہتے۔ فاقہ ہمارے لیے بہترین علاج ثابت ہوسکتا ہے۔" رسل نے جواب دیا۔

وہ لوگ ہوٹل سے نکل کر ساحل پر آگئے۔ بارش اگرچہ گزشتہ رات ہی بند ہوچکی تھی لیکن آسمان پر اب بھی بادل چھائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سورج بھی بادلوں کی اوٹ سے جھانک لیتا۔ رسل اور ویرا ساحل کی ریت پر لیٹے رہے اور بلمونٹ ان کے قریب بیٹھا ہمدردانہ لہجے میں باتیں کرتا رہا۔ بلمونٹ نے باتوں ہی باتوں میں رسل سے اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرلیا تھا۔ مثلاً یہ کہ اس کی آمدنی کے ذرائع کیا تھے اور وہ مہینے بھر میں کتنا کما لیتا تھا۔ رسل ان دنوں آسٹریلیا کی ایک فاؤنڈیشن کے لیے پولیٹکس کے موضوع پر جنوب مشرقی ایشیا پر ایک نصابی کتاب بھی لکھ رہا تھا۔ بلمونٹ نے یہ بھی معلوم کرلیا کہ اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں فاؤنڈیشن کی طرف سے اسے کتنی گرانٹ ملی تھی اور سب سے اہم اس نے رسل سے یہ بھی اگلوا لیا تھا کہ اس وقت ٹریولرز چیکس کی صورت میں اس کے پاس کتنی رقم موجود تھی۔

اسی روز دوپہر کو وہ دونوں میاں بیوی اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے کہ مونیکا دستک دیے بغیر کمرے میں چلی آئی۔ وہ ان کے لیے چاکلیٹ ملک شیک لے کر آئی تھی۔ رسل کو نجانے یہ احساس کیوں ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ نروس سی تھی۔ وہ دونوں چند لمحے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ مونیکا اپنی جگہ پر کھڑی رہی جیسے کسی حکم کی تعمیل کر رہی ہو کہ جب تک وہ دونوں ملک شیک نہ پی لیں وہ ان کے سروں پر مسلط رہے۔ ویرا نے تو اپنے گلاس سے چھوٹی چھوٹی چسکیاں لینا شروع کردی تھیں لیکن رسل نے گلاس میز پر رکھ کر دوبارہ وہ کتاب کھول لی تھی جسے وہ مونیکا

www.allpdfstuff.blogspot.com

کے آنے سے پہلے پڑھ رہا تھا۔ اس نے مونیکا سے کہا تھا کہ کتاب کا زیرِ مطالعہ باب ختم ہونے کے بعد وہ ملک شیک پی لے گا۔

تقریباً دس منٹ بعد ویرا متلی سی محسوس کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ رسل نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور سامنے برآمدے میں بچھی ہوئی کرسیوں پر مونیکا اور بلمونٹ بیٹھے سرگوشیانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ رسل نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ لیکن ملک شیک پینے کے فوراً ہی بعد وہ اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ متلی کے ساتھ ہی نہ صرف اسے چکّر آنے لگے تھے بلکہ ذہن پر غنودگی بھی طاری ہو رہی تھی۔ وہ اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا کہ پیٹ میں بڑی شدّت سے مروڑ اٹھنے لگے۔ وہ کچھ دیر تک برداشت کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر کتاب پٹخ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اسے بری طرح چکّر آ گیا لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ لیکن متلی ہونے کے ساتھ پیٹ کی تکلیف شدّت اختیار کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دماغ سن ہو رہا تھا جیسے نیند پوری شدت سے اس پر حملہ آور ہو رہی ہو۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جسم سے جان نکلی جا رہی ہو۔ ٹانگوں میں جسم کا بوجھ برداشت کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ وہ بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ اس نے برآمدے میں بیٹھے ہوئے مونیکا اور بلمونٹ کی طرف دیکھا۔ لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی اس کی مدد کو نہیں آیا۔ رسل اپنے آپ کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش کرتا رہا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ دھڑام سے فرش پر گرا اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ رسل سے لیتھرون کے ساتھ یہ واقعہ ۴ ستمبر ۱۹۷۵ کو پیش آیا تھا۔

تقریباً اڑتالیس گھنٹے بعد اسپتال کے بستر پر رسل کو ہوش آیا تو اس کے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ ویرا بھی اس کے قریب ہی موجود تھی۔ رسل کو ہوش میں آتے دیکھ کر ویرا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی لیکن اس کا چہرہ بھی اس طرح پیلا ہو رہا تھا جیسے جسم کا سارا خون نچڑ گیا ہو۔ ویرا کو بھی کچھ علم نہیں تھا کہ اس دوران ان پر کیا بیتی تھی۔ البتّہ ہوٹل کے ایک ملازم نے بتایا تھا کہ وہ دونوں اپنے کمرے کے فرش پر بے ہوش پڑے ہوئے پائے گئے تھے جنھیں فوری طور پر اسپتال پہنچا دیا گیا تھا جہاں بروقت طبّی امداد سے ان کی جانیں بچا لی گئی تھیں۔ اگر اسپتال پہنچتے ہی ان کے معدے صاف نہ کر دیے جاتے تو اس وقت ان کی لاشیں اسپتال کے سرد خانے میں پڑی ہوئی ہوتیں۔

"مونیکا اور بلمونٹ کہاں ہیں؟" رسل نے ویرا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" ویرا نے کندھے اچکائے۔ "ہوش میں آنے کے بعد ان میں سے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔"

اسی روز جب حالت سنبھلنے کے بعد انھیں چھٹی دے دی گئی تو وہ اسپتال سے نکل کر سیدھے ریلوے ہوٹل پہنچے۔ بلمونٹ کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے زور آزمائی سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ دوڑتا ہوا ہوٹل کے استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچ گیا اور بلمونٹ اور مونیکا کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ممکن ہے انھیں بھی اسی قسم کا کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو اور انھیں بھی کسی کلینک یا اسپتال پہنچا دیا گیا ہو لیکن اس انکشاف نے اسے بری طرح بدحواس کر دیا کہ وہ دونوں میاں بیوی گزشتہ روز ہی ہوٹل چھوڑ کر جا چکے تھے اور انھوں نے اپنا کوئی ایڈریس بھی نہیں چھوڑا تھا۔

اپنے کمرے میں واپس آ کر رسل نے جب اپنے سامان کا جائزہ لیا تو اس کے دیوتا کوچ کر گئے۔ ان دونوں کے پاسپورٹ، شادی کا لائسنس، ڈرائیونگ لائسنس، ویرا کی شادی کی انگوٹھی، طلائی زنجیر، مووی کیمرہ، نقدی، گیارہ سو ڈالرز مالیت کے ٹریولرز چیک اور آسٹریلیا تک کے قابلِ استعمال ہوائی ٹکٹ غائب تھے۔

رسل نے بلمونٹ اور مونیکا کے خلاف پولیس میں رپورٹ لکھوانے کی کوشش کی مگر زبان آڑے آ رہی تھی۔ وہ پولیس والوں کو جو بات سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا وہ ان کے پلّے نہیں پڑ رہی تھی۔ بالآخر پولیس نے جو رپورٹ درج کی اس کا مفہوم اس سے قطعی مختلف تھا جو رسل انھیں بتانا چاہتا تھا۔

اس واقعہ کے تقریباً چھ ماہ بعد انٹرپول کے ایک ایجنٹ نے ملبورن میں رسل سے رابطہ قائم کر کے اس واقعہ کی تفصیلات دریافت کیں اور انھیں ایک مرد اور ایک عورت کی تصویریں دکھا کر شناخت چاہی تو رسل اچھل پڑا۔

"یہی ہیں۔" وہ تصویریں دیکھتے ہی بولا۔ "بلمونٹ اور اس کی بیوی مونیکا کو میں کہیں بھی پہچان سکتا ہوں۔ یہ انہی کی تصویریں ہیں۔"

وہ تصویریں چارلس سوبھراج اور میری آندرے کی

تھیں۔ جس وقت رسل اور اس کی بیوی ویرا کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا اُس وقت میری آندرے کو تھائی لینڈ میں آئے ہوئے پورا ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ اور تھائی لینڈ میں اس کا نہ صرف قیام ہی غیر قانونی تھا بلکہ وہ ایک فرضی نام اور چارلس سوبھراج کی بیوی کی حیثیت سے مجرمانہ زندگی کا آغاز کر چکی تھی۔ رسل اور ویرا کو زہر آلود، ملک شیک پلا کر انھیں لوٹنا میری آندرے کی پہلی واردات تھی اور چارلس نے اس معاملے میں اس کی پوری پوری مدد کی تھی۔

✣

ہواہن سے بنکاک تک واپسی کے آٹھ گھنٹے کے ٹرین کے سفر نے میری آندرے کو بری طرح تھکا دیا تھا۔ تھکن سے زیادہ اس پر بدحواسی طاری تھی۔ ہواہن کے ریلوے ہوٹل میں انھوں نے رسل اور اس کی بیوی ویرا کے ساتھ جو کچھ بھی کیا تھا وہ اس کے حواس مختل کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس نے بڑی شریفانہ زندگی گزاری تھی۔ کسی معمولی سی قانون شکنی کا خیال بھی کبھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ اس معاملے میں اس کا ماضی بے داغ تھا لیکن چارلس کی محبت میں اب اس کے کردار پر ایک سنگین جرم کا ایسا دھبّہ لگ چکا تھا جس کا احساس اس کی روح کو مجروح کر رہا تھا۔ ایک انجانا سا خوف اس کے ذہن پر مسلّط تھا۔ اور وہ اس احساس سے چھٹکارا پانے کے لیے چند روز مکمّل آرام کرنا چاہتی تھی۔

واپسی کے سفر کے دوران ٹرین میں بھی اسے ہر لمحہ یہی دھڑکا لگا رہا تھا کہ پولیس کسی بھی وقت ان پر ہاتھ ڈال سکتی ہے۔ وہ اپنی اندرونی کیفیت کو چھپانے کے لیے فرینکی کو گود میں دبوچے مضطربانہ انداز میں اس کے ریشمی بالوں کو سہلاتی رہی تھی۔ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹرین رکی تو، فرینکی اس کی گود سے اچھل کر ٹرین سے اُتر گیا۔ میری آندرے نے بھی اس کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ وہ دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے رہے۔ کتّا پلیٹ فارم پر مسافروں کی ٹانگوں میں اِدھر سے اُدھر دوڑا پھر رہا تھا۔ اس اسٹیشن پر ٹرین صرف ایک منٹ کے لیے رکتی تھی لیکن میری آندرے اور کتّے کی بھاگ دوڑ کی وجہ سے دو منٹ لیٹ ہو گئی۔ بالآخر جب وہ کتّے کو دبوچ کر اپنی سیٹ پر آ گئی تو اس کی.... آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ اس کے دل میں یہ خوف بیدار ہو چکا تھا کہ اگر ہواہن میں ان کے فرار کی خبر پھیل گئی تو یقینی طور پر ریلوے پولیس کو بھی اطلاع کر دی جائے گی اور اس کتّے کی وجہ سے انھیں آسانی سے شناخت کیا جا سکتا تھا۔ وہ مسلسل سسکیاں بھر رہی تھی اور چارلس اسے تسلّیاں دے رہا تھا کہ انھیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔

بنکاک پہنچنے کے بعد بھی کئی روز تک میری آندرے پر بدحواسی سی طاری رہی۔ احساسِ جرم کے ساتھ وہ اپنی بے بسی اور تنہائی پر بھی آنسو بہاتی رہتی۔

"دیکھو ڈیر!" چارلس اسے راہ پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "میرے بارے میں تم اب تک غلط فہمی کا شکار رہی ہو۔ میں دل کی گہرائیوں سے تمھیں چاہتا ہوں۔ مجھے تمھاری ضرورت ہے۔ ہم بہت جلد شادی کر لیں گے اور پھر تمھارا اپنا بچہ ہو گا۔ پھر تمھیں جانوروں میں محبت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اب تک جو کچھ بھی ہوا اسے بھول جاؤ۔ آئے دن ہوٹل تبدیل کرنا اور نکوشی سے تعلقات دراصل میرے ایک منصوبے کا حصّہ تھے۔ میرا یہ منصوبہ اب پایۂ تکمیل کو پہنچنے والا ہے۔ آئندہ تمھیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہو گی۔"

"کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو؟" میری آندرے کے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔

"کیا تمھیں میری محبت پر شبہ ہے؟"، چارلس نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "بہت جلد تمھیں میری محبت کا ثبوت بھی مل جائے گا۔"

چارلس کی باتیں میری آندرے کے لیے خاصی حوصلہ افزا ثابت ہوئیں اور اس کے دل پر چھائے ہوئے مایوسی کے بادل چھٹنے لگے۔

وہ نہایت ہی خوشگوار دن تھا۔ چارلس تقریباً ایک گھنٹے سے اسے ٹیکسی میں شہر کے مختلف علاقوں کی سیر کرا رہا تھا۔ بالآخر وہ اس علاقے میں نکل آئے جہاں نہر کے کنارے کیلے کے درختوں کی قطاروں کے پیچھے عالیشان کوٹھیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ بیشتر سفارتخانے بھی اسی علاقے میں واقع تھے۔ بندر درختوں پر اس طرح چھلانگیں لگا رہے تھے جیسے یہ انہی کی راجدھانی ہو۔ اسی علاقے سے ملحق وہ علاقہ تھا جہاں بعض عالیشان ہوٹل، نائٹ کلب اور جواخانے واقع تھے۔ ویتنام کی جنگ کے دوران یہ علاقہ ہوس پرست امریکی فوجیوں کی شکارگاہ سمجھا جاتا تھا۔

ٹیکسی ایک پانچ منزلہ عمارت کے سامنے رک گئی جس کے دروازے پر کانت ہاؤس کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ جدید طرزِ تعمیر کی حامل اس عمارت کا مقابلہ ہالی ووڈ کی کسی بھی خوبصورت بلڈنگ سے کیا جا سکتا تھا۔ عمارت کے احاطے

میں ایک خوبصورت سوئمنگ پول بھی موجود تھا۔ پہلی سے پانچویں منزل تک آمد و رفت کے لیے خودکار لفٹ نصب تھی۔ کشادہ، ہوادار اور روشن راہداریوں سے سمندر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ اس اپارٹمنٹ ہاؤس کے کرائے داروں میں سے بیشتر کا تعلق مختلف سفارت خانوں اور ہوائی کمپنیوں سے تھا۔ گیراج والے کمپاؤنڈ میں ایم۔جی اور رینالٹ گاڑیاں کھڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

میری آندرے اب تک نہیں سمجھ سکی تھی کہ چارلس اسے یہاں کیوں لایا ہے۔ وہ ٹیکسی سے اتر کر میری آندرے کا ہاتھ پکڑے پُروقار انداز میں چلتا ہوا عمارت کے مرکزی دروازے میں داخل ہو گیا۔ زمینی لاؤنج میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ لفٹ میں داخل ہو کر چارلس نے بٹن دبا دیا اور لفٹ ہلکی سی آواز کے ساتھ پانچویں منزل کی طرف اٹھنے لگی۔

پانچویں منزل میں لفٹ سے برآمد ہوتے ہی چارلس نے جب انکشاف کیا کہ اس نے یہ پینٹ ہاؤس میری آندرے کے لیے کرائے پر حاصل کر لیا ہے تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اپارٹمنٹ پانچ سو تین کا دروازہ کھول کر وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئے گرم ہوا کا ایک جھونکا میری آندرے کے چہرے سے ٹکرایا جس میں ناگوار سی بُو بھی شامل تھی۔ دیواروں پر جابجا دھبّے تھے اور فرش پر بھی گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ ردّی کاغذوں کے ٹکڑے اور سوکھی ہوئی ڈبل روٹی کے ٹکڑے بھی بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے جس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ پچھلے کرائے دار اس اپارٹمنٹ کو بہت بری حالت میں چھوڑ کر گئے تھے اور عمارت کی انتظامیہ نے اس کے بعد بھی اس کی صفائی وغیرہ کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یہاں نظر آنے والا فرنیچر بھی قابلِ تعریف نہیں تھا۔ ایسا فرنیچر عام طور پر تھرڈ کلاس رہائشی ہوٹلوں ہی میں دیکھنے میں آتا ہے ــ میری آندرے اس کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی جہاں سے سوئمنگ پول کو دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کھڑکی سے شہر کا نظارہ قابلِ دید تھا۔ شہر کے اس پار ایک بہت بڑے بدھ اسٹوپا کی دھوپ میں چمکتی ہوئی سنہری چھت عجیب سا منظر پیش کر رہی تھی۔

چارلس بہت خوش تھا۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کے ارفع ترین مقام پر تصور کر رہا تھا۔ اس کے خیال میں یہ پینٹ ہاؤس کرائے پر حاصل کر کے اس نے بہت بڑا تیر مارا تھا اور چاہتا تھا کہ میری آندرے بھی اس کے ساتھ اسی جوش و خروش کا اظہار کرے۔ میری آندرے اس لحاظ سے بہرحال خوش تھی کہ اسے ہوٹلوں کی زندگی سے نجات مل گئی تھی۔ یہاں رہتے ہوئے اسے کم از کم گھر کا احساس تو ہو گا۔ اس نے فوراً ہی اس نئے گھر کی سجاوٹ کا پروگرام سوچنا شروع کر دیا۔ چارلس اگرچہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ پورے گھر کو رنگ روغن کرا سکتا لیکن اسے رہائش کے قابل بنانے میں تھوڑا بہت تو خرچ کر ہی سکتا تھا۔ اس فلیٹ میں قدم رکھنے کے بعد ہی میری آندرے پر انکشاف ہوا تھا کہ چارلس نے قیمتی وزٹنگ کارڈ بھی چھپوا لیے تھے۔

اے۔ گوتھر۔ جیم ڈیلر
سوٹ نمبر ۵۰۳۔ کانت ہاؤس
بنکاک۔ تھائی لینڈ

اس نے وزٹنگ کارڈز کا پیکٹ نکال کر میری آندرے کے اوپر اس طرح اچھال دیا کہ وہ نوٹوں کی طرح اس کے سر پر برسنے لگے۔

شام سے پہلے پہلے وہ اس اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئے۔ ایک کمرہ چارلس نے اپنے دفتر کے لیے مخصوص رکھا تھا۔ جہاں قیمتی پتھر خریدنے کے خواہشمند گاہکوں کو بھی لایا جا سکتا تھا۔ جبکہ دوسرے کمرے کو خوابگاہ بنا لیا گیا۔ رات کو آہنی اسپرنگوں والے پلنگ پر لیٹتے ہوئے میری آندرے کچھ عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ اس کے ان جذبات کا اظہار اس کی ڈائری سے بھی ہوتا تھا۔

"آج میں بہت خوش ہوں۔ مایوسی کی وہ سیاہ گھٹائیں بالآخر چھٹنا شروع ہو گئی ہیں جنھوں نے میرے گرد تاریکی کے سائے پھیلا رکھے تھے۔ نیا گھر میرے لیے خوش بختی کی علامت ثابت ہوا اور آج سے ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کر رہے ہیں۔ خوشگوار زندگی کا جس سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔"

دوسرے روز صبح سویرے ہی میری آندرے نے فلیٹ کی صفائی شروع کر دی۔ دیواریں اور فرش اس طرح رگڑ رگڑ کر صاف کیا کہ ان میں چمک نظر آنے لگی۔ تمام فرنیچر کو گیلے کپڑے سے رگڑنے کے بعد صوفوں کے کشنوں پر نئے غلاف چڑھا دیے۔ شام کے لگ بھگ وہ ان کاموں سے نمٹی ہی تھی کہ چارلس ایک پنچنگ بیگ لے آیا جسے لیونگ روم کے وسط میں ٹانگ دیا گیا۔ اس بیگ پر چارلس کراٹے کی پریکٹس کرنا چاہتا تھا۔ میری آندرے نے احتجاج کیا کہ یہ بیگ اس جگہ مناسب نہیں رہے گا۔ وہ اس کے لیے کوئی اور جگہ منتخب کرے مگر چارلس نے اس کے احتجاج کی پروا نہیں کی اور پورے جوش و خروش سے بیگ پر مکّے برساتا رہا۔ میری آندرے نے خاموشی ہی میں عافیت

سمجھی کیونکہ وہ اس بیگ کو مسئلہ بنا کر اپنے لیے کوئی نئی الجھن پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

دوسرے دن میری آندرے باورچی خانے کے لیے بازار سے چند سستے قسم کے برتن خرید لائی اور کھانا بھی وہ گھر ہی میں تیار کرنے لگی۔ اپنے سلیقے اور لگن سے چند روز کے اندر ہی اندر وہ گرہستی کی تقریباً ہر چیز جمع کر چکی تھی اس کا زیادہ وقت گھر کی دیکھ بھال اور آرائش ہی میں گزرتا۔ جب وہ گھر پر نظر ڈالتی تو اسے عجیب سی مسرّت کا احساس ہوتا۔ گھر کی دیکھ بھال سے جو تھوڑا بہت وقت بچتا وہ فرنیکی کی دیکھ بھال پر صرف ہو جاتا جو کام کے دوران روئی کے گالے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے لڑھکتا رہتا۔ گھر کے افراد میں اضافے کے لیے چارلس بندر کا ایک بچّہ بھی لے آیا تھا۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے بڑا ہو گیا تھا۔ میری آندرے کی سرتوڑ کوشش کے باوجود بندر کا وہ بچّہ کوئی سلیقہ نہیں سیکھ سکا تھا۔ وہ جگہ جگہ گندگی پھیلاتا رہتا تھا۔ جس سے بچنے کے لیے میری آندرے نے اسے جانگیہ پہنانا شروع کر دیا۔ چارلس نے اس بندر کو نپولین کا نام دیا تھا۔ وہ دن بھر اس رسّی پر جھولتا رہتا جو چارلس نے پنچنگ بیگ لٹکانے کے لیے چھت کے کنڈے سے باندھی ہوئی تھی۔ اسے جب بھی موقع ملتا وہ فرنیکی کی مرمت کر ڈالتا۔ میری آندرے نپولین سے سخت نالاں تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ اسے گود میں لے کر سمجھانے کی کوشش کرتی۔

میری آندرے خوش تھی۔ اسے ایک گھر مل گیا تھا جہاں اس کی مصروفیت کا سامان موجود تھا مگر اس کی یہ خوشی زیادہ دیرپا ثابت نہ ہو سکی۔ وہ ہر صبح ناشتے کے بعد سبزی گوشت وغیرہ لینے چلی جاتی جہاں سے اس کی واپسی تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوتی۔ اس روز چارلس بھی ناشتا کرتے ہی کہیں چلا گیا تھا۔ میری آندرے بھی اس کے فوراً ہی بعد فلیٹ سے نکل گئی تھی، تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد جب وہ سودا سلف خرید کر فلیٹ واپس پہنچی تو وہاں چارلس کے ساتھ نکوشی کو دیکھ کر سُن سی ہو کر رہ گئی۔ چارلس اس طرح رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر ایک لمحہ بدحواس سا ہوا لیکن پھر اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور کسی ندامت یا شرمندگی کا اظہار کرنے کے بجائے ایک ضروری کام کا بہانہ کرتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

میری آندرے سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی نکوشی کو دیکھتی رہی جو ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے گھر کی آرائش کے سلسلے میں میری آندرے کی تعریف کر رہی تھی۔ میری آندرے نے کئی روز بعد نکوشی کو دیکھا تھا۔ چارلس نے اسے بتایا تھا کہ نکوشی سے اب اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن اس وقت اسے یہاں دیکھ کر میری آندرے کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ چارلس نے اس سلسلے میں اسے دھوکے میں رکھا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح اس دوران بھی اس سے ملتا رہا تھا۔

"یہ فلیٹ تمھیں کیسا لگا؟ مجھے یقین ہے تمھیں پسند آیا ہو گا؟" نکوشی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اچھا ہے۔ اب تک تو یہ جگہ بڑی پُرسکون ثابت ہوئی ہے۔" میری آندرے نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ یہ چارلس کے مقاصد کے لیے بہترین ثابت ہو گا۔ اسی لیے تو میں نے فوراً ہی اسے کرائے پر حاصل کر لیا تھا۔" نکوشی مسکرائی۔

میری آندرے کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے قریب ہی بم پھٹا ہو۔ "یہ فلیٹ تم نے کرائے پر لیا تھا؟" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

"ہاں۔" نکوشی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "یہ ذمّہ داری چارلس نے میری ہی کندھوں پر لاد دی تھی۔ درجنوں مکان دیکھنے کے بعد بالآخر یہ فلیٹ مجھے پسند آ گیا اور میں نے فوراً ہی ڈپازٹ دے کر اسے کرائے پر حاصل کر لیا۔"

میری آندرے خاموشی سے ہونٹ چبانے لگی۔ اس رات میری آندرے کی ڈائری میں شامل ہونے والے الفاظ قدرے مختلف تھے۔

"ہوا ہن سے واپسی پر چارلس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ نکوشی سے آئندہ کوئی تعلق نہیں رکھے گا لیکن وہ پرلے درجے کا جھوٹا اور مکّار ثابت ہوا۔ مجھے دھوکے میں رکھ کر وہ نکوشی سے ملتا رہا اور آج تو وہ اس حرّافہ کو اپنے ساتھ گھر پر بھی لے آیا تھا۔ نکوشی کو اس کے ساتھ دیکھ کر میری جو حالت ہوئی اس کا اندازہ صرف میں ہی لگا سکتی ہوں۔ دل اتنے ٹکڑوں میں بٹ چکا ہے کہ ان کا شمار ممکن نہیں رہا۔ میرے چہرے پر اذیت و کرب کے بکھرے ہوئے تاثرات سے میری اندرونی کیفیت کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ کوئی بھی مجھے اب تک نہیں سمجھ سکا۔ مجھ سے کسی کو محبّت نہیں۔ کوئی مجھے نہیں چاہتا۔ میرے پاس دو سو ڈالر کی جو رقم بچی تھی وہ بھی گھر کی آرائش اور دیگر ضروریات پر خرچ کر چکی ہوں۔ اب میرے پاس ایک کوڑی

تک نہیں بچی۔ میرا ویزا ختم ہو چکا ہے۔ پاسپورٹ اب استعمال کے قابل نہیں رہا۔ میں اپنے آپ کو قیدی محسوس کر رہی ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میں اب بھی چارلس سے محبت کرتی ہوں۔ اس بے ایمان کو ٹوٹ کر چاہتی ہوں جس کا ہر قدم مجھے تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔

❋

وہ ستمبر کا آخری ہفتہ تھا۔

پچیس سالہ ڈومنک تھائی لینڈ کے حسین ترین شہر چیانگ مائی کی سڑکوں پر دن بھر کی آوارہ گردی کے بعد تھک کر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھا اپنے اگلے پروگرام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ دو سال سے دنیا کی سیاحت کر رہا تھا۔ کچھ عرصہ اس نے آسٹریلیا میں بھی گزارا تھا جہاں ایک کمپنی میں کلرک کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے اس نے کچھ رقم بھی جمع کر لی تھی۔ وہ یورپ اور ایشیا کا ہر وہ شہر دیکھ چکا تھا جس کے لیے خواہش کی جا سکتی تھی۔ تھائی لینڈ اس کا آخری پڑاؤ تھا۔ اس کے پاس اب بھی پندرہ سو ڈالر کی رقم موجود تھی اور وہ سوچ رہا تھا تھا کہ اب اسے اپنے وطن فرانس واپس پہنچ کر عملی زندگی شروع کر دینی چاہیے۔ یوں بھی دو سال اپنے وطن سے دور رہتے ہوئے اب وہ اداس سا رہنے لگا تھا اور اسے اپنی بیوی اور بچہ بھی یاد آنے لگا تھا جنھیں وہ دو سال سے نہیں دیکھ سکا تھا۔

وہ چیانگ مائی میں صرف ایک دن کے لیے آیا تھا لیکن اس خوبصورت شہر کی رنگینیاں اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ شہر کی ان رنگینیوں میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کر کے کبھی وہ اداس بھی ہو جاتا اور وہ سوچتا کہ کاش اس کا کوئی ساتھی بھی ہوتا جس سے تفریح کا لطف دوبالا ہو جاتا۔ اس وقت بھی وہ اپنی تنہائی ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اپنے قریب ہی ایک آواز سن کر چونک گیا۔

”اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو تم فرانسیسی ہو؟“

”بالکل ٹھیک سمجھے۔“ ڈومنک نے اس نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا جس کے چہرے کے نقوش قدرے مشرقی تھے۔ آنکھوں پر تاریک شیشوں والی عینک لگی ہوئی تھی۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی جس کی عمر کسی طرح بھی تیس سے کم نہیں ہو سکتی تھی اور ناک چیری کی طرح سُرخ ہو رہی تھی۔

”میرا نام ایلین گوتھر ہے۔“ اجنبی نے فوراً ہی تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ میری بیوی مونیکا ہے۔“

مونیکا کے لہجے سے ڈومنک کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کا تعلق کینیڈا سے تھا۔ اس کی شکل و صورت اگرچہ واجبی سی تھی لیکن ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ نے اسے خاصا پرکشش بنا دیا تھا۔ ایلین گوتھر بھی بڑا ہنس مکھ واقع ہوا تھا۔ ان کی طرف سے اپنائیت کا اظہار پا کر ڈومنک بھی جلد ہی ان سے بے تکلف ہو گیا۔ اور پھر فوراً ہی ایلین گوتھر نے میزبانی کے فرائض سنبھال لیے۔ بقول اس کے تھائی لینڈ میں طویل قیام کی وجہ سے وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ یورپین باشندوں کے لیے کون سے کھانے مناسب ہو سکتے تھے۔ اس کے آرڈر پر ویٹریس نے میز پر طرح طرح کے لاتعداد کھانے سجا دیے۔ ڈومنک کو اعتراف کرنا پڑا کہ ایسے لذیذ کھانے اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں کھائے تھے۔ اور پھر ایک گھنٹے کے اندر اندر ایلین گوتھر نے اپنے مطلب کی ہر بات اس سے اگلوالی۔

”تم نے اپنے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔“ ڈومنک نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پوچھا۔ ”تم کیا کرتے ہو؟“

”میرا قیمتی پتھروں کا بزنس ہے۔“ ایلین گوتھر نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”اوہ۔“ ڈومنک چونک گیا۔ ”پھر تو اچھا خاصا کما لیتے ہو گے؟“

”اس میں شبہ نہیں کہ اس کاروبار میں کمائی کے بے شمار مواقع موجود ہیں لیکن اکیلا آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔ اسے چاروں طرف بھاگ دوڑ کرنا پڑتی ہے۔ اس طرح بہت سے چانسز ضائع ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی دوسرا ساتھی بھی ہو تو بلاشبہ لاکھوں کمائے جا سکتے ہیں۔“ ایلین نے کہتے ہوئے ویٹریس کو اشارے سے بلا کر بل لانے کی ہدایت کی۔

وہ شام بہت خوشگوار تھی۔ معطر ہوا کے جھونکوں میں موسیقی کی گنگناہٹ بڑا دلفریب تاثر دے رہی تھی۔ ایلین گوتھر، ڈومنک کو اس پُرشباب شام سے لطف اندوز ہونے کی ترغیب دے رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک ایسے نائٹ کلب سے واقف ہے جہاں پرکشش لباس میں تھائی لڑکیاں صدیوں پرانے گیت اور قدیم موسیقی پر رقص کرتی ہیں۔ اگر ڈومنک اس دلفریب منظر سے بھی لطف اندوز نہ ہو سکے تو وہ اسے ایک ایسی جگہ لے جا سکتا تھا جہاں لڑکیاں باکسنگ کرتی ہیں۔ وہاں ہر رات لڑکیوں میں باکسنگ کے مقابلے ہوتے ہیں۔ ان کے لڑنے کے انداز کو دیکھ کر بڑے بڑے شہرت یافتہ باکسروں کے نام ذہن سے نکل جاتے ہیں۔

وہ ریسٹورنٹ سے نکل کر اس طرف چل دیے جہاں ایلین گوتھر کی کرائے کی کار کھڑی تھی لیکن چند قدم چلنے کے بعد ڈومنک کو یکایک یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دماغ گھوم رہا ہو۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال کر چلنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی ٹانگوں میں جسم کا بوجھ سہارنے کی سکت نہ رہی ہو۔ آخر میں اسے صرف اتنا یاد رہا کہ ایلین گوتھر اور مونیکا نے اسے سہارا دے کر گاڑی میں ٹھونسا تھا اور گاڑی اس کے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اپنے ان نئے دوستوں کو دیکھ کر پریشان سا ہو گیا جو اس پر جھکے ہوئے تھے۔

”اب تمھاری طبیعت کیسی ہے؟“ ایلین نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

”مم... مجھے کیا ہوا تھا؟“ ڈومنک کے ہونٹوں سے کمزور سی آواز نکلی۔ وہ گزشتہ رات کے واقعات یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اسی لمحے اس کے پیٹ میں زبردست مروڑ اٹھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کی آنتوں کو گرہ دے کر کس رہا ہو۔ وہ بُری طرح تڑپ اٹھا۔

”تمھیں پیچش ہے۔“ ایلین گوتھر نے اس کے مرض کی تشخیص کر دی۔ ”اس ملک کی آب و ہوا ہی ایسی ہے۔ غالباً سفر کے دوران غیر متوازی خوراک اور ناقص پانی کی وجہ سے یہ بیماری تمھیں لگی ہو گی۔“

ایلین گوتھر، ڈومنک سے باتیں کر رہا تھا اور مونیکا پلنگ کی پٹی کے قریب بیٹھی اس کی پیشانی سہلا رہی تھی۔ اس کے نرم ہاتھ کے لطیف لمس سے ڈومنک پر عجیب سا سحر طاری ہو رہا تھا۔ ایلین گوتھر رُکے بغیر کہے جا رہا تھا۔ وہ ڈومنک کو اپنے ان تجربات سے آگاہ کر رہا تھا جو مشرق میں طویل قیام کے دوران اسے پیش آئے تھے۔ آخر میں وہ بولا۔

”تمھاری حالت ایسی نہیں کہ تم چیانگ مائی جیسے دور دراز شہر میں اکیلے رہ سکو جہاں مناسب دواؤں کا حصول بھی ممکن نہیں۔ اگر تم پسند کرو تو ہم تمھیں اپنی کار میں بنکاک لے چلتے ہیں جہاں تم ٹھیک ہونے تک ہمارے اپارٹمنٹ میں رہ سکتے ہو۔“

”تم لوگوں کے ساتھ۔“ ڈومنک الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہاں۔ ہم تمھیں مہمان کی طرح رکھیں گے اور علاج کے ساتھ ساتھ تمھاری دیکھ بھال بھی کریں گے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم مجھ پر اعتماد کرو۔ میں خود تمھارا علاج کروں گا۔“ ایلین نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

ڈومنک نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت وہ ان دونوں کا بے حد مشکور تھا جو نہ صرف ہمدردی سے پیش آ رہے تھے بلکہ اس کے صحت یاب ہونے تک اس کی دیکھ بھال اور علاج کے لیے بھی تیار تھے۔ اس نے مونیکا کی طرف دیکھا اور پھر بے بسی کے احساس سے بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

❋

اپارٹمنٹ نمبر ۵۰۲ کا دوسرا بیڈ روم ڈومنک کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔

پہلے دو ہفتے اس پر نیم مدہوشی کی سی کیفیت طاری رہی۔ اسے کچھ احساس نہیں تھا کہ وہ کن حالات سے دوچار ہے۔ جسم کی تمام تر قوتیں آہستہ آہستہ سلب ہوتی جا رہی تھیں۔ بعض اوقات اسے یوں محسوس ہوتا جیسے زندگی کے آخری لمحات گزار رہا ہو اور موت کا فرشتہ کسی بھی وقت اس کا بلاوا لے کر پہنچ سکتا تھا۔ اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ وہ یہاں تک کس طرح پہنچا تھا۔ یہاں آنے کے دوسرے ہی روز جب ایلین گوتھر نے یہ مشورہ دیا کہ اس کا پاسپورٹ اور ٹریولرز چیکس وغیرہ اس کے مکمل صحت یاب ہونے تک کسی محفوظ جگہ پر رکھ دیے جائیں تو اسے اتنا بھی یاد نہیں تھا کہ اس نے کیا جواب دیا تھا، اس پر زیادہ تر نیم مدہوشی کی سی کیفیت طاری رہتی۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ ایلین گوتھر دن میں ایک دو مرتبہ اس کے کمرے میں آتا تھا اور اپنے ہاتھ سے دوا کھلا کر چلا جاتا تھا لیکن اس کے چند ہی منٹ بعد اس کے پیٹ میں شدید اینٹھن ہونے لگتی، اس کے ساتھ ہی متلی سی محسوس ہونے لگتی اور وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبائے ابکائیاں لیتا گرتا پڑتا باتھ روم میں گھس جاتا۔

مونیکا کو وہ اپنے لیے فرشتۂ رحمت سمجھ رہا تھا۔ اسے جب بھی ہوش آتا مونیکا کو اپنے پلنگ کے قریب بیٹھے ہوئے پاتا۔ وہ ایک ماہر اور ہمدرد نرس کی طرح اس کی تیمارداری کر رہی تھی۔ ڈومنک نے کئی مرتبہ مونیکا سے درخواست کی تھی کہ کسی ڈاکٹر کو بلا لیا جائے لیکن مونیکا نے ہر مرتبہ نفی میں سر ہلا دیا تھا اور وہ پرخلوص اور ہمدردانہ لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتی کہ ایک تو ڈاکٹر بہت مہنگے ثابت ہوں گے اور دوسرے یہاں کے ڈاکٹروں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسے ایلین پر اعتماد رکھنا چاہیے۔ وہ ایسی

بیماریوں کے بارے میں ڈاکٹروں سے زیادہ جانتا ہے اور وہی اس کا علاج بہتر طور پر کر سکتا ہے۔

ایلین گوتھر یا چارلس سوبھراج، جس نے بیسیوں مختلف نام اپنا رکھے تھے، اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ وہ دن رات بنکاک کے گلی کوچوں میں گشت کرتا رہتا۔ ہیروں کی فروخت کے سلسلے میں بعض گاہکوں کو وہ فلیٹ پر بھی لے آتا۔ ایک روز مونیکا بالفاظِ دیگر میری آندرے گھر میں داخل ہوئی تو صوفے پر ایک نوجوان لڑکی کو سوتے دیکھ کر چونک سی گئی۔ وہ اطالوی تھی اور میری آندرے کے اندازے کے مطابق اس کی عمر بیس بائیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اگر وہ اپنی صحت کا خیال رکھتی تو یقیناً حسین سمجھی جاتی مگر دنیا کی آوارگی اور نشے نے اس کا حُسن غارت کر دیا تھا۔ چارلس کے بیان کے مطابق وہ اس کی گاہک تھی جو کسی قسم کے قیمتی پتھر خریدنا چاہتی تھی لیکن میری آندرے کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ چارلس کے دماغ میں ایک بار پھر عشق کے جراثیم کلبلانے لگے تھے۔ اس کی تصدیق اس طرح بھی ہو گئی کہ دوسرے گاہکوں کی طرح واپس جانے کے بجائے وہ اطالوی لڑکی وہیں ڈیرہ جمانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میری آندرے نے چند روز تو اسے برداشت کیا لیکن پھر ایک روز جبکہ چارلس گھر میں موجود نہیں تھا میری آندرے نے اس اطالوی لڑکی کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا اور شام کو جب اس نے چارلس کو اپنی... کارروائی کے بارے میں بتایا تو وہ محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔ گویا اسے میری آندرے کی اس کارروائی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

اس واقعہ کے تیسرے ہی دن... نکوشی، میری آندرے کا خون جلانے کے لیے آن دھمکی۔ اس نے میری آندرے کو مبارکباد دی کہ اس نے جس طرح اطالوی لڑکی سیمونٹیا کو گھر سے نکالا تھا وہ اس کا ایک مستحسن اقدام تھا۔ لیکن اس نے سیمونٹیا کے بارے میں جو نیا انکشاف کیا وہ میری آندرے کے لیے چونکا دینے والا تھا۔

"تمھیں شاید اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ سیمونٹیا ماں بننے والی تھی۔" نکوشی کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"ماں!" میری آندرے بدحواس سی ہو گئی۔ "کس کے بچے کی ماں ہے؟"

"یہ تو میں نہیں جانتی۔" نکوشی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن وہ تقریباً دو ماہ سے ایک گھٹیا سے ہوٹل میں رہ رہی تھی جہاں چارلس روزانہ چند گھنٹے ضرور گزارتا تھا۔ سیمونٹیا نے چارلس سے اپنی ضرورت کے لیے کچھ رقم کا مطالبہ بھی کیا تھا لیکن چارلس نے صاف انکار کر دیا کیوں کہ اس کے خیال میں یہ خطرناک کام تھا اور پولیس اس کی طرف متوجہ ہو سکتی تھی۔ لیکن بہر حال چارلس نے گزارے کے لیے اسے کچھ رقم دے دی تھی۔"

"تمھیں یہ سب کچھ کیسے پتا چلا؟" میری آندرے نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"چارلس کی کوئی بات مجھ سے پوشیدہ نہیں۔" نکوشی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "اس نے یہ ساری باتیں خود بتائی تھیں۔"

میری آندرے کا چہرہ دُھواں ہو گیا۔ اسے بہر حال، اپنے اس سوال کا جواب مل گیا تھا کہ اطالوی لڑکی سیمونٹیا سے چارلس کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ اسی رات میری آندرے نے چارلس سے اس اطالوی لڑکی کے بارے میں جرح کی تو وہ ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گیا۔ اسے خاموش پا کر... میری آندرے نے بھی بات کو آگے بڑھانا مناسب نہیں سمجھا اور اس طرح بات آئی گئی ہو گئی لیکن اس کے تقریباً دو ماہ بعد میری آندرے نے چارلس کے ذاتی کاغذات کے بکس میں اطالوی لڑکی سیمونٹیا کا پاسپورٹ دیکھا تو وہ سناٹے میں رہ گئی اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ سیمونٹیا اب کہاں ہو سکتی تھی!

❋

اوائلِ اکتوبر میں چیانگ مائی سے واپسی کے چند ہی روز بعد کانت ہاؤس کے ایک اپارٹمنٹ میں نئے کرائے دار آئے تھے۔ وہ دونوں میاں بیوی فرانسیسی تھے۔ ان دونوں کی عمریں چھبیس اور تیس کے درمیان رہی ہوں گی۔ سموئیل کا قد نسبتاً چھوٹا اور جسم بھاری بھرکم تھا۔ وہ بنکاک کے ایک فرسٹ کلاس ریسٹورنٹ میں شیف کی حیثیت سے ملازم ہو کر آیا تھا۔ جبکہ اس کی بیوی بیلے قد میں اس سے تقریباً پانچ انچ نکلتی ہوئی تھی۔ خوبصورت جسم، ملیح و صبیح چہرہ۔ اسے یقینی طور پر پیرس کی حسیناؤں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ ان کے تعلقات کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہوں گے۔

سموئیل نے یہ کام پیرس کے ایک ریسٹورنٹ میں سیکھا تھا۔ اپنے کام میں مہارت حاصل کرنے کے بعد اس نے امریکہ جانے کی کوشش کی تھی لیکن کئی ماہ تک سفارتخانے کے چکر لگانے کے بعد بھی ویزا حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو اس نے امریکہ کا خیال ہی دل سے نکال دیا اور کسی دوسرے ملک کے بارے میں سوچنے لگا۔ بالآخر اس کی نگاہِ

انتخاب بنکاک پر پڑی۔ اس کے خیال میں بنکاک میں اس کے لیے بہترین مواقع موجود تھے۔ اس کے ایک دوست نے بھی اسے بنکاک ہی جانے کا مشورہ دیا تھا اور یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ اس کے ایک دوست کی سفارش سے اسے بنکاک کے اچھے سے اچھے ریسٹورنٹ میں ملازمت مل سکتی ہے۔ بنکاک اگرچہ ان کے لیے دنیا کے آخری سرے پر تھا لیکن یہ ان کے لیے زندگی کا بہترین ایڈونچر بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

"میری امریکہ جانے کی خواہش تھی۔" ایک روز سیموئیل نے بیلے سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ خواہش تو پوری ہوتی نظر نہیں آتی، البتہ اگر ہم ایک دو سال کے لیے بنکاک چلے جائیں تو کیسا رہے گا؟"

"بنکاک!" بیلے کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ وہ سیاحت کی شوقین تھی اور اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے جہنم میں بھی جانے کو تیار تھی بشرطیکہ وہاں اس کی دلچسپی کا سامان موجود ہو۔ "لیکن یہ کون سی جگہ ہے۔ اسکا کوئی جغرافیہ، حدودِ اربعہ؟"

"یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ یہ شہر چین میں کسی جگہ واقع ہے۔" سیموئیل نے جواب دیا۔

انہوں نے فوراً ہی تیاری شروع کر دی اور اس کے چند ہی روز بعد وہ بنکاک روانہ ہو گئے۔ جہاں پہنچنے کے بعد سیموئیل کو اپنی جغرافیہ دانی کی غلطی کا احساس ہوا۔ جسے وہ چین سمجھا تھا وہ تھائی لینڈ ثابت ہوا۔ دوسرے ہی دن اس نے اپنے دوست کے اس دوست کو تلاش کرنے کی کوشش کی جس کی سفارش پر اسے کسی اچھے ہوٹل میں ملازمت مل سکتی تھی لیکن وہ شخص تو نہ مل سکا البتہ اس کا ہنر اس کے لیے سب سے بڑی سفارش ثابت ہوا اور اسے بنکاک کے سب سے اعلیٰ ریسٹورنٹ میں شیف کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ کانت ہاؤس میں اپارٹمنٹ کے حصول کو بھی وہ اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے کیونکہ پرسکون علاقہ ہونے کے علاوہ کانت ہاؤس اور اس کے قرب و جوار میں کچھ فرانسیسی بھی آباد تھے۔

سیموئیل تو اپنے کام پر چلا جاتا اور بیلے گھر کے کاموں سے نمٹ کر سوئمنگ پول پر آ جاتی۔ پول کے کنارے گھاس پر لیٹ کر سن باتھ لیتے ہوئے اس کی نظریں کانت ہاؤس کی پانچویں منزل تک کی کھڑکیوں پر بھٹکتی رہتیں ——— پانچویں منزل کی ایک کھڑکی میں اسے اکثر ایک لڑکی کا چہرہ دکھائی دیتا جو کھڑکی میں کھڑی نیچے جھانکتی رہتی یا شہر کا نظارہ کرتی رہتی۔ بیلے نے عمارت کے نگران سے دریافت کیا تو پتا چلا کہ وہ ایک جیم ڈیلر کی بیوی ہے۔ وہ ان کے بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا تھا کہ دونوں میاں بیوی ہنس مکھ، ملنسار اور خوش طبع ہیں۔ اس کے خیال میں وہ انتہائی صلح جو اور پرسکون لوگ تھے کیونکہ آج تک ان کی طرف سے کسی کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ لفٹ خراب تھی۔ سیموئیل اور بیلے اپنے فلیٹ میں جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ پشت سے آنے والی آوازیں سن کر رک گئے۔

"آہا، تم فرانسیسی ہو۔ اجنبی ملک میں اپنے کسی ہم وطن کو دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے۔" پیچھے آنے والے شخص نے سیموئیل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

اور پھر وہ سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے ہی ایک دوسرے سے متعارف ہو گئے۔ اس شخص نے اپنا نام ایلین گوتھر بتایا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی مونیکا بھی موجود تھی۔ بیلے نے اس لڑکی کو فوراً ہی پہچان لیا جسے اس نے اکثر پانچویں منزل کی کھڑکی میں کھڑے دیکھا تھا۔ وہ لوگ جلد ہی ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔

سیموئیل اور ایلین گوتھر اپنے اپنے کام کے سلسلے میں گھروں سے باہر ہوتے تو مونیکا اور بیلے زیادہ دیر تک سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھی گپیں ہانکتی رہتیں۔ بہت جلد ان دونوں میں گاڑھی چھننے لگی تھی۔

ایلین گوتھر کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ اس کا زیادہ وقت ڈوسِٹ تھانی یا اندرا جیسے عالیشان ہوٹلوں میں گزرتا جن کے شاپنگ آرکیڈز میں یورپین سیاحوں کی بھرمار رہتی۔ وہ ہر چند گھنٹے بعد سیام انٹر کانٹی نینٹل کا ایک چکر بھی لگا لیتا۔ جس قطعۂ زمین پر یہ ہوٹل تعمیر کیا گیا تھا وہ ایک شہزادی کی ملکیت تھی۔ یہاں زیادہ تر امریکی اور اطالوی سیاحوں کی آمد و رفت تھی اور ظاہر ہے ایسے ہی دولتمند سیاح چارلس کے لیے بہترین شکار ثابت ہوتے تھے۔ وہ کسی گاہک کو جواہرات دکھانے کے بہانے کبھی گھر پر بھی لے آتا۔ ایسے موقع پر میری آندرے کو چارلس کی ہدایت پر بعض مخصوص کھانے تیار کرنے پڑتے۔ بیلے کا زیادہ وقت بھی اب میری آندرے کے پاس ہی گزرتا۔ ایسے موقع پر وہ کھانا تیار کرنے اور سرو کرنے میں میری آندرے کی مدد کرتی۔ چارلس نے اس کی موجودگی پر کبھی اعتراض نہیں کیا تھا کیونکہ اس کے خیال میں اس کی خوبصورتی گاہک کو متاثر کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی تھی۔

بیلے بھی چارلس کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں

رہی تھی لیکن اس کی بعض باتیں بیلے کے لیے الجھن کا باعث بنی رہیں۔ مثال کے طور پر اس کی ہر قمیص کی جیب پر اس کے نام کے ابتدائی حروف مونوگرام کی صورت میں کڑھے ہوئے تھے لیکن ہر قمیص پر مونوگرام کے حروف مختلف تھے۔ ایک قمیص کی جیب پر اے۔ جی۔ دوسری پر سی ایس اور دیگر قمیصوں پر بھی مختلف حروف کے مونوگرام تھے جو مختلف ناموں کی علامت ظاہر کرتے۔

ایک روز جبکہ وہ سب لوگ سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھے ہلکی شراب کی چسکیاں لے رہے تھے تو بیلے اس معاملے میں پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"یہ میرا ٹریڈ سیکریٹ ہے۔" چارلس نے اس لہجے میں جواب دیا کہ بیلے اس سلسلے میں مزید کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی۔

چارلس کی بعض اور باتیں بیلے کے لیے الجھن کا باعث بنی ہوئی تھیں۔ جب وہ کھانا کھاتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے اس سے پہلے اسے کبھی کچھ کھانے کو نہ ملا ہو۔ وہ ندیدوں کی طرح ہر چیز حلق میں ٹھونستا چلا جاتا۔ اس طرح سوپ یا شوربے والی کوئی چیز کھاتے ہوئے قطرے اس کے منہ سے ٹپکتے رہتے جس سے اس کی قمیص کا ستیاناس ہو جاتا مگر اسے ذرا بھی پروانہ ہوتی۔ گفتگو کے دوران وہ اپنے مخاطب کو زبان کھولنے کا موقع دیے بغیر مسلسل بولتا رہتا جیسے ٹیپ ریکارڈر چل رہا ہو۔

ایک رات کھانے کے دوران چارلس اسی طرح مسلسل بول رہا تھا۔ سیموئیل، بیلے یا میری آندرے کو ہونٹوں کو جنبش دینے کا موقع تک نہیں مل سکا تھا۔ چارلس انھیں بتا رہا تھا کہ وہ ایشیا کے بڑے بڑے شہروں میں جیولری کی سلسلہ وار دکانیں کھولنے والا ہے جس کا ہیڈ کوارٹر بنکاک میں ہو گا۔ اس نے اپنے اس پراجیکٹ کو گولڈ فنگر کا نام دیا تھا۔

"کیا تمہارا شوہر تمہیں بھی کبھی بولنے کا موقع دیتا ہے یا گفتگو کا شعبہ اسی نے سنبھال رکھا ہے۔" دوسرے دن بیلے نے میری آندرے سے دریافت کیا۔

میری آندرے کندھے اچکا کر رہ گئی۔ چند لمحے ہونٹ چباتی رہی پھر مدھم لہجے میں بولی۔ "وہ جو کچھ بھی کہتا ہے اس میں کم از کم پچاس فیصد مبالغہ آرائی ہوتی ہے۔"

لیکن سیموئیل کے خیال میں چارلس کی باتوں میں مبالغہ آرائی کا عنصر نوّے فی صد سے بھی زیادہ تھا۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں اس کی طرف سے کسی حد تک مشکوک ہو گیا تھا۔ کیونکہ مختلف اوقات میں اس نے اپنے بارے میں متضاد باتیں بتائی تھیں۔

ایک موقعے پر اس نے بتایا تھا کہ وہ ساربون یونیورسٹی سے نفسیات کی ڈگری حاصل کر چکا ہے۔ دوسری ملاقات میں اس نے قانون کی ڈگری کا ذکر کیا تھا اور ایک موقعے پر کسی یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرنے کی بات بھی کی تھی۔

"ممکن ہے اس نے واقعی یہ تین ڈگریاں حاصل کی ہوں۔" بیلے نے اپنے شوہر کے خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔

"وہ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹا ہے۔" سیموئیل نے کہتے ہوئے بات ختم کر دی۔

مونیکا کے بارے میں ایک بات بہرحال طے شدہ تھی۔ ان دونوں کے خیال میں مونیکا کا شمار ان عورتوں میں ہوتا تھا جو ہر حالت میں شوہر کی اطاعت گزار اور وفا شعار ہوتی ہیں۔ وہ شوہر کی خوشنودی کے لیے اپنی خواہشات تک کچل دیتی ہیں۔ مونیکا بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ جب ایلین گوتھر کافی پی رہا ہوتا تو وہ ایک مستعد ویٹرس کی طرح ہاتھ باندھے اس کے قریب کھڑی رہتی اور پیالی ختم ہوتے ہی اسے دوبارہ بھر دیتی۔ کھانے کے دوران بھی ایلین گوتھر کی تنقید جاری رہتی۔ مونیکا اپنی بساط کے مطابق اچھے سے اچھا کھانا پکانے کی کوشش کرتی لیکن ایلین کوئی نہ کوئی نقص تلاش کر ہی لیتا۔ اس تنقید سے بچنے کے لیے مونیکا کھانے کی تیاری کے سلسلے میں اب بیلے سے بھی مدد لینے لگی تھی۔

بیلے نے یہ بات بھی نوٹ کی تھی کہ ایلین اپنی بیوی کے مقابلے میں کتے اور بندر کو زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ اس کی موجودگی میں مونیکا سہمی سہمی سی رہتی اور جب ایلین کسی گاہک کو لے آتا تو مونیکا ادنیٰ کنیز کی طرح ایک کونے میں ہاتھ باندھے کھڑی رہتی۔ اس نے کبھی ان کی گفتگو میں مداخلت کی کوشش نہیں کی تھی۔

ڈومنک اسی خواب گاہ تک محدود تھا جہاں اسے پہلے روز رکھا گیا تھا۔ اس کی کمزوری میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایلین اب دن میں ایک آدھ مرتبہ ہی اس کمرے میں آتا، اور ڈومنک سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اسے یقین دلاتا کہ جیسے ہی وہ تندرست ہو گا اسے جواہرات کے بزنس میں شریک کر لیا جائے گا۔

بیلے کی آمدورفت بڑھ گئی تھی۔ وہ مونیکا سے اس حد تک بے تکلف ہو چکی تھی کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی زندگی کے ایسے حالات سے بھی آگاہ کرنے لگیں، جن کا تذکرہ کسی محرم راز کے سامنے ہی کیا جا سکتا تھا۔ مونیکا اب قدرے کھل رہی تھی۔ اس نے بیلے کو بتایا کہ وہ کینیڈا میں بڑی اکتا دینے والی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اگر وہ ایلین کی دعوت قبول نہ کرتی تو شاید اس وقت اپنے قصبے کے اسپتال میں بیٹھی مریضوں کے چارٹ دیکھ رہی ہوتی۔

مونیکا اور ایلین کی ازدواجی زندگی کے بارے میں بیلے کے دل میں اب کچھ شبہات سر ابھارنے لگے۔ اسے یقین سا ہو چلا تھا کہ یہ دونوں میاں بیوی نہیں ہیں۔ اس نے جب بھی اس موضوع پر بات کی، مونیکا نے بڑی خوبصورتی سے اسے ٹال دیا۔ بیلے نے کبھی اصرار نہیں کیا لیکن یہ انکشاف اس کے لیے حیرت انگیز ثابت ہوا کہ میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے ہوئے بھی طویل عرصے سے اجنبیوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ ایک روز سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھے ہوئے بیلے نے جب اس سلسلے میں دریافت کر ہی لیا تو مونیکا نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"ایلین اپنے بزنس میں اتنا مصروف ہے کہ کسی اور بات کے لیے اسے فرصت ہی نہیں ملتی۔ ہم تقریباً دو مہینے سے ایک دوسرے سے دُور ہیں۔"

اس رات سیموئیل جب گھر آیا تو بیلے اسے مونیکا کے ان معاملات کے بارے میں بتائے بغیر نہ رہ سکی۔

"میں اس معاملے میں مونیکا کو قصوروار نہیں سمجھتا۔" سیموئیل نے جواب دیا۔ "وہ بیچاری ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے اپنے محبوب سے ملنے آئی تھی لیکن یہاں آ کر اس خوفناک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ محبوب کو اس سے کوئی دل چسپی نہیں... وہ جانوروں کو اس سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ مونیکا کی حیثیت ایک زرخرید کنیز سے زیادہ نہیں۔ ایلین محض اپنے مہمانوں کو متاثر کرنے کے لیے اسے اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہے۔"

بیلے کے خیال میں سیموئیل کا یہ تجزیہ سراسر غلط تھا۔ اگر ایلین واقعی ایسا سنگدل ہوتا تو ڈومنک کا اتنا خیال کیوں رکھتا جو اس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔

"میرا خیال ہے یہ بھی ایک ناٹک ہے۔" سیموئیل نے جواب دیا۔ "ایک صحت مند اور نوجوان آدمی کے لیے پیچش کی بیماری اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔ علاج نہ بھی ہو تو محض پرہیز سے یہ تکلیف دو چار روز میں ختم ہو جاتی ہے چہ جائیکہ وہ کئی ہفتوں سے بیمار پڑا ہے اور مزے کی بات یہ کہ اس کی بیماری مزید طول کھینچ رہی ہے۔ کمزوری اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ سہارے کے بغیر وہ چل پھر بھی نہیں سکتا۔ مجھے حیرت ہے کہ اس نے اب تک کسی ڈاکٹر سے رجوع کیوں نہیں کیا!"

"میں نے اس سلسلے میں مونیکا سے بات کی تھی۔" بیلے نے بتایا۔ "اس کا کہنا ہے کہ ایلین خود اس کا علاج کر رہا ہے۔ وہ ایسی بیماریوں کے سلسلے میں ڈاکٹروں سے زیادہ جانتا ہے۔ اس کے علاوہ ایلین اب تک اس پر اچھی خاصی رقم خرچ کر چکا ہے اور سمجھتا ہے کہ ڈومنک تندرست ہونے کے بعد اس کے لیے کام کر کے اس کا حساب چکا سکتا ہے۔ اگر ڈومنک اس کے گھر سے رخصت ہونا چاہے تو ایلین کے مطابق اسے بیس ڈالر یومیہ کے حساب سے اب تک کے اخراجات ادا کرنے ہوں گے۔"

"میں نے غلط نہیں کہا تھا۔" سیموئیل بولا۔ "ایلین کی انسانی ہمدردی اس ایک مثال سے ظاہر ہو جاتی ہے۔"

"لیکن میرا خیال ہے اسپتال کے مقابلے میں یہ خرچ بہت کم ہے۔" بیلے نے گویا ایلین کی وکالت کی۔

"اسپتال میں رہتے ہوئے وہ بیماری سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔" سیموئیل نے جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ ایلین کسی خاص وجہ سے اسے اپنے گھر میں رکھے ہوئے ہے۔ میرا خیال ہے ایلین چاہتا ہے کہ کچھ لوگ اس کے اردگرد جمع رہیں اور ہر معاملے میں اس سے رجوع کریں۔ اسے تم اس کی فطرت کہہ سکتی ہو۔"

بیلے نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس طرح یہ گفتگو یہیں ختم ہو گئی۔

جس روز ایلین کو بڑے ہوٹلوں میں کوئی کامیابی نہ ہوتی وہ ہوٹل ملائشیا جیسے نچلے درجے کے ہوٹلوں کا رُخ کرتا۔ ملائشیا ہوٹل اتنا اہم ہرگز نہیں تھا کہ کسی گائیڈ بک میں اس کا حوالہ موجود ہوتا۔ صرف وہی غیر ملکی سیاح اس طرف کا رُخ کرتے جن کا مختصر سا سامان ان کے کندھوں پہ لدا ہوتا اور ان کے پاس موجود تھوڑی بہت رقم ایسی جگہ چھپا کر رکھی جاتی کہ جیب کتروں کی انگلیاں وہاں تک نہ پہنچ سکیں۔ سستا ہونے کی وجہ سے ملائشیا ہوٹل کا نام ایشیا اور یورپ کے درمیان سفر کرنے والے سیاحوں میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔ نچلے درجے کے سیاح بنکاک پہنچتے ہی سب سے پہلے اس ہوٹل کا راستہ دریافت کرتے۔ اگر دوسرے ملک میں رہنے والا کوئی شخص خط لکھ کر ہوٹل کا بروشر طلب کرتا تو اسے مایوسی نہ ہوتی۔ بروشر دیکھ کر اندازہ ہوتا کہ یہاں کے اخراجات تو بہت کم ہیں لیکن مہمانوں کو وہی سہولتیں حاصل ہوں گی جو ہلٹن یا انٹرکانٹینینٹل جیسے کسی ہوٹل میں حاصل ہو سکتی ہیں لیکن متعلقہ شخص جب بنکاک پہنچ کر ملائشیا ہوٹل میں داخل ہوتا تو اسے بہت مایوسی ہوتی۔ یہاں قدیم زمانے کی کسی سرائے کا منظر نظر آتا۔ برآمدے میں لاتعداد ہپی قسم کی لڑکیاں اور لڑکے براجمان نظر آتے۔ ان کے جسموں پر مختلف رنگوں کے ملبوسات سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہ ہوتا کہ وہ ایران، افغانستان، پاکستان اور ہندوستان سے ہوتے ہوتے آئے تھے۔ ان ممالک کی کوئی نہ کوئی سوغات کسی نہ کسی صورت میں ان کے پاس نظر آ ہی جاتی۔

یہ اکتوبر ۱۹۷۵ء کے وسط کی بات ہے۔ اسی ملاقشیا ہوٹل میں گھومتے ہوئے چارلس نے دو فرانسیسی نوجوانوں کو اپنے جال میں پھنسا ہی لیا۔ وہ دونوں فرانسیسی پولیس میں خدمات انجام دے چکے تھے اور کسی کی عمر بھی بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ ان میں سے ایک جس کا نام یانک تھا، پستہ قامت اور دوسرا جیکس دبلا پتلا اور دراز قامت کا مالک تھا۔ وہ تقریباً ایک سال سے دنیا کی آوارہ گردی کر رہے تھے۔ کئی ممالک سے گزرے تھے اور بھانت بھانت کے لوگوں سے پالا پڑا تھا لیکن اب تک انھوں نے اپنے آپ کو بے راہ روی اور منشیات سے محفوظ ہی رکھا تھا۔ وہ اپنے دامن کو اسی طرح آلودگی سے بچائے ہوئے وطن لوٹنا چاہتے تھے۔

چارلس نے آدھے گھنٹے کے اندر اندر ان سے مطلوبہ معلومات حاصل کر لیں۔ اس کے لیے دو باتیں اہم تھیں۔ پہلی تو یہ کہ وہ خانساماں یا ویٹر کی حیثیت سے کوئی ملازمت حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن ورک پرمٹ نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے اور دوسری اہم بات یہ تھی کہ وہ چند روز کے لیے پتایا جانا چاہتے تھے تاکہ دنیا کے اس خوبصورت ترین ساحل کی تفریح سے لطف اندوز ہو سکیں۔

"پتایا میں تمھیں نوکری مل سکتی ہے۔" چارلس نے کہا۔ "وہاں لاتعداد ایسے ہوٹل موجود ہیں جہاں ورک پرمٹ کے بغیر بھی کام حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ہوٹل کے بزنس سے متعلق میرے بھی چند اہم لوگوں سے بہت قریبی تعلقات ہیں۔ اگر تم پسند کرو تو میں تمھاری مدد کر سکتا ہوں۔"

چارلس سے اس ملاقات کو تائید غیبی سمجھ کر ان دونوں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ چارلس اپنی چکنی چپڑی باتوں سے انھیں پوری طرح شیشے میں اُتار چکا تھا۔ وہ اس کی ہر بات کو آمنّا و صدّقنا کہتے ہوئے بے چون و چرا عمل کرنے لگے۔ چارلس انھیں ہوٹل سے گھر لے آیا۔ جہاں رات مستقبل کے پروگرام بناتے ہوئے گزری اور دوسرے دن صبح سویرے ہی وہ چارلس کی کرائے کی ٹویوٹا کار میں پتایا کی طرف روانہ ہو گئے۔ میری آندرے کے علاوہ اس کا پالتو کتّا فرنیکی، اندر پنولین اور بیمار ڈومنک بھی اس سفر میں ان کے ساتھ شامل تھے۔

سفر خاصا خوشگوار ثابت ہو رہا تھا۔ بات بات پر قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ چارلس خطرناک پہاڑی سڑک پر ڈرائیو کرتے ہوئے بڑی مہارت کا ثبوت دے رہا تھا۔ پہاڑی راستہ ختم ہوتے ہی میدانی علاقہ شروع ہو گیا۔ یہاں سڑک

اگرچہ خاصی کشادہ تھی لیکن مال بردار ٹرکوں کی آمد و رفت زیادہ ہونے کے باعث بہت محتاط ڈرائیونگ کرنی پڑ رہی تھی۔ ٹرک ڈرائیور اپنے آپ کو جہاز کا پائلٹ سمجھ کر ڈرائیونگ کر رہے تھے۔

دونوں فرانسیسی نوجوان ایک بات دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ہر ٹرک کا ڈرائیور اسٹیرنگ والے کونے میں دبکا بیٹھا تھا۔ جب کہ باقی پوری سیٹ خالی تھی۔ تھائی لینڈ کے ڈرائیوروں کا عقیدہ ہے کہ مہاتما بدھ ان کے ہمسفر رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ ساتھ والی سیٹ بدھ کے لیے ہمیشہ خالی رکھتے ہیں۔ بعض ڈرائیور اس خالی سیٹ پر آرام دہ خوب صورت کشن بھی سجا لیتے ہیں تاکہ ان کے بدھ کو زیادہ سے زیادہ آرام ملے۔ بسوں اور ٹرک ڈرائیوروں کی بے پروائی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا تھا کہ وہ ہمیشہ سڑک کے وسط میں چلتے، سامنے سے آنے والی گاڑی کو اپنا بچاؤ خود ہی کرنا پڑتا۔ سڑک پر جا بجا ٹوٹی پھوٹی گاڑیاں اور مویشیوں اور دیگر جانوروں کی سڑتی ہوئی لاشیں ان کی غفلت کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔

وہ لوگ کسی حادثے سے دوچار ہوئے بغیر پتایا پہنچ گئے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ایلین گوتھر ساحل کے قریب ایک چھوٹا سا بنگلا کرائے پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد جیکس اور یانک تو کام کی تلاش میں نکل گئے اور میری آندرے بیراکی کا مختصر سا لباس پہن کر ساحل کی طرف چل پڑی۔ اس کا کتا فرنیکی بھی اس کے ہمراہ تھا، جب کہ ڈومنک ایک کمرے میں بستر پر لیٹا رہا۔ کمزوری کے باعث اس سفر نے اسے بُری طرح تھکا دیا تھا۔ وہ کچھ دیر سونا چاہتا تھا لیکن نپولین نے بستر پر اُچھل کود سے اسے مسلسل پریشان کیے رکھا۔

اس رات انھوں نے کھانا جرمن ریسٹورنٹ میں کھایا ... کھانے کے بعد وہ ساحل کے ساتھ ساتھ سیر کو نکل گئے۔ چاندنی میں ساحل کا منظر بڑا دلفریب تھا۔ رومان زدہ جوڑے ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کہیں جھاڑیوں سے سرگوشیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جس سے وہاں کی صورتحال کا اندازہ لگانا زیادہ دُشوار نہیں تھا۔ آس پاس کے درختوں پر بندروں نے الگ قیامت مچا رکھی تھی۔ وہ کیلے توڑ توڑ کر قریب سے گزرنے والوں پر پھینکتے اور اس طرح شور مچاتے جیسے یہاں ان لوگوں کی آمد ان ... کے لیے ناگوار ثابت ہو رہی ہو۔

وہ لوگ بُری طرح تھک چکے تھے لیکن چارلس کا خیال تھا کہ یہ سہانی رات گھر کی چار دیواری میں مقید ہو کر برباد نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس نے ایک ڈسکو کلب چلنے کی تجویز پیش کی جسے طوعاً و کرہاً منظور کر لیا گیا۔ ڈومنک بھی کئی روز بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوا تھا۔ وہ بھی اپنے آپ کو ان کے ساتھ گھسیٹتا رہا۔

ڈسکو کلب میں ایک عجیب طوفانِ بدتمیزی برپا تھا۔ تیز موسیقی پر وحشیانہ رقص ہو رہا تھا۔ جیکس، یانک اور میری آندرے بھی رقص میں شامل ہو گئے۔ جب وہ دوبارہ اپنی سیٹوں پر آ کر بیٹھے تو چارلس ٹیلی فون کا بہانہ کر کے اُٹھ گیا اور اس کی واپسی آدھے گھنٹے سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔

آدھی رات کے قریب وہ بنگلے پر واپس پہنچے۔ چارلس تو میری آندرے کو لے کر فوراً ہی اپنے کمرے میں گھس گیا تھا لیکن جیکس اور یانک اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی بُری طرح اچھل پڑے۔ ان کی عدم موجودگی میں غالباً کوئی چور بنگلے میں گھس آیا تھا۔ ان کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ ان کے پاسپورٹ، ٹریولرز چیک اور دیگر قیمتی چیزیں غائب تھیں۔ ان کا شور سُن کر چارلس وہیں پہنچ گیا۔ اس ہنگامہ آرائی پر پہلے تو اس نے برہمی کا اظہار کیا لیکن جب صورتِ حال کا علم ہوا تو ہمدردی جتانے لگا۔ چارلس نے انھیں تسلی دی کہ بنکاک میں فرانسیسی سفارت خانے سے نئے پاسپورٹ حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس میں اگرچہ چند روز لگیں گے لیکن اس دوران وہ اس کے گھر رہ سکتے ہیں جہاں انھیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔

جیکس اور یانک کے لیے اس تجویز پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ پتایا میں مزید قیام بھی اب ممکن نہیں رہا تھا اور وہ لوگ دوسرے ہی روز بنکاک واپس پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر تنگیٔ داماں کا احساس ہوا۔ فلیٹ مختصر سا تھا اور ان کی تعداد بڑھ گئی تھی مگر چارلس نے چٹکی بجاتے میں اس مسئلے کا حل بھی سوچ لیا اور ملحق فلیٹ نمبر ۵۰۴ جو کچھ عرصے سے خالی پڑا تھا کرائے پر حاصل کر لیا اور جیکس اور یانک کے ساتھ ڈومنک کو بھی اس فلیٹ میں منتقل کر دیا گیا۔

اس رات جب سب لوگ چارلس کے لیونگ روم میں جمع تھے تو چارلس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ وہ باری باری ان سب کی طرف دیکھ رہا تھا اور بات بات پر قہقہے لگا رہا تھا۔ بچپن میں ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت سے محروم رہنے والا یہ شخص جوانی کی حدود میں قدم رکھنے تک بے پناہ محرومیوں کا شکار رہا تھا۔ وہ پیار اور محبّت کو ترستا رہا تھا۔ پھر جوان ہوا تو ایک محبت کرنے والی بیوی اور دو چار بچّوں کی خواہش شدت اختیار کرنے لگی لیکن اس معاملے میں بھی اسے مایوسی و محرومی کا شکار ہونا پڑا اور اب اکتیس سال کی عمر میں چارلس سوبھراج اپنے آپ کو ایک ایسے خاندان کا سربراہ تصوّر کر رہا تھا جس کا ہر فرد اس کی نظرِ کرم کا محتاج تھا اور یہ عجیب سا احساس ہی اس پر سرخوشی سی طاری کر رہا تھا۔

٭ "ہانگ کانگ میں چند روزہ قیام انتہائی دل چسپ اور پُرلطف ثابت ہوا۔"

یہ الفاظ جینفر نے سیٹل میں اپنی ایک دوست کو خط میں لکھے تھے "ایک چھوٹے سے جزیرے پر واقع بدھ خانقاہ میں جو روحانی سکون ملا، اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ خانقاہ میں دو دن پلک جھپکنے کی دیر میں گزر گئے۔ جزیرے کے ریسٹورنٹ میں لذیذ کھانے کھانے کے بعد محسوس ہوا کہ میں اب تک کھانے کے حقیقی ذائقوں سے محروم رہی ہوں۔ اب میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ میرا دوبارہ مشرق میں آنے کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ اب میں کھٹمنڈو روانہ ہونے والی ہوں اور غالباً ایک دن کے لیے بنکاک میں بھی قیام کروں گی۔ اگر موقع ملا تو دوبارہ ہانگ کانگ ضرور آؤں گی۔"

جینفر بکنگ کے لیے ایئرلائن کے دفتر پہنچی تو اس نے کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی ریزرویشن کلرک سے دریافت کیا کہ وہ کھٹمنڈو جاتے ہوئے اسی ٹکٹ پر ایک دن بنکاک میں قیام کر سکتی ہے یا نہیں؟

"بنکاک میں بدھ کی ایک بہت بڑی خانقاہ ہے اور میں چند گھنٹوں کے لیے وہاں رُکنا چاہتی ہوں۔ اگر اس کے لیے مجھے ٹکٹ پر کچھ اضافی رقم بھی خرچ کرنا پڑے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔" جینفر نے بکنگ کلرک کی طرف دیکھتے ہوئے ملتجی لہجے میں کہا۔

بکنگ کلرک نے اس کی فلائٹ بک کا جائزہ لیا۔ پھر مسکراتے ہوئے بتایا کہ وہ فاضل رقم خرچ کیے بغیر اس ٹکٹ پر چند روز کے لیے بنکاک میں قیام کر سکتی ہے۔ یہ سنتے ہی جینفر کی آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ اس کی دلی مراد بھر آئی تھی۔

ہانگ کانگ سے بنکاک تک چار گھنٹے کے ہوائی سفر کے دوران جینفر بدھ تعلیمات پر مبنی کتاب "کرم" کا مطالعہ کرتی رہی۔ بدھ فلسفے کے بارے میں وہ پہلے بھی پڑھ چکی تھی لیکن اس وقت چونکہ اسے نفس کشی اور نروان جیسی چیزوں سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی، اس لیے یہ فلسفہ اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا لیکن اب چونکہ وہ روحانی سکون اور نروان کی تلاش میں جا رہی تھی۔ وہ یہی رائے لے کر آئی تھی کہ باقی زندگی کھٹمنڈو کی کسی بدھ خانقاہ میں گزار دے گی۔ اس لیے سرخ جلد والی اس کتاب کے مطالعہ سے اس پر نئے نئے اسرار کھل رہے تھے۔ یہ کتاب دراصل سیٹل سے روانہ ہونے سے ایک روز پہلے اس کی دوستوں نے اسے تحفے کے طور پر دی تھی جس پر اس کا نام بھی لکھا ہوا تھا اور جینفر اس کتاب کو اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ کیونکہ یہاں کی خانقاہ

کا پہلا اصول یہی تھا کہ نروان کے حصول کے سلسلے میں یہاں داخل ہونے والوں کو اپنی ہر چیز سے دست بردار ہونا پڑتا تھا اور ایک خاص مدت کے بعد تو ان کا نام بھی بدل دیا جاتا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنا اصل نام بھی بھول جاتے تھے، لیکن جینفر کا خیال تھا کہ وہ ایسی ایک آدھ چیز اپنے پاس ضرور رکھے گی جو اسے ماضی کی یاد دلاتی رہے، یہ اگرچہ گناہ تھا لیکن اسے یقین تھا کہ یہ چھوٹا سا گناہ اس کے ضمیر پہ بوجھ ثابت نہیں ہوگا۔

*

اینا بیلا کے لیے یورپ کا یہ سفر بڑا تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔ اسے قدم قدم پر گھر کی یاد ستا رہی تھی۔ فرانس، اٹلی اور یونان جاتے ہوئے اس نے اپنے پرانے دوستوں سے تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ جان کر اسے سخت مایوسی ہوئی کہ وہ لوگ اس امریکی لڑکی کو قطعی فراموش کر چکے تھے جو تقریباً دس سال پہلے ان کے پاس رہ گئی تھی۔

اینا بیلا اب تیس سال کی ہو چکی تھی۔ پہلی مرتبہ جب وہ یورپ آئی تھی تو انیس بیس سال کی بھرپور دوشیزہ تھی۔ اس وقت اسے ہر جگہ خوش آمدید کہا جاتا تھا۔ ہر شخص اس کی قربت کا خواہاں نظر آتا تھا لیکن اب دس برس گزرنے کے بعد جبکہ زندگی نے اس کے چہرے پر سنگِ مرمر کی طرح وقت کے نشانات ثبت کر دیے تھے اور اب وہی لوگ اگر اسے پہچان بھی لیتے تو چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد آگے بڑھ جاتے۔ اس صورتِ حال نے اُسے سخت مایوس کیا تھا، لیکن اُس نے اپنا سفر جاری رکھا۔ افغانستان سے اس نے اپنی والدہ کو جو خط لکھا، اس میں ایک بڑی دلچسپ بات شامل تھی۔

"کابل کا ایک دولتمند تاجر مجھ سے شادی کا خواہشمند ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میری قیمت کم سے کم تیس اونٹ ہو سکتی ہے۔"

بیلا کا اشارہ غالباً افغانستان کی اس رسم کی طرف تھا جسے شادی بیاہ کے معاملے میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ولور کی یہ رسم صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ لڑکی کی ایک قیمت مقرر کر دی جاتی ہے اور لڑکے کو یہ قیمت شادی سے پہلے ادا کرنا پڑتی ہے۔

پاکستان سے گزرتے ہوئے اینا بیلا کو بعض چھوٹے چھوٹے مسائل کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس سلسلے میں اسے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ وہ ہر ملک سے اپنے والدین کو خط لکھ کر اپنی خیریت سے مطلع کرتی رہتی۔ کراچی سے اس نے ٹیلیفون پر اپنی ماں سے بات کی اور پھر وہ براہ لاہور سے ہوتی ہوئی ہندوستان میں داخل ہو گئی۔ ہندوستان کے بارے میں بھی اس کے تاثرات دوسرے ملکوں سے مختلف نہیں تھے لیکن بمبئی کو بہرحال اس نے ہندوستان کے دوسرے شہروں سے قدرے مختلف پایا۔

بمبئی میں اگرچہ دولت کی فراوانی تھی لیکن غربت و افلاس کی جو تصویر یہاں دیکھنے میں آئی، اس نے اینا بیلا کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ اس شہر کے کم از کم دو لاکھ افراد اپنی راتیں کھلے آسمان تلے بسر کرنے پر مجبور تھے۔ انھیں نہ تو پیٹ بھر روٹی میسّر تھی اور نہ ہی وہ زندگی کی ان بنیادی سہولتوں سے آشنا تھے جو زندہ رہنے کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔

سنجے کا مکان تلاش کرنے میں اینا بیلا کو زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اُونچی فصیل والی یہ وسیع و عریض اور عالیشان کوٹھی دیکھ کر وہ ششدر سی رہ گئی۔

گیٹ پر ایک مسلح محافظ چوبیس گھنٹے موجود رہتا تھا۔ سنجے کی ماں مسز سبیتا نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ وہ ایک بھاری بھرکم اور پُروقار عورت تھی۔ پورے گھر پر اس کا رعب طاری تھا۔ چابیوں کا ایک گچھا اس کی ساری کے بیلٹ میں لٹکا رہتا۔ اس کی اجازت کے بغیر اس گھر کی حدود میں کوئی پتا بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ مسز سبیتا کو خوشی تھی کہ اینا بیلا طویل ترین سفر کر کے اس کے بیٹے سنجے کی تعزیت کے لیے یہاں آئی تھی۔ وہ کیلی فورنیا میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہوائی حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کا سلوک دیکھ کر اینا بیلا اپنے آپ کو کسی ملک کی شہزادی سمجھنے لگی۔ ہر شخص اس کے سامنے بچھا جا رہا تھا۔ مسز سبیتا نے تو حد ہی کر دی تھی۔ اس نے اگرچہ فوراً ہی اینا بیلا کو منہ بولی بیٹی تسلیم کر لیا تھا لیکن وہ کسی دیوی کی طرح اس کی پرستش کرنے لگی تھی۔ اس نے اینا بیلا کی ماں سیسل کو بھی اس بارے میں ایک تفصیلی خط لکھا۔

"اینا بیلا کی آمد سے ہمارے گھر میں بہار سی آ گئی ہے مُرجھائی ہوئی کلیاں کھل اٹھی ہیں۔ وہ ہمارے لیے فرشتۂ رحمت ثابت ہوئی ہے اس کے دم سے گھر کے ہر فرد کے چہرے پر وہ رونق عود کر آئی ہے جو سنجے کی موت کے بعد رخصت ہو گئی تھی۔ اینا بیلا ہمارے لیے ایک ایسا پیغام ثابت ہوئی ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ گھر کا ہر فرد دیوی کی طرح اس کی پرستش کرتا ہے۔

میں اپنے بیٹے کے سوگ کے باعث صرف سفید ساریاں پہنتی ہوں۔ یوں بھی ہندوستان میں بیوہ عورتیں رنگین لباس استعمال نہیں کرتیں۔ میں نے اپنی تمام رنگین ساریاں اینا بیلا کو دے دی ہیں۔ ساری میں اس کا حسن نکھر آتا ہے۔ میری بیٹی ششی اس سے بہت متاثر ہے۔ ششی کا زیادہ وقت اینا بیلا کے ساتھ گزرتا ہے۔

اینا بیلا اکثر مجھ سے ہمارے مذہبی عقائد اور زندگی کے فلسفے کے بارے میں دریافت کرتی ہے۔ بالآخر طویل مباحثوں کے بعد ہم اس بات پر متفق ہو جاتے ہیں کہ انسان کے عقائد خواہ کچھ بھی ہوں، وہ ایک خدا پر ضرور یقین رکھتا ہے۔

اینا بیلا نے بتایا تھا کہ افغانستان میں سفر کے دوران کچھ دشواریاں پیش آئی تھیں۔ میں نے اسے مشورہ دیا ہے کہ وہ کسی بھی ملک میں تنہا سفر نہ کرے۔ وہ بڑی ذہین لڑکی ہے اور اسے اپنے آپ پر پورا اعتماد ہے۔ اسے یقین ہے کہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہاں رہتے ہوئے اس نے ہندی اور گجراتی زبانیں بھی سیکھنا شروع کر دی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب وہ ہندوستان سے رخصت ہوگی تو ان زبانوں پر پوری مہارت حاصل کر چکی ہوگی۔"

اینا بیلا کا شمار ان لوگوں میں کیا جا سکتا تھا جو کسی پر بوجھ بننا پسند نہیں کرتے۔ وہ کیلی فورنیا میں بھی اسپتال میں کام کرتی رہی تھی۔ یہاں بھی اس نے اس خواہش کا اظہار کیا تو اسے فوراً ہی بمبئی کے سب سے اچھے اسپتال میں ملازمت دلا دی گئی۔ وہ انسانیت کی خدمت کا جذبہ لے کر اسپتال کے دروازے میں داخل ہوئی تھی لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ اتنا بڑا اسپتال ہونے کے باوجود یہاں نہ تو جدید ترین آلات تھے اور نہ ہی مریضوں کو وہ سہولتیں حاصل تھیں۔ ڈاکٹروں اور اسٹاف کا رویّہ بھی مریضوں کے ساتھ مناسب نہیں تھا۔ اینا بیلا کے خیال میں دنیا کے تمام ڈاکٹر ایک ہی جیسے تھے۔ اس لائن میں آنے سے پہلے وہ یہ دعوے تو کرتے ہیں کہ دُکھی انسانیت کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیں گے لیکن اس شعبے میں عملی زندگی کا آغاز ہوتے ہی وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

ایک روز اینا بیلا ایک ہندو ڈاکٹر کے ساتھ اسپتال کے مختلف شعبوں کا راؤنڈ لگاتے ہوئے جیسے ہی ایمرجنسی روم کے سامنے پہنچی، ایک ادھیڑ عمر عورت نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا دامن تھام لیا۔ اس لاغر اور فاقہ زدہ عورت کی صحیح عمر کا اندازہ لگانا کم از کم اینا بیلا کے خیال میں بہت مشکل تھا۔ وہ تیس سال کی بھی ہو سکتی تھی اور ستّر سال کی بھی۔ وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے رو رو کر فریاد کر رہی تھی۔

اینا بیلا نے گھوم کر دیکھا۔ ہڈیوں کے ڈھانچے کی طرح ایک بوڑھا شخص دیوار کے قریب راہداری کے فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ڈاکٹر، کمپاؤنڈر اور نرسوں کی آمد و رفت جاری تھی لیکن کسی نے اس بوڑھے شخص کی طرف توجہ نہیں دی۔ اینا بیلا کا دامن تھامتے ہوئے اس لاغر عورت کا خیال تھا کہ شاید یہ امریکی لیڈی ڈاکٹر اس کی فریاد سُن لے لیکن اینا بیلا کے ساتھ ہندو ڈاکٹر نے اس عورت کو بُری طرح جھڑک دیا اور اینا بیلا کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گیا۔

او۔ پی۔ ڈی کا منظر عبرت انگیز تھا۔ ہال میں بیسیوں لوگ کیڑوں مکوڑوں کی طرح کلبلاتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہر ایک کے چہرے پر مردنی طاری تھی۔ فاقوں اور بیماری نے انھیں نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔

"وہ عورت کیا کہہ رہی تھی؟" اینا بیلا نے اس ناتواں عورت کے بارے میں دریافت کیا جو ایمرجنسی روم کے سامنے اس کا دامن تھام کر فرش پر پڑے ہوئے بے حس و حرکت بوڑھے کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اوہ وہ!" ہندو ڈاکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔ "وہ اس کا باپ تھا جو مر چکا ہے لیکن وہ کسی طرح بھی اس کی موت کا یقین کرنے کو تیار نہیں۔ اس کے دوسرے رشتہ داروں کو اطلاع دے دی گئی ہے۔ کوئی نہ کوئی آ کر اس کی لاش لے جائے گا۔"

"اس کی موت کی وجہ کیا تھی؟" اینا بیلا نے دریافت کیا۔ "میرا مطلب ہے بیماری کیا تھی؟"

"ہندوستان!" ہندو ڈاکٹر نے جواب دیا۔

*

بمبئی میں کچھ عرصہ قیام کے بعد اینا بیلا دہلی پہنچ گئی۔ اس شہر میں غربت و افلاس کی تصویر بمبئی سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔ بھیک مانگنے والے چھوٹے چھوٹے بچے ٹانگوں سے لپٹ جاتے۔ اینا بیلا کو کناٹ سرکل کے ایک ایسے ہوٹل میں جگہ مل گئی جہاں زیادہ تر مغربی ممالک سے آنے والے سیّاحوں کی آمد و رفت تھی۔ نوجوان یورپی سیاح ہوٹل کے لان میں جمع رہتے۔ ان لوگوں کا تعلق اپنے ممالک کے اس طبقے سے تھا جو معاشرے کی پیشانی پر بدنما دھبّہ سمجھے جاتے تھے۔ منشیات کی طلب ہی انھیں دُنیا کی آوارہ گردی پر مجبور کر رہی تھی۔ ان میں نوجوان لڑکے بھی تھے۔ اور ایسی لڑکیاں بھی جن کے لیے عزت و ناموس کے الفاظ اپنا مفہوم کھو چکے تھے۔ حشیش کے ایک کش کے لیے وہ اپنے آپ کو جانور سمجھنے کو تیار تھیں۔ ان کی گفتگو کا موضوع بھی صرف ایک ہی تھا۔ منشیات کہاں سے اور کیسے دستیاب ہو سکتی ہے! ایسے قیمتی پتھر کہاں سے خریدے جا سکتے ہیں جنھیں دوسرے ممالک میں دگنی تگنی قیمت پر فروخت کیا جا سکے اور یہ کہ کھٹمنڈو

تک کس طرح پہنچا جائے؟ ان میں بعض نوجوان ایسے بھی تھے جو زندگی میں کچھ پانا چاہتے تھے۔ انھیں نروان کی تلاش تھی اور ان کے خیال میں یہ نروان انھیں ہمالیہ کی تنہائیوں ہی میں کسی جگہ حاصل ہو سکتا تھا۔

اینا بیلا نے بھی نوجوان ہپیّوں کے اس گروہ میں شامل ہونے کی کوشش کی تھی لیکن وہ یا تو پہلے ہی جوڑا جوڑا تھے یا منشیات کے استعمال نے انھیں اپنے آپ سے بھی بیگانہ کر رکھا تھا۔ بعض نوجوان اکیلے بھی تھے لیکن وہ لوگ تیس برس کی اینا بیلا کے بجائے لڑکیوں کو ترجیح دیتے تھے۔ اس وقت اینا بیلا کو بڑی شدّت سے اپنی عمر کا احساس ہونے لگا۔ اس احساس سے پیچھا چھڑانے کے لیے وہ اکیلی ہی دہلی کی سڑکوں پر گھومنے لگی۔

ایک رات وہ گھومتی ہوئی لال قلعہ پہنچ گئی۔ اس رات غالباً وہاں کوئی تقریب تھی۔ رنگ برنگی روشنیوں میں محلات کی سنگِ مرمر کی دیواریں بڑا پُرتاثر منظر پیش کر رہی تھیں۔ یہی وہ جگہ تھی جس نے تین سو سال تک ہندوستان کی تاریخ میں نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔ نادر شاہ اسی قلعے سے تاریخی تخت طاؤس ایران لے گیا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں اسی قلعے میں کھڑے ہو کر نہرو نے ہندوستان کی آزادی کا اعلان کیا تھا ــــ اسی جگہ کے بارے میں ایک شاعر نے کہا تھا کہ روئے زمین پر اگر کوئی جنت ہے تو وہ یہی ہے۔ فارسی کے یہ اشعار آج بھی سنگِ مرمر کی ایک تختی پر کندہ نظر آتے ہیں۔ (یہ شعر کشمیر کے لیے ہے اور معزز مصنف کی لاعلمی کا ثبوت ہے۔ محسن رضا)۔

وہ بڑی دلفریب شام تھی۔ یاسمین اور گلاب کی خوشبو سے فضا معطر ہو رہی تھی۔ اینا بیلا ایک کرسی پر بیٹھی اسٹیج پر پیش کیا جانے والا ٹیبلو دیکھ رہی تھی کہ ایک آدمی انگریزی میں معذرت آمیز جملے بڑبڑاتا ہوا اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اینا بیلا نے سرسری نگاہ سے زیادہ اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ وہ غالباً کوئی یورپین ہی تھا۔ کچھ دیر بعد جب ہندوستان کے قومی ترانے کے ساتھ یہ پروگرام ختم ہو گیا تو اچانک ہی چاروں طرف تیز روشنیاں جگمگا اٹھیں۔ اینا بیلا نے پہلی مرتبہ غور سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ وہ امریکی تھا۔ اینا بیلا کو متوجہ پا کر وہ دوستانہ انداز میں مسکرا دیا اور اس ٹیبلو پر تبصرہ کرنے لگا۔ اخلاقاً اینا بیلا کو بھی جواب دینا پڑا اور اس طرح بات آگے بڑھتی رہی۔ کچھ ہی دیر بعد اینا بیلا اس شخص کے ساتھ لال قلعہ کے مرکزی گیٹ کے قریب ایک اسٹال کے سامنے کھڑی کوکا کولا کی چسکیاں لے رہی تھی۔ قلعے کے اس گیٹ پر کھڑے ہوئے اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ کسی زمانے میں اسی راستے سے مغل شہنشاہوں

اور شہزادوں کی سواریاں گزرا کرتی تھیں۔

اس شخص نے مارک کے نام سے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ سال میں کم از کم تین مرتبہ نیویارک سے دہلی آتا ہے۔ امریکہ میں اس کا ریڈی میڈ گارمنٹس کا کاروبار کئی ریاستوں میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ دہلی سے سستے کپڑے کے امریکی ملبوسات تیار کروا کے لے جاتا تھا جہاں امریکہ کے مختلف ڈیپارٹمنٹ اسٹورز پر ہندوستان کے مقابلے میں کم از کم بیس گنا منافع پر فروخت کر دیتا تھا۔ وہ نرم اور دلفریب لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ اگرچہ زیادہ خوبرو نہیں تھا لیکن جنسِ مخالف کے لیے اس میں خاصی کشش موجود تھی۔ اس نے اگرچہ اپنی عمر پینتیس سے کچھ کم ہی بتائی تھی مگر اینا بیلا کے خیال میں وہ کم از کم چالیس کا ضرور رہا ہوگا۔ بہرحال اینا بیلا کو اس کی عمر سے کوئی غرض نہیں تھی۔

امریکہ سے ہندوستان تک کے سفر کے دوران لاتعداد لوگوں سے اینا بیلا کی ملاقات ہوئی تھی لیکن ان میں سے کوئی بھی انھیں متاثر نہ کر سکا تھا اور نہ ہی ان میں سے کوئی چند گھنٹوں سے زیادہ اسے یاد رہ سکا تھا، البتہ ایتھنز میں اس کی ملاقات ایک ایسے سویڈیش نوجوان سے ہوئی تھی جو نہ صرف صحتمند تھا بلکہ اس کی طرف مائل بھی تھا لیکن دوسرے روز جب اس نے اینا بیلا سے پچاس ڈالر قرض مانگے تو اینا بیلا کو اس کی نیّت بھانپنے میں دیر نہ لگی اور اس نے فوراً ہی اس نوجوان سے قطع تعلق کر لیا۔ استنبول میں ایک ترک نوجوان نے اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس ترک نوجوان کے کہنے کے مطابق وہ تین سال ڈلاس میں رہ چکا تھا لیکن اس کے جھوٹ کی کلی اس طرح کھل رہی تھی کہ وہ انگلش کے چند الفاظ سے زیادہ نہیں بول سکتا تھا۔ اینا بیلا بھی اس میں دلچسپی لینے لگی لیکن ایک روز جب وہ باتھ روم میں تھی اور ترک نوجوان کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جیسے ہی باتھ روم سے باہر نکلی اس ترک نوجوان کو اپنے بیگ کی تلاشی لیتے دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ یہ شخص اس سے اتنی محبّت اور ہمدردی کیوں جتا رہا تھا۔ اینا بیلا نے اسے دھکّے دے کر کمرے سے نکال دیا۔ اس واقعے کے بعد اینا بیلا خاصی محتاط ہو گئی، اور وہ ایسے نوجوانوں سے دُور رہنے لگی جو ہمدردی جتا کر اس کے قریب آنے کی کوشش کرتے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ پژمردہ سی رہنے لگی۔ جب کسی نوجوان جوڑے کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے دیکھتی تو اس کے دل میں بھی یہ خواہش مچل اٹھتی کہ کاش اس کا بھی کوئی ساتھی ہوتا! جس پر اعتماد کرتے ہوئے وہ اس کا سہارا لے سکتی۔ وہ واقعی کسی کی رفاقت کو ترس گئی تھی۔

مارک سے ملاقات کے ابتدائی چند منٹ اس کے لیے بڑے

سنسنی خیز ثابت ہوئے تھے۔ یہ شخص اسے دوسروں سے قدرے مختلف نظر آیا تھا۔ اب تک کئی مرتبہ تلخ تجربہ ہونے کے باوجود اس نے ایک بار پھر جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ پُر وقار ہونے کے ساتھ ہی مارک تحکمانہ شخصیت کا مالک تھا۔ اس میں ایسی صلاحیتیں موجود تھیں کہ فوراً ہی دوسروں پر حاوی ہو جاتا تھا۔ اینا بیلا کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ اس نے اینا بیلا کو ڈنر کی دعوت دے ڈالی اور اس کے انکار کے باوجود اسے ٹیکسی میں لاد کر کچھ دیر دہلی کی مختلف سڑکوں کی سیر کراتا رہا اور پھر جیسے ہی ٹیکسی اکبر ہوٹل کے سامنے رُکی، اینا بیلا کو بڑی شدّت سے کمتری کا احساس ہونے لگا۔ اس کا لباس اس ہوٹل کے لیے قطعی موزوں نہیں تھا۔ کراچی میں صدر کی ایک دکان سے اس نے جین اور بلاؤز خریدا تھا جس پر مقامی کشیدہ کاری کا کام تھا اور کثرتِ استعمال سے اس کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ اس وقت وہ یہی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کا یہ لباس کسی تھرڈ کلاس ہوٹل کے لیے تو بہت مناسب تھا لیکن اکبر ہوٹل، جہاں ڈپلومیٹس اور کمپنی کے ڈائریکٹروں کی آمد و رفت تھی، جس کے گیٹ کے سامنے لیموزائن گاڑیوں کی ایک لمبی قطار نظر آ رہی تھی اور باوردی ملازم دروازے پر کھڑا آنے جانے والے ہر شخص کے سامنے جھکا جا رہا تھا، اینا بیلا اس لباس میں ایسے ہوٹل میں داخل ہو کر اپنی تذلیل کا باعث بننا نہیں چاہتی تھی۔

مارک نے بھی شاید اس کی اس کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ اگر وہ پسند کرے تو ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں جانے سے پہلے اس کے کمرے میں جا کر لباس تبدیل کر سکتی ہے۔ نہ صرف لباس بلکہ مجموعہ حلیہ درست کرنے کا سامان بھی موجود ہے۔ اینا بیلا اس کے کمرے میں جاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی لیکن اس کے لہجے کے خلوص نے اسے قدم آگے بڑھانے پر مجبور کر دیا۔

مارک کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اینا بیلا کو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ وہ متجسّس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ مارک کپڑوں کے اس بنڈل کی طرف متوجّہ ہو گیا جو بقول اس کے اس نے نمونے کے طور پر امریکہ لے جانے کے لیے منتخب کیے تھے۔ چند کپڑے ادھر ادھر ہٹانے کے بعد بالآخر اس نے جامنی رنگ کی ایک میکسی نکال لی، جس کے گلے پر کشیدہ کاری کا کام بنا ہوا تھا۔ میکسی قدرے ڈھیلی تھی، مگر مارک نے ایک دو جگہوں پر پنیں لگا کر اسے فٹ کر دیا۔ صرف دو منٹ بعد اینا بیلا قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی اپنے آپ کا تنقیدی جائزہ لے رہی تھی۔ ڈھنگ کے اس لباس نے اس کے حسن میں واقعی نکھار سا پیدا کر دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو آئینے

میں دیکھ رہی تھی کہ مارک اس کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا اور اپنے ہاتھوں سے اس کے کانوں میں بالیاں پہنانے لگا۔ اینا بیلا نے آج تک ٹاپس کے علاوہ کانوں میں کوئی اور چیز نہیں پہنی تھی۔ لیکن کندھوں تک جھولتی ہوئی بالیاں دیکھ کر وہ کچھ عجیب سا محسوس کرنے لگی۔

اکبر ہوٹل کے شیش محل ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہی اینا بیلا کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ زمین سے نکل کر کہکشاں میں پہنچ گئی ہو، دیواروں پر چاروں طرف آئینے لگے ہوئے تھے۔ چھت پر بھی آئینے نصب تھے اور چھت سے لٹکتی ہوئی رنگ برنگے موتیوں کی لڑیوں کا عکس ان آئینوں میں جگمگاتی ہوئی ستاروں بھری رات کا منظر پیش کر رہا تھا۔ فانوس کی روشنیوں نے اس منظر کو کچھ اور بھی اثر انگیز بنا دیا تھا۔ یہ اینا بیلا کی زندگی کی حسین ترین رات تھی۔

اکبر ہوٹل کے ہال کی آرائش موتیوں سے نہیں بلکہ رنگ برنگی چوڑیوں سے کی گئی ہے جو اپنی نوعیت کا منفرد انداز ہے (محسن رضا)

اینا بیلا نے مارک کو ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد پایا تھا۔ کئی روز گزرنے کے بعد بھی اس نے اینا بیلا سے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ ان کا زیادہ وقت ایک ساتھ ہی گزر رہا تھا۔ البتہ اینا بیلا اس وقت اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی جب مارک کو اپنے کاروبار کے سلسلے میں کسی ٹیکسٹائل ملز یا کپڑے کا کاروبار کرنے والی کسی کمپنی کے دفتر جانا ہوتا۔ اس دوران اینا بیلا یا تو دہلی کی سڑکوں پر ماری ماری پھرتی رہتی یا اپنے گھٹیا سے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھی مارک کی واپسی انتظار کرتی رہتی، اپنے شوہر جمی کے انتقال کے بعد ایک سال کے اس عرصہ میں اس کی زندگی کو گھن سا لگ گیا تھا۔ کسی کی چاہت کی خواہش کے باوجود اس نے کبھی محبت کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا۔ لیکن اب زندگی کے یہ لطیف جذبات اس کے سینے میں ایک بار پھر ہلچل مچانے لگے تھے۔ اس نے کئی مرتبہ مارک کے بارے میں ان خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی مگر مارک پوری طرح اس کے دل و دماغ پر چھا چکا تھا۔ طویل عرصہ بعد اسے خوشی کے یہ لمحات میسر آئے تھے اور وہ انہیں کھونا نہیں چاہتی تھی۔

مارک کے بارے میں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی کہ وہ ایک ہمدرد اور خوش اخلاق انسان تھا۔ منشیات سے اسے کسی قسم کی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ طویل عرصہ قبل بیوی سے علیحدگی کے بعد نیویارک کے نواح میں واقع ایک وسیع و عریض مکان میں تجرد کی زندگی گزار رہا تھا۔ ایک مرتبہ اینا بیلا نے مارک سے اس کا نیویارک کا ایڈریس مانگا تھا لیکن اس وقت اسے پنسل کاغذ نہیں مل سکا تھا اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ بعد میں کسی وقت اسے اپنا ایڈریس دے دے گا مگر وہ وعدہ کبھی پورا نہیں ہو سکا تھا۔

اینا بیلا کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ یہ صورت حال اسے کہاں سے کہاں لے جائے گی اور ان کا ساتھ کب تک رہے گا۔ کیونکہ دہلی میں مارک

کا قیام غیر متعین تھا۔ اسے اپنے کاروبار کے سلسلے میں یہاں ایک مہینہ بھی لگ سکتا تھا اور ایک سال بھی۔ اس نے اینا بیلا کے استفسار پر بعض باتوں کا سرسری سا جواب دیا تھا اور بعض باتوں کو بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا تھا۔

ایک رات اینا بیلا اپنے کمرے میں لباس تبدیل کر رہی تھی۔ مارک نے اسے موتی محل میں کھانے کی دعوت دی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ تیاری میں اسے اتنی دیر نہ ہو جائے کہ مارک کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑے۔ اس دوران دروازے پر دستک کی آواز ابھری، پوچھنے پر ویٹر نے بتایا کہ اس کے لیے فون کال ہے۔ وہ لباس تبدیل کر کے کمرے سے نکلی اور پانچ منزلوں کی سیڑھیاں دوڑتے ہوئے طے کر کے نیچے استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچ گئی۔ فون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کال کرنے والا کون ہو سکتا ہے کیونکہ مارک کے علاوہ کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ اس ہوٹل میں قیام پذیر تھی اور پھر اس شہر میں کسی اور سے اس کی واقفیت بھی نہیں تھی۔

"ہیلو!" وہ ماؤتھ پیس میں بولی۔

جواب میں خاموشی رہی۔

"ہیلو... کون ہے، مارک؟ ہیلو...؟"

اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ ہلکی سی سنسناہٹ کے سوا لائن پر بالکل خاموشی تھی۔ یکایک اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ غیر ارادی طور پر ریسیور پر اس کی گرفت سخت ہو گئی۔ اس نے الجھی ہوئی نگاہوں سے ڈیسک کلرک کی طرف دیکھتے ہوئے ریسیور اس کی طرف بڑھا دیا۔ کچھ دیر وہ بھی ہیلو ہیلو چیختا رہا پھر ریسیور اینا بیلا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ لائن کٹ چکی تھی

"کس کا فون تھا؟ اس نے اپنا نام تو بتایا ہوگا؟"

اینا بیلا نے ریسیور رکھتے ہوئے کاؤنٹر کلرک کی طرف دیکھا۔

"کوئی نام نہیں بتایا تھا۔ اب اگر دوبارا فون آیا تو پوچھ لوں گا۔" کاؤنٹر کلرک نے کندھے اچکا دیے۔

اینا بیلا کی پیشانی پر لکیریں سی ابھر آئیں، وہ اضطراب اور بے چینی کا احساس لیے اپنے کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر تک وہ سوچتی رہی کہ کس کی کال ہو سکتی تھی، اگر مارک ہوتا تو وہ اسے اس طرح پریشان نہ کرتا۔ اس کے علاوہ اس کی کسی سے جان پہچان نہیں تھی۔ وہ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے اپنے ہوٹل سے نکل کر اس ریسٹورنٹ میں پہنچ گئی جہاں مارک سے ملاقات طے تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مارک پہلے ہی سے وہاں موجود ہوگا لیکن وہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ خالی بیٹھنا معیوب سمجھ کر اس نے چائے منگوالی اور ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے مارک کا انتظار کرنے لگی۔

دو گھنٹے گزر گئے، مارک نہیں آیا۔ اس دوران وہ تین مرتبہ چائے منگوا چکی تھی۔ قریب سے گزرنے والا ویٹر بار بار اسے گھور رہا تھا۔ اینا بیلا کی پریشانی میں اضافہ ہونے لگا۔ بالآخر اس نے اکبر ہوٹل فون کر کے مارک کے بارے میں دریافت کیا تو جواب ملا کہ اس نام کا کوئی آدمی وہاں قیام پذیر نہیں ہے۔ ہوٹل کے مہمانوں میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں تھا جس کے نام میں مارک کا لفظ شامل ہو۔ پچھلے ایک ہفتے سے اس نام کا کوئی شخص ہوٹل میں نہیں آیا تھا اور نہ ہی اس نام سے آئندہ کے لیے کسی نے ریزرویشن کروائی تھی۔ فون پر بات کرنے والے آپریٹر نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ ممکن ہے اس شخص نے اسے اپنا نام غلط بتایا ہو۔

اینا بیلا کو یاد آیا کہ جب سے مارک سے ملاقات ہوئی تھی، اس نے ایک مرتبہ بھی مارک کو اکبر ہوٹل فون نہیں کیا تھا، ان کی ہمیشہ بالمشافہ ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں۔ عام طور پر اس سے ملاقات کے لیے مارک ہی اس کے ہوٹل آتا رہا تھا یا اس نے پہلے سے ملاقات کے لیے کسی جگہ کے بارے میں طے کیا تھا۔ اس صورت حال نے اینا بیلا کو بری طرح بدحواس کر دیا۔ اسے اپنے آپ میں ایک عجیب سی شکست و ریخت کا احساس ہونے لگا۔

مارک کے اس فریب نے اسے بہت مایوس کیا تھا۔ دنیا کا ہر مرد مکار، فریبی اور دغا باز تھا۔ مرد سے اس کا اعتماد اٹھ گیا تھا۔ وہ تقریباً پانچ مہینوں سے دنیا کی آوارہ گردی کر رہی تھی لیکن اس صورت حال سے مایوس ہو کر اس نے امریکہ واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ بہت سی قابلِ دید جگہیں باقی تھیں لیکن اس نے ان مقامات کا خیال ذہن سے نکال دیا تھا کیونکہ اس کے خیال میں یہ دنیا صرف اور صرف نوجوانوں کے لیے تھی جبکہ وہ خود جوانی کی حدود پھلانگ چکی تھی اور اس میں اب کسی کے لیے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ البتہ ہندوستان کے بارے میں اس نے طے کیا تھا کہ زندگی میں کبھی کوئی مناسب وقت دیکھ کر دوبارا یہاں ضرور آئے گی۔

ہندوستان سے رخصت ہونے سے پہلے اینا بیلا چند قیمتی پتھر خریدنا چاہتی تھی۔ وہ دن بھر شہر میں مختلف جوہریوں کی دکانوں پر گھوم پھر کر نیلم، زمرد، یاقوت اور ہیروں کی قیمتیں دریافت کرتی رہی پھر اسی رات امریکہ میں اپنی ماں کو فون کیا کہ وہ امریکہ میں ان قیمتی پتھروں کی قیمتیں دریافت کر کے بتائے۔ اس کے پاس ٹریولرز چیکس کی صورت میں سولہ سو ڈالر بچ رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیوں نہ اس رقم سے یہ قیمتی پتھر خرید کر

امریکہ لے جائے جہاں اسے تھوڑا بہت منافع تو مل ہی سکتا تھا۔

سیسل نے کئی روز بعد بیٹی کی آواز سنی تھی۔ اس نے سوالات کی بوچھار کر دی۔ وہ زیادہ تر اس کی صحت کے بارے میں پوچھتی رہی آخر میں اس نے ہندوستان کے بارے میں پوچھا،

"کیسا ملک ہے؟ تمہیں یقیناً پسند آیا ہوگا۔"

"جہنم کا اگر کوئی دوسرا نام ہو سکتا ہے تو وہ ہندوستان ہے۔" اینا بیلا نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ "میں اب یہاں سے رخصت ہونے والی ہوں۔"

"سیدھی امریکہ آؤ گی یا کہیں اور بھی جانے کا ارادہ ہے؟" سیسل نے دریافت کیا۔

"میں یہاں سے بنکاک جاؤں گی۔ ممکن ہے وہاں سے ایک آدھ دن کے لیے کھٹمنڈو بھی چلی جاؤں۔" اینا بیلا نے جواب دیا۔ ایک دو روز پہلے اس کی ملاقات دو ایسی فرانسیسی لڑکیوں سے ہوئی تھی جو بس کے ذریعے نیپال جانے کا پروگرام بنا رہی تھیں، اور اینا بیلا نے سوچا تھا کہ اگر اتنے قریب پہنچ کر بھی وہ کھٹمنڈو نہ گئی تو اسے زندگی بھر افسوس رہے گا۔ وہ کوہ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھی،

"ٹھیک ہے لیکن محتاط رہنا اور جلد سے جلد واپس آنے کی کوشش کرنا۔" سیسل نے کہا۔

"مطمئن رہیے! میں خیریت سے گھر پہنچ جاؤں گی۔" اینا بیلا نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

فون بند ہوتے ہی سیسل اٹلس لے کر بیٹھ گئی اور نقشے میں کھٹمنڈو تلاش کرنے لگی۔ نیپال کا چھوٹا سا ملک ہندوستان اور چین کے درمیان اس طرح پھنسا ہوا نظر آ رہا تھا جیسے ان دونوں ملکوں کو تصادم سے بچانے کے لیے ایک دوسرے سے دور رکھنا چاہتا ہو۔ نیپال کے نقشے کو دیکھتے ہوئے نجانے کیوں سرد سی لہر سیسل کے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ ایک انجانا سا خوف محسوس کرنے لگی۔ آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی اور وہ بہت دیر تک خلا میں گھورتی رہی۔

* کمبوڈیا کی سرحد کے قریب ثنا تنا بیری نامی تھائی لینڈ کا وہ چھوٹا سا قصبہ اس ملک میں آنے والے سیاحوں کے راستے سے بالکل ہٹا ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بنکاک اور پتایا تک آنے والے سیاح اس طرف کا رخ نہیں کرتے۔ انتہائی دور دراز ہونے کے باوجود یہاں کے لوگ جدید تہذیب سے پوری طرح آشنا ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اب بھی پرانی اقدار کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں اور کسی قیمت پر بھی انہیں ترک کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ البتہ اس قصبے سے ہٹ کر دوسری چھوٹی چھوٹی آبادیاں ابھی تک جہالت کی لپیٹ میں ہیں۔

ثنا تنا بیری کی عمارتوں کا طرزِ تعمیر دیکھ کر ان پر امریکی ولاز کا شبہ ہوتا ہے لیکن ان عمارتوں کی تعمیر میں صرف لکڑی استعمال کی گئی ہے، کمروں کی دیواروں، چھتوں اور ستونوں کو خوب صورت بنانے کے لیے ان پر ایسے نقش و نگار کندہ کیے گئے ہیں جنہیں ووڈ کارونگ کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ ہر مکان کے سامنے برآمدہ اور اس سے آگے وسیع لان مکینوں کے ذوق کی عکاسی کرتا ہوا نظر آتا ہے

ربڑ اور چند مخصوص پھلوں کی کاشت کو اس قصبے کی معیشت میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں کے مردوں میں اگرچہ وہ وجاہت نہیں جسے پرکشش کہا جا سکے لیکن بادامی آنکھوں والی عورتیں خاصی حسین ہیں۔ اب تک اس قصبے کی کم از کم دو لڑکیاں حسینۂ تھائی لینڈ کا اعزاز حاصل کر چکی ہیں۔

۱۹۷۵ء کے موسمِ خزاں میں چارلس سوبھراج نے جب اس قصبے کا رخ کیا تو اس کا مقصد سیر و تفریح سے لطف اندوز ہونا نہیں تھا، اسے اس قصبے کے فطری حسن یا حسین لڑکیوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی، اسے تو قیمتی پتھروں کی کشش اس قصبے میں کھینچ لائی تھی۔

ثنا تنا بیری کے نواح میں واقع قیمتی پتھروں کی یہ قدیم کانیں ابھی تک جدید آلات سے روشناس نہیں ہو سکی تھیں۔ کانکن وہی طریقہ اپنائے ہوئے تھے جو صدیوں پہلے ان کے آباؤ اجداد نے

اختیار کیا تھا۔ انہیں اپنے فن میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ خوردبین نگاہوں سے پہلے زمین کا سروے کرتے پھر کوئی ایک جگہ منتخب کرکے کام شروع کر دیتے۔ ان کے اندازے شاذ ہی غلط ثابت ہوتے تھے، سب سے پہلے تقریباً دس مربع فٹ جگہ پر جھاڑیاں صاف کرکے کھدائی شروع کر دی جاتی۔ سرخ چکنی مٹی میں یہ کھدائی زیادہ سے زیادہ چھ فٹ کی گہرائی تک کی جاتی پھر اس گڑھے میں دو فٹ پانی بھر کر اسے کم از کم ایک دن کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ پھر تانبے کی رنگت والے کانکن لنگوٹ باندھ کر اس گڑھے میں اتر جاتے۔ ان کے دوسرے ساتھی رسّیوں میں بندھی ہوئی بالٹیاں نیچے لٹکا دیتے۔ وہ لوگ ان بالٹیوں میں کیچڑ بھر بھر کر اوپر پہنچاتے رہتے۔ اس کیچڑ کو خاص طریقے سے صاف کیا جاتا تو اس میں چند ایک ایسے پتھر ضرور نکل آتے جنہیں تراشنے اور پالش کرنے کے بعد انہی پتھروں کو روبی، نیلم اور یاقوت کی حیثیت حاصل ہو جاتی۔

مرد کیچڑ کی ان کانوں میں کام کرتے جبکہ ان کی عورتیں اور جوان لڑکیاں بانس کے درختوں کے جھنڈ میں بیٹھی مخصوص گیت گنگنانے کے ساتھ ان پتھروں کو تراشنے اور پالش کرنے میں مصروف رہتیں یہاں آنے والے لوگوں کا انہی عورتوں سے سابقہ پڑتا اور وہ تھوڑی سی بحث و تکرار کے بعد ان سے اپنی مرضی کے جواہرات نہایت سستے داموں خریدنے میں کامیاب ہو جاتے۔ یہاں دو قیراط کا یاقوت دس ڈالر اور تقریباً پانچ قیراط کا بہترین یاقوت زیادہ سے زیادہ تین سو ڈالر میں خریدا جا سکتا تھا۔ مارکیٹ میں جن کی قیمت بعض اوقات ہزاروں ڈالر تک ہو سکتی تھی۔

چارلس شانتابیری جانے کے لیے ہمیشہ آدھی رات کے وقت روانہ ہوتا۔ اس طرح دو فائدے تھے۔ ایک تو رات کے وقت سڑک پر ٹریفک کم ہوتا تھا اور دوسرے وہ صبح سویرے شانتابیری کی ہیرے کی کانوں پر پہنچ جاتا تھا۔ اس طرح اسے بہتر مال مل جاتا۔ اور اگر کبھی کانوں پر عورتوں سے سودا طے نہ ہوتا تو وہ قصبے کا رُخ کرتا جہاں جوہریوں کی چھوٹی بڑی لاتعداد دکانیں موجود تھیں۔ ان دکانوں پر ہیرے وغیرہ قدرے بہتر شکلوں میں دستیاب تھے۔ اس لحاظ سے ان کی قیمتیں بھی کچھ زیادہ ہی ہوتیں لیکن بنکاک کے مقابلے میں بہرحال یہ قیمتیں بہت کم محسوس ہوتیں۔ چارلس وہاں سے کبھی خالی ہاتھ نہ لوٹتا۔

چارلس اکثر میری آندرے سے کہا کرتا تھا کہ اگر اس کے پاس تیس چالیس ہزار ڈالر جمع ہو جائیں تو وہ شانتابیری میں ایک دفتر قائم کرکے کانوں سے برآمد ہونے والا تمام خام مال خرید لیا کرے گا۔ ان قیمتی پتھروں کو اصل شکل دینے کے لیے وہ جدید طرز پر ایک چھوٹا سا پلانٹ بھی لگائے گا اور یہاں سے تیار مال بنکاک پہنچا کر وہاں سے پوری دنیا میں پھیلا دے گا۔

میری آندرے اب چارلس کو کسی حد تک سمجھ چکی تھی۔ وہ جب بھی اپنے کسی نئے منصوبے کی تفصیل بتاتا تو وہ خاموشی سے سنتی رہتی۔ چارلس نے بے شمار منصوبے بنائے تھے لیکن آج تک کسی کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا تھا۔ میری آندرے کے مستقبل کے بارے میں بھی اس نے اکثر بڑے بلند بانگ دعوے کیے تھے لیکن وہ صرف یہ جانتی تھی کہ اسے روزانہ بارہ چودہ افراد کا کھانا تیار کرنا پڑتا تھا۔ دن بھر کے کام سے وہ تھک کر چور ہو جاتی۔ کبھی رات گئے تک اسے کنیز کی طرح کام کرنا پڑتا۔ رات کو وہ بستر پر اکیلی کروٹیں بدلتی رہتی۔ چارلس عام طور پر رات کو بھی گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ میری آندرے نے جب بھی اس سلسلے میں کچھ پوچھنا چاہا، چارلس نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

میری آندرے کو شبہ تھا کہ چارلس اب بھی نکوشی سے ملتا ہے اور رات میں وہ اسی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے جب بھی سوال کیا، چارلس نے سختی سے تردید کر دی۔ لیکن اس کے پُراسرار رویّے سے میری آندرے کے دل میں شبہات بڑھتے رہے اور پھر ایک روز دوپہر کے کھانے کے بعد چارلس جیسے ہی گھر سے نکلا میری آندرے نے بھی اس کا تعاقب شروع کر دیا چارلس اس تعاقب سے بے خبر تھا۔ وہ سیدھا اس دکان پر پہنچا جہاں نکوشی ملازم تھی۔ وہ بڑی گرمجوشی سے ایک دوسرے سے ملے اور کچھ دیر بعد دکان سے نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

میری آندرے بکھر کر رہ گئی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر بنکاک سے رخصت ہو جائے لیکن اس معاملے میں وہ اپنے آپ کو قطعی بے بس محسوس کر رہی تھی وہ ایک سینما ہال میں گھس گئی اور ایک پچھلی سیٹ پر بیٹھی خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

اس واقعہ کے دو تین روز بعد رات کے کھانے پر۔۔۔

میری آندرے کو ایک نیا چہرہ نظر آیا۔ میری آندرے اسے بھی کوئی گاہک ہی سمجھی تھی لیکن بعد میں اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔

اجے چوہدری کا تعلق دہلی کے ایک ہندو گھرانے سے تھا۔ بلند قامت، صحت مند اور خوبرو، جنسِ مخالف کے لیے اس میں بڑی کشش تھی۔ چارلس نے اپنے ایک پرانے دوست کی حیثیت سے اس کا تعارف کرایا تھا۔ لیکن یہ وضاحت نہیں کر سکا تھا کہ ان کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔

دو تین روز تک تو مہمانوں کی طرح اجے چوہدری کی آمد و رفت جاری رہی اور پھر ایک روز وہ بھی اپنا بوریا بستر اٹھا لایا۔ اسے چارلس کے معتمدِ خاص کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ ہمزاد کی طرح چارلس کے ساتھ لگا رہتا۔ کبھی وہ میری آندرے کے پاس بیٹھ کر ہمدردانہ لہجے میں باتیں کرنے لگتا۔ اجے چوہدری کے بیان کے مطابق وہ دہلی کے ایک کروڑپتی کا بیٹا تھا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی لیکن باپ سے اختلافات کے بعد وہ گھر سے الگ ہو گیا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق اس نے زندگی کے بہت سے پہلو دیکھے تھے۔ بھوکا پیاسا فٹ پاتھ پر بھی سویا تھا۔ ماڈلنگ کے علاوہ فلموں میں بھی کام کر چکا تھا۔ اُس نے بہت سے ایسے بزنس بھی شروع کیے تھے جن میں لاکھوں کے منافع کی توقع تھی لیکن راتوں رات دولت مند بننے کا یہ خواب کبھی پورا نہ ہو سکا، اس کے منصوبے ہمیشہ ناکام رہے اور اب وہ چارلس کے ساتھ جسے وہ ایلین گوتھر کے نام سے جانتا تھا، پارٹنرشپ میں کام شروع کرنے والا تھا اور اسے یقین تھا کہ ان کی یہ شراکت زندگی کے آخری لمحوں تک قائم رہے گی۔

چارلس اور اجے چوہدری کو اکٹھے دیکھ کر میری آندرے کو کچھ عجیب سا احساس ہوتا، وہ دونوں متناسب جسم کے تھے ــــ اجے چوہدری نہ صرف قد میں چارلس سے نکلتا ہوا تھا بلکہ اس سے زیادہ طاقتور اور مضبوط بھی تھا لیکن چارلس کے سامنے وہ ہمیشہ دبا دبا سا رہتا۔ چارلس کو فخر تھا کہ اجے جیسے نوجوان کُتّوں کی طرح اس کے آگے پیچھے دم ہلاتے پھرتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری آندرے یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی کہ اجے چوہدری اس کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ میری آندرے اگرچہ تیس اکتیس سال کی عمر ہی میں پچاس سال کی بڑھیا نظر آنے لگی تھی لیکن اجے چوہدری اکثر اس کے حسن کی تعریف کرتا۔ چارلس اس کے تیار کیے ہوئے کھانوں میں طرح طرح کے نقص نکالتا لیکن اجے چوہدری کے خیال میں میری آندرے کے کھانے اتنے لذیذ ہوتے تھے کہ بقول شخصے وہ انگلیاں چاٹنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

چارلس میری آندرے پر اجے چوہدری کے اس التفات سے بے خبر نہیں تھا لیکن اس نے کبھی ان کے معاملات میں مداخلت کی کوشش نہیں کی۔ وہ غالباً یہ سمجھ کر خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا کہ میری آندرے کے سلسلے میں اس کی ذمہ داریاں اجے چوہدری نے سنبھال لی تھیں۔ کوئی نہ کوئی تو ایسا ہونا چاہیے تھا جو میری آندرے کی دلجوئی کر سکے۔ اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اجے چوہدری، چارلس کی ہدایات پر ہی ایسا کر رہا ہو۔

استنبول

کے گیلاٹا ٹاور کے قرب و جوار کا علاقہ یہودیوں کی آبادی پر مشتمل تھا۔ اس علاقے میں رہائش پذیر تقریباً بیس ہزار یہودی امن و آشتی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ علاقہ غیر ملکی سیّاحوں کا بھی گڑھ سمجھا جاتا تھا جہاں انھیں منشیّات کے حصول میں کبھی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ گیلاٹا ٹاور عام طور پر فائر ٹاور کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی تاریخ کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کیا جا سکتا بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ اس کی تعمیر چودھویں صدی میں ہوئی تھی، جب کہ بعض مؤرخین کی تحقیق کے مطابق خلیج فاسفورس کے ساحل پر یہ ٹاور چھٹی صدی میں ایک رومن شہنشاہ نے تعمیر کرایا تھا، جس کی سب سے اوپر والی منزل پر ہمیشہ آگ روشن رہتی تھی جس سے جہاز راں رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ لائٹ ہاؤس کے علاوہ اس ٹاور سے زمانۂ قدیم میں رسدگاہ کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ ماہرینِ فلکیات اس ٹاور پر بیٹھ کر خلا کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ آج بھی اس ٹاور میں آگ روشن رہتی ہے اور ایک آدمی چوبیس گھنٹے نگرانی کے لیے موجود رہتا ہے تاکہ یہ آگ بجھنے نہ پائے۔ سترھویں صدی میں ایک شخص نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ پرندوں کی طرح فضا میں اُڑ سکتا ہے۔ اس کا عملی مظاہرہ کرنے کے لیے اس نے اپنے بازوؤں سے مصنوعی پر باندھ کر فائر ٹاور کی چوٹی سے چھلانگ لگا دی۔ وہ فضا میں پرندے کی طرح پرواز تو نہ کر سکا البتہ کچھ ہی دیر بعد سمندر کی گہرائیوں میں غائب ہو گیا تھا۔

استنبول کی تیس لاکھ کی آبادی میں فائر ٹاور کے قرب و جوار میں آباد بیس ہزار یہودی اگرچہ آٹے میں نمک کے برابر تھے لیکن شہر کی تجارت پر انھی کا قبضہ تھا۔ کچھ لوگ اپنے اس آبائی پیشے کو چھوڑ کر سائنس اور انجینئرنگ جیسے شعبوں میں بھی داخل ہو چکے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو دوسری جنگِ عظیم کے دوران ۱۹۴۳ء میں کسی نہ کسی طرح جرمنی سے فرار ہو کر مختلف ممالک سے ہوتے ہوئے ترکی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور یہاں بھی انھوں نے اپنی حیثیت برقرار رکھی تھی۔ یہ بظاہر ترک حکومت کے وفادار تھے، لیکن درپردہ ان کی وفاداریاں اسرائیل سے وابستہ تھیں۔ انتہائی دولت مند ہونے کے باوجود یہ لوگ بھکاریوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کی دولت کا بیشتر حصّہ چوری چھپے اسرائیل منتقل ہو رہا تھا۔

لیون حکیم اور اس کی بیوی راشیل کو یہودیوں کی اس بستی کا ایک مثالی جوڑا سمجھا جاتا تھا۔ لیون حکیم بیسویں صدی کے اوائل میں ایک ساحلی گاڑی سے فرار ہو کر استنبول پہنچا تھا۔ اس وقت اس کی عمر نو دس برس تھی۔ وہ ہوٹلوں میں محنت مزدوری کرکے پیٹ بھرتا رہا۔ پھر ایک ٹھیلے پر سستے قسم کے ریڈی میڈ کپڑے بیچنے لگا۔

سلطان حمام بازار، استنبول کا وہ علاقہ ہے جہاں ہر قسم کی دُکانیں موجود ہیں۔ استنبول آنے والا کوئی بھی غیر ملکی سیّاح اس بازار کو نظر انداز کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

بیس سال کی عمر میں لیون حکیم نے راشیل نامی ایک یہودی لڑکی سے شادی کر لی، جس کے بطن سے دو بیٹوں اور ایک بیٹی نے جنم لیا۔ راشیل، لیون حکیم کے لیے خوش بختی کی علامت ثابت ہوئی۔ اس نے ٹھیلا چھوڑ کر ریڈی میڈ گارمنٹس کی ایک چھوٹی سی فیکٹری میں سپروائزر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی جہاں وہ درزی کا کام بھی سیکھتا رہا اور پھر کچھ ہی عرصہ بعد اس نے ملازمت چھوڑ کر اپنی دکان کھول لی۔ وہ ایک کامیاب بزنس مین ثابت ہوا اور مختصر سے عرصہ میں وہ شہر کے مختلف علاقوں میں کئی دکانوں کا مالک بن چکا تھا۔ وہ ایک مثالی یہودی تھا۔ اس نے ہمیشہ دوسروں کا احترام کیا تھا اور اپنی بیوی اور بچّوں کو بھی یہی درس دیتا تھا۔

لیون حکیم کا بڑا لڑکا اسرائیل اور بیٹی ربیکا باپ کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے لیکن دوسرا بیٹا وِٹالی حکیم باغیانہ راستوں پر چل نکلا تھا۔ اس کی حرکات کی وجہ سے لیون حکیم کو اکثر اپنے احباب اور ملنے والوں کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ وِٹالی کو نہ تو تعلیم سے دلچسپی تھی اور نہ ہی کسی کام سے۔ وہ دن بھر شہر کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومتا رہتا۔ کئی مرتبہ چھوٹی موٹی چوریوں اور لڑائی جھگڑوں کے الزام میں بھی پکڑا گیا تھا لیکن بزرگوں کی مداخلت سے ہر مرتبہ معاملہ رفع دفع ہو گیا تھا۔

اسرائیل نے اپنی الگ دکان کھول لی تھی۔ وِٹالی کو زبردستی اس دکان پر بٹھا دیا گیا لیکن جب کچھ عرصہ بعد ترکی قوانین کے تحت اسرائیل کو فوجی خدمات کے لیے فوج میں بھرتی ہونا پڑا تو اس نے دکان اپنے ایک قابلِ اعتماد دوست کے حوالے کر دی جس پر ناراض ہو کر وِٹالی نے کام چھوڑ دیا اور اصرار کرنے لگا کہ اسے اس کی ماں کے رشتہ داروں کے پاس تل ابیب بھیج دیا جائے۔

کچھ عرصہ تل ابیب میں گزارنے کے بعد وہ پھر استنبول آ گیا، لیکن چند روز بعد وہ پھر اسرائیل چلا گیا اور اس طرح طویل عرصے تک اسرائیل اور ترکی کے درمیان اس کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران میں اس نے نہ صرف اپنا حلیہ ہپیّوں کی طرح بنا لیا تھا بلکہ حشیش کا استعمال بھی شروع کر دیا تھا۔

سترہ سال کی عمر میں اس نے اپنے بڑے بھائی کو بتایا کہ وہ ترکی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے والا ہے۔ سب سے پہلے وہ پیرس جائے گا اور اس کے بعد امریکہ کا رُخ کرے گا۔ اس کا زیادہ وقت نیلی مسجد کے ارد گرد گزرتا۔ یہ علاقہ ہپیّوں کا گڑھ تھا۔ وہ ان ہپیّوں کے ساتھ بیٹھا دن بھر حشیش پیتا رہتا۔ اسرائیل نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ گھر چھوڑنا اس کے لیے مناسب نہیں ہو گا مگر وِٹالی اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔

"استنبول ایک مُردہ شہر ہے۔" وِٹالی نے کہا "میں پیرس اور نیو یارک جیسے شہروں میں رہنا چاہتا ہوں جہاں زندگی اپنے اصل رنگ میں موجود ہے۔"

"لیکن استنبول تمھارا گھر ہے۔" اسرائیل نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی "تم یہیں پیدا ہوئے تھے۔ تمھاری زندگی اسی شہر کے گلی کوچوں سے وابستہ ہے۔ تم اپنے خاندان کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔"

وِٹالی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ نہ صرف اپنے گھر سے بلکہ مذہبی پابندیوں سے بھی فرار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے اس امر سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ تین ہزار سال پہلے یہودی مذہب کے بانی نے کیا کہا تھا۔

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟" بڑے بھائی نے زچ ہو کر پوچھا۔

"آزادی۔" وِٹالی کا جواب بہت مختصر تھا۔

اس گفتگو کے دوسرے ہی روز وِٹالی حکیم اپنے گھر کو خیر باد کہہ چکا تھا۔

لیون حکیم کو وقتاً فوقتاً وِٹالی کے خطوط ملتے رہے۔ پہلا خط پیرس سے لکھا گیا تھا۔ دوسرا لندن سے اور آخری خط نیو یارک سے پوسٹ کیا گیا تھا جس میں اس نے انکشاف کیا تھا کہ اسے گرین وچ ولیج کے ایک نائٹ کلب میں گٹار نواز کی حیثیت سے کام مل گیا ہے اور وہ جینا نامی ایک لڑکی کے ساتھ پرسکون اور مطمئن زندگی گزار رہا ہے۔

لیون حکیم کو بیٹے کی اس آوارگی کا دُکھ دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا لیکن اس نے اپنی باتوں سے کبھی اپنے اس کرب کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ راشیل کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ وہ بیٹے کے ہر خط کو کئی کئی بار پڑھتی، چومتی اور پھر حفاظت سے صندوق میں رکھ دیتی۔ وقت آہستہ آہستہ رینگتا رہا اور بالآخر چھ سال بیت گئے۔

وہ فروری ۱۹۷۰ء کی سہ پہر تھی۔ لیون اور راشیل ڈرائنگ روم میں بیٹھے وِٹالی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی نے ان کی گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ راشیل نے اُٹھ کر ریسیور اُٹھا لیا اور پھر فون پر وِٹالی کی آواز سُن کر وہ اچھل پڑی۔ وِٹالی استنبول ایئر پورٹ پر ٹرانزٹ میں تھا۔ اس نے اپنے والدین سے درخواست کی کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو ایئر پورٹ پر آ کر اس سے مل لیں۔ راشیل کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ وہ دونوں ایئر پورٹ جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ کچھ ہی دیر بعد دوبارہ فون کی گھنٹی بجی۔ یہ بھی وِٹالی ہی کی کال تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ ایئر پورٹ پر نہ آئیں کیوں کہ وہ خود گھر پہنچ رہا ہے۔

وِٹالی کی آمد سے اس گھر کی خوشیاں لوٹ آئیں۔ راشیل چیخ چیخ کر پڑوسیوں کو بتا رہی تھی کہ اس کا بیٹا واپس آ گیا ہے۔ راشیل کا خیال تھا کہ وِٹالی نے کہیں اور جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے لیکن جب وِٹالی نے بتایا کہ وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں اسپین جا رہا ہے اور استنبول میں اس کا قیام چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں ہو گا تو راشیل کے دل پر مُردنی سی طاری ہو گئی۔

لیون حکیم بڑے غور سے بیٹے کو دیکھ رہا تھا۔ چھ سال کے اس عرصہ میں وِٹالی بالکل بدل گیا تھا۔ کندھوں تک جھولتے ہوئے بال، بے ترتیب مونچھیں اور جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ ایک کان میں سونے کی چھوٹی سی بالی اور گلے میں نیکلس، قمیص پر ایک قابلِ اعتراض تصویر چھپی ہوئی تھی۔ وہ اپنے گھر والوں کو بڑے فخر سے بتا رہا تھا کہ ان چھ برسوں میں اس نے کیا کیا تیر مارے تھے۔ انگلش اور فرانسیسی کے علاوہ اب وہ اسپینی زبان میں بھی کسی حد تک مہارت حاصل کر چکا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو متاثر کرنے کے لیے بتایا کہ وہ عنقریب "امپورٹ ایکسپورٹ" کا بزنس شروع کرنے والا ہے جس سے وہ چند سال کے اندر اندر کروڑ پتی نہیں تو لکھ پتی ضرور بن سکتا ہے۔

وِٹالی جس طرح اچانک آیا تھا اسی طرح واپس چلا گیا۔ راشیل کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک تُند بگولا تھا جو آ کر گزر گیا۔ وہ کھڑکی میں کھڑی اس ٹیکسی کو دیکھتی رہی جو اس کے بیٹے کو ایک بار پھر اس سے دُور لے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے اور وہ چونکی تو اس وقت جب لیون حکیم نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے کھڑکی سے ہٹا دیا۔ راشیل نے لیون کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن آخر برسوں سے بندھا ہوا جذبات کے سیلاب کا وہ بند ٹوٹ گیا۔

چند سال اور بیت گئے۔

لیون حکیم بوڑھا ہو چکا تھا۔ جسم پھولنے کے ساتھ دولت میں بھی کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ لوگ پرانے مکان سے لاتعداد کمروں والے نئے مکان میں منتقل ہو چکے تھے۔ یہودیوں کی بستی کا یہ واحد مکان تھا جسے دیکھ کر اس کے مکینوں کی دولت مندی کا احساس ہوتا تھا۔ بوڑھا ہونے کے باوجود لیون حکیم اب بھی دولت سمیٹنے میں مصروف تھا جب کہ اس کی بیوی راشیل کا زیادہ وقت مذہبی سرگرمیوں میں گزر رہا تھا۔ ان کے بڑے بیٹے اسرائیل اور بیٹی ربیکا کی اولاد اب اس کی تمناؤں کا مرکز تھی۔ پوتوں اور نواسوں سے کھیلتے ہوئے کبھی وِٹالی کی یاد آ جاتی تو وہ بکھر سی جاتی۔

اس خاندان کو یہودیوں کی اس بستی میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی جب بھی گھر سے باہر نکلتے لوگ ان کے سامنے بچھ بچھ جاتے۔ گھر کے ایک ایک فرد کی خیریت دریافت کی جاتی لیکن وِٹالی کا نام کبھی کسی کی زبان پر نہیں آیا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی تھا اب تقریباً تیس سال کا ہو چکا تھا اور مامتا کی ماری ماں ہر وقت اس کی خیریت کی دعائیں مانگتی رہتی۔

انھی دنوں لیون حکیم کے بڑے بیٹے اسرائیل کو وِٹالی کے بارے میں ایک ایسی اطلاع ملی کہ کچھ دیر کے لیے تو وہ سکتے میں رہ گیا۔ وِٹالی حکیم کو اسپین میں منشیات کی اسمگلنگ کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس کے قبضے سے حشیش برآمد ہوئی تھی لیکن چونکہ یہ اس کا پہلا جُرم تھا اس لیے مجسٹریٹ نے تنبیہ کے طور پر چند گھنٹے حراست کی سزا کے بعد اس کی رہائی کا حکم دیا تھا۔ اسرائیل کسی نہ کسی طرح یہ خبر اپنے والدین سے چھپانے میں کامیاب ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ ان بوڑھوں میں سے کسی کو اس کی بھنک بھی مل جاتی تو اس کی حرکتِ قلب بند ہو جاتی۔

اسپین کے مغربی ساحل پر لبزا نامی اس چھوٹے سے جزیرے کو نشہ باز ہپیّوں کی جنّت کہنا غلط نہ ہو گا۔ لمبے بالوں، میلے چیکٹ لباس اور بے ترتیب داڑھیوں والے ہپّی نوجوان جوق در جوق اس جزیرے کا رخ کرتے۔ یہ ہپّی ہمیشہ چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں سفر کرتے اور ہر گروہ میں ایک دو نوجوان لڑکیاں ضرور شامل ہوتیں جو ان ہپیّوں کے لیے بیر رچیک کی حیثیت رکھتی تھیں۔ نشے کی طلب نے ان لڑکیوں سے وہ شرم و حیا چھین لی تھی، جسے صنفِ نازک کی پاکیزگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

جزیرے کی پولیس اگرچہ منشیات کے معاملے میں بڑی حسّاس واقع ہوئی تھی۔ سڑکوں پر سگریٹ پیتے ہوئے ہپیّوں کو روک لیا جاتا۔ ان کے سگریٹ سونگھے جاتے اور اگر تمباکو میں حشیش کی بُو محسوس ہوتی تو اس ہپّی کو چند روز جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند رکھنے کے بعد جزیرے سے نکال دیا جاتا.... لیکن اس کے باوجود یہ دُنیا کا غالباً واحد علاقہ تھا جہاں منشیات کا استعمال سب سے زیادہ ہو رہا تھا۔ سڑکوں پر حشیش آلود سگریٹ پینے والے ہپیّوں کو پکڑنا نچلے درجے کے پولیس والوں کی کارکردگی تھی جب کہ قحبہ خانوں اور چلہ کوٹھیوں میں حشیش اور دیگر منشیات کا استعمال عام تھا۔

جزیرے کا ساحل بہت زیادہ کٹا پھٹا اور دشوار گزار ہونے کی وجہ سے اسمگلروں کو جزیرے تک آمد و رفت میں کبھی کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ منشیات کے علاوہ آج کے

اس خلائی دور میں اس جزیرے پر غلاموں اور کنیزوں کی خرید و فروخت کا گھناؤنا کاروبار بھی عروج پر تھا۔ چند گروہ اس کاروبار میں خاصے سرگرم تھے۔ ان کا طریقہ کار بہت ہی سہل اور سادا تھا۔ اس گروہ کے آدمی جزیرے پر آنے والی ایسی یورپین ہپی لڑکیوں کی تلاش میں گھومتے رہتے جو حشیش کے محض ایک سگریٹ کے لیے سب کچھ لٹا دینے کو تیار نظر آتی تھیں۔ وہ لوگ ایسی لڑکیوں کو حشیش اور دیگر منشیات کا لالچ دے کر اپنے ساتھ کسی لانچ پر لے جاتے جہاں انھیں دوسرے آدمیوں کے حوالے کر دیا جاتا بعد میں ان لڑکیوں پر انکشاف ہوتا کہ انھیں فروخت کیا جا چکا تھا اور اس طرح وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ فروخت ہوتی رہتیں۔

۱۹۷۵ء میں ایک ایسی فرانسیسی لڑکی نے جزیرہ لبزا پر قدم رکھا جو یہاں آنے والے ہپیوں سے قطعی مختلف تھی۔ حسین اور نوجوان کارمائن کارو محض سیر و تفریح کے لیے اس جزیرے پر آئی تھی لیکن چند روز بعد ہی اس نے مستقل طور پر یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ کڑھائی، سلائی اور فیشن کی ماہر تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ فیشن گارمنٹس کے شعبے میں یہاں قدم جما سکتی ہے۔ مقامی کاٹن سے خوبصورت تراش کے بلاؤز اور اسکرٹ تیار کر کے بڑی بڑی دکانوں پر فروخت کیے جا سکتے تھے۔ ابتدا میں اسے اپنے مقصد میں کچھ کامیابی بھی ہوئی لیکن چند ماہ بعد اس کے لیے اس کام کو جاری رکھنا ممکن نہیں رہا۔ جزیرے کے دکاندار اس سے تعاون کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اس کے ساتھ ہی کارمائن پر یہ خوفناک انکشاف بھی ہوا کہ اس کے پاس جو کچھ بھی تھا، وہ اس کاروبار میں لگا چکی تھی اور اب اس کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں بچی تھی۔

کارمائن دراصل اپنی ایک دور کی رشتہ دار زازی کی دعوت پر لبزا آئی تھی۔ زازی اس سے کہیں زیادہ حسین اور دلکش تھی۔ کارمائن کو رخصت کرتے ہوئے اس کے والدین خاصے پریشان تھے۔ اجنبی ملک میں کوئی بھی بات ہو سکتی تھی لیکن انھیں بہرحال یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہاں زازی موجود تھی۔ زازی کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس نے عیش و نشاط ہی کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا تھا لیکن انھوں نے اپنی بیٹی کو جو تعلیم دی تھی اس پر انھیں پورا بھروسہ تھا کہ وہ کارمائن کو زازی کے نقشِ قدم پر چلنے سے باز رکھے گی۔

ان کا یہ خیال کسی حد تک درست بھی تھا کیوں کہ فرانس میں رہتے ہوئے وہ کبھی منشیات کے قریب بھی نہیں پھٹکی تھی لیکن جزیرے پر آنے کے چند ہی روز بعد اس میں یہ تبدیلی آ گئی تھی کہ دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر کبھی کبھار چرس بھرے سگریٹ کا ایک آدھ کش لگا لیتی۔ یہاں اس کے حلقے کی بیشتر لڑکیاں بازاروں اور ساحل پر گھوم پھر کر حشیش اور دیگر منشیات فروخت کرتی رہتیں جس سے انھیں اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی مگر کارمائن کے دل میں ایسا خیال کبھی نہیں آیا تھا۔ وہ محنت پر یقین رکھتی تھی اور وہ دیانتداری سے کام کر کے روزی کمانا چاہتی تھی۔ وہ ایسے معاشرے سے تعلق رکھتی تھی جہاں نوجوانوں میں بے راہ روی ایک بہت معمولی سی بات بن کر رہ گئی تھی اور پھر اس جزیرے پر تو کوئی بھی لڑکی اس سے محفوظ نہیں تھی لیکن کارمائن نے اس معاملے میں بھی اپنے آپ کو ہمیشہ محفوظ رکھا تھا۔

ایک رات زازی سے باتیں کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ اس کا ریڈی میڈ گارمنٹس کا بزنس نہ صرف ٹھپ ہو چکا ہے بلکہ اس کے پاس اب پھوٹی کوڑی تک نہیں رہی۔ ان حالات میں اب اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ پیرس واپس چلی جائے۔

زازی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔ وہ اس سے پہلے بھی کارمائن کو اپنے راستے پر لگانے کی کوشش کر چکی تھی۔ اس نے کارمائن کو بڑے بڑے سبز باغ دکھائے تھے کہ یہ جزیرہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں قدم قدم پر دولت کمانے کے مواقع موجود ہیں۔ ضرورت صرف موقع شناسی کی تھی مگر کارمائن احمق تھی جو بھکاریوں جیسی زندگی بسر کر رہی تھی۔ خوش قسمتی اس کے لیے بانہیں پھیلائے کھڑی تھی لیکن وہ حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے اس سے کنّی کترا رہی تھی۔

”میری طرف دیکھو۔“ زازی نے کہا۔ ”شروع میں جب میں اس جزیرے پر آئی تھی تو تمھاری طرح میں نے بھی پاکیزگی کا دامن بڑی مضبوطی سے تھامے رکھا تھا۔ محنت اور دیانت سے روزی کمانے کی کوشش کی تھی لیکن چند فاقوں نے میرے تمام کس بل نکال دیے اور میں نے وہ راستہ اپنا لیا جس پر خوشیاں میری منتظر تھیں۔“

کارمائن کو اس کا اندازہ تھا۔ مکان کا قیمتی ساز و سامان اور زازی کی باہوں اور گلے میں لدے ہوئے زیورات اس کی صداقت کا ثبوت تھے۔ گو کارمائن سے بھی اب تک بعض چھوٹے چھوٹے گناہ سرزد ہو چکے تھے جنھیں نظر انداز کیا جا سکتا تھا لیکن زازی کے نقشِ قدم پر چلنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

اس کے چند ہی روز بعد کارمائن اس حالت کو پہنچ گئی کہ اس کے پاس ایک وقت کے کھانے کو کچھ نہ بچا۔ فلیٹ کے مالک نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے فوری طور پر کرایہ ادا نہ کیا تو وہ اسے اٹھا کر سمندر میں پھینک دے گا۔ دوسری طرف انتھک کوشش کے باوجود وہ کوئی کام تلاش کرنے میں کامیاب نہیں

ہو سکی تھی۔ اس رات وہ غیر ارادی طور پر زازی کے مکان پر پہنچ گئی جہاں اس کی ملاقات ایک ایسے خوبرو نوجوان سے ہوئی جسے دیکھتے ہی اس کے دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو گیا۔ اس نوجوان کا پورا نام اگرچہ خاصا لمبا چوڑا تھا لیکن زازی نے ویٹالی حکیم کے نام سے تعارف کرایا تھا۔ وہ بھی اگرچہ ہپی ہی تھا مگر جزیرے پر آنے والے دوسرے ہپیوں سے قدرے مختلف۔ اس کی آواز میں بڑی کشش تھی۔ وہ انگریزی، فرانسیسی، اسپینی اور ترک زبانیں بڑی روانی سے بولتا تھا۔ زازی کے ہاں اس وقت کچھ اور لوگ بھی موجود تھے اور ویٹالی حکیم ہر ایک کا ہاتھ دیکھ کر ان کی قسمت کا حال بتا رہا تھا۔ کارمائن کا ہاتھ دیکھتے ہوئے اس نے بتایا کہ اس کا ستارہ گردش میں آنے والا ہے اور وہ کسی بڑے خطرے سے دوچار ہونے والی ہے۔ ویٹالی حکیم شعبدے بازی کا بھی ماہر تھا۔ اس نے ایسے ایسے شعبدے دکھائے کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ کارمائن زندگی میں پہلی بار کسی نوجوان سے متاثر ہوئی تھی لیکن وہ ویٹالی حکیم اور زازی کے درمیان بعض خفیہ اشاروں کے تبادلے کو نہیں دیکھ سکی تھی۔

چند ہی روز میں کارمائن نے ویٹالی حکیم کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ دونوں ساتھ رہنے لگے۔ کارمائن نے ویٹالی کے لیے اپنے ہاتھ سے کئی فیشن ایبل لباس تیار کیے جب کہ ویٹالی ایک قحبہ خانہ میں جہاں غیر ملکی سیاحوں اور ماہی گیروں کی آمد و رفت تھی، گٹار بجا کر مالی امور میں اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ فارغ اوقات میں وہ دونوں گھنٹوں ساحل کی ریت پر بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ بعض اوقات ویٹالی مدھم سُروں میں کوئی فرانسیسی گیت گنگنانے لگتا تو کارمائن پر ایک سحر سا طاری ہو جاتا۔

۱۹۷۵ء کے موسمِ خزاں میں جزیرے پر غیر ملکی سیاحوں کی آمد و رفت کم ہو گئی۔ ساحل اور ریستورانوں میں بس اکّا دکّا آدمی ہی نظر آنے لگے۔ ویٹالی حکیم نے بھی ریستوران میں گٹار بجانا چھوڑ دیا اور وہ گھر ہی میں کارمائن کا ہاتھ بٹانے لگا۔ ایک اطالوی لڑکی نے کارمائن سے دو بلاؤز خریدے تھے جو اسے بے حد پسند آئے تھے اور اس نے مزید ایک درجن بلاؤز کی تیاری کا آرڈر دے دیا تھا۔ کارمائن جلد سے جلد یہ کام ختم کر لینا چاہتی تھی۔

ایک روز جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو یہ دیکھ کر اسے دھچکا سا لگا کہ سلائی کڑھائی سے متعلق اس کی تمام چیزیں غائب تھیں۔ وہ بلاؤز بھی موجود نہیں تھے جن پر ان دنوں وہ کام کر رہی تھی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ کمرے میں کھڑی متوحش نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی کہ اپنے کندھوں پر کسی کے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کر کے اچھل پڑی۔

اس کے ساتھ ہی کمرے کی فضا ویٹالی حکیم کے قہقہوں سے گونج اٹھی۔ وہ اسے باہوں سے پکڑ کر ہنستے ہوئے بولا

”بس بہت ہو چکا سلائی کڑھائی کا یہ کام۔ اب ہمیں شادی کر لینی چاہیے۔ آج میں تمھارے لیے شادی کا لباس خریدنے والا ہوں۔“

کارمائن سُن سی ہو کر رہ گئی۔ ویٹالی حکیم سے اس کی ملاقات کو ابھی چند ہفتے ہی تو ہوئے تھے۔ اس سیماب فطرت نوجوان کو وہ خود بھی ابھی پوری طرح نہ سمجھ سکی تھی، اپنے والدین سے اس کا کیا تعارف کراتی۔ جب کہ چارلس ڈیگال کی موت نے پورے فرانس کو سوگ کی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور اس کے والدین بھی اس سوگ میں شریک تھے۔ ایسے موقعے پر ان سے شادی کی بات کرنا کارمائن کے خیال میں مناسب نہیں تھا۔

کارمائن شادی سے انکار کر کے ویٹالی کو کھونا نہیں چاہتی تھی البتہ وہ کوئی ایسا عذر تلاش کر رہی تھی جس کی آڑ میں اس معاملے کو کچھ عرصے کے لیے ٹالا جا سکے۔ بالآخر اسے ایک بہانہ ہاتھ آ ہی گیا۔

”میرا خیال ہے اس وقت شادی کرنا ہم دونوں کے لیے مناسب نہیں ہو گا۔ ہمارے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، شادی کے بعد مزید دشواریاں پیش آئیں گی۔“

”اس کی پروا مت کرو۔“ ویٹالی حکیم نے جواب دیا۔ ”میں عنقریب ایک بزنس ٹرپ پر مشرقِ بعید جانے والا ہوں۔ بنکاک کا ایک رئیس میرا منتظر ہے۔ فی الحال میں اکیلا ہی جاؤں گا اور اس کے چند روز بعد تمھیں بھی وہیں بلا لوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں کسی قسم کی مالی دشواری پیش نہیں آئے گی۔“

مشرقِ بعید کے نام سے کارمائن چونک سی گئی۔ بنکاک، کھٹمنڈو، ہانگ کانگ، ان علاقوں کے بارے میں اس نے بہت سی پُراسرار داستانیں سُن رکھی تھیں۔ ایسی جگہیں دیکھنے کو کس کا دل نہیں چاہتا مگر وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی یہ خواہش اتنی جلد پوری ہو سکتی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اسے ایک اور خدشہ بھی تھا۔ ویٹالی اور زازی کے طرزِ زندگی میں کوئی فرق نہیں تھا اور وہ ایسی زندگی نہیں اپنانا . . . چاہتی تھی۔ بالآخر اس کے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔

”اگر میں تمھارے ساتھ بنکاک چلی بھی گئی تو مجھے وہاں کیا کرنا پڑے گا؟“

”کچھ نہیں۔“ ویٹالی حکیم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”چند روز وہاں کی سیر و تفریح کے بعد ہم یہاں واپس آ جائیں گے، اگر مناسب سمجھا تو میڈرڈ، پیرس یا روم چلے جائیں گے۔ وہاں بھی تفریح کے سوا تمھیں کچھ بھی کرنا نہیں پڑے گا۔“

”بس۔“ کارمائن نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی

طرف دیکھا۔ اس جواب سے اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی "صرف تفریح یا کچھ اور بھی؟"

"شاید ایک چھوٹا سا کام اور کرنا پڑے" ویٹالی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آگئی "بنکاک سے واپسی پر ہیروں کا ایک چھوٹا سا پیکٹ تمھیں اپنے ساتھ لانا پڑے گا"

کارمائن سناٹے میں آگئی۔ ویٹالی حکیم مختصراً اسے اپنے منصوبے کی تفصیل بتا رہا تھا اور جب بات کارمائن کی سمجھ میں آئی کہ وہ ہیروں کی اسمگلنگ کے لیے اسے اپنا آلۂ کار بنانا چاہتا ہے تو اس نے بلا تاخیر ویٹالی کی اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔

"اگر تمھیں میرا یہ منصوبہ پسند نہیں آیا تو میرے پاس ایک اور تجویز بھی ہے" ویٹالی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "بنکاک میں بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹ اسٹورز ملازمت کے سلسلے میں یورپین لڑکیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر تمھیں سیلز گرل کا کام مل جائے تو میرے خیال میں تمھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اس طرح شادی کے لیے کچھ رقم بھی جمع کر سکو گی"

کارمائن کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر اس نے یہ تجویز ماننے سے بھی انکار کر دیا تو ویٹالی حکیم کو کھو دے گی۔ یوں بھی سیلز مین شپ کوئی ایسا کام نہیں تھا جس سے عزت پر حرف آتا ہو۔ یہ تو روزگار کا ایک عام ذریعہ تھا اور وہ پہلے بھی سیلز گرل کی حیثیت سے کام کر چکی تھی۔ اس تجویز پر اس نے فوراً ہی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

کارمائن کی رضامندی پر ویٹالی حکیم خوشی سے جھوم اٹھا اور اس سلسلے میں ضروری تیاریوں کا عذر پیش کرتے ہوئے وہ فوراً ہی فلیٹ سے نکل گیا۔ وہ سیدھا نازی کے ہاں پہنچا اور اسے یہ خوشخبری سنائی کہ اس کی اسکیم کامیاب ہو رہی ہے اور اگر ہمارا در بنکاک میں اس کے آدمیوں نے عین وقت پر دھوکا نہ دیا تو واپسی پر وہ کارمائن کے ذریعے بڑی تعداد میں قیمتی پتھر اور ہیروئن اسمگل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا"

نازی کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ بکھر گئی۔

جینیفر بحفاظت بنکاک پہنچ گئی۔ ایئر پورٹ ٹرمینل سے نکلتے ہی اسے ٹیکسی اور رکشے والوں نے گھیر لیا۔ بالآخر موٹر رکشا کا ایک ڈرائیور اسے اس محاذ پر فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ رکشے پر بیٹھتے ہوئے جینیفر نے ڈرائیور کو ملائشیا ہوٹل کا پتا بتا دیا۔۔۔ ملائشیا ہوٹل کے بارے میں اسے ہانگ کانگ میں ایک فرانسیسی لڑکی نے بتایا تھا کہ بنکاک میں اس سے سستا اور کوئی ہوٹل نہیں ہو سکتا۔ جینیفر کے لیے یہ ہوٹل واقعی بہت سستا ثابت ہوا۔ کمرے کا کرایہ صرف چھ ڈالر یومیہ تھا۔ ہوٹل میں آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد جینیفر ایک نوجوان لڑکی اور ایک لڑکے سے متعارف ہو گئی۔ ان دونوں کا تعلق اٹلانٹا سے تھا اور وہ مشرقی شناسی کے مطالعہ کی غرض سے مشرق اور مشرقِ بعید کا دورہ کر رہے تھے۔

اس کے تقریباً دو گھنٹے بعد وہ تینوں بنکاک کی سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔ چند تفریحی مقامات کی سیر کے بعد انھوں نے جینیفر کی خواہش پر بنکاک کی سب سے بڑی بدھ خانقاہ "واٹ پوٹمپل" کی تلاش شروع کر دی۔ شہر کی ایک نواحی سڑک پر موسیقی کی آواز سن کر وہ اس طرف متوجہ ہو گئے۔ سیکڑوں آدمیوں کا جلوس تھا جس کے آگے ایک بے ترتیب بینڈ ملی جلی دھن بجا رہا تھا۔ ڈھول تاشوں کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جلوس کے وسط میں چند لوگوں نے ایک نوجوان کو کندھے پر اٹھا رکھا تھا، جسے دھوپ سے بچانے کے لیے نارنجی اور سرخ رنگ کا بہت بڑا چھاتا تنا ہوا تھا۔ اس نوجوان کا سر گنجا، چہرہ تاثرات سے عاری اور جسم پر سفید ریشمی گون تھا۔

"اوہ" جینیفر خوشی سے چیخی "بدھ کا پیرو یہ نوجوان اپنی ریاضت کے ابتدائی مراحل طے کر چکا ہے اور اب باقاعدہ پجاری کی حیثیت دینے کے لیے خانقاہ لے جایا جا رہا ہے۔ اسے یہ رتبہ ملنے پر لوگ خوشیاں منا رہے ہیں۔ دیکھو، وہ کس طرح ناچ رہے ہیں اور اس نوجوان بھکشو پر پھولوں کی بارش کر رہے ہیں"

وہ تینوں سڑک کے کنارے کھڑے جلوس کا نظارہ کر رہے تھے۔ بھکشو بننے کا امیدوار جیسے ہی سامنے سے گزرا، جینیفر نے جھک کر اسے تعظیم دی اور بدھ کے مخصوص اشاروں سے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

"لیکن یہ نوجوان تو اتنا خوش نظر نہیں آتا" دوسری لڑکی نے تبصرہ کیا۔

"نہیں" جینیفر نے اس کی رائے سے اختلاف کیا "وہ اپنی ابتدائی ریاضت مکمل کر چکا ہے اور اس وقت اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرنا چاہتا" کہنے کے ساتھ ہی وہ دوڑتی ہوئی جلوس کے ساتھ شامل ہو گئی، اور دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی پورے جوش و خروش کا مظاہرہ کرنے لگی۔

پہاڑی پر واٹ پو خانقاہ اب نظر آنے لگی تھی جینیفر جلوس کے ساتھ کچھ دور اور چلنے کے بعد جلوس سے الگ ہو کر درختوں کے سائے میں گھاس پر بیٹھ گئی۔ کسی اندرونی جذبے کے تحت اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور وہ اپنے آپ میں کمزوری سی محسوس کرنے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد جب اس کے دونوں نئے دوست اسے تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے تو اس کی حالت دیکھ کر چونک سے گئے۔

"شاید تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے" نوجوان نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، میں ٹھیک ہوں۔ بس تھوڑی سی تھکن محسوس کر رہی ہوں" جینیفر کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

اس دوران جلوس خانقاہ میں پہنچ چکا تھا۔ زرد چغوں والے بیسیوں مہنت، بھکشو بننے کے امیدوار اس نوجوان کو خانقاہ کے اس ہال میں لے جا چکے تھے جس کے سامنے مہاتما بدھ کا تقریباً چالیس فٹ اونچا مجسمہ نصب تھا۔ جینیفر اپنی جگہ پر بیٹھی اس سنہری مجسمے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر یکایک مہرِ سکوت سی لگ گئی تھی۔ وہ خود بھی بدھ کی پجارن بننے کا جذبہ لے کر آئی تھی، لیکن اس تنہائی نوجوان کی حالت دیکھ کر اس کے ارادے ... متزلزل ہونے لگے تھے۔

دوسرے دن وہ امریکی جوڑا کلکتہ روانہ ہو گیا۔ انھوں نے ایک دوسرے سے ایڈریس لے لیے تھے اور جینیفر سے وعدہ کیا تھا کہ ہندوستان سے ہوتے ہوئے بہت جلد وہ کھٹمنڈو بھی جائیں گے اور وہاں جینیفر سے ضرور ملاقات کریں گے۔

جینیفر اپنے آپ کو یکایک تنہا محسوس کرنے لگی۔ وہ سارا دن شہر کی چھوٹی بڑی خانقاہوں میں گھومتی رہتی۔ بنکاک بدھ کے پیروکاروں کا گڑھ تھا۔ یہاں کے لوگوں نے اپنی زندگیاں بدھ کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ ہر گھر کے سامنے ایک چھوٹی سی خانقاہ ضرور بنی ہوئی تھی۔ بعض گھروں کے سامنے تو یہ خانقاہیں مرغیوں کے ڈربوں سے زیادہ بڑی نہیں تھیں جن کی لکڑی پر خوبصورت کندہ کاری تھی۔ بدھ مذہب میں اگرچہ بھیک مانگنے کو برا سمجھا جاتا ہے لیکن ہر صبح سیکڑوں بدھ بھکشو کاسۂ گدائی ہاتھ میں لیے گھروں کے دروازوں پر دستک دیتے ہوئے نظر آتے۔

ان خانقاہوں میں گھومتے ہوئے جینیفر کو ایک خانقاہ میں بدھ کے ترمیمی مجسمے نظر آئے اور رائل گرینڈ پیلس میں زمرد سے بنے ہوئے بدھ کے ایک قدِ آدم مجسمے کو دیکھ کر تو وہ دنگ رہ گئی۔ اس کے دونوں طرف ٹھوس سونے کے دو اژدہے بنے ہوئے تھے، گویا وہ اس مجسمے کے محافظ تھے۔ جینیفر کے دل میں یکایک خواہش ابھری کہ کاش وہ ان میں سے کسی ایک چیز کو فروخت کر سکتی تاکہ کوریان میں فاقہ زدہ بچوں کے لیے چند ہفتوں کی خوراک کا انتظام ہو سکے۔

وہ بنکاک میں اس کا آخری دن تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی روانگی کی تیاری کر رہی تھی کہ کھڑکھڑاہٹ کی آواز کے ساتھ کمرے کا ایئر کنڈیشنڈ بند ہو گیا اور چند منٹ بعد ہی کمرہ تنور کی طرح دہکنے لگا۔ اس کی روانگی میں اگرچہ ابھی کئی گھنٹے باقی تھے مگر وہ کمرے سے نکل کر نیچے لابی میں آگئی جہاں ہوا کے جھونکے قدرے خنکی کا احساس دلا رہے تھے۔ لابی میں اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ جینیفر نے کافی شاپ سے لیمونیڈ کا ایک گلاس خریدا اور پلاسٹک کی ایک شکستہ سی کرسی پر بیٹھ کر ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگی۔ اس نے ان دو آدمیوں کی طرف ابھی تک توجہ نہیں دی تھی جو اس کے لابی میں آنے کے فوراً ہی بعد گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں بھی اس کے قریب خالی کرسیوں پر جگہ سنبھال چکے تھے۔

ان دونوں میں ایک ہندوستانی تھا۔ دراز قد، صحتمند جسم اور مخصوص تراش کی مونچھوں نے اس کی شخصیت کو کچھ اور بھی پُر وقار بنا دیا تھا۔ دوسرا اس سے نسبتاً چھوٹے قد کا تھا۔ جسم میں ہلکا ہونے کے باوجود وہ خاصا مضبوط اور توانا نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش سے اس کی قومیت کا صحیح اندازہ لگانا دشوار تھا۔ وہ مشرقی بھی ہو سکتا تھا اور یوریشین بھی۔ ان دونوں میں جنسِ مخالف کے لیے بے پناہ کشش تھی۔ جینیفر اگرچہ کوریان کی بدھ خانقاہ میں راہبہ کی زندگی گزارنے کی نیت سے آئی تھی اور ایسے خیالات کو بھی ذہن میں لانا اس مذہب میں گناہ سمجھا جاتا تھا لیکن اس وقت ان دونوں آدمیوں کو دیکھ کر اس کے اندر حق و باطل کی قوتوں میں زبردست کشمکش شروع ہو چکی تھی۔

دائیں طرف کی کرسی پر بیٹھے ہوئے آدمی نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر نہایت خاموشی سے جینیفر کی طرف بڑھا دیا۔ جینیفر نے وہ کارڈ پڑھا اور خاموشی سے اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال لیا۔ کارڈ پر چھپے ہوئے الفاظ اس کے ذہن کی لوح پر ثبت ہو چکے تھے۔

"اے۔ گوتھر۔ جیم ڈیلر"

ایلین گوتھر اور مونیکا کا یہ فلیٹ تو نائٹ کلب بنتا جا رہا ہے۔ کوئی شب ایسی نہیں گزرتی جب یہاں کوئی ہنگامہ نہ ہوتا ہو۔ بیلے نے اپنے شوہر سیموئیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پانچویں منزل کے اس فلیٹ سے آنے والی موسیقی اور ہاؤ ہو کی آوازوں نے ہی اسے اس طرف متوجہ کیا تھا۔

بیلے کا یہ تبصرہ غلط نہیں تھا۔ کچھ عرصے سے ایلین گوتھر کے اپارٹمنٹ میں لوگوں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ وہ لوگ رات بھر ادھم مچاتے رہتے۔ ملحق فلیٹ میں مقیم ایلین کے "مہمان" بھی بعض اوقات رقص و موسیقی کے اس ہنگامے میں شامل ہو جاتے اور بے چاری میری آندرے کو ان کے لیے کھانا پکانے اور ان کی خدمت گزاری ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ بیلے اس کے لیے اپنے دل میں بڑی ہمدردی محسوس کرنے لگی تھی۔

۱۵ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کی رات اس پارٹی کی مہمانِ خصوصی وہ امریکی لڑکی تھی جسے ایلین گوتھر اور اس کا ہمزاد اجے چودھری کہیں

سے پکڑ لائے تھے۔ اس کا نام جنیفر تھا اور وہ غالباً اس کی زندگی کی خوشگوار ترین رات تھی۔ اس کی آواز نہ صرف سب سے نمایاں تھی بلکہ رقص میں بھی والہانہ پن تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اجے چودھری کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لیا اور اسے "بمپ" سکھانے لگی جو اس کے کہنے کے مطابق امریکہ کا سب سے ہنگامہ خیز رقص تھا اور ان دنوں امریکہ کا ہر نوجوان اس رقص کا دیوانہ ہو رہا تھا۔ رقص کیا تھا ایک طوفان بدتمیزی تھا۔ جب وہ ا بجے چودھری کو ...... ٹکر مارتی تو کمرے کی فضا قہقہوں سے گونج اٹھتی۔ بعد میں اس نے چارلس کو بھی، جسے وہ ایلین کے نام سے جانتی تھی، اپنے ساتھ گھسیٹنے کی کوشش کی لیکن اس نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ اسے صرف جنیفر کا رقص دیکھنے سے دلچسپی ہے۔

چارلس سے زیادہ میری آندرے، جنیفر میں دلچسپی لے رہی تھی۔ جب وہ اس نئی لڑکی کو لے کر فلیٹ میں داخل ہوا تھا تو اس کا دل چاہا تھا کہ اسے اٹھا کر پانچویں منزل سے نیچے پھینک دے لیکن پھر یہ سوچ کر رہ گئی تھی کہ یہ لڑکی زیادہ دنوں تک چارلس کا ساتھ نہیں دے سکے گی۔ کیوں کہ چارلس کو ہپیوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی اور میلی سی جینز اور پیوند لگے بلاؤز میں ملبوس یہ لڑکی اسی قبیلے سے تعلق رکھتی تھی لیکن میری آندرے کے لیے تشویش کی بڑی بات یہ تھی کہ یہ لڑکی نہ صرف بہت حسین تھی بلکہ اس کی عمر بھی اس کے اندازے کے مطابق بیس سال سے زیادہ نہیں تھی اور وہ مچلتے ہوئے جذبات کے طوفان میں گھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔

رقص و موسیقی کا طوفان تھما تو شراب اور حشیش کا دور چلنے لگا۔ چند منٹ بعد ہی کمرے کی فضا حشیش کے دھوئیں سے بوجھل ہو گئی۔ ڈومنک بھی چارپائی سے اٹھ کر صوفے پر نیم دراز ہو گیا تھا۔ ایلین کی دی ہوئی دوائیں وہ باقاعدگی سے استعمال کر رہا تھا لیکن اس کے پیٹ کی کیفیت جوں کی توں تھی۔ اس نے شاید ابھی تک یہ بات محسوس نہیں کی تھی کہ دوا کے باقاعدہ استعمال کے باوجود اس کی حالت بد سے بدتر ہو رہی تھی۔ اس کی کمزوری میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ دوسرے دو فرانسیسی لڑکے، جو ملحق فلیٹ میں تھے، وہ بھی یہاں آنے کے بعد مستقل بیمار ہو رہے تھے۔ وہ بھی چارلس ہی کی دی ہوئی دوائیں کھا رہے تھے لیکن ایک روز چارلس نے اعلان کیا کہ اب وہ دونوں ٹھیک ہیں اور انھیں مزید دواؤں کی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں واقعی شبہ نہیں تھا کہ اس کے دو تین دن بعد وہ اپنے آپ کو بہتر محسوس کرنے لگے اس کے ساتھ ہی چارلس نے انھیں کچھ ذمے داریاں بھی سونپ دیں جن میں میری آندرے کے ساتھ گھر کی صفائی اور سودا سلف لانے کے علاوہ شہر میں گھوم پھر کر غیر ملکی سیاحوں میں جواہرات کے گاہک تلاش کرنا بھی شامل تھا۔ آج کی رات وہ بھی اس محفل میں شامل تھے اور زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

یہ یادگار پارٹی جاری ہی تھی کہ نکوشی بھی پہنچ گئی ــــ میری آندرے نے بڑی خونخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا مگر وہ میری آندرے کو نظر انداز کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ ایک اور تھائی لڑکی بھی تھی۔ وہ مقامی اسپتال میں نرس تھی اور عنقریب امریکہ جانے والی تھی۔ اسے امریکی حکومت کی طرف سے جنوبی ریاست کے ایک اسپتال میں کام کرنے کی اجازت مل گئی تھی اور اس سلسلے میں تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔

اس محفل میں تین حسین لڑکیاں موجود تھیں اور چارلس ان کے ساتھ بڑے جاندار قہقہے لگا رہا تھا۔ یہ صورت حال میری آندرے کے لیے تشویشناک تھی۔ اس نے چارلس کی کرسی کے ہتھے پر بیٹھ کر ایک ہاتھ اس طرح اس کے کندھے پر رکھ دیا جیسے ایک لمحہ کو بھی اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہ ہو۔ چارلس کو اس کے خیالات بھانپنے میں دیر نہ لگی۔ وہ میری آندرے کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

"احمق مت بنو۔ نکوشی کے بارے میں تمھارے خدشات قطعی بے بنیاد ہیں۔ وہ بھی دوسروں کی طرح میرے لیے کام کر رہی ہے۔ یہ میرا بزنس ہے اور میں اس میں تمھاری طرف سے کوئی مداخلت برداشت نہیں کروں گا۔"

میری آندرے کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اصل خطرہ وہ نکوشی ہی کی طرف سے محسوس کر رہی تھی اور چارلس نے اس کے خیالات پڑھ لیے تھے۔ چارلس اب فرش پر بیٹھ گیا تھا اور اس نے اپنے تمام مہمانوں کو اپنے گرد جمع کر کے ایک ماہر جوتشی کی طرح ان کے ہاتھ دیکھنا شروع کر دیے تھے۔ جنیفر کا ہاتھ وہ بہت دیر تک تھامے رہا۔ اس نے غالباً جنیفر کے ہاتھ میں ہلکی سی لرزش کو محسوس کر لیا تھا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ اجے چودھری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میرے پیٹ پر گھونسا مارو اور دیکھو، کوئی لحاظ مت کرنا۔" چارلس نے کہا۔ وہ اپنے کراٹے کے فن کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔

اجے چودھری چند لمحے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چارلس کے پیٹ پر گھونسا رسید کر دیا لیکن اس نے زیادہ طاقت استعمال نہیں کی تھی۔

"اور زور سے۔" چارلس دہاڑا۔

اجے چودھری نے اس مرتبہ پوری قوت استعمال کی تھی،

اور اسے یہی محسوس ہوا تھا جیسے اس نے کسی چٹان پر گھونسا مار دیا ہو۔ اس کا ہاتھ بری طرح جھنجھنا اٹھا اور پھر چارلس کے طیش دلانے پر وہ پے در پے اس کے پیٹ پر گھونسے برساتا رہا۔ چارلس اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہلا تھا۔ نہ ہی اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نمودار ہوئے تھے۔ اس کے برعکس اجے چودھری دیر تک اپنا ہاتھ سہلاتا رہا۔

کمرے میں موجود ہر شخص کا چہرہ حیرت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، پھر حیرت کی جگہ خوف کے ہلکے سے تاثرات ابھر آتے، اور چارلس چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ اپنی طاقت کے مظاہرے سے انھیں مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد چارلس نے ایک بار پھر سب کے گلاسوں میں شراب انڈیل دی جب کہ وہ خود لیمن کی ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے اس طرح ان کے چہروں کا جائزہ لے رہا تھا جیسے کسی نقشے پر کوئی خزانہ تلاش کر رہا ہو۔

رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چارلس کو پہلی مرتبہ میری آندرے نے ایسے خوشگوار موڈ میں دیکھا تھا۔ وہ جنیفر کی طرف اشارہ کر کے سب کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"یہ امریکی حسینہ مجھے بہت پسند آئی ہے۔ اگر اسے پتایا کی سیر نہ کرائی گئی تو یہ اس کے ساتھ زیادتی ہو گی۔"

"اور یہ پتایا کہاں ہے؟" کسی نے پوچھا۔

"روئے زمین پر یہ جنت یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ اس کے ساحل کو دنیا کا خوب صورت ترین ساحل ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔" چارلس نے جواب دیا۔ اس نے پتایا کی تعریف کچھ اس طرح کی تھی کہ جنیفر کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ وہ کھٹمنڈو کی خانقاہ میں ایک نئی زندگی کی ابتدا کرنے جا رہی تھی لیکن یہاں کی صورت حال نے اسے شدید الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

◇

پیٹ پونگ بنکاک کا بدنام ترین علاقہ ہے اور اسے شہر کی پیشانی پر بدنما دھبہ کہنا غلط نہ ہو گا۔ تنگ اور نیم تاریک گلیاں، ڈربہ نما مکان جن کے دروازوں پر کھڑی ہوئی عورتیں راہگیروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے فحش حرکات میں مصروف رہتیں۔ بعض فاحشاؤں کے ایجنٹ گلیوں میں گھوم پھر کر گاہکوں کو پھنسانے کی کوشش کرتے۔ پولیس آئے دن اس بازارِ حسن پر چھاپے مارتی رہتی لیکن چند غیر ملکی سیاحوں کے سوا کوئی بھی گرفت میں نہ آتا اور وہ بھی وہ لوگ ہوتے جو محض آنکھیں سینکنے کے لیے اس طرف آ نکلتے تھے جب کہ طوائفیں اور ان کے ایجنٹ پُرپیچ اور خفیہ راستوں سے صاف بچ نکلتے تھے۔ اس بازارِ حسن کے علاوہ شہر میں اور بھی ایسی بے شمار جگہیں موجود تھیں جہاں بے حیائی کا یہ کاروبار پورے عروج پر تھا۔ ان خفیہ نائٹ کلبوں میں تماشائیوں کے سامنے اسٹیج پر بے حیائی کا ایسا مظاہرہ کیا جاتا کہ انسانیت بھی تھرا اٹھتی۔

۱۵ اکتوبر کی رات کا آخری پہر تھا۔ جنیفر دو ایشیائی مردوں کے ساتھ ایک ایسے ہی خفیہ نائٹ کلب میں بیٹھی تھی جہاں اسٹیج پر بے حیائی کا بدترین مظاہرہ ہو رہا تھا۔ ہال تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا لیکن فضا پر سناٹا ساطاری تھا۔ ان دونوں کی ہر حرکت کے ساتھ فضا میں آوازیں گونج اٹھتیں۔ جنیفر اپنی سیٹ پر مبہوت سی بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ بعض اوقات اسے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگتا۔ وہ بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ بالآخر بے حیائی کا یہ ڈراما ختم ہوا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

بظاہر شو ختم ہو چکا تھا لیکن چند منٹ بعد ہی ہال کی بتیاں ایک بار پھر بجھ گئیں اور نیلے رنگ کی اسپاٹ لائٹ اسٹیج پر رکھی ہوئی تنکوں کی ایک پٹاری پر مرکوز ہو گئی۔ کچھ دیر بعد ہی لڑکی... اسٹیج پر نمودار ہوئی۔ جنیفر کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ پہلے تو وہ یہی سمجھی کہ لڑکی بے لباس تھی لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس نے جلد کی رنگت کا لباس پہن رکھا تھا جو اس کے جسم سے چپکا ہوا تھا۔ وہ لڑکی دو زانو ہو کر پٹاری کے سامنے بیٹھ گئی۔ دوسرے ہی لمحہ اس نے پٹاری کا ڈھکنا ہٹا دیا۔ اس کے ساتھ ہی نیلی اسپاٹ لائٹ کی جگہ سرخ روشنی نے لے لی۔

پٹاری سے ایک ناگ کو سر اٹھاتے دیکھ کر لوگوں کے سانس رک گئے۔ ہال کی دیواروں پر نصب اسپیکروں سے بین کی آواز فضا میں بکھر رہی تھی۔ ناگ بین کی دھن پر پھن پھیلائے جھومنے لگا۔ سرخ روشنی میں اس کی چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں بڑا خوفناک تاثر دے رہی تھیں۔ لڑکی گھٹنوں کے بل اس طرح آگے کو جھکی ہوئی تھی کہ اس کا چہرہ سانپ کے پھن سے صرف پانچ انچ کے فاصلے پر تھا۔ جھومتا ہوا سانپ بار بار اس کی طرف لپکتا لیکن پھر ایک دم پیچھے ہٹ جاتا۔ لڑکی کچھ اور آگے کو جھک گئی۔ سانپ اب بھی آگے پیچھے جھوم رہا تھا۔ تماشائیوں کے سانس رکے ہوئے تھے۔ ان کی نظریں سانپ اور لڑکی پر گویا جم کر رہ گئی تھیں۔ دفعتاً خاموش فضا میں سانپ کی پھنکار ابھری۔ دوسرے ہی لمحہ سانپ کا پھن بڑی پھرتی سے آگے کو جھکا۔ لڑکی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ ڈسنے کے بعد سانپ جھومتا ہوا پٹاری میں سمٹ گیا۔ لڑکی کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نمودار نہیں ہوئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے سرکنے لگی۔ پھر وہ تماشائیوں کے سامنے جھکی اور دوڑتی ہوئی اسٹیج کے پیچھے

غائب ہوگئی۔ ہال یکبارگی تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔

یہ خوفناک ڈراما ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ لکڑی کا ایک چھوٹا سا بکس اسٹیج پر لاکر رکھ دیا گیا۔ اس کا ڈھکنا اٹھاتے ہی ایک مرغی اُچھل کر باہر آگئی۔ اس کے دونوں پیر رسّی سے بندھے ہوئے تھے۔ مرغی اپنے آپ کو آزاد کرانے کے لیے پھڑپھڑانے لگی۔ پھڑپھڑاہٹ کی آواز سُن کر سانپ نے ایک بار پھر پھن اُٹھا دیا۔ اپنے آرام میں اسے مرغی کی یہ مداخلت پسند نہیں آئی۔ وہ چند لمحے جھُومتا رہا پھر اچانک ہی پھڑپھڑاتی ہوئی مرغی پر پھن مار دیا۔ مرغی کچھ دیر پھڑپھڑانے کے بعد ساکت ہوگئی... سانپ کے زہر نے چند سکینڈ ہی میں اس کا خاتمہ کر دیا تھا۔

دوسرے تماشائیوں کی طرح جینفر پر بھی سکتے کی سی کیفیّت طاری تھی۔ وہ چونکی تو اس وقت جب اس کے ساتھ بیٹھے ہوتے چارلس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ ان کے اُٹھتے ہی دوسری طرف بیٹھے ہوئے اجے چودھری نے بھی سیٹ چھوڑ دی تھی۔

✡

اس ایک رات نے جینفر کی زندگی کی کایا پلٹ دی۔ وہ یہ عزم لے کر گھر سے نکلی تھی کہ زندگی کا باقی حصّہ ہمالیہ کی تنہائیوں میں راہبانیت میں گزار دے گی۔ وہ زندگی کی تمام دلچسپیوں سے منہ موڑ چکی تھی لیکن وہ رات اس کے لیے بڑی تباہ کن ثابت ہوئی اور اس کے عزائم اور ارادوں کو اس طرح بہالے گئی جیسے پانی کا تیز دھارا خس وخاشاک کو بہالے جاتا ہے۔ زندگی کا یہ رُخ اس نے پہلی مرتبہ اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ منفی قوتیں پوری طرح اس پر حاوی ہوگئیں اور اس نے راہبہ بننے کا خیال ذہن سے نکال کر یہ ہنستی مسکراتی اور ہنگامہ خیز زندگی اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے فیصلے کی اس تبدیلی میں چارلس سوبھراج کا بڑا ہاتھ تھا یا شاید اس کا مقدّر اسے گھیر کر اس طرف لے آیا تھا۔

صبح کے سورج کی ابتدائی کرنیں سمندر کی پُرسکون لہروں پر مچل رہی تھیں۔ شہر میں روزمرّہ کے معمولات کا آغاز ہوچکا تھا لیکن پتایا کے ساحل کا یہ دورُ افتادہ حصّہ ابھی تک ویران پڑا تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ ناریل کے اُونچے درختوں اور دُور تک پھیلی ہوئی جھاڑیوں میں چڑیوں کی چہچہاہٹ بڑا رومان پرور تاثر دے رہی تھی۔

قریبی بستی کا ایک بوڑھا سائیکل پر سوار ہلکے ہلکے پیڈل مارتا ہوا شہر کی طرف جارہا تھا۔ سائیکل کے کیریئر پر انڈوں سے بھری ہوئی ٹوکری لدی ہوئی تھی۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ وہ روزانہ اسی وقت اپنے گھریلو پولٹری فارم سے جمع ہونے والے انڈے اپنے گاہکوں کو سپلائی کرنے کے لیے شہر جایا کرتا تھا۔ اس روز ساحل کے کنارے والی سڑک سے گزرتے ہوئے اس نے ایک یورپین عورت کو ساحل کی ریت پر لیٹے دیکھا تو اسے حیرت نہیں ہوئی۔ بعض غیر ملکی سیّاح صبح سویرے ساحل کی ریت پر غسلِ آفتابی سے لطف اندوز ہونا پسند کرتے ہیں۔ سمندر کی ہلکی ہلکی لہریں بار بار اس یورپین عورت کے جسم کو چھُو کر واپس لوٹ رہی تھیں۔ بوڑھا سائیکل چلاتے ہوئے بار بار مُڑ کر ریت پر تقریباً ایک دو انچ پانی میں لیٹی ہوئی اس عورت کو دیکھ رہا تھا۔ یورپین عورتیں کبھی اس کی سمجھ میں نہیں آسکی تھیں، اپنے جسم کو پُرکشش رکھنے کے لیے وہ عجیب وغریب طریقے استعمال کرتی تھیں اور غالباً یہ بھی انھی میں سے ایک طریقہ تھا کہ مُردوں کی طرح سانس روکے پڑی رہیں۔

بوڑھے کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اس وقت تک دھوپ میں اچھّی خاصی تمازت آچکی تھی لیکن وہ یورپین عورت ابھی تک اسی طرح ریت پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی پوزیشن میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ جس حالت میں بوڑھے نے جاتے ہوئے دیکھا تھا، وہ اب بھی اسی حالت میں بے حس وحرکت لیٹی ہوئی تھی۔ پانی کی لہریں اب اس کے جسم کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں یوں کھُلی ہوئی تھیں جیسے وہ آسمان کی وسعتوں میں کچھ تلاش کر رہی ہو۔

بوڑھا سائیکل سے اُتر کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ قریب پہنچتے ہی اسے صورتِ حال کو سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے بدن پر رعشہ سا طاری ہوگیا۔ وہ نوجوان اور خوب صورت یورپین عورت ریت پر چِت لیٹی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ اطراف میں پھیلے ہوئے تھے اور اب وہ پوری طرح پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بوڑھا چند لمحے پھٹی پھٹی سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بے اختیار اس نے چیخنا شروع کر دیا۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر پولیس پہنچ گئی۔ بوڑھے کا بیان نوٹ کرنے کے بعد لاش اُٹھوا دی گئی اور تحقیقات شروع ہوگئی۔ سب سے پہلے لاش کی شناخت ضروری تھی۔ پولیس نے پتایا کے تمام قابلِ ذکر ہوٹلوں سے رابطہ قائم کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ان کے ہاں قیام پذیر کوئی یورپین عورت غائب تو نہیں تھی لیکن اس سلسلے میں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

پولیس متوفیہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں قطعی ناکام رہی۔ بالآخر یہ فرض کر لیا گیا کہ وہ یورپین لڑکی پیراکی کے لیے سمندر میں اُتری ہوگی کہ حادثے کا شکار ہوگئی۔ اسے ایک اتفاقی حادثہ قرار دے کر لاش کو پلاسٹک کے بیگ میں بند کر کے لاوارثوں کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا اور کیس

داخلِ دفتر کر کے پولیس بہت جلد اس واقعے کو بھُول گئی۔

اس واقعے کے کئی ماہ بعد جب اس کیس کو دوبارہ اٹھایا گیا تو تحقیقات کے لیے لاش کا پوسٹ مارٹم کرنا ضروری سمجھا گیا۔ پولیس والے گورکن یہ بھُول چکے تھے کہ اس یورپین لڑکی کی لاش کو کہاں دفن کیا گیا تھا۔ کئی قبروں کی کھُدائی کے بعد بالآخر وہ اصل قبر دریافت کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ لاش کے بچے کھچے اجزا کے لیبارٹری ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹر نے رپورٹ دی کہ اس کے پھیپھڑوں میں نمکین پانی اور ریت کے ذرات پائے گئے تھے جو اس کی موت کا باعث بنے تھے۔ ڈاکٹر کی تحقیق کے مطابق اس لڑکی کے سر کو زبردستی ریت اور پانی میں دبائے رکھا گیا تھا جس سے ریت اور پانی اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہوگیا تھا اور سانس رُک جانے سے اس کی موت واقع ہوئی تھی۔

وہ جینفر تھی جو بچپن ہی سے پانی سے خوفزدہ تھی۔ وہ نروان کی تلاش میں گھر سے نکلی تھی اور یہ حسرت دل میں لیے اس عبرت انگیز انجام کے ساتھ دُنیا سے رخصت ہوگئی تھی۔

میری آندرے کانت ہاؤس کے سوئمنگ پول کے کنارے نرم گھاس پر لیٹی غسلِ آفتابی سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ بیلے بھی پہنچ گئی۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی لیٹ گئی اور دونوں فیشن اور کھانے کے موضوعات پر باتیں کرنے لگے۔ چند منٹ بعد ہی بیلے اس پارٹی کے بارے میں دریافت کر رہی تھی جو تین روز پہلے میری آندرے کے فلیٹ میں منعقد ہوئی تھی اور رات بھر جاری رہی تھی۔ میری آندرے نے جسم کو ذرا سا اوپر اٹھاتے ہوئے اپنا سارا بوجھ کہنیوں پر منتقل کر دیا اور بڑے رازدانہ لہجے میں بتانے لگی کہ اس رات جینفر نامی اس امریکی لڑکی نے رات بھر ہنگامہ مچائے رکھا۔ وہ اس قدر گندی ثابت ہوئی تھی کہ اس نے مردوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

”کیا وہ لڑکی اب بھی یہیں ہے؟“ بیلے نے کہتے ہوئے پانچویں منزل کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔“ میری آندرے نے نفی میں سر ہلا دیا ”وہ اسی رات ایلین کے ساتھ پتایا چلی گئی تھی۔ خیال تھا کہ رات بھر کی تفریح کے بعد صبح دونوں لوٹ آئیں گے لیکن وہاں جینفر کی ملاقات اپنے چند پرانے ہپّی دوستوں سے ہوگئی اور وہ ان کے ساتھ ہی رہ گئی۔ اس کے بعد جینفر کے بارے میں کچھ نہیں سنا گیا۔“

کانت ہاؤس کے اپارٹمنٹ نمبر پانچ سو تین اور پانچ سو چار میں جینفر کی آمد و رفت کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس وقت میری آندرے کی بات پر بھی بیلے نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی لیکن اس کے کچھ ہی دیر بعد جب میری آندرے بڑبڑانے والے انداز میں بولی تو اسے قدرے چونکنا پڑا تھا۔

”میں اپنے گھر کینیڈا واپس جانا چاہتی ہوں... مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا...“

”تب تم چلی کیوں نہیں جاتیں؟“ بیلے نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”کاش میں ایسا کر سکتی۔“ میری آندرے نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی موضوع بدل دیا۔

اس رات میری آندرے نے اپنی ڈائری میں چند اور جملوں کا اضافہ کیا۔

”کاروبار میں چارلس کے قدم جم رہے ہیں لیکن ہمارا زیادہ وقت غیر ملکیوں کے ساتھ ہی گزرتا ہے۔ بہرحال مجھے، اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ میری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ مجھے چارلس کی محبت حاصل رہے۔ اس میں اگرچہ مجھے پوری طرح کامیابی نہیں ہوئی لیکن میرے دل میں اس کی حیثیت بڑھتی جا رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک روز

اسے پالوں گی۔"

ایلین گوتھر کے فلیٹ میں آنے جانے والوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا اور ایلین ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا۔

"مجھے حیرت ہے کہ ایلین اتنے ڈھیر سارے مہمانوں کے اخراجات کس طرح برداشت کرتا ہوگا۔ ہر رات عمدہ کھانوں کے علاوہ قیمتی شراب پانی کی طرح بہائی جاتی ہے۔" بیلے نے ایک روز اپنے شوہر سیموئیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" سیموئیل نے کندھے اچکا دیے لیکن اس کے دل میں شروع ہی سے طرح طرح کے شبہات جنم لے رہے تھے کہ پانچویں منزل کے اس فلیٹ میں دراصل وہ کچھ نہیں ہو رہا جو ان کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ "ان لوگوں کے ہاں تم اپنی آمدورفت کم کر دو۔ ان سے زیادہ میل جول بڑھانا مفید نہیں ہوگا۔" اس نے کہا۔ صرف دو روز پہلے اسے اپنے ذرائع سے اطلاع ملی تھی کہ بنکاک کے ایک بڑے ہوٹل میں ایلین کے داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے کیونکہ ہوٹل کی انتظامیہ کو یہ پسند نہیں تھا کہ وہ ہوٹل کے شاپنگ آرکیڈ میں گھومتے ہوئے غیر ملکی سیاحوں کو ورغلاتا رہے۔ یوں بھی ہوٹل کی انتظامیہ کو اس کی سرگرمیوں پر کچھ شبہ سا ہوا تھا۔

بیلے کے خیال میں ایلین گوتھر کے بارے میں سیموئیل کے شبہات بے بنیاد تھے۔ یوں بھی اسے ایلین گوتھر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو میری آندرے یا بالفاظ دیگر مونیکا سے زیادہ دلچسپی تھی۔ ان میں گہری دوستی کا رشتہ استوار ہو چکا تھا اور وہ اپنے اپنے ملک سے ہزاروں میل دور اس اجنبی شہر میں ایک دوسرے سے اپنے دکھ سکھ کا اظہار کر لیا کرتی تھیں۔ ان کی گفتگو ملبوسات، کھانوں اور مہنگائی تک محدود رہتی اور ظاہر ہے ان باتوں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن اکتوبر کے اختتام پر نومبر کا مہینہ شروع ہوتے ہی کچھ ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات رونما ہونے لگے جو بیلے کی نگاہوں سے پوشیدہ تو نہ رہ سکے لیکن اس نے اس طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔

ایک روز بیلے جب میری آندرے کے فلیٹ میں گئی تو چارلس کے بیڈ روم میں ہتھکڑیوں کا ایک جوڑا۔ ایک اسپائی گلاس والی ٹاکی اور دوربین دیکھ کر چونک سی گئی۔ اس نے ان چیزوں کو نظر انداز کرنا چاہا لیکن ہتھکڑی اور واکی ٹاکی نے اسے استفسار پر مجبور کر ہی دیا۔

"ان چیزوں کا تعلق میرے کاروبار سے ہے۔" چارلس نے اس طرح خشک لہجے میں جواب دیا کہ بیلے مزید کچھ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکی لیکن بعد میں ایک موقعے پر اس نے اشارۃً یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ... وہ ویتنام میں کمیونسٹ حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے حریت پسندوں کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دے رہا ہے۔

بیلے نے اپنے شوہر تک اطلاع پہنچانے میں زیادہ دیر نہیں لگائی کہ ایلین کا سیاست میں بھی عمل دخل ہے اور وہ کمیونسٹ ویتنامی حکومت کے خلاف حریت پسندوں کے ساتھ مل کر کام کر رہا ہے۔

"سیاست میں وہ ایسا ہی ہے جیسے بندر کو کپڑے پہنا دیے جائیں۔" سیموئیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور اپنی بیوی کو ایک بار پھر تنبیہ کی کہ وہ ایلین فیملی کے معاملات میں زیادہ دلچسپی نہ لے اور نہ ہی کسی قسم کی مداخلت کرے۔

لیکن بیلے اپنی متجسّس طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھی۔ دوسروں کے معاملات میں کنسوئیاں لینے کی اس کی یہ عادت بہت پرانی تھی۔ ایک روز جب وہ ایلین کے فلیٹ میں داخل ہوئی تو میری آندرے کچن میں کافی بنانے میں مصروف تھی۔ ایلین کے بیڈ روم سے گزرتے ہوئے بیلے کی نظر اس پورٹیبل سیف کی طرف اٹھ گئی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک خانے میں مختلف رنگوں والے لاتعداد پاسپورٹ پڑے ہوئے تھے۔ مختلف رنگ ان کا تعلق مختلف ممالک سے ظاہر کر رہے تھے۔ دوسرے خانے میں ایک چھوٹا سا صندوقچہ کھلا ہوا تھا جس میں قیمتی پتھر بھرے ہوئے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد روبیز کی تھی۔

چند روز تک تو بیلے اس معاملے میں خاموش رہی۔ اس نے اپنے شوہر سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ زیادہ دنوں تک اس بات کو ہضم نہ کر سکی اور آخر ایک روز اس نے میری آندرے سے ایلین کے سیف میں ان پاسپورٹوں کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔

"اسی سے پوچھ لینا۔" میری آندرے نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔ بیلے اس کے چہرے پر انجانے سے خوف کے ہلکے سے تاثرات کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ "وہ اکثر مختلف ممالک کے سفر کرتا رہتا ہے۔" میری آندرے نے بات جاری رکھی۔ "ممکن ہے اس نے اُن ملکوں کی شہریت لے رکھی ہو۔"

ایسی بہت سی غیر معمولی چیزوں کے علاوہ بیلے کو ایلین گوتھر کے بیمار مہمانوں نے بھی الجھا رکھا تھا۔ ڈومنک دو ماہ سے بیمار تھا اور چیانگ مائی کے ریسٹورنٹ میں چارلس سے پہلی ملاقات سے اب تک اس کے وزن میں تقریباً پچیس پونڈ کی کمی آ چکی تھی۔ چارلس اگرچہ باقاعدگی سے ہر صبح اسے گلابی رنگ کا مکسچر دے جاتا مگر کئی روز سے ڈومنک نے چارلس کی دی ہوئی دوا کا استعمال بند کر دیا تھا۔ ایک روز اتفاق

سے اسے فلیٹ سے باہر نکلنے کا موقع مل گیا تھا اور وہ پیچش اور پیٹ میں درد کی گولیاں لے آیا تھا اور اب چارلس کی دی ہوئی دوا کے بجائے وہی گولیاں استعمال کر رہا تھا۔

نومبر کے شروع میں ڈومنک اپنے آپ کو قدرے بہتر محسوس کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ سفر کر سکتا ہے۔ ایک روز اس نے چارلس سے اپنے پاسپورٹ کا مطالبہ کیا تو وہ چند لمحے عجیب سے نگاہوں سے اسے گھورتا رہا پھر قدرے درشت لہجے میں بولا۔

"بالکل نہیں، تم ابھی اس قابل نہیں کہ چند میل کا سفر بھی برداشت کر سکو۔ جب تک تمھارے جسم میں پہلے کی سی توانائی نہیں آ جاتی میں اس وقت تک تمھیں سفر کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

چارلس کے دوسرے مہمان یانک اور جیکسن بھی اگرچہ وقتاً فوقتاً پیٹ کی بیماری میں مبتلا ہوتے رہتے تھے لیکن ڈومنک کی نسبت وہ صحت مند تھے اور چارلس کے لیے کام کرتے رہتے تھے۔ کبھی وہ گاہکوں کی تلاش میں شہر کی سڑکوں پر مارے مارے پھرتے اور کبھی گھر کی صفائی کرتے ہوئے نظر آتے۔ بوقتِ ضرورت چارلس اپنی کرائے کی گاڑی پر ان میں سے کسی ایک سے شوفر کا کام بھی لے لیتا۔ جب اور کوئی کام نہ ہوتا تو چارلس ان سے دونوں فلیٹوں کے فرش دھلوانا شروع کر دیتا۔ وہ دونوں نہایت خاموشی سے اس کے احکامات پر عمل کرتے رہتے۔ وہ اس کوشش میں تھے کہ دونوں کے پاس ایک ایک ہزار ڈالر جمع ہو جائیں تاکہ وہ چارلس کے احسانات کا حساب چکانے کے بعد پیرس تک کا ہوائی ٹکٹ خرید سکیں۔

"تمھارا یہ دوست ایلین گوتھر اپنے آپ کو بگ باس کی حیثیت میں دیکھنا پسند کرتا ہے۔" سیموئیل نے یہ بات بیلے سے اس وقت کہی تھی جب ایک رات وہ اپنی بیوی کو چارلس کے فلیٹ میں ہونے والی پارٹی سے اٹھا کر لایا تھا۔ "اسے دیکھ کر مجھے ایڈورڈ رابنس یاد آ جاتا ہے جو فلموں میں ہمیشہ غنڈوں کے سرغنہ کا کردار ادا کیا کرتا تھا۔ بہرحال، ایلین کی بیوی ایک اچھی عورت ہے جس سے وہ اپنے ہاں آنے والے گاہکوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ ایک خوشگوار گھریلو زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے باڈی گارڈ بھی موجود ہے اور وہ ہر وقت احکامات جاری کرتا رہتا ہے۔ گویا ان سب کا اَن داتا ہو۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں ایلین دنیا کا سب سے بڑا فراڈ ہے اور میں ایک بار پھر تمھیں یہی مشورہ دوں گا کہ اس سے دور ہی رہو۔"

بیلے کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔ اسے ایلین پر اپنے شوہر کی ہر وقت کی یہ نکتہ چینی پسند نہیں آئی تھی۔ وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر خوابگاہ میں گھس گئی۔

اس رات اس نے اپنے شوہر کی باتوں پر غور کرتے ہوئے صورتحال کا جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہنچی کہ ایلین گوتھر اور اس کی بیوی مونیکا میں کوئی برائی نہیں تھی۔ وہ دونوں وقت کے تیز رفتار دھارے کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہے تھے اور ظاہر ہے ہر شخص کے دل میں یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ وہ زندگی کا بھرپور لطف اٹھائے۔ یہ درست تھا کہ ایلین بعض اوقات آؤٹ آف دے طریقہ اختیار کرتا تھا لیکن سوال تو یہ تھا کہ ایسا کون شخص تھا جو محض رزقِ حلال کے چکر میں زندگی برباد کرنا چاہتا ہو؟

نومبر کے وسط میں اس فلیٹ کے باسیوں میں دو اور مہمانوں کا اضافہ ہو گیا۔ وہ دونوں کنیڈین تھے اور اتفاق سے دونوں بیمار تھے۔ چارلس انھیں سہارا دے کر اوپر تک لایا تھا اور یہ بھی محض اتفاق تھا کہ بیلے بھی اس وقت فلیٹ میں موجود تھی۔

"میں تمھیں اب تک نہیں سمجھ سکی کہ تم کیا ہو؟" بیلے نے چارلس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ وہ ان دونوں نوجوانوں کو ہر چند منٹ بعد باتھ روم کا رُخ کرتے

دیکھ کر پریشان سی ہو گئی تھی۔

"کیا مطلب، کیا کہنا چاہتی ہو؟" کہتے ہوئے اگرچہ چارلس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن لہجے کی سرد مہری چھپ نہیں رہ سکی تھی۔

"اوہ، کچھ نہیں۔" بیلے گڑبڑا سی گئی۔ "مجھے صرف اس بات پر تشویش ہے کہ اس فلیٹ میں آنے والا تمھارا ہر مہمان بیمار کیوں ہو جاتا ہے؟"

"یہ بنکاک ہے۔" چارلس نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ "اگر لوگ یہاں آکر بیمار ہو جاتے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں تو صرف ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

میری آندرے بھی اس وقت موجود تھی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اگر بات کچھ آگے بڑھی تو اچھا خاصا ہنگامہ ہو جائے گا۔ وہ بیلے کو ایک طرف لے گئی اور اسے سمجھانے لگی کہ ایلین کے ساتھ نہ تو کبھی اس لہجے میں بات کرے اور نہ ہی اس کے معاملات میں کسی قسم کی مداخلت یا جرح کرے۔ اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس اجنبی سرزمین پر غیر ملکیوں کی خدمت کر رہا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

"مجھے افسوس ہے۔" بیلے نے معذرت کی لیکن اسے حیرت اس بات پر ہوئی تھی کہ چارلس سے اس کی باتوں نے میری آندرے کو پریشان کیوں کر دیا تھا۔

ایلین کے فلیٹ میں آنے والے نئے مہمان میاں بیوی تھے۔ راجر کلیبر کی عمر ستائیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اس نے حال ہی میں میڈیکل یونیورسٹی سے دندان سازی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کی خوبصورت بیوی گیزل تدریس کے ساتھ ساتھ فلاسفی کی تعلیم بھی حاصل کر رہی تھی۔ اپنے اپنے شعبوں میں عملی زندگی شروع کرنے سے پہلے وہ دنیا کی سیاحت کر لینا چاہتے تھے اور اسی سلسلے میں دنیا کے مختلف ممالک کی سیر کرتے ہوئے بنکاک پہنچے تھے۔ اس روز وہ پتایا میں تفریح کے دوران کرائے کے ہاتھی کی سواری کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے کہ اپنے قریب کھڑے ہوئے ایک مرد اور عورت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ عورت کی صورت تو بس واجبی سی تھی مگر مرد کو ایک نظر دیکھنے کے بعد نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ ایسی ہی پر وقار اور پرکشش شخصیت کا مالک تھا وہ۔

ان دونوں نے اپنے آپ کو میاں بیوی کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا۔ ایلین گوتھر اور مونیکا۔ اپنے ملک سے ہزاروں میل دور اپنے ہموطنوں سے مل کر میری آندرے کا دل بھر آیا۔ وہ اپنے ملک کے تازہ ترین حالات معلوم کرنے لگی۔ راجر اور گیزل بڑی خوش اخلاقی سے اس کی باتوں کا جواب دیتے رہے۔

اس رات انھوں نے پتایا کے سب سے بڑے اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا جہاں ڈانس فلور بھی موجود تھا اور ہلکی موسیقی پر کئی جوڑے رقص کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ راجر اور گیزل کھانے دوران بار بار اُٹھ کر ڈانس فلور پر پہنچ جاتے۔ کھانے کے بعد وہ شہر کی سیر کرتے رہے۔ اسی دوران ایلین نے انھیں پیش کش کی تھی کہ اگر وہ پسند کریں تو بنکاک میں تفریح کے دوران ان کے اپارٹمنٹ میں جب تک چاہیں قیام کر سکتے تھے۔ راجر اور گیزل بنکاک میں صرف چند گھنٹے رکنے کے بعد ہی پتایا چلے آئے تھے۔ ان کا پروگرام یہی تھا کہ بنکاک کی سیر پتایا سے واپسی پر ہی کی جائے۔

اسی رات ان دونوں میاں بیوی کو پیچش شروع ہو گئی۔ وہ رات بھر اس اذیت میں مبتلا رہے اور پو پھٹنے تک تو وہ اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ کسی سہارے کے بغیر چلنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ ایلین صبح کی روشنی طلوع ہونے سے پہلے ہی انھیں اپنی گاڑی پر لاد کر بنکاک روانہ ہو گیا۔ صبح ہونے پر جب وہ کانت ہاؤس میں داخل ہوئے تو ایلین نے راجر اور میری آندرے نے گیزل کو سہارا دے رکھا تھا۔ وہ دونوں جاتے ہی بستر پر گر گئے۔

وہ دونوں تقریباً چوبیس گھنٹے سوتے رہے۔ دوسرے روز صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو مونیکا ان کے لیے کافی لیے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں ہمدردی کی جھلک تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے دونوں کو کافی پلائی۔ اس دوران وہ کینیڈا ہی کے بارے میں باتیں کرتی رہی پھر عجیب سی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

مونیکا کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد راجر اور گیزل پر ایک بار پھر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے رہے لیکن جلد ہی ایک بار پھر گہری نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔ اس مرتبہ بھی وہ تقریباً چوبیس گھنٹے دنیا سے بے خبر رہے۔ جب آنکھ کھلی تو نقاہت کے ساتھ وہ اپنے آپ میں ایک انجانا سا خوف محسوس کر رہے تھے۔ انھیں بنکاک آئے ہوئے اڑتالیس گھنٹے ہو چکے تھے لیکن انھیں قطعی علم نہیں تھا کہ پتایا کے اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کے بعد سے اب تک ان پر کیا بیتی تھی۔

ان کے ہوش میں آنے کے کچھ ہی دیر بعد ایلین بھی کمرے میں پہنچ گیا اور ہمدردی جتاتے ہوئے بتانے لگا کہ وہ ایک ایسی خوفناک بیماری میں مبتلا ہو چکے ہیں جس میں پیچش کے ساتھ مریض پر نیند کا غلبہ بھی رہتا ہے۔ اس نے دروازے کی طرف رُخ کر کے مخصوص انداز میں تالی بجائی۔ فوراً ہی ڈومنک نمودار ہوا۔ اس نے ایلین کے اس بیان کی تصدیق کی کہ اس بیماری کے دوران وہ بھی ہفتوں مدہوشی کی کیفیت میں رہا ہے۔

"اگر ایسی بات ہے تو یہ بیماری مہلک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ بہتر ہو گا کہ کسی ڈاکٹر کو بلا لیا جائے۔" راجر نے خوفزدہ سے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" ایلین نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ "مجھ سے بہتر اس بیماری کو تھائی لینڈ کا کوئی ڈاکٹر بھی نہیں سمجھ سکتا۔ میرے پاس کچھ ایسی دوائیں ہیں جن کے بارے میں تھائی ڈاکٹر بھی کچھ نہیں جانتے۔ تم لوگوں کا علاج میں خود کروں گا۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر تم خود ہی ہمارا علاج کرنا چاہتے ہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" راجر کے لہجے میں کمزوری تھی۔

"ایک بات اور۔" ایلین اس انداز میں بولا جیسے اسے اچانک ہی کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ "یہاں بہت سے لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ کسی کے دین ایمان کا کوئی بھروسہ نہیں۔ تم لوگوں کے پاس اگر کوئی قیمتی چیز ہو تو مجھے دے دو تاکہ اسے حفاظت سے رکھ دیا جائے۔"

راجر اور گیزل نے نہایت فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے پاسپورٹ، ہوائی ٹکٹ، نقدی اور ٹریولرز چیک اس کے حوالے کر دیے۔ وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ رہے تھے کہ پتایا میں ایلین گوتھر جیسے شخص سے ملاقات ہو گئی تھی جو دوسروں کی ہمدردی میں گھلا جا رہا تھا۔ ایلین نے انھیں دوا کی ایک ایک خوراک پلا دی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں کم از کم دو دن کے لیے نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

ایک ہفتے میں وہ ڈھانچوں میں تبدیل ہو گئے۔ گیزل کو جب بھی ہوش آتا اس کا زیادہ وقت باتھ روم کے چکر کاٹنے میں گزرتا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ تین چار گھنٹوں میں اسے کم از کم بیس مرتبہ باتھ روم جانا پڑا تھا۔ راجر پر نیم مدہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ وہ جب بھی ہوش میں آتا تھا ایلین گوتھر یا مونیکا کمرے میں آ جاتی اور انھیں دوا پلا کر چلی جاتی۔ یہ دوا گلابی رنگ کے بد ذائقہ مکسچر اور گولیوں پر مشتمل ہوتی۔ دوا پلاتے وقت مونیکا ان سے باتیں بھی کرتی رہتی۔ اس نے انھیں بتایا کہ وہ کیوبک سٹی کے اسپتال میں باقاعدہ نرس رہ چکی ہے اور مریض کی دیکھ بھال کرنا خوب جانتی ہے اس لیے ان دونوں کو اس کی ہدایات پر عمل کرتے رہنا چاہیے۔

ایک رات جبکہ فلیٹ پر خاموشی طاری تھی، اپنے پہلو میں گیزل کی سسکیاں سن کر راجر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ دونوں کچھ دیر پہلے ہی ہوش میں آئے تھے۔

"کیا ہم مر رہے ہیں؟" گیزل نے سسکی لیتے ہوئے کمزور سے لہجے میں کہا۔ "وطن سے ہزاروں میل دور، اجنبی ملک میں جہاں ہمارے لیے کوئی رونے والا بھی نہ ہو گا۔"

"نہیں ڈارلنگ!" راجر نے اسے تسلی دی۔ "مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ بعض اوقات معمولی سی بیماری بھی طول کھینچ لیتی ہے۔" گیزل کو تو وہ تسلی دے رہا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو بھی لمحہ بہ لمحہ موت کی طرف بڑھتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں انھیں غلط دوا تو نہیں دی جا رہی؟

ایلین گوتھر "بزنس" کے سلسلے میں چند روز کے لیے کہیں جا رہا تھا۔ اس نے مونیکا کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ گھر اور مہمانوں کا پورا پورا خیال رکھے۔ اس میں معمولی سی غفلت بھی نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے دوسرے ہی روز مونیکا دوا لے کر راجر اور گیزل کے کمرے میں پہنچ گئی اور وہیں رک کر ان کے دوا پینے کا انتظار کرنے لگی۔ راجر نے اسے دوا میز پر رکھ دینے کو کہا کیونکہ اس وقت کسی چیز کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر پانی کا ایک قطرہ بھی اس کے حلق سے نیچے اترا تو قے ہو جائے گی۔ مونیکا کی بھویں تن گئیں۔ مگر ظاہر ہے وہ زبردستی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دوا میز پر رکھ کر یہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی کہ کچھ دیر بعد آ کر دیکھے گی کہ اس نے دوا پی لی ہے یا نہیں۔

"مجھے یقین ہے کہ بیماری کی اصل وجہ یہی دوا ہے۔" مونیکا کے جانے کے بعد راجر نے گیزل کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ "ڈارلنگ! اب تم بھی اس دوا کو ہاتھ مت لگانا۔"

گیزل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اس حد تک مایوس ہو چکی تھی کہ کسی کی کسی بھی ہدایت پر عمل کرنے کو تیار تھی۔ راجر بستر سے اٹھ کر گرتا پڑتا باتھ روم میں گھس گیا اور دوا فلش میں بہا دی۔

اس روز وہ اپنے آپ کو قدرے بہتر محسوس کرنے لگا۔ دوا کے استعمال نہ کرنے سے اس نے اپنے آپ میں جو تبدیلی محسوس کی تھی، اس سے اسے یقین ہو گیا کہ ایلین گوتھر

کسی خاص مقصد کے تحت انھیں غلط دوائیں استعمال کرا رہا تھا۔

اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔ وہ مونیکا سے دوا لے کر رکھ لیتے اور اس کے جاتے ہی راجر ساری دوا گٹر میں بہا دیتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چند ہی روز میں اپنے آپ کو بہتر محسوس کرنے لگے۔ ان میں اتنی توانائی آ گئی تھی کہ اب وہ اپنا سفر جاری رکھ سکتے تھے۔ ایک روز میری آندرے جیسے ہی ان کے کمرے میں پہنچی، راجر اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"ہمارے پاسپورٹ، نقدی، ٹکٹ اور ٹریولرز چیک کہاں ہیں؟ ہم اب یہاں سے رخصت ہونا چاہتے ہیں!"

میری آندرے کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا لیکن اس نے جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔

"اس کے لیے تمھیں ایلین گوتھر کی واپسی کا انتظار کرنا ہوگا!" وہ مرتعش لہجے میں بولی "تمھاری چیزیں ایلین کے سیف میں ہیں اور مجھے سیف کا کومبی نیشن معلوم نہیں۔ ایلین آجکل میں آنے ہی والا ہے!"

اس خوف سے کہ وہ میاں بیوی کوئی ہنگامہ کھڑا نہ کر دیں وہ انھیں بہلا پھسلا کر شہر کی سیر کرانے لے گئی۔ دوپہر کا کھانا بھی انھوں نے ایک بہترین ریسٹورنٹ میں کھایا۔ اس دوران راجر محسوس کر چکا تھا کہ ان کی میزبان کچھ اکھڑی اکھڑی سی ہے۔ اس کے چہرے پر بار بار کرب کے تاثرات ابھر آتے۔

"شاید تم کچھ تکلیف محسوس کر رہی ہو۔ تمھاری طبیعت تو خراب نہیں ہو رہی؟" راجر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اوہ" نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں" میری آندرے سنبھل گئی اور پھر اس نے اپنے "شوہر" کے خلاف شکایتوں کی پٹاری کھول دی کہ وہ کس طرح اسے ہر معاملے میں نظرانداز کرتا رہتا ہے۔ وہ کئی مرتبہ اس سے کینیڈا جانے کے لیے کہہ چکی ہے لیکن وہ اس کی بات پر کان ہی نہیں دھرتا۔

"میں نے سنا ہے کہ مشرقی ممالک کے قوانین میں بیوی کو خاصا تحفظ حاصل ہے۔ تم اپنے حقوق کے لیے عدالت سے رجوع کیوں نہیں کرتیں؟" راجر نے مشورہ دیا۔

"مجھ پر ایسا بھی ظلم نہیں ٹوٹ رہا" میری آندرے اب ایلین کی وکالت پر اتر آئی "میں زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی ہوں۔ ہم اکثر مختلف مقامات کی سیاحت کے لیے بھی جاتے ہیں۔ بے شمار لوگوں سے ملاقات بھی ہوتی ہے۔ دراصل، میرے اعصاب تھک چکے ہیں!"

"تب تو میں تمھیں خوش قسمت سمجھوں گی!" گیبرل مسکرائی۔

"ہاں ہیں خوش قسمت ہوں!" میری آندرے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "میں واقعی بہت خوش قسمت ہوں!"

وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہی تھی لیکن راجر اور گیبرل اس کے چہرے کا کرب محسوس نہ کر سکے

نومبر ۱۹۷۵ء کے آخری ہفتے میں وٹیالی حکیم برما سے ہوتا ہوا بنکاک پہنچ گیا۔ کارمائن بھی حسب پروگرام دو تین روز بعد یہاں پہنچنے والی تھی اور اس دوران وٹیالی حکیم کو اس شخص سے رابطہ قائم کرنا تھا جس کی دعوت پر وہ راتوں رات دولت مند بننے کی امیدیں لے کر یہاں آیا تھا۔

بنکاک میں پہلی رات یہ یہودی نوجوان جی بھر کے تفریح کر لینا چاہتا تھا۔ ایک دو گھنٹے پیٹ پونگ کی گلیوں میں گزارنے کے بعد ایک ریسٹورنٹ میں اس نے اتنا کھانا کھا لیا کہ اسے اپنا پیٹ پھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس پر وہ تھائی بیئر کے گلاس یکے بعد دیگرے حلق میں انڈیلتا جا رہا تھا۔ اپنے آپ کو فربہی کی طرف مائل پا کر اگرچہ وہ کئی دنوں سے ڈائیٹنگ کر رہا تھا لیکن آج کی رات اس نے ساری احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

ریسٹورنٹ سے نکل کر وہ بدمست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا بازاروں میں ٹہلنے لگا۔ بسیار خوری اور خالص بیئر کے کئی گلاس چڑھانے کے بعد اسے اپنی طبیعت میں بوجھل پن سا محسوس ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی آنکھوں کے سامنے دھند سی چھانے لگتی۔ وہ مختلف سڑکوں پر ٹہلتا ہوا ایک ایسے اوپن ائیر ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا جہاں ایک چبوترے پر بنے ہوئے رنگ میں باکسنگ کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ ریسٹورنٹ کے گاہک اس کھیل سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جب ایک باکسر دوسرے کو زوردار ہک یا پنچ رسید کرتا یا فلائنگ کک لگاتا تو تماشائی چیخ چیخ کر داد دیتے۔ وٹیالی حکیم یہ جان کر ششدر رہ گیا کہ باکسنگ کے فن میں بے پناہ مہارت دکھانے والے وہ دونوں کھلاڑی مرد نہیں لڑکیاں تھیں۔

اس اوپن ائیر ریسٹورنٹ سے نکل کر وہ ایک نائٹ کلب میں پہنچ گیا۔ اس نے آوارہ گردی کے دوران بیشتر ممالک کے نائٹ کلبوں میں ... رقص دیکھے تھے لیکن تھائی رقاصاؤں کی بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ آدھی رات تک رقص سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر نائٹ کلب سے نکل کر ملائشیا ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا جہاں اس نے کمرہ بک کروا رکھا تھا۔ آدھی رات کے بعد سڑکوں پر چیکنگ شروع ہو جاتی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی پولیس والا اسے بھی روک کر بازپرس شروع کر دے

کیونکہ اس کی جیب میں وہ دو نام موجود تھے جنھوں نے اس سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ ان میں ایک اسکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا اور دوسرا چینی۔ وہ برما سے بھاری مقدار میں ہیرے اور مارفین لے کر آنے والے تھے جو وٹیالی حکیم کے حوالے کر دی جاتی اور وہ ان چیزوں کو کارمائن کے ذریعے پیرس بھجوا دیتا۔

دوسرے دن تقریباً سات گھنٹوں تک وٹیالی حکیم اپنے ان مطلوبہ آدمیوں کو تلاش کرتا رہا مگر کوئی بھی ٹیکسی ڈرائیور اس کا مطلوبہ اپارٹمنٹ ہاؤس تلاش نہیں کر سکا تھا۔ بالآخر وہ ہوٹل واپس آ گیا۔ اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔

اس رات وہ کھانا کھانے کے بعد کمرے میں بند ہو کر ایسا سویا کہ دوسرے دن شام سے پہلے اس کی آنکھ نہ کھل سکی۔ وہ تیار ہو کر لابی میں آ گیا تاکہ ٹیلی فون کال بک کرا سکے لیکن آپریٹر نے بتایا کہ کم از کم چھ گھنٹوں سے پہلے اس کی کال نہیں مل سکے گی۔ وٹیالی نے چند بھاٹ (تھائی کرنسی) اس کے ہاتھ میں تھما دیے اور کاؤنٹر پر پڑا ہوا اخبار اٹھا کر لابی میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ آپریٹر کو نذرانہ پیش کرنے کے بعد اسے یقین تھا کہ کال ملنے میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

اس کے دماغ پر ابھی تک نیند کا خمار طاری تھا۔ اخبار پڑھتے ہوئے وہ بار بار اونگھ جاتا۔ اسے یہ بھی احساس نہیں ہو سکا تھا کہ دو آدمی کب اس کے پاس دوسری کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ ان میں ایک کے چہرے کے نقوش قدرے مشرقی تھے اور دوسرا سو فیصد ہندوستانی تھا۔ ان دونوں کے چہروں پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔ وٹیالی حکیم کو جلد ہی انھوں نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ان سے باتیں کرتے ہوئے وٹیالی حکیم محسوس کر رہا تھا جیسے ان سے بہت پرانی شناسائی رہی ہو۔

رات اپنا نصف سفر طے کر چکی تھی۔ اس کی کال ابھی تک نہیں ملی تھی۔ بالآخر اپنے ان نئے ہمدرد دوستوں کی خواہش پر وٹیالی حکیم نے اپنے کمرے سے سامان سمیٹا اور کمرے کا حساب چکا کر ان کے پینٹ ہاؤس روانہ ہو گیا۔ ان میں ایک کا نام ایلین گوتھر تھا اور دوسرا اجے چودھری۔

ہوٹل چھوڑنے سے پہلے وٹیالی حکیم، کارمائن کے نام پیغام چھوڑنا نہیں بھولا تھا۔ نبد لفافہ ہوٹل کے کاؤنٹر کلرک کے حوالے کرتے ہوئے اس نے ہدایت کی تھی کہ ایک دو دن میں اس نام کی لڑکی جیسے ہی یہاں پہنچے یہ لفافہ اس کے حوالے کر دیا جائے۔ لہٰذا اسے روانہ ہوتے ہوئے اس نے کارمائن کو بنکاک کے تین ہوٹلوں کے نام دیے تھے کہ وہ ان میں سے کسی ایک میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے

اس مشن کا انحصار کارمائن پر تھا اور کارمائن کو وہ بڑی حد تک سمجھ چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر یہاں آتے ہی کارمائن کی اس سے ملاقات نہ ہوئی تو وہ دوسرے ہی روز لہٰذا واپس چلی جائے گی۔ اسی لیے اس نے ہوٹل میں اس کے لیے پیغام چھوڑنا ضروری سمجھا تھا۔

چارلس کی واپسی پر ایک نوجوان ترک یہودی کو اس کے ساتھ دیکھ کر میری آندرے سٹپٹا سی گئی۔ ان کا فلیٹ ایک باقاعدہ سرائے بن چکا تھا۔ پلنگ اور صوفوں کے علاوہ فرش پر بھی بستر بچھے ہوئے تھے۔ اس سرائے میں مقیم ہر شخص پیچش کا شکار تھا اور دن رات فلش میں پانی گرنے کی آواز آتی رہتی تھی۔

واپسی کے بعد اگلے دو دن چارلس کا رویہ بڑا پُراسرار سا رہا۔ اس کی حرکتوں سے اندازہ ہو رہا تھا جیسے وہ کینیڈین جوڑے سے اب پیچھا چھڑانا چاہتا ہے اس کے ساتھ ہی وہ وٹیالی حکیم پر بھرپور توجہ دے رہا تھا۔ اس یہودی نوجوان نے اشاروں کنایوں میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ بڑی مقدار میں قیمتی پتھر خریدنا چاہتا ہے۔ کینیڈین دندان ساز راجر اب تکلیف دہ ثابت ہونے لگا تھا۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی ہنگامے پر تلا رہتا اور بات بات پر اپنے پاسپورٹ اور ٹریولرز چیکس وغیرہ کی واپسی کا مطالبہ کرتا۔ اس نے اکثر اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ وہ تھائی لینڈ کے شمال میں خوبصورت ترین شہر چیانگ مائی کی سیر کو جانا چاہتا ہے۔

وٹیالی حکیم کی رات اطمینان سے گزری لیکن صبح ہوتے ہی اسے بھی اس فلیٹ کے دوسرے مہمانوں کی طرح پیچش ... کی بیماری نے گھیر لیا تھا اور چارلس سوبھراج ایک مشفق، مہربان اور فرض شناس میزبان کی طرح دوا کا گلاس لے کر اس کی مدد کو پہنچ گیا تھا جسے پینے کے بعد وٹیالی حکیم کم از کم چوبیس گھنٹوں کے لیے گہری نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

اس روز چارلس نے راجر کو یہ خوشخبری سنائی کہ وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں چیانگ مائی جا رہا ہے اگر وہ لوگ پسند کریں تو وہ انھیں بھی اپنی گاڑی پر لے جانے کو تیار ہے۔ راجر اور گیبرل اگرچہ اپنے آپ میں اب بھی بے حد کمزوری محسوس کر رہے تھے لیکن انھوں نے فوراً ہی اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ انھیں یقین تھا کہ آب و ہوا کی تبدیلی ان کی صحت کے لیے مفید ثابت ہو گی۔ یوں بھی یہ سفر دن میں ہونے والا تھا اور ان کا خیال تھا کہ وہ راستے کے قدرتی مناظر سے بھی پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں گے، لیکن پھر یکایک چارلس غائب ہو گیا۔ وہ صرف چند منٹ کا

کہہ کر گیا تھا لیکن اس کی واپسی رات دس بجے سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ اس نے آتے ہی اعلان کر دیا کہ ہر شخص تیار ہو جائے۔ وہ پکنک کے لیے چیانگ مائی جا رہے ہیں۔ اس کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد کرائے کی ٹویوٹا چیانگ مائی کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ گاڑی میں راجر اور گیزل کے علاوہ چارلس، اجے چوہدری اور میری آندرے بھی موجود تھی جس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔

فلیٹ سے رخصت ہونے سے چند منٹ پہلے چارلس غیر متوقع طور پر دوا کے دو گلاس لے کر راجر اور گیزل کے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ اس کے خیال میں روانگی سے پہلے ان کے لیے یہ دوا پی لینا ضروری تھا کیونکہ راستہ ناہموار تھا اور گاڑی کے جھٹکوں سے ان کے معدوں میں گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ راجر نے گلاس اس طرح ہونٹوں سے لگا لیا جیسے وہ واقعی دوا پینے جا رہا ہو جبکہ گیزل اپنے گلاس سے ایک ہلکی سی چسکی لے چکی تھی۔ اسی دوران کچن سے میری آندرے نے چارلس کو کسی کام کے لیے پکارا۔ چارلس ان دونوں کی طرف دیکھتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس قیمتی موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راجر نے بڑی پھرتی سے دونوں گلاسوں کی دوا باتھ روم کے فلش میں بہا دی اور چند منٹ بعد جب چارلس دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو گلاس خالی دیکھ کر اس نے اطمینان سے سر ہلا دیا۔

”یہ دوا تم لوگوں کو سفر کی بہت سی تکلیفوں سے بچائے رکھے گی۔“ وہ باری باری ان کے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

اور اب ڈرائیونگ کرتے ہوئے چارلس مسلسل جھک رہا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً مڑ کر راجر اور گیزل کی طرف بھی دیکھ لیتا۔ اسے امید تھی کہ کچھ ہی دیر میں یہ دونوں انٹاغفیل ہو جائیں گے لیکن چار گھنٹے میں تقریباً دو سو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بھی جب وہ پوری طرح بیدار اور ہوش و حواس میں نظر آئے تو چارلس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

چارلس نے ایک گیراج کے سامنے کار روک لی اور راستہ دیکھنے کے لیے اجے چوہدری کے ساتھ گاڑی سے اتر کر ایک طرف چلا گیا۔ چند منٹ میں جب وہ واپس لوٹے تو دونوں کے چہرے بگڑے ہوئے تھے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی بات پر آپس میں جھگڑ پڑے تھے۔ لیکن اجے چوہدری کا رویہ نرم تھا۔ اس نے کبھی چارلس کے سامنے اونچے لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ وہ کسی دیوتا ہی کی طرح چارلس کی پرستش کرتا تھا اور اسے اب تک چارلس سے کسی بات پر اختلاف کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا تھا۔ لیکن اس وقت جب وہ دوبارہ گاڑی میں آ کر بیٹھے تو اجے چوہدری، جو راستے بھر انھیں لطیفے سناتا رہا تھا، اس طرح خاموش ہو گیا جیسے اس کے ہونٹوں کو تالا لگ گیا ہو۔

”ہم غلط راستے پر آ نکلے ہیں۔“ چارلس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت رات کے تین بج رہے ہیں اور راستے کی تلاش میں سفر جاری رکھنا خطرے سے خالی نہیں ہو گا۔ اس لیے اب ہم بنکاک واپس جا رہے ہیں۔“

راجر اور گیزل پر مایوسی طاری ہو گئی۔ وہ اپنے آپ کو انجانے سے خطرے میں محسوس کر رہے تھے۔ رات کے اس آخری پہر میں اگرچہ نیند ان پر بار بار حملہ آور ہو رہی تھی لیکن وہ دونوں اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے رہے اور بالآخر صبح بنکاک پہنچ کر انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

کانت ہاؤس پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد چارلس دوا لے کر ان کے کمرے میں گھس آیا اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ لوگ بُرا نہ مانیں تو انھیں صرف ایک رات کے لیے کسی ہوٹل میں منتقل کر دیا جائے کیونکہ آج رات یہاں جواہرات کا ایک بہت بڑا خریدار آنے والا ہے۔ فلیٹ میں بہت سے بیمار افراد کی موجودگی سے وہ کوئی خوشگوار تاثر نہیں لے گا۔ اس نے تجویز کیا تھا کہ اجے چوہدری اور مونیکا انھیں ہوٹل لے جائیں گے اور ان کی دیکھ بھال کریں گے۔

”میرے خیال میں یہ سب کچھ ضروری نہیں۔“ راجر نے چند لمحے سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”ہم اب اپنے آپ کو بہتر محسوس کر رہے ہیں اور اپنی دیکھ بھال خود کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاسپورٹ اور ٹریولرز چیک وغیرہ ہمیں دے دیے جائیں۔“

”اس خوش فہمی میں کبھی مت رہنا کہ تم لوگ بالکل تندرست ہو چکے ہو۔“ چارلس نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”یہ بیماری بار بار حملہ آور ہوتی ہے۔ جسم میں ڈی ہائیڈریشن کی وجہ سے نیند یا بے ہوشی کا دورہ کسی بھی وقت پڑ سکتا ہے۔ اگر تمھیں میری بات کا یقین نہ ہو تو یہ صاحب اس کی تصدیق کر سکتے ہیں جن پر بار بار بے ہوشی حملہ آور ہوتی رہی ہے۔“ اس نے صوفے پر لیٹے ہوئے وِیٹالی حکیم کی طرف اشارہ کیا جس نے تائید میں سر ہلا دیا۔ یہ یہودی نوجوان جب اس فلیٹ میں آیا تھا تو زندگی اس میں بھرپور انداز میں موجود تھی لیکن تقریباً چھتیس گھنٹوں کی نیند یا بے ہوشی نے اسے نچوڑ

کر رکھ دیا تھا۔

راجر اور گیزل کو بنکاک کے ایک ایسے گھٹیا سے ہوٹل میں پہنچا دیا گیا جس کا کرایہ چارلس پہلے ہی ادا کر چکا تھا۔ مونیکا اور اجے چوہدری بھی وہیں رک گئے تھے تاکہ چارلس کے آنے پر اس کی نئی ہدایات پر عمل کیا جا سکے۔ انھیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چارلس کے ساتھ وِیٹالی حکیم بھی موجود تھا جو کمزوری کی وجہ سے چلنے پھرنے میں خاصی تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ چارلس نے اعلان کیا کہ فی الحال اس نے چیانگ مائی جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا ہے اور وہ شانتا بیری جا رہا ہے۔ وِیٹالی حکیم بھی اس کے ساتھ جائے گا۔

وِیٹالی حکیم ان دو آدمیوں سے ابھی تک رابطہ قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا جو برما سے ہیرے اور مارفین لے کر آنے والے تھے۔ چارلس سے ملاقات کو وہ اپنے لیے تائیدِ غیبی ہی سمجھ رہا تھا۔ چارلس اس کے لیے نہ صرف ہمدرد دوست ثابت ہوا تھا بلکہ وہ ایک ماہر جوہری بھی تھا۔ اس کے ذریعے وہ شانتا بیری سے ہیروں کی اچھی خاصی مقدار خرید لے گا اور جب کار مائن بنکاک پہنچ جائے گی تو یہی ہیرے اس کے ذریعے پیرس یا لبزا بھجوا دے گا۔

چارلس، وِیٹالی حکیم کو سہارا دے کر ہوٹل سے باہر لے آیا اور نیچے کھڑی ہوئی ٹویوٹا میں بٹھا کر چند منٹ میں لوٹنے کا کہہ کر دوبارہ ہوٹل میں گھس گیا۔ وہ چند لمحے راجر اور گیزل کے چہروں کو دیکھتا رہا پھر ہمدردانہ لہجے میں بولا۔

”تم دونوں کے چہرے پھر پیلے ہو رہے ہیں۔ میرا خیال ہے بیماری کے خلاف جسم میں قوتِ مدافعت پیدا کرنے کے لیے تمھیں ایک ایک خوراک پی لینی چاہیے۔“

وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور چند منٹ بعد لوٹا تو اس کے ہاتھوں میں دو گلاس تھے جن میں روزانہ دی جانے والی خوراک سے زیادہ دوا تھی۔ اس نے گلاس دونوں کے ہاتھوں میں تھما دیے اور وہ دونوں متوحش نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

”دوا پی لو۔“ میری آندرے نے آگے بڑھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ”ایلین وہی کچھ کر رہا ہے جو تمھارے لیے بہتر سمجھتا ہے۔“

”میں یہ دوا نہیں پی سکتی۔ مجھے اس کا ذائقہ پسند نہیں۔“ گیزل بولی۔

”جب تک تم دوا نہیں پیو گی اس وقت تک تم اس بیماری سے پیچھا نہیں چھڑا سکو گی اور ظاہر ہے بیماری کی حالت میں، میں تمھیں سفر کی اجازت بھی نہیں دے سکتا۔ چلو اب جلدی سے دوا پی لو۔“ چارلس نے اس کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا اور گیزل کو مجبوراً دوا کا ایک گھونٹ بھرنا پڑا۔

مگر راجر نے دوا پینے سے صاف انکار کر دیا۔ ”اس دوا سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“ وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”اس کے استعمال سے تو ہماری بیماری اور بھی بڑھ رہی ہے۔“

میری آندرے نے چارلس سے بوتل لے لی اور ایک گلاس میں دوا انڈیل کر ایک چسکی بھرتے ہوئے بولی۔ ”اگر تمھیں کسی قسم کا شبہ ہے تو میں بھی تمھارے ساتھ یہ دوا پی رہی ہوں۔ چلو، اب شروع ہو جاؤ۔ میں ایک نرس ہوں اور نرس اپنے کسی مریض کو بیماری کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتی۔“

گیزل نے اسے چسکیاں لیتے دیکھ کر اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس ایک ہی سانس میں حلق میں انڈیل لیا۔ میری آندرے نے بھی ایک بڑا سا گھونٹ بھرا لیکن دوسرے ہی لمحے معذرت کرتی ہوئی باتھ روم میں گھس گئی۔ چند سیکنڈ بعد ہی باتھ روم کے فلش میں پانی گرنے کی آواز سن کر راجر کو اندر کی صورتِ حال سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ اس نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے چارلس کی ہدایات پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ چارلس کندھے اچکا کر رہ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔

”اگر تم مستقل بیمار رہ کر بنکاک ہی میں اپنی زندگی کے دن پورے کرنا چاہتے ہو تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی وہ غصّے میں پیر پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا، جہاں نیچے کھڑی ہوئی ٹویوٹا میں وِیٹالی حکیم اس کا منتظر تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ان کی گاڑی شانتا بیری کی ہیروں کی کانوں کی طرف جا رہی تھی۔

اس گھٹیا سے ہوٹل کے کمرے میں میری آندرے ایک کرسی پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ گیزل پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ اور وہ اپنے آپ کو بیدار رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ راجر نے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ لیا اور ہولے سے جھنجھوڑتے ہوئے بے بس لہجے میں بولا۔

”یہ سب کیا ہے؟ ہمیں کیا ہو رہا ہے؟“

”تم بیمار ہو اور کوئی بات نہیں ہے۔“ گیزل کے بجائے میری آندرے نے جواب دیا۔

”لیکن یہ معمولی سی بیماری اتنا طول نہیں کھینچ سکتی۔“ راجر بولا۔ تین ہفتے پہلے اس کی ملاقات ایلین گوتھرا اور مونیکا سے ہوئی تھی اور وہ اسی روز سے مستقل بیمار چلے آ رہے تھے۔

گیزل کو اب آنکھیں کھلی رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ نیند پوری شدت سے اس پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد ہی وہ لڑھک

گئی۔ راجر اس کے بعد بھی اپنا ایک ہاتھ اس کے کندھے پر جمائے رہا جیسے اسے خدشہ ہو کہ کوئی گیزل کو اس سے چھین نہ لے۔

اس صورتحال نے میری آندرے کو بوکھلا دیا۔ چارلس کی طرح ایسے معاملات میں وہ ابھی اتنی مہارت حاصل نہیں کر سکی تھی۔ عورت ہونے کے ناتے اس میں ہمدردی کے جذبات بھی کچھ زیادہ ہی تھے۔ اس نے راجر کو مشورہ دیا کہ انھیں فوری طور پر دوبارہ ان کے فلیٹ پر منتقل ہو جانا چاہیے کیونکہ ایسی صورتحال میں ہوٹل میں رات گزارنا مناسب نہیں ہو گا۔ راجر فوراً ہی تیار ہو گیا۔ اس نے بے ہوش گیزل کو کندھے پر لادا اور میری آندرے کے پیچھے پیچھے تین منزلوں کی سیڑھیاں طے کرتا ہوا نیچے آ گیا۔ ٹیکسی پر کانت ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے اس نے ملتجی لہجے میں میری آندرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ کسی طرح ان کے پاسپورٹ واپس کر سکتی ہو تو ان پر یہ احسان کر دے۔ کیونکہ وہ بیماری کی حالت میں اب ایک منٹ بھی یہاں نہیں رہنا چاہتے اور کوشش کریں گے کہ آج رات ہی کسی فلائٹ سے واپس وطن روانہ ہو جائیں۔

"اس وقت یہ ناممکن ہے۔" میری آندرے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "صبح ایلین گوتھر کے آتے ہی تمھاری چیزیں تمھارے حوالے کر دی جائیں گی۔"

راجر نے محسوس کیا تھا کہ میری آندرے اس وقت شدید ذہنی الجھن کا شکار تھی۔ اس کا یہ اندازہ غلط نہیں تھا۔ بعد میں میری آندرے نے چارلس کے سامنے یہ اعتراف بھی کر لیا کہ اپنے ہم وطنوں کو اس حالت میں دیکھ کر اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔

چارلس اور اجے چوہدری جب اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق شاننا بیری سے واپس لوٹے تو صبح ہونے والی تھی۔ بنکاک سے شاننا بیری کا چھ گھنٹے کا راستہ تھا۔ وہ رات ساڑھے دس بجے کے قریب بنکاک سے روانہ ہوئے تھے۔ اگر شاننا بیری میں رکے بغیر ہی واپس آ جاتے تو صبح چھ بجے سے پہلے نہیں پہنچ سکتے تھے جبکہ وہ اس وقت سے بہت پہلے واپس آ گئے تھے اور ویٹالی حکیم ان کے ساتھ نہیں تھا۔

آوازیں سن کر راجر بھی اپنے کمرے سے نکل کر نشست گاہ میں پہنچ گیا۔ چارلس تھکا تھکا سا نظر آ رہا تھا جبکہ اجے چوہدری کا حلیہ بھی بگڑا ہوا تھا۔ اس کا لباس بے ترتیب اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ راجر نے پہلی مرتبہ اسے اس حالت میں دیکھا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی خاصا محنت طلب کام کر کے آ رہے تھے اور پریشانی ان کے چہروں سے عیاں تھی۔

"ویٹالی کہاں ہے؟" راجر نے باری باری دونوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ کئی روز کی رفاقت سے اسے اس یہودی نوجوان سے کچھ انس سا پیدا ہو گیا تھا جو یہاں آتے ہی اسی کی طرح بیمار ہو گیا تھا۔

"ویٹالی کو پٹایا میں اپنے کچھ پرانے دوست مل گئے تھے۔"

چارلس نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی اور وہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

مگر راجر اس طرح آسانی سے پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ "وہ تمھارے ساتھ واپس کیوں نہیں آیا؟" اس نے پوچھا۔

"وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جانا چاہتا تھا اور ظاہر ہے میں اسے واپسی کے لیے مجبور تو نہیں کر سکتا تھا۔" چارلس کے لہجے میں ناگواری تھی۔

"حیرت ہے۔" راجر نے کہا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن الفاظ نوکِ زبان پر آ کر رک گئے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس نے کمرے میں ویٹالی حکیم کا سامان دیکھا تھا۔ اس کے کپڑے اور دیگر چیزیں اب بھی فلیٹ میں موجود تھیں۔ وہ یہ سب کچھ چھوڑ کر اپنے دوستوں کے ساتھ کیسے چلا گیا تھا۔ وہ مزید کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے شبہات سر ابھار رہے تھے۔

گیزل جیسے ہی بیدار ہوئی، راجر نے کہا کہ انھیں فوراً اور اسی وقت یہ فلیٹ چھوڑ دینا چاہیے خواہ اس کے لیے ہنگامہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ گیزل نے حواس پر قابو پاتے ہی اپنے کپڑے وغیرہ سمیٹنا شروع کر دیے جبکہ راجر لڑکھڑاتا ہوا چارلس کے کمرے میں پہنچ گیا جو اس وقت اپنی میز پر بیٹھا ٹیبل لیمپ کی روشنی میں ہیروں کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس کے سامنے میز پر بہت سے ہیرے بکھرے ہوئے تھے۔

"مجھے اپنا پاسپورٹ، ٹریولرز چیک اور ہوائی ٹکٹ چاہئیں ابھی اور اسی وقت۔" راجر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے تم ابھی سفر کے قابل نہیں ہوئے۔" ایلین نے ہیروں سے توجہ ہٹائے بغیر جواب دیا۔

"ہم بالکل ٹھیک ہیں اور سفر کر سکتے ہیں۔"

"میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ چند روز مزید آرام کرنے کے ساتھ ساتھ دوا استعمال کرتے رہو۔ یہ دوا تم لوگوں کے لیے بہت ضروری ہے۔" ایلین بولا۔

راجر کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی میری آندرے کمرے میں گھس آئی۔ وہ غالباً دروازے میں کھڑی ان کی باتیں سنتی رہی تھی۔ "ان کے پاسپورٹ واپس کر دو۔" وہ چارلس کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "انھیں گھر واپس جانے دو۔" اس کی آنکھوں میں بے پناہ اداسی تھی۔

اور پھر اسی رات راجر اور گیزل بنکاک سے پرواز کر گئے۔ یہ انکشاف تو بعد میں ہوا کہ ان کے پاسپورٹس کے نہ صرف کئی سادے اوراق غائب تھے بلکہ نصف سے زیادہ ٹریولرز چیک بھی سلیپ بک میں موجود نہیں تھے۔ بہرحال ان کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ اپنی زندگیاں بچا لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

۲۹ نومبر ۱۹۷۵ء کی صبح پٹایا کے ساحل سے چند میل دور سیام کنٹری کلب گولف گراؤنڈ کے قریب سے گزرنے والی سڑک پر چند مزدور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ان کا تعلق ایک قریبی بستی سے تھا اور شہر میں مزدوری کے لیے روزانہ تقریباً اسی وقت اس سڑک سے گزرتے تھے۔ سڑک سے کچھ فاصلے پر ایک کھیت سے ہلکا سا دھواں اٹھتے دیکھ کر انھوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کھیتوں میں دور دور تک کوئی کاشتکار وغیرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا اور دھوئیں کی کوئی وجہ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک مزدور صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے سڑک سے اتر کر کھیت میں پہنچ گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کی چیخوں کی آواز سن کر دوسرے مزدور بھی اس طرف دوڑ پڑے۔

وہ ایک انسانی جسم تھا جو دھیرے دھیرے سلگ رہا تھا۔ لاش کا بیشتر حصہ راکھ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ البتہ اس کی قمیص کا ایک حصہ اب بھی جلنے سے محفوظ رہا تھا جس پر بچھو کا نشان بنا ہوا تھا۔

اس واقعے کے کئی ماہ بعد یہ تصدیق ہو سکی کہ وہ سوختہ لاش ترک یہودی ویٹالی حکیم کی تھی جس کے سر پر پہلے کسی وزنی چیز سے متعدد ضربیں لگائی گئی تھیں اور پھر اس پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی گئی تھی۔ جلی ہوئی لاش کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ اس یہودی نوجوان کی موت میں کم از کم دو آدمیوں نے حصہ لیا تھا۔

ایلین گوتھر فیملی کو کانت ہاؤس کے اپارٹمنٹ میں آئے ہوئے صرف تین ماہ ہوئے تھے لیکن فلیٹ کی حالت بتا رہی تھی جیسے کئی برسوں سے اس کی دیکھ بھال پر توجہ نہ دی گئی ہو۔ میری آندرے فلیٹ کی از سر نو آرائش کے لیے چارلس سے کچھ رقم نکلوانے میں کامیاب ہو گئی۔ اور اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ڈومنک کی مدد سے نہ صرف پورے گھر کی صفائی کر ڈالی بلکہ دیواروں پر نیا رنگ بھی کر دیا گیا۔ دو دن بعد جب چارلس شاننا بیری کی ہیرے کی کانوں کے دورے سے لوٹا تو اس نے رنگ کے انتخاب پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے نیا رنگ کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ اس مرتبہ دیواروں پر گہرا سرخ رنگ کیا گیا تھا۔ خون کی طرح سرخ رنگ دیکھ کر میری آندرے پر عجیب سی وحشت طاری رہنے لگی۔

دسمبر کا مہینہ جنوبی ایشیا والوں کے لیے خاصا خوشگوار ثابت ہوتا ہے لیکن کانت ہاؤس کی پانچویں منزل پر واقع چارلس سوبھراج کا فلیٹ ان دنوں ہنگاموں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اب وہاں سے موسیقی کے بجائے اکثر چیخم دھاڑ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

ایک روز آدھی رات کے وقت چیخوں اور شور کی آوازیں سن کر دوسری منزل پر بیلے گھبرا کر اپنی بالکونی پر نکل آئی اور سر اوپر اٹھا کر آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگی۔ سیموئیل نے جب اسے بالکونی میں کھڑے دیکھا تو قدرے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"وہاں کھڑی کیا کر رہی ہو۔ اندر آؤ۔"

بیلے چوں چرا کیے بغیر کمرے میں آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ اسے اطمینان تھا کہ صبح سوئمنگ پول کے کنارے سن باتھ لیتے ہوئے مونیکا اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دے گی۔ اس کا یہ خیال درست نکلا، میری آندرے، بیلے کو اپنی واحد دوست سمجھتی تھی۔ دوسرے روز سوئمنگ پول کے کنارے وہ سسکیاں بھرتے ہوئے اسے بتا رہی تھی کہ ایلین گوتھر کا سلوک اس کے ساتھ انتہائی وحشیانہ اور غیر انسانی ہے۔ اس نے اپنی اس غلطی کو بھی تسلیم کر لیا کہ وہ ایلین کے محبت بھرے خطوط پڑھ کر اپنے گھر کی پرسکون فضا چھوڑ کر یہاں چلی آئی تھی۔ کینیڈا میں اسے ہر قسم کا تحفظ حاصل تھا لیکن یہاں جب سے آئی تھی ایک لمحہ کو بھی تحفظ کا احساس نہیں کر سکی تھی۔ بیلے خاموشی سے سنتی رہی۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ یہ سب کچھ سن چکی تھی اور ظاہر ہے ہمدردی کے اظہار کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ لیکن۔ بات صرف میری آندرے کی نہیں تھی۔ بیلے نکوشی کو بھی جانتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایلین، مونیکا کو جلانے کے لیے نکوشی کو اپنے ساتھ لیے گھومتا رہتا ہے۔ اور ایک رات تو اس نے نکوشی اور ایلین کو بھی لڑتے ہوئے سنا تھا۔ نکوشی نے اسے فریبی، مکّار، دھوکے باز اور فراڈی جیسے خطابات سے نوازا تھا۔ میری آندرے کا خیال تھا کہ اس جھگڑے کے بعد ان دونوں کے تعلقات ختم ہو جائیں گے۔ لیکن نکوشی اس کے بعد بھی آتی رہی۔ جس سے میری آندرے کو بھی اب پختہ یقین ہو گیا تھا ان دونوں میں کاروباری نوعیت کے علاوہ [illegible] تھے۔

"لیکن۔ اب کیا مسئلہ ہے؟ گزشتہ رات کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟" بیلے نے پوچھا۔

"وہ ایک اور لڑکی کے پیچھے لگ گیا ہے" ... میری آندرے نے گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا۔ اس کی یہ نئی رقیب، ایک خوبصورت تھائی لڑکی تھی جس کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی۔ وہ کالج کی اسٹوڈنٹ تھی اور اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے جزوی طور پر ایک ریسٹورنٹ میں ویٹریس کی حیثیت سے ملازمت بھی کر رہی تھی۔

یہ میری آندرے کی بدقسمتی ہی تھی کہ اس روز اسی کے مشورے پر وہ اس ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے چلے گئے تھے۔ وہی خوبصورت ویٹریس ان کی میز پر سرو کر رہی تھی۔ میری آندرے نے اس خوبصورت ویٹریس میں چارلس کی دلچسپی کو فوراً ہی محسوس کر لیا تھا۔ اس کا نام اگرچہ خاصا لمبا چوڑا تھا جو آسانی سے ان کی زبان پر نہیں آ سکتا تھا۔ ان کی سہولت کے لیے ویٹریس نے اپنے نام کے صرف ایک حصے پر ہی اکتفا کر لیا تھا۔ سوزی بلاشبہ حسین تھی۔ وہ چلتی تو محسوس ہوتا جیسے زمین پر قدم رکھنے کے بجائے ہوا میں تیر رہی ہو۔ کھانے کے دوران چارلس کی نظریں مسلسل اسی کے تعاقب میں لگی ہوئی تھیں۔ سوزی نے بھی چارلس کی اس دلچسپی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ جب بھی ان کی میز کے قریب سے گزرتی، اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور بھی گہری ہو جاتی۔ اور جب وہ بل لے کر آئی تو اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً ہی تعارف کا مرحلہ بھی طے کر لیا۔ اس نے اپنا نام ایلین اور اپنی ساتھی کو آندرے کے نام سے متعارف کرایا تھا اور بقول اس کے وہ حال ہی میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے تھے۔

اس تعارف پر میری آندرے کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ایلین نے سوزی کو باتوں میں الجھا لیا تھا۔ سوزی اگرچہ انگریزی کے چند حروف سے زیادہ نہیں جانتی تھی لیکن میرج کا مطلب اس نے سمجھ لیا تھا اور وہ ... میری آندرے کو خوش قسمت سمجھ رہی تھی کہ اسے ایلین جیسا خوبرو شوہر ملا تھا۔

چند ہی ملاقاتوں کے بعد چارلس، سوزی کو اپنے جال میں پھانسنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے نکوشی اور میری آندرے کے درمیان سوزی کے لیے بھی جگہ نکال لی تھی۔ چارلس شہر سے باہر کہیں بھی جاتا تو سوزی اس کے ہم رکاب ہوتی اور وہ ایک طرح سے اس کی رازداں بن چکی تھی۔

چارلس کھانا وغیرہ بھی اب اسی ریسٹورنٹ میں کھانے لگا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس نے میری آندرے کو ساتھ لے جانے کی حماقت کبھی نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ ریسٹورنٹ کے اس حصے میں بیٹھتا جہاں سوزی کی ڈیوٹی ہوتی۔ اپنے لیے کھانوں کا انتخاب بھی اس نے سوزی ہی پر چھوڑ دیا تھا اور وہ وقتاً فوقتاً اسے قیمتی تحائف سے بھی نوازتا رہتا تھا۔ تحائف کی ابتدا پھولوں کے گلدستے سے ہوئی تھی۔ پھر ایک رات جب اس نے ایک ہیرے کی انگوٹھی .... پیش کرنا چاہی تو سوزی نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

"تمھارے انکار سے میرا دل ٹوٹ جائے گا" چارلس نے کہتے ہوئے انگوٹھی زبردستی اس کی انگلی میں پہنادی۔

اور اس کے بعد تو چارلس نے اس پر قیمتی تحائف کی بارش کر دی۔ سوزی کے پاس اتنے قیمتی پتھر جمع ہو چکے تھے کہ اسے حیرت ہونے لگی تھی۔ ان چیزوں کے بارے میں تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ چارلس کو ایک متوسط گاہک سمجھ رہی تھی لیکن اسے اپنا یہ خیال تبدیل کرنا پڑا۔ چارلس تو ایسا دولت مند ثابت ہوا تھا جسے دولت کی ذرّہ برابر بھی پروا نہیں تھی۔ سوزی کا خیال تھا کہ وہ ان قیمتی تحائف کے بدلے اس سے بھی کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا لیکن یہ جان کر اسے حیرت ہوئی کہ اتنے دن گزرنے کے بعد بھی چارلس نے اس سے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ اس نے تو اسے کبھی چھوا تک نہیں تھا۔ چارلس کبھی کبھار میری آندرے کو بھی ساتھ لے آتا۔ وہ بیوی کی موجودگی میں بھی سوزی سے فلرٹ کرتا۔ سوزی کو شبہ تھا کہ میری آندرے کے دل میں اس کے خلاف نفرت پیدا ہو رہی تھی۔

سوزی کا یہ خیال غلط نہیں تھا۔ اتفاق سے یہ ریسٹورنٹ اسی ہوٹل کے شاپنگ آرکیڈ میں واقع تھا جہاں کی ایک جیولری شاپ میں نکوشی ملازمت کر رہی تھی۔ چارلس کی جاسوسی کے خیال سے بیک وقت ان دونوں لڑکیوں پر نگاہ رکھنا میری آندرے کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ میری آندرے اس ہوٹل کی عمارت میں داخل ہوئے بغیر سڑک کے دوسری طرف واقع تحائف فروخت کرنے والی ایک دکان میں کھڑے ہو کر ریسٹورنٹ کی کھڑکی سے چارلس اور سوزی پر نگاہ رکھ سکتی تھی۔ جب ان کے خلاف اچھے خاصے ثبوت جمع ہو گئے تو ایک روز میری آندرے، چارلس سے الجھ پڑی لیکن چارلس اس موضوع پر کوئی گفتگو کرنے کو تیار نہیں تھا۔

"سوزی سے میرا تعلق صرف کاروبار کی حد تک ہے۔"

اس نے پرانا حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس سلسلے میں کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔"

میری آندرے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ اس پر یہ انکشاف تو بہت عرصے بعد ہوا تھا کہ چارلس نے دسمبر کے پہلے ہفتے میں سوزی سے شادی کے لیے بھی کہا تھا۔ شادی کے موضوع کو اس نے اپنا معمول بنا لیا تھا۔ اس نے یہ بھی اعتراف کر لیا تھا کہ میری آندرے اس کی بیوی نہیں، معمولی سیکریٹری ہے اور وہ کبھی کبھار دوستوں سے مذاق کے لیے اپنے آپ کو میاں بیوی بھی کہہ لیتے ہیں۔

"محبت تو میں تم سے کرتا ہوں۔" اس نے سوزی کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "دراصل تم ہی وہ لڑکی ہو جس کی مجھے تلاش تھی اور میں تمھاری کھوج میں اب تک بھٹک رہا تھا۔"

"مجھے تمھاری رفیقِ حیات بننے پر خوشی ہو گی لیکن مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔" سوزی نے جواب دیا۔ چارلس کی شادی کی یہ خواہش اس کے لیے قطعی غیر متوقع بھی نہیں تھی۔ چارلس ایک گاہک کی حیثیت سے ریسٹورنٹ میں آیا تھا جس نے اپنی سخاوت سے اسے متاثر کیا تھا۔ اس دوران وہ ابھی صرف دو تین مرتبہ اس کے ساتھ ڈیٹنگ کے لیے گئی تھی اور وہاں بھی اس نے زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور اب وہ اسے شادی کے لیے مجبور کر رہا تھا۔ سوزی کے لیے فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا اور اسی لیے اس نے مہلت حاصل کر لی تھی۔

اور اب کانت ہاؤس کے کمپاؤنڈ میں سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھی ہوئی میری آندرے آنسو بہاتے ہوئے بیلے کو سوزی کے بارے میں یہ سب کچھ بتا رہی تھی۔ گزشتہ رات ان کا جھگڑا بھی اسی بات پر ہوا تھا۔ بات ایک دوسرے پر ہاتھ اٹھانے تک پہنچ گئی تھی اور وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے پر پھینکتے رہے تھے۔ فلیٹ میں موجود چارلس کے بیمار مہمان، اس صورتحال سے یقیناً پوری طرح لطف اندوز ہوئے ہوں گے۔

بیلے، میری آندرے کا ہاتھ تھامے اسے پُرسکون کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دفعتاً میری آندرے نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور سسکی بھرتے ہوئے بولی۔ "اب وہ مجھے اپنے بچّے کی ماں بننے پر مجبور کر رہا ہے۔"

"کیا تم واقعی....؟" بیلے نے الجھی ہوئی نگاہوں سے میری آندرے کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔" میری آندرے نے نفی میں سر ہلایا۔ "لیکن میں اس کے بچّے کی ماں نہیں بننا چاہتی۔ اس کی اولاد بھی اس کی طرح عفریت ہی ہو گی۔ قابلِ نفرت۔"

بیلے نے ابھی تک سوزی کو نہیں دیکھا تھا جو میری آندرے کی زندگی برباد کرنے کا باعث بن رہی تھی لیکن اس کی یہ خواہش بھی جلد ہی پوری ہو گئی۔ بیلے کے اندازے کے مطابق اس کی عمر زیادہ سے زیادہ پندرہ سولہ سال رہی ہو گی۔ وہ بلاشبہ حسین تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور چہرے پر بے پناہ معصومیت۔ اس کا شمار یقیناً ان لڑکیوں میں نہیں کیا جا سکتا تھا جو چارلس جیسے شخص کی محفلوں کی رونق بننے کے قابل ہو۔ اس کے تو ابھی اپنے کھیلنے کے دن تھے لیکن میری آندرے نے اس کی جو تصویر کھینچی تھی وہ یقیناً بہت بھیانک تھی۔

بیلے نے سیموئیل کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس کا تبصرہ بیلے کی توقع سے قطعی برعکس تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایلین گوتھر کو عورتوں سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ اپنے کاروبار میں انھیں آلۂ کار کی حیثیت سے استعمال کر رہا تھا۔ میری آندرے کو اس نے محض اس لیے اپنے گھر کے ایک مستقل فرد کی حیثیت دے رکھی تھی کہ وہ کنیڈین تھی۔ اور یورپین سیّاحوں کو جب یہ معلوم ہوتا کہ مشرقی نقوش والے اس شخص کی بیوی کنیڈین ہے تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ نکوشی کی حیثیت ایلین کے لیے اس لحاظ سے زیادہ اہم تھی کہ وہ نہ صرف قیمتی پتھروں کی پرکھ میں مہارت رکھتی تھی بلکہ اسے گاہک فراہم کرنے کے علاوہ تھائی حکومت کی بیوروکریسی سے بھی پوری طرح واقف تھی اور اس سلسلے میں بھی اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ البتّہ سوزی والا معمّہ سیموئیل کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ ایلین کی زندگی میں اسے کیا حیثیت حاصل رہی ہو گی لیکن بہرحال، کوئی نہ کوئی تو وجہ رہی ہو گی لیکن ایلین کی محبت والی بات سیموئیل کے حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔

سیموئیل یا بیلے اس حقیقت سے کبھی بھی آگاہ نہیں ہو سکتے تھے کہ سوزی اس ویتنامی لڑکی سونگ سے بے پناہ مشابہت رکھتی تھی جس نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران سائیگون کے ایک اسپتال میں گورکھ سوبھراج نامی اس بچّے کو جنم دیا تھا، جسے اس کے ہندو باپ نے اپنی اولاد کی حیثیت سے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ بچّہ نہ صرف باپ کی شفقت کو ترستا رہا بلکہ بعد میں اسے ماں کی ممتا سے بھی محروم ہونا پڑا تھا۔ سوزی میں چارلس سوبھراج کی دلچسپی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اسے سوزی کی صورت میں اپنی ماں کا چہرہ دکھائی دیا تھا۔

بنکاک آنے کے بعد چارلس بہت عرصہ سے جواہرات

کے اپنے بزنس کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کا مشن تو یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح پچیس ہزار ڈالر جمع کر کے جواہرات کی تراش اور پالشنگ کا ایک چھوٹا سا پلانٹ لگا لے۔ اپنے طور پر قیمتی پتھروں کی کانوں کی کھدائی بھی اس کے منصوبے میں شامل تھی لیکن اوائل دسمبر میں اسے اپنا یہ دیرینہ خواب بکھرتا ہوا نظر آنے لگا۔ وہ بڑے بڑے ہوٹلوں کی لابیوں میں گھوم پھر کر غیر ملکی سیاحوں کے ہاتھ اِکّادُکّا قیمتی پتھر فروخت کرنے کے علاوہ ان غیر ملکی سیاحوں کے ذریعے بھی یہ رقم جمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو چند روز تک دوست کی حیثیت سے اس کے ساتھ نظر آتے اور پھر ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتے لیکن اس کے اخراجات آمدنی کے مقابلے میں بڑھ رہے تھے۔ دو فلیٹوں کا کرایہ، تین عورتوں کو خوش رکھنے کے لیے ان پر بھاری اخراجات کے علاوہ اسے درجن بھر افراد کے کھانے کا بوجھ بھی برداشت کرنا پڑ رہا تھا جن میں سے بیشتر بیمار تھے۔ اس کے علاوہ بدقسمتی کے سایوں نے بھی اب اس کا تعاقب شروع کر دیا تھا۔

ایک دن بنکاک کی سڑکوں پر کرائے کی ٹویوٹا کار میں تیز رفتار ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایک چوراہے پر ٹریفک کی سرخ بتی دیکھ کر وہ گاڑی روکنے میں کامیاب نہ ہو سکا جس کے نتیجے میں گاڑی ایک نوجوان سائیکل سوار سے جا ٹکرائی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چاروں طرف لوگوں کا ہجوم لگ گیا جس کی وجہ سے چارلس کو فرار ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ سائیکل سوار لڑکے کی حالت نازک تھی۔ چارلس نے اسے اپنی کار میں ڈالا اور دو پولیس والوں کی نگرانی میں اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسپتال پہنچنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ بُری طرح پھنس چکا ہے۔ فوری طبّی امداد مل جانے کے بعد زخمی سائیکل سوار اگرچہ خطرے کی حدود سے باہر نکل چکا تھا لیکن چارلس کو اپنی جان چھڑانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے نکوشی کو فون پر صورتِ حال سے مطلع کرتے ہوئے اسے جلد از جلد اسپتال پہنچنے کی ہدایت کی۔

اسپتال پہنچتے ہی نکوشی نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سائیکل سوار تھائی نوجوان کو دس ہزار بھاٹ (تقریباً سات سو ڈالر) ہرجانہ یا معاوضے کے طور پر قبول کر کے معاملہ رفع دفع کرنے پر آمادہ کر لیا۔ چارلس کو کچھ رقم ان پولیس والوں کی نذر بھی کرنا پڑی تھی جو اس کے ساتھ آئے تھے۔

”آئندہ جب کسی تھائی باشندے سے میرا ایکسیڈنٹ ہوا۔“ نکوشی کے ساتھ اسپتال سے واپس آتے ہوئے چارلس دانت بھینچ کر بولا۔ ”تو سب سے پہلے میں یہ اطمینان کروں گا کہ وہ زندہ تو نہیں بچا۔“

اس کے چند ہی روز بعد ایک دن چارلس اچانک ہی ہانگ کانگ روانہ ہو گیا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ ایک ضروری کام سے اکیلا ہی جا رہا ہے لیکن میری آندرے کو شبہ تھا کہ نکوشی یا سوزی میں سے کوئی ایک یقیناً اس کے ساتھ ہو گی۔ میری آندرے نے اس شبہے کا اظہار کرتے ہوئے آواز بلند کرنے کی کوشش کی تھی مگر چارلس خلافِ معمول غصّے میں آنے کے بجائے نرم لہجے میں بولا۔

”سمجھنے کی کوشش کرو ڈیئر! میں دن رات یہ سب کچھ کس کے لیے کر رہا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میرے پاس اتنی رقم جمع ہو جائے کہ بڑے پیمانے پر جواہرات کا اپنا بزنس شروع کر سکوں۔ اور یہ سب کچھ میں صرف اور صرف تمہارے لیے ہی کر رہا ہوں۔ چند روز کی مصروفیت ہے اس کے بعد ہم فلپائن کے ساحل پر لمبی چھٹی منانے کے لیے چلیں گے جہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں ہو گا۔“

بار بار فریب کھانے کے باوجود میری آندرے کے لیے یہ تسلّی کافی تھی۔ چارلس اس کے فوراً ہی بعد چند قیمتی پتھر اور نو ہزار ڈالر، جو اس کی کل پونجی تھی، لے کر ایئرپورٹ روانہ ہو گیا جہاں ٹکٹ لینے اور کسٹمز سے نمٹنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس وقت وہ ڈچ ٹالی حکیم کا پاسپورٹ استعمال کر رہا تھا، جس کی جلی ہوئی لاش کئی روز قبل پتایا کے ساحل کے قریب ملی تھی اور اس وقت تک اس لاش کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔

ہانگ کانگ میں بدقسمتی چارلس کی منتظر تھی۔ وہ میکاؤ کے کاسینو میں جُوا کھیلنے کا پروگرام بنا کر آیا تھا جہاں کئی سال قبل ہیلن کی موجودگی میں اس نے بڑی بڑی رقمیں جیتی تھیں۔ لیکن حیات ریجنسی ہوٹل میں داخل ہوتے ہی چارلس کا ٹکراؤ پرانی جان پہچان کے ایک ایسے شخص سے ہو گیا جو چھوٹے پیمانے پر وارداتیں کر کے اپنی گزر اوقات کیا کرتا تھا۔ اس نے چارلس کو میکاؤ کاسینو سے دور ہی رہنے کا مشورہ دیا کیونکہ اس بات کا قوی امکان تھا کہ کاسینو والے اپنے اس پرانے مقروض کو پہچاننے میں غلطی نہیں کریں گے۔ ان دس برسوں میں میکاؤ کاسینو بھی سائنسی ترقی میں پیچھے نہیں رہا تھا۔ یہاں اب ایسے کمپیوٹر استعمال کیے جا رہے تھے جن میں ناپسندیدہ افراد کے ناموں کی فہرست کے علاوہ ان کی تصویروں کا ریکارڈ بھی موجود تھا۔ ایسے لوگوں کی نشاندہی ہونے پر یا تو انھیں کاسینو میں داخلے سے روک دیا جاتا تھا یا ان کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے دی جاتی۔

کاسینو میں داخلہ چارلس کے لیے واقعی خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ ہانگ کانگ کے سینٹرل انٹیلی جنس ڈویژن کے پاس اس کے اصل نام سے اس کے جرائم پر مشتمل ایک ضخیم فائل موجود تھی اور اس بات کا امکان تھا کہ جلد یا بدیر پاسپورٹوں کی چوری، لاتعداد سنگین جرائم اور اس کی مختلف شناختی حیثیتوں پر مشتمل ایک طویل فہرست ایشیا اور یورپ کے ہر ایئرپورٹ کے امیگریشن کاؤنٹرز پر ”بین الاقوامی طور پر مطلوب“ مجرم کی حیثیت سے فراہم کر دی جائے گی۔

پیرس کے بعد ہانگ کانگ چارلس کا پسندیدہ ترین شہر تھا۔ یہاں بھی زندگی کا دھارا اسی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ پیرس کی طرح اس شہر میں بھی دولت کی کمی نہیں تھی۔ یہاں کی ڈیوٹی فری شاپس ہیرے جواہرات اور دنیا بھر کی ایسی قیمتی چیزوں سے بھری ہوئی تھی جن کے حصول کی خواہش ہر دل میں مچلتی تھی۔ بڑے بڑے ہوٹلوں کے علاوہ درمیانے درجے کے ہوٹل بھی ایئرپورٹ سے ہوٹل تک لانے لے جانے کے لیے رولس رائز گاڑیاں استعمال کرتے تھے۔ ہانگ کانگ میں ہر سال تقریباً دس لاکھ غیر ملکی سیاحوں کی آمد و رفت تھی۔ اسے مشرقِ بعید کا دروازہ بھی کہا جا سکتا تھا۔ مشرقِ بعید کی سیاحت کو آنے والا ہر غیر ملکی سیّاح سب سے پہلے ہانگ کانگ ہی میں پڑاؤ ڈالتا تھا۔ اس طرح ان کی جیبیں بھی خاصی بوجھل ہوتیں۔ ۱۹۷۵ء میں سیاحوں کی آمد و رفت سے ہانگ کانگ کو تیس کروڑ ڈالر کی آمدنی ہوئی تھی جس سے ہانگ کانگ میں دولت کی فراوانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

لیکن اس سنہری سکّے کا دوسرا پہلو بھی چارلس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ہانگ کانگ کی پولیس کا شمار دنیا کی بہترین پولیس میں ہوتا تھا۔ جس کے پیچھے برطانوی ذہنی قوّت کارفرما تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ہانگ کانگ پولیس کا رابطہ کمپیوٹر کے ذریعے بھی اسکاٹ لینڈ یارڈ، ایف بی آئی اور انٹرپول سے قائم تھا۔ امیگریشن اور کسٹمز کے قوانین بھی دہلی اور بنکاک کی نسبت بہت سخت تھے۔ موخر الذکر شہروں کے ایئرپورٹس پر بیشتر باتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا لیکن ہانگ کانگ ایئرپورٹ پر کسٹمز کی خواتین کی مہارت اور چابکدستی قابلِ تعریف تھی۔ ان کی عقابی نگاہوں سے کوئی چیز چھپانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ یہ ایشیا کا واحد ایئرپورٹ تھا جہاں ہر آنے جانے والے مسافر کے پاسپورٹ کا معائنہ نہایت باریک بینی سے کیا جاتا۔

ان تمام حقائق سے قطع نظر چارلس یہ بھی جانتا تھا کہ کسی فری لانس جرائم پیشہ کے لیے زیادہ عرصہ تک اپنی سرگرمیاں جاری رکھنا ممکن نہیں تھا کیونکہ یہاں چینی غنڈوں کی بالادستی تھی اور وہ غیر ملکیوں کے ساتھ مل کر کام کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایسی صورتِ حال میں چارلس کو یہاں اپنے کاروبار میں خاصی دشواریاں پیش آ سکتی تھیں۔

ہانگ کانگ میں یہ پہلی رات چارلس نے نہایت خاموشی سے گزار دی۔ اس رات اس نے حیات ریجنسی کے قرب و جوار میں گھوم پھر کر صورتِ حال کا جائزہ لینے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ یہ علاقہ رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ قدم قدم پر نائٹ کلبوں، قحبہ خانوں اور چھوٹے چھوٹے جُوا خانوں کے نیون سائن راہگیروں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔

ہالیڈے اِن زیرِ زمین ڈسکو کلب اور شاپنگ آرکیڈ کی وجہ سے نوجوان طبقے میں خاصا مقبول تھا۔ یہاں کی کافی شاپ میں تیار ہونے والے امریکن ہمبرگر پورے شہر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ بیشتر لوگوں کو ان ہمبرگرز کی طلب ہی یہاں کھینچ لاتی تھی۔

دوسری رات چارلس ہالی ڈے اِن کے لاؤنج میں بیٹھا ٹی۔ وی پر آنے والا پروگرام دیکھ رہا تھا۔ بظاہر اس کی توجہ ٹی۔ وی کی طرف تھی لیکن وہ بار بار گہری نظروں سے کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے اس جوڑے کو دیکھ رہا تھا جن کے چہروں پر اداسی اور تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ اگر وہ اپنے وطن میں ہوتے تو یقیناً صحت مند ہوتے لیکن دنیا کی .... آوارہ گردی نے ان کی صحت کو بھی متاثر کیا تھا۔ پستہ قامت مرد کی آنکھوں پر عینک اور چہرے پر بے ترتیب داڑھی نے اس کا عجیب سا حلیہ بنا رکھا تھا۔ اس کی عمر اگرچہ تیس کے لگ بھگ تھی لیکن اس وقت وہ اپنی عمر سے کہیں بڑا لگ رہا تھا۔ اس کی ساتھی عمر میں اس سے سات آٹھ سال کم ضرور رہی ہو گی۔ اس کا شمار خوبصورت لڑکیوں میں کیا جا سکتا تھا۔

چارلس نے فوراً ہی نوٹ کر لیا کہ لڑکی کی انگلی میں شادی کی انگوٹھی نہیں تھی لیکن اس نے جس انداز سے اپنے ساتھی کا ہاتھ تھام رکھا تھا اس سے ان کی لگن کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ دونوں بھی اگرچہ ٹی۔ وی دیکھ رہے تھے لیکن ان کے چہروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انھیں اس پروگرام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ غالباً اپنے ہی بارے میں سوچ رہے تھے۔

وہ دونوں خاموش تھے اور چارلس ان میں سے کسی ایک کے بولنے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ ان کی قومیت کا اندازہ لگا سکے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ امریکی ہو سکتے تھے۔ چارلس اپنی سیٹ سے اٹھ کر ان کے قریب ایک خالی کرسی پر جا بیٹھا۔ چند لمحے خاموشی سے ٹی وی دیکھتا رہا پھر برٹش ٹورسٹ کی طرف دیکھتے ہوئے تبصرہ کرنے لگا کہ اس سے زیادہ بُرا

اور اکتا دینے والا کوئی ٹی وی پروگرام اس نے آج تک نہیں دیکھا۔ مرد نے اگرچہ شستہ انگریزی میں جواب دیا لیکن اس کے لہجے میں ہلکی سی تبدیلی محسوس کر کے اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ دونوں ڈچ تھے۔ کسی ڈچ باشندے کو فریب دینا چارلس کے خیال میں اتنا آسان نہیں تھا۔ یہ لوگ ضرورت سے زیادہ حسّاس ہوتے ہیں اور دوسروں کے بارے میں شبہ کرنا اور سرد مہری ان کی فطرت کا خاصّہ ہوتا ہے۔ چارلس نے اگرچہ ایک مرتبہ اپنے سوتیلے بھائی آندرے کو بھی مشورہ دیا تھا کہ وہ ان لوگوں سے دور رہا کرے لیکن اس وقت وہ خود جس بحران میں مبتلا تھا اس کے پیش نظر اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج رات جیسی بھی مچھلی ملے اس کا شکار کر لینا چاہیے۔

ہینک بنٹا نجا کی عمر انتیس سال تھی۔ اسے کیمسٹری میں ماسٹرز کی ڈگری پر فخر تھا لیکن یہ ڈگری اب تک نہ تو اسے کوئی ملازمت دلوا سکی تھی اور نہ ہی پی ایچ ڈی کے داخلے میں معاون ثابت ہوئی تھی۔ ہینک کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ شاید اس کی دوغلی نسل سے تعلق کی وجہ سے تھا۔ اس کا باپ ڈچ اور ماں انڈونیشین تھی۔ دوغلے پن میں وہ اپنے آپ کو قطعی بے قصور سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں اصل قصور تو نیدرلینڈز کے ان قدیم حکمرانوں کا تھا جو بحری قزاقوں کی سرپرستی کرتے تھے۔ بحری قزاقوں کے یہ گروہ انڈونیشیا اور اس کے نواحی جزیروں کے قرب و جوار کے سمندر میں لوٹ مار کے بعد واپس لوٹتے تو مالِ غنیمت میں ان جزیروں کی جوان اور خوبصورت عورتیں بھی شامل ہوتیں۔ ہینک کا دادا بھی ایک بحری قزاق تھا جو ایک عورت کے عشق میں مبتلا ہو کر قزاقی ترک کر کے انڈونیشیا ہی میں آباد ہو گیا تھا۔ ہینک کے باپ نے ایک انڈونیشین عورت سے شادی کی تھی لیکن کچھ ہی عرصہ بعد وہ اپنی بیوی کو لے کر نیدرلینڈز چلا گیا تھا۔ اس طرح ہینک کی رگوں میں ڈچ اور انڈونیشین خون دوڑ رہا تھا۔

ہینک کی ساتھی کارنیلیا کی عمر پچیس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ دونوں نہ صرف ایک ہی شہر کے رہنے والے تھے بلکہ ان کا بچپن بھی اکٹھے ہی گزرا تھا۔ ہینک کیمسٹری میں ماسٹرز کی ڈگری لینے کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا اور کارنیلیا ایک فارم پر پنیر بنانے پر ملازم ہو گئی تھی۔ ہینک نے جب محسوس کیا کہ کیمسٹری کی ڈگری اس کے کسی کام نہیں آ رہی ہے تو اچانک ہی اس کے دماغ میں یہ بات سما گئی کہ کیوں نہ دنیا کی سیّاحت کی جائے۔ کارنیلیا نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور رقم جمع کرنے کے لیے ڈبل شفٹ میں کام شروع کر دیا۔ ہینک کے پاس اگرچہ زیادہ رقم نہیں تھی لیکن اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اگر کہیں اسے رقم کی ضرورت پڑی تو وہ انڈونیشیا پہنچ جائے گا جہاں اس کی ماں کے رشتہ دار اس کی مدد کر سکتے تھے۔

چارلس چند منٹ کے اندر اندر نہ صرف ان دونوں سے متعارف ہو گیا بلکہ ان میں دوستی کا ایک ایسا رشتہ بھی استوار ہو گیا جس میں کم از کم ہینک اور کارنیلیا کو خلوص اور چاہت کے سوا اور کچھ محسوس ہی نہیں ہوا تھا۔ کھانا حیات ریجنسی ہوٹل میں کھایا گیا اور پھر چارلس انھیں ہوٹل کے شاپنگ آرکیڈ کی سیر کراتا رہا جس کی بیشتر دکانوں کے شوکیسوں میں ہمہ اقسام کے قیمتی پتھر جگمگاتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ بالآخر چارلس نے انھیں اپنے کمرے میں چلنے کی دعوت دی جہاں وی سی آر پر غیر سنسر شدہ فلمیں دیکھنے کا اہتمام بھی موجود تھا۔ ان دونوں نے یہ خلوص بھری دعوت قبول کر لی اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس کے کمرے میں چلے آئے۔

کمرہ دیکھ کر ہینک اور کارنیلیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ انھیں یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ ان کا میزبان اپنے وقت کا بہت بڑا رئیس ہے جس نے ان کی خاطر تواضع میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اس وقت وی سی آر پر ایک بیہودہ سی فلم دیکھتے ہوئے وہ دنیا کی بہترین اسکاچ وھسکی سے لطف اندوز ہو رہے تھے جس کا بل ہوٹل کے دفتر میں چارلس کے حساب میں جمع ہو گیا تھا۔

چارلس اپنے ان مہمانوں کو ہانگ کانگ کی سیر کراتا رہا۔ کبھی وہ وکٹوریہ ہاربر پر کسی خوبصورت بجرے میں سمندر کی سیر کرتے ہوئے نظر آتے، کبھی ڈیوٹی فری شاپس میں گھومتے ہوئے دکھائی دیتے جہاں جواہرات کی خرید کے سلسلے میں چارلس انھیں اپنی رہنمائی سے نوازتا۔ شہر کی سیر کے دوران کسی وقت کارنیلیا نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ یاقوت کی انگوٹھی خریدنا چاہتی ہے اور چارلس نے اسے نہ صرف قیمت کے بارے میں خبردار کیا تھا بلکہ یاقوت کی کوالٹی کے بارے میں بھی محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ کئی دکانوں پر گھومنے کے بعد کارنیلیا کے چہرے پر مایوسی کے سائے پھیل گئے۔ ہر جگہ انگوٹھی کی قیمت اس کی قوتِ خرید سے بہت زیادہ تھی۔ چارلس کسی ایسے ہی موقعے کا منتظر تھا۔ اس نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے حقِ دوستی اور حقِ میزبانی ادا کرتے ہوئے کارنیلیا کو پیشکش کی کہ اگر وہ پسند کرے تو اس کے ذاتی کولیکشن سے کم قیمت پر انگوٹھی خرید سکتی ہے۔ کارنیلیا بھی ایسا کوئی موقع کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سولہ سو ڈالر میں اپنی پسند کی انگوٹھی چارلس سے

خرید لی۔ وہ اس سودے کے لیے اپنے میزبان کی انتہائی شکر گزار تھی کیونکہ اس کو یہ قیمتی انگوٹھی بازار کے حساب سے آدھی سے بھی کم قیمت پر مل گئی تھی۔ اسی روز اس نے ایمسٹرڈم میں اپنی ایک دوست کو انگوٹھی کی خرید کے بارے میں لکھے جانے والے خط میں اپنے میزبان کا تعارف بھی کرا دیا۔

”ہانگ کانگ میں ہمارے اس دوست کا نام ایلین ڈوبیوس ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اجنبی ملک میں اس جیسے شریف آدمی سے ہماری ملاقات ہو گئی۔ اس کا تعلق بنکاک سے ہے اور اس نے ہمیں بنکاک آنے کی دعوت بھی دی ہے۔“

چارلس اگرچہ وٹالی حکیم کے پاسپورٹ پر ہانگ کانگ میں داخل ہوا تھا لیکن یہاں وہ اپنے لیے ایلین ڈوبیوس کا نام استعمال کر رہا تھا۔ اس نے ہینک اور کارنیلیا کو یہ پیشکش بھی کی تھی کہ ان کے بنکاک پہنچنے پر انھیں لینے کے لیے وہ نہ صرف اپنی کار ایئرپورٹ بھیج دے گا بلکہ اگر وہ لوگ پسند کریں تو انھیں بلامعاوضہ رہائش کے لیے اس کے بینٹ ہاؤس کا ایک کمرہ بھی مل سکتا ہے جہاں ایک فرانسیسی شیف دنیا کے بہترین کھانوں سے ان کی تواضع کرے گا۔ کارنیلیا اس کی اس پیشکش سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ پینٹ ہاؤس کے نام پر اس کی آنکھوں کے سامنے ایمسٹرڈم کی فورچ ایونیو کا منظر گھوم گیا جہاں کے پینٹ ہاؤسز کی رہائش کا تصوّر صرف وہی لوگ کر سکتے تھے جن کی آمدنی کے ذرائع لامحدود ہوں اور غالباً ایلین ڈوبیوس کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔

اس کے چند روز بعد دس دسمبر کی رات ہینک اور…

کارنیلیا بنکاک ایئرپورٹ پر جہاز سے اتر رہے تھے۔ امیگریشن اور کسٹمز وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد پبلک لاؤنج میں پہنچ کر ہینک، ایلین کو فون کرنے کے لیے بوتھ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر ان کا راستہ روک لیا۔ وہ ایلین ڈوبیوس تھا۔ ان دونوں کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ انھوں نے ایلین کو اپنی آمد کے بارے میں قطعی اطلاع نہیں دی تھی۔

جب وہ ٹرمینل کی عمارت سے باہر نکلے تو ایلین کے بیان کے برعکس لیموزائن کے بجائے کرائے کی ایک پرانی سی ٹویوٹا کار کو دیکھ کر انھیں سخت مایوسی ہوئی۔ ایلین نے جس فرانسیسی شیف کا تذکرہ کیا تھا وہ ایک بدحال کنیڈین عورت ثابت ہوئی اور پینٹ ہاؤس کسی طرح بھی ایمسٹرڈم کے کسی گھٹیا ترین فلیٹ سے بہتر نہیں تھا۔ یہ سب کچھ اگرچہ ان کے لیے حیرت کا باعث تھا لیکن ان کے خیال میں بلامعاوضہ رہائش کے لیے اس سے بہتر کوئی اور جگہ مل بھی نہیں سکتی تھی۔

ان نئے مہمانوں کی آمد کے دو دن بعد بیلے اپنی دوست سے ملاقات کے لیے پانچویں منزل پر پہنچی تو فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔ دستک دینے پر کوئی جواب نہیں ملا تو وہ یہی سمجھی کہ مونیکا ساتھ والے فلیٹ میں ہو گی۔ اس دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اندر سے آتی ہوئی مونیکا کی آواز نے اس کے خیال کی تصدیق کر دی اور وہ دستک دیے بغیر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

کمرہ نیم تاریک تھا۔ روشنی سے اندھیرے میں آ جانے سے اسے کچھ زیادہ ہی تاریکی کا احساس ہوا تھا۔ چند لمحوں بعد جب اس کی آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو وہ الجھی ہوئی نگاہوں سے صورت حال کا جائزہ لینے لگی۔ کرسی پر ایک اجنبی نیم دراز تھا۔ اس کے چہرے پر بے ترتیب داڑھی، پیلی رنگت، آنکھیں اوپر کو چڑھی ہوئی اور جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس کے قریب ہی فرش پر ایک خوبصورت لڑکی آڑی ترچھی حالت میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبا رکھا تھا اور پورے جسم پر رعشہ سا طاری تھا۔ ان کی حالت دیکھ کر بیلے کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے الجھی ہوئی نگاہوں سے قریب کھڑی ہوئی مونیکا کی طرف دیکھا جو کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔ بیلے بھی اس کے پیچھے ہی باہر آ گئی۔

”کون ہیں یہ لوگ؟“ بیلے نے دوسرے فلیٹ میں پہنچ کر مونیکا سے پوچھا۔

”ایلین کے گاہک۔“ مونیکا کے لہجے میں تلخی تھی۔ ”ان کا تعلق ہالینڈ سے ہے۔“

بیلے نے بات کو آگے بڑھانا ضروری نہیں سمجھا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے فلیٹ میں آ گئی۔ وہ اس سے پہلے بھی ایلین کے فلیٹ میں آنے والے بہت سے لوگوں کو بیماری اور کسمپرسی کی حالت میں دیکھ چکی تھی لیکن اس نے کبھی زیادہ توجہ نہیں دی تھی مگر آج کے اس منظر نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ وہ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتی رہی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس پر ایک عجیب سا اضطراب طاری تھا۔ بار بار ذہن میں آنے والا ایک خیال اسے بری طرح مضطرب کیے ہوئے تھا۔ کوشش کے باوجود وہ ایک لمحے کو بھی اس خیال کو ذہن سے نہیں جھٹک سکی تھی۔ جب وہ اوپر کے

فلیٹ میں گئی تھی تو کمرے کی نیم تاریکی کے باعث وہ زیادہ توجہ نہیں دے سکی تھی مگر اب یہ خیال بار بار اس کے ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا کہ کرسی پر بیٹھے ہوئے اس بے ترتیب داڑھی والے اجنبی کے دونوں ہاتھ کرسی کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔

کارمائن حسبِ وعدہ دسمبر کے وسط میں بنکاک پہنچ گئی۔ ایئرپورٹ سے نکلتے ہی اس نے پریذیڈنٹ ہوٹل کا رُخ کیا جہاں اسے کم از کم اس وقت تک قیام کرنا تھا جب تک کہ ویٹالی حکیم اس سے رابطہ قائم نہ کرلیتا۔ شہر کی تفریح کا خیال اس نے فی الوقت ذہن سے نکال دیا تھا۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے ہی میں رہتی کہ اگر اس دوران ویٹالی حکیم خود آجائے یا اس کی فون کال آئے تو فوری طور پر اس سے رابطہ قائم ہو سکے۔ لیکن دو دن گزرنے کے بعد بھی ویٹالی حکیم کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو اسے تشویش ہونے لگی۔ ویٹالی حکیم نے تین ہوٹلوں کے نام بتاتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ان میں سے کسی ایک میں بھی ہوسکتا ہے۔ کارمائن نے مزید انتظار کرنے کے بجائے خود رابطہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور دوسرے ہوٹلوں کو ٹیلیفون کرنے لگی۔

پہلے ہوٹل سے جواب ملا کہ وہاں اس نام کے کسی شخص نے کبھی قیام نہیں کیا۔ دوسرے ہوٹل سے ملنے والا جواب بھی مایوس کن تھا۔ تیسری جگہ، ہوٹل ملائشیا کی طرف سے ملنے والے جواب نے تو اسے کسی حد تک بدحواس کر دیا تھا۔ ہوٹل کے کاؤنٹر کلرک نے بتایا کہ ہوٹل میں قیام پذیر مہمانوں میں اس نام کا کوئی شخص نہیں ہے۔ کارمائن مایوس ہو کر فون بند کرنے ہی والی تھی کہ اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک اور خیال آگیا۔ اس نے اپنا نام بتاتے ہوئے دریافت کیا کہ اس کے لیے کوئی پیغام تو نہیں چھوڑا گیا۔ اس مرتبہ اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ اس کے لیے ایک پیغام موجود تھا۔ اس نے فوراً ہی ملائشیا ہوٹل کی طرف دوڑ لگا دی۔ جہاں لفافے میں بند پیغام میں بتایا گیا تھا کہ ویٹالی حکیم، قیمتی پتھروں کا کاروبار کرنے والے گوتھر نامی ایک شخص کے گھر پر مقیم ہے۔ اس کا پورا پتا بھی تحریر تھا۔ کارمائن نے اطمینان کا سانس لیا۔ آخرِ کار وہ اپنے محبوب کے بارے میں معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

کانت ہاؤس میں کارمائن کی آمد چارلس سوبھراج کے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔ اس سے چند روز پہلے ہی تو وہ ہینک اور کارنیلیا کو لے کر آیا تھا جو ملحق فلیٹ میں صاحبِ فراش تھے لیکن وہ عیار ذہن کا مالک تھا۔ اس نے کسی گھبراہٹ کا مظاہرہ کرنے کے بجائے بڑی خوبصورتی سے صورتحال کو قابو میں رکھا۔

یہ اتفاق تھا کہ اسی روز بیلے سے بھی کارمائن کی ملاقات ہوگئی تھی۔ کارمائن، ویٹالی حکیم سے ملنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی لیکن فلیٹ میں مقیم کسی بھی شخص سے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ بیلے کو کارمائن کی حالت پر افسوس بھی ہو رہا تھا۔ انتہائی سستے قسم کا لباس اس کی بدحالی کی منہ بولتی تصویر تھا۔ بیلے اسے بنکاک میں بعض ایسی دکانوں کے بارے میں بتانے لگی جہاں سے اچھے مگر سستے ملبوسات حاصل کیے جاسکتے تھے۔ بیلے نے پیشکش کی تھی کہ اگر کارمائن پسند کرے تو وہ اس کے ساتھ بازار جانے کو تیار ہے۔ لیکن دوسرے دن پندرہ دسمبر کو کارمائن جس طرح اچانک آئی تھی اسی طرح کانت ہاؤس سے غائب بھی ہوگئی۔ حالانکہ اس نے فی الحال کہیں جانے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔

”کیا وہ خود ہی کہیں گئی ہے؟“ بیلے نے مونیکا سے دریافت کیا۔

جواب میں مونیکا محض کندھے اُچکا کر رہ گئی۔ اس کا چہرہ اب ہر وقت دُھواں دُھواں سا رہنے لگا تھا اور وہ بیلے سے نظریں چُرانے لگی تھی۔

”مجھے نہیں معلوم وہ کہاں چلی گئی ہے؟“ بیلے کے دوبارہ استفسار پر اس نے ایک بار پھر کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ان ہپیوں کا کیا بھروسہ۔ جس طرف منہ اٹھتا ہے چل دیتے ہیں۔“

اس کے دوسرے دن صبح سویرے پتایا کے ساحل پر ایک نوجوان لڑکی کی لاش تقریباً ایک فٹ گہرے پانی میں ڈوبی ہوئی ملی۔ جنیفر کی طرح اس لاش کے بارے میں بھی تھائی کام چور پولیس نے یہ مفروضہ قائم کر لیا کہ یہ ٹورسٹ لڑکی سے چٹان سے پھسل کر پانی میں جا گری تھی جہاں ڈوبنے سے اس کی موت واقع ہوگئی اور اس کی لاش کو لہروں نے کم گہرے پانی تک پہنچا دیا۔ پولیس نے اسے بھی محض ایک حادثہ قرار دے کر کیس کو داخلِ دفتر کر دیا۔ کئی ماہ بعد تحقیقات سے یہ انکشاف ہوا کہ وہ کارمائن تھی جسے نہ صرف گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا بلکہ اس کی گردن کی ہڈی بھی ٹوٹی ہوئی تھی جو غالباً کراٹے کے بھرپور وار کا نتیجہ تھا۔ اسے مرنے کے بعد ہی پانی میں پھینکا گیا تھا۔

کانت ہاؤس سے کارمائن کے غائب ہونے کے دوسرے دن ہینک اور کارنیلیا کو بھی فلیٹ سے رخصت کر دیا گیا۔ دو چار دن میں ہی ان کی حالت مُردوں سے بدتر ہو چکی تھی۔ انھیں سہارا

دے کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے نیچے لاکر عمارت کے سامنے کھڑی ہوئی چارلس سوبھراج کی کار میں ٹھونس دیا گیا۔ وہ آدھی رات کا وقت تھا۔ کار میں چارلس کے علاوہ اجے چوہدری بھی موجود تھا۔ ان کی واپسی صبح پانچ بجے سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ ابھی اندھیرا ہی تھا اور وہ اکیلے تھے۔ ان کی پتلونیں گھٹنوں تک بھیگی ہوئی تھیں اور کیچڑ کے دھبے بھی نظر آرہے تھے۔ چارلس نے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی پتلون اتار دی اور اسے ڈومنک کی طرف اچھالتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا کہ اسے فوری طور پر دھو دیا جائے۔ پتلون اٹھاتے ہوئے ڈومنک کو پٹرول کی بو محسوس ہوئی لیکن اس سلسلے میں کوئی سوال کرنے کے بجائے اس نے چارلس کی ہدایت پر عمل کرنا ضروری سمجھا۔

۱۸، دسمبر کے بنکاک پوسٹ کے صفحۂ اوّل پر دو کالمی سُرخی کے ساتھ شائع ہونے والی ایک خبر اس روز بیشتر لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ خبر کے ساتھ ایک مرد اور ایک عورت کی بھیانک تصویریں بھی موجود تھیں۔ خبر اگرچہ بہت مختصر سی تھی مگر اس کا ایک ایک لفظ رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا۔

”پولیس کو بنکاک سے تقریباً پینتالیس کلومیٹر دور سڑک سے کچھ فاصلے پر واقع ایک گڑھے سے ایک نوجوان مرد اور ایک عورت کی جلی ہوئی لاشیں ملی ہیں۔ وہ دونوں آسٹریلین تھے۔ لاشوں کے کچھ حصّے جلنے سے محفوظ رہ گئے تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ نے انکشاف کیا ہے کہ ان کی موت جلنے سے پہلے ہی واقع ہو چکی تھی۔ ان کے جسموں پر بعض جگہ تشدد کے نشانات بھی پائے گئے ہیں۔“

وہ ہینک بنٹانجا اور کارنیلیا کی لاشیں تھیں۔ انھیں سر پر کسی بھاری چیز سے ضربیں لگا کر ہلاک کیا گیا تھا پھر ان کی لاشوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی گئی تھی۔

بیلے اور سیموئیل بنکاک کے جنوب میں ساحل پر کرسمس کی چھٹیاں منا رہے تھے۔ ان کا پروگرام تو پندرہ دن کا تھا مگر موسم خراب ہونے کی وجہ سے وہ جلد ہی واپس لوٹ آئے۔ ان دنوں بنکاک بھی شدید سردی کی لپیٹ میں تھا۔ وہ بائیس دسمبر کو واپس آئے تھے اور اسی روز انھیں سفارت خانے میں ملازم اپنے ایک دوست کی طرف سے رات کی پارٹی میں شرکت کی دعوت ملی جسے انھوں نے بخوشی قبول کر لیا۔ جب وہ تیار ہو کر جانے لگے تو سوچا کہ کیوں نہ ایلین اور مونیکا سے بھی ملتے چلیں کیونکہ کئی روز سے ان سے بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ لفٹ کے ذریعے پانچویں منزل پر پہنچ گئے۔

فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔ بیلے کی دستک پر بھی کوئی جواب نہیں ملا تو پہلی مرتبہ انھیں احساس ہوا کہ فلیٹ پر سکوت طاری تھا۔ گزشتہ کئی مہینوں سے یہاں ہر وقت بہت تیز موسیقی، ایلین گوتھر کے مہمانوں اور گاہکوں کی آمدورفت کا شور، یا لتو نمدر نپولین اور ریشمی بالوں والے چھوٹے سے کتے فریکی کے بھونکنے کی آوازیں گونجا کرتی تھیں لیکن آج یہاں کی فضا پُرسکون تھی اور یہ سکوت کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

بیلے دروازے پر مسلسل دستک دے رہی تھی۔ بالآخر دروازہ کھل گیا اور ڈومنک کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ ایلین کا پہلا مہمان تھا جو یہاں آتے ہی بیمار ہوگیا تھا اور اب تک پیچش کی شدید بیماری سے نجات حاصل نہیں کر سکا تھا۔ وہ بیلے اور سیموئیل کو راستہ دینے کے لیے دروازے سے ہٹ گیا۔ کمرے کے اندر ایک صوفے پر یانک اور جیکسن گم صم بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے دیکھ کر ان بچوں کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا جو جنگل میں راستہ بھول چکے ہوں۔ بیلے اور سیموئیل حیران تھے کہ خلافِ معمول انھوں نے خاموشی کیوں اختیار کر رکھی ہے وہ اس سلسلے میں کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن اسی لمحے نیچے کوئی گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی اور یانک اس طرح اچھل کر کھڑکی کے قریب پہنچ گیا جیسے اس میں یکایک برقی رو دوڑ گئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔ وہ چند لمحے کھڑکی سے جھانک کر نیچے رکنے والی کار کو دیکھتا رہا پھر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی اب بدل گئے تھے جیسے کوئی متوقع خطرہ ٹل گیا ہو۔

”سب لوگ کہاں غائب ہیں؟“ بیلے نے بالآخر خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

”کھٹمنڈو۔“ جیکسن نے جواب دیا۔ ”ایلین، مونیکا اور اجے چوہدری کرسمس کی چھٹیاں گزارنے کے لیے اچانک ہی نیپال چلے گئے ہیں۔ ایلین کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کھٹمنڈو کے ایک کاسینو میں نہ صرف بڑے جوئے کا پروگرام بنا رہا تھا بلکہ اسے وہاں کچھ ضروری کاروباری امور بھی نمٹانے تھے۔“

”حیرت ہے۔“ بیلے نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”مونیکا نے تو کبھی ذکر تک نہیں کیا تھا کہ وہ کرسمس کی چھٹیاں کہیں باہر

گزارنا چاہتے ہیں۔"

"میں نے کہا نا کہ انھوں نے یہ پروگرام اچانک ہی بنایا تھا۔" جیکسن بولا۔ "وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر تیار ہو کر رخصت ہو گئے تھے۔ اور ہمیں یہاں گھر کی دیکھ بھال کے لیے چھوڑ گئے۔"

بیلے گہری نظروں سے ان کے چہروں کا جائزہ لینے لگی۔ ان سب کے چہروں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اسے شبہ تھا کہ وہ لوگ کسی نئی بیماری کا شکار تو نہیں ہو گئے۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈومنک کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ پیشانی ٹھنڈی تھی اور یہ کیفیت کسی بیماری کی علامت کے بجائے کسی خوف کا نتیجہ بھی ہو سکتی تھی۔ ڈومنک نے اس کی تصدیق بھی کر دی کہ انھیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ بلکہ آج تو وہ اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کر رہے تھے۔ اس فلیٹ میں آنے کے بعد سے وہ مسلسل بیمار رہے تھے اور آج پہلی مرتبہ انھوں نے اپنے آپ میں یہ خوشگوار تبدیلی محسوس کی تھی۔

"پھر کیا معاملہ ہے؟ اس خاموشی کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟" بیلے نے متجسّس لہجے میں پوچھا۔

"تم لوگ غالباً کسی پارٹی میں جا رہے ہو۔" ڈومنک نے ان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "واپس آؤ گے تو بتا دیں گے کہ کیا معاملہ ہے؟"

"نہیں۔" بیلے نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ اس وقت تک یہاں سے ہلنے کو تیار نہیں تھی جب تک کہ وہ اصل صورتحال سے آگاہ نہ ہو جاتی۔ وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "پہلے ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ اصل بات کیا ہے؟"

یانک اس طرح محتاط نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لینے لگا جیسے یہ جاننا چاہتا ہو کہ اس کی آواز اس کمرے سے باہر تو نہ جائے گی۔ اس نے ایک مرتبہ اپنے ساتھیوں کے چہروں کا جائزہ لیا اور پھر کسی غبارے کی طرح پھٹ پڑا۔ اس کے منہ سے نکلنے والا ایک ایک لفظ بیلے کے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا۔

"تم شاید اپنے دوست ایلین کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔" یانک کہہ رہا تھا۔ "وہ چور، لٹیرا، ڈاکو اور... اور قاتل ہے۔ وہ بہت سے... لوگوں کو قتل کر چکا ہے اور ہمیں بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اور اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ ہم تمھیں اس کی اصلیت بتا چکے ہیں تو وہ اپنا راز چھپانے کے لیے تمھیں بھی موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"میں سمجھی نہیں؟" بیلے نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت اسے کس قسم کے تاثرات کا اظہار کرنا چاہیے۔

یانک نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ اب جیکسن اور ڈومنک بھی بولنے لگے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ جنیفر، ترک یہودی ویٹالی حکیم اور آخر میں آنے والی خوبصورت لڑکی کارمائن کا اس طرح اچانک غائب ہو جانا بے معنی نہیں تھا۔ پھر ہینک اور کارنیلیا کا معاملہ تو ابھی تازہ ہی تھا۔ انھیں یقین تھا کہ ایلین گوتھر ان سب لوگوں کو ٹھکانے لگا چکا تھا۔

"جب تم ساحل پر چھٹیاں منانے کے لیے گئی ہوئی تھیں تو پولیس کو شہر سے کچھ دور دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں۔" یانک نے بتایا۔ "ایک عورت اور ایک مرد۔ ان کی اگرچہ شناخت نہیں ہو سکی تھی لیکن ہمیں یقین ہے کہ وہ ہینک اور کارنیلیا کی لاشیں تھیں۔" اس نے جیب سے اخبار کا ایک تراشہ نکال کر بیلے کی طرف بڑھا دیا۔

اس اخباری تراشے میں خبر کے ساتھ ایک مرد اور ایک عورت کی جلی ہوئی ناقابلِ شناخت لاشوں کی تصویریں بھی تھیں۔ وہ چند لمحے ان تصویروں کا جائزہ لیتی رہی پھر یانک کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"لیکن اس خبر میں تو بتایا گیا ہے کہ وہ دونوں آسٹریلین تھے۔"

"پوری خبر پڑھو۔" یانک نے کہا۔

بیلے ایک بار پھر خبر پڑھنے لگی۔ جس میں ایک جگہ یہ بھی تحریر تھا کہ لڑکی نے جو بنیان پہن رکھا تھا اس کا کچھ حصہ جلنے سے محفوظ رہا تھا۔ اور اس پر ساختہ ہالینڈ کا لیبل لگا ہوا تھا۔

"یہ ہینک اور کارنیلیا کے سوا کوئی نہیں ہو سکتے۔" یانک نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

ڈومنک نے اس کے خیال کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ اس روز آدھی رات کے وقت اس نے ایلین گوتھر اور اجے چوہدری کو نیم مدہوش ہینک اور کارنیلیا کو تقریباً گھسیٹ کر عمارت کی سیڑھیوں پر لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

"ہینک اور کارنیلیا اپنے ہوش میں نہیں تھے۔" ڈومنک نے بتایا۔ "ایلین کے ہاتھ میں آہنی سریہ اور اجے چوہدری کے ہاتھ میں ربر کے پائپ کا ایک ٹکڑا بھی تھا۔ وہ دونوں صبح پانچ بجے کے قریب اکیلے ہی لوٹے تھے اور ان کے

پتلونوں کے پائنچے کیچڑ آلود تھے۔" ڈومنک ایک لمحہ کو خاموش ہوا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی۔ وہ بیلے کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ایلین نے واپس آتے ہی پتلون اتار کر میری طرف پھینکتے ہوئے اسے فوری طور پر دھونے کا حکم دیا تھا اور پتلون اٹھاتے ہوئے اس سے اٹھنے والی پٹرول کی ہلکی سی بُو کو محسوس کر کے میں چونکے بغیر نہیں رہا تھا۔"

بیلے نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ سیموئیل کا چہرہ بھی اس کی طرح دھواں ہو رہا تھا۔ ایلین گوتھر کی سرگرمیوں کے بارے میں وہ پہلے ہی مشکوک تھا اور اسی لیے وقتاً فوقتاً اپنی بیوی کو اس سے دور رہنے کی ہدایت کیا کرتا تھا۔ ایلین کی سرگرمیوں پر شبہ تو بیلے کو بھی تھا لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ اس قدر ہنس مکھ اور ملنسار شخص ایسے سنگین جرائم کا مرتکب بھی ہو سکتا ہے۔ اسے یانک وغیرہ کی باتوں پر واقعی یقین نہیں آ رہا تھا اور پھر ایلین وغیرہ کے خلاف ان کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت بھی نہیں تھا۔ ممکن ہے طویل بیماری کے بعد اپنے آپ کو کسمپرسی کی حالت میں پا کر ان پر یکایک مایوسی طاری ہو گئی ہو اور انھوں نے ایلین کے خلاف یہ کہانی گھڑ لی ہو۔ ایلین کے آنے کے بعد اس فلیٹ میں لاتعداد لوگوں کی آمد و رفت رہی تھی اور ان میں سے اکثر ایسے تھے جو یہاں سے رخصت ہونے کے بعد دوبارہ نظر نہیں آئے تھے اور ظاہر ہے ایلین نے ان سب کو قتل تو نہیں کر دیا ہو گا۔

"شاید اسے دیکھنے کے بعد تمھیں ہماری باتوں کا یقین آ جائے گا۔" ڈومنک نے کہتے ہوئے اپنا پاسپورٹ جیب سے نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ "یہاں آتے ہی ایلین نے میرا پاسپورٹ، ٹریولرز چیک اور دیگر تمام سفری کاغذات حفاظت کے خیال سے مجھ سے لے لیے تھے اور میں گزشتہ ایک مہینے سے ان کی واپسی کا مطالبہ کر رہا تھا مگر وہ ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی عذر پیش کر دیتا۔ لیکن کھٹمنڈو روانہ ہونے سے پہلے بالکل غیر متوقع طور پر اس نے میرا پاسپورٹ واپس کر دیا۔ یہ دیکھو... پاسپورٹ کے یہ صفحات میرے الزام کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔" اس نے پاسپورٹ کے بعض صفحات کی نشاندہی کی۔ اصل صفحات نکال کر ان کی جگہ بڑی مہارت سے کسی اور پاسپورٹ کے صفحات شامل کیے گئے تھے۔ جن پر تھائی لینڈ میں آمد و رفت کے ویزوں کی متعدد مہریں لگی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے ڈومنک کی بیماری کے دوران یہ پاسپورٹ کسی اور ہی نے استعمال کیا تھا۔

"میں کچھ اور ثبوت بھی فراہم کر سکتا ہوں۔" اس مرتبہ یانک نے دہشت زدہ بیلے کو متوجہ کیا اور ان دونوں میاں بیوی کے ہاتھ پکڑ کر چارلس کے بیڈ روم میں لے گیا۔ جہاں ایک چھوٹا سا سیف پڑا ہوا تھا۔ "شاید تم لوگوں کو یاد ہو کہ میرا اور جیکسن کا پاسپورٹ اور دیگر سفری کاغذات بتایا کے اس بنگلے سے چوری ہو گئے تھے جو ایلین نے ہماری تفریح کے لیے کرائے پر حاصل کیا تھا؟"

"ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ پتایا سے واپسی پر مونیکا نے بھی اس کا ذکر کیا تھا۔" بیلے نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بنکاک واپس آتے ہی ہم نے فرانسیسی سفارتخانے کو اس واقعے کی اطلاع دے دی تھی اور بڑی بحث و تکرار کے بعد ہمیں نئے پاسپورٹ جاری کیے گئے تھے۔ سفارتخانے والوں نے طرح طرح کے سوالات کر کے میرا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ پاسپورٹ کس نے چوری کیے تھے۔ ظاہر ہے میں کس کا نام لیتا لیکن اب مجھے اس سوال کا جواب مل گیا ہے۔" یانک نے کہتے ہوئے سیف کا دروازہ کھول دیا اور اس کے ایک خانے میں رکھے ہوئے تقریباً درجن بھر مختلف پاسپورٹوں میں سے سُرخ جلد والا فرانسیسی پاسپورٹ نکال لیا۔ یہ اس کا اپنا پاسپورٹ تھا۔

یانک نے پاسپورٹ بیلے کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ڈومنک کے پاسپورٹ کی طرح اس پاسپورٹ کے بعض اصل صفحات بھی غائب تھے اور تھائی لینڈ میں آمد و رفت کے لیے متعدد ویزوں کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ یانک نے سُرخ رنگ کا ایک مارکر اٹھایا اور پاسپورٹ کے ہر صفحے پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ دیں۔

"اب وہ دھوکے باز کم از کم اس پاسپورٹ کو دوبارہ استعمال نہیں کر سکے گا۔" یانک کے لہجے میں تلخی تھی۔

دونوں فلیٹوں میں کچھ اور ایسے شواہد بھی موجود تھے جو ایلین کے خلاف ان کے بیانات کی تصدیق کر رہے تھے۔ ان میں یہاں قیام کرنے والے اور پھر یکایک غائب ہو جانے والے لوگوں کے سامان کی کوئی ایک آدھ چیز، سیاحت کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والے کتابچے، ایسے خطوط جنھیں لکھنے کے بعد پوسٹ نہیں کیا جا سکا تھا اور اسی قسم کی چیزیں شامل تھیں۔

یانک اور جیکسن کا خیال تھا کہ ان تمام شواہد کی موجودگی

میں ایلین گوتھر کے خلاف، چوری، ڈکیتی، رہزنی اور قتل کا کیس کیا جاسکتا تھا لیکن بیلے کا ذہن میری آندرے میں الجھا ہوا تھا۔ کیا وہ ایلین کی ان غیر قانونی سرگرمیوں سے بے خبر تھی یا وہ بھی ان جرائم میں اس کے ساتھ شامل تھی؟

"وہ یقیناً سب کچھ جانتی تھی۔" یانک نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "وہ اندھی اور بہری نہیں تھی۔ کوئی بیوقوف بھی سمجھ سکتا تھا کہ اس فلیٹ میں کیا ہو رہا ہے۔ مونیکا ہی بیمار ہونے والوں کو ایلین کی دی ہوئی دوائیں پلایا کرتی تھی۔"

"ایسی صورت میں۔" بیلے کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "ہمیں وقت ضائع کیے بغیر پولیس کو اطلاع دے دینی چاہیے۔"

"بالکل نہیں۔" سیموئیل نے بڑی شدت سے اس کی مخالفت کی۔ "پولیس کو یقین دلانا بہت مشکل ہوگا اور بالفرض ہم کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہ کرسکے تو الٹی آنتیں گلے کو آجائیں گی۔"

انھیں سیموئیل کی بات کا مفہوم سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ جیکسن وغیرہ نے بھی اس کی اس رائے سے اتفاق کیا تھا کہ اپنے آپ کو اس معاملے میں ملوث کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ کسی اجنبی ملک میں سفر کرتے ہوئے غیر ملکی سیاحوں کی پالیسی یہی ہونی چاہیے کہ وہ اس ملک کے قانون سے دور ہی رہیں بصورتِ دیگر انھیں بے شمار مسائل کا سامنا ہو سکتا تھا۔

یانک اس وقت اپنے ساتھیوں کی نمائندگی کر رہا تھا۔ اس وقت ان سب کی متفقہ رائے یہی تھی کہ ان تینوں کو پہلی فرصت میں تھائی لینڈ کی حدود سے نکل جانا چاہیے۔ یانک نے بتایا کہ وہ اور جیکسن فرانسیسی پولیس میں ملازمت کر چکے تھے اور پولیس سے ان کے تعلقات اب بھی تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ پیرس پہنچتے ہی انٹرپول سے رابطہ قائم کرکے اونچی سطح پر ایلین گوتھر کے خلاف تحقیقات کرائیں گے۔ بیلے اور سیموئیل نے بھرپور انداز میں اس کی تائید کی تھی لیکن ایک اہم مسئلہ اب بھی باقی تھا۔ ان تینوں کے پاس ایک پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی جبکہ ٹکٹوں کے لیے دو سو پچاس ڈالر کی رقم درکار تھی۔ بیلے نے سیموئیل کی طرف دیکھا۔ سیموئیل نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"ٹھیک ہے۔ یہ رقم ہم تم لوگوں کو قرض کے طور پر دے دیں گے۔ اب تم لوگ روانگی کی تیاری کرو۔" بیلے نے کہتے ہوئے ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لیا۔ اس کمرے میں رقص و موسیقی اور بادہ نوشی کی محفلیں جما کرتی تھیں۔ لیکن اب ان دیواروں سے خوف محسوس ہو رہا تھا اور وہ ایک لمحے کو بھی یہاں نہیں رکنا چاہتی تھی۔

اس رات پیرس کے لیے کوئی فلائٹ نہیں تھی۔ البتہ دوسرے دن آدھی رات کے لگ بھگ ایک فلائٹ جانے والی تھی۔ ان تینوں پر وحشت کے ساتھ ایلین کا خوف بھی طاری تھا۔ وہ کسی بھی وقت واپس آسکتا تھا۔ چنانچہ وہ رات فلیٹ میں گزارنے کے بجائے وہ ائیر پورٹ پہنچ گئے اور ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد ایسی جگہوں پر چھپے رہنے کی کوشش کرتے رہے جہاں زیادہ لوگوں کا ہجوم ہوتا۔ انھیں تقریباً بیس گھنٹے اسی اذیت میں مبتلا رہنا پڑا۔ فلیٹ سے رخصت ہونے سے پہلے یانک نے ایک کام یہ دکھایا تھا کہ اس نے سیف کے تالے میں چابی اس طرح گھمائی تھی کہ تالے کا میکینزم جام ہوکر رہ گیا تھا اور اسے کم از کم چابی کی مدد سے نہیں کھولا جا سکتا تھا۔ یہ چابی کئی روز پہلے اس نے چارلس کی میز کی دراز سے چوری کی تھی۔ اور ائیر پورٹ پہنچتے ہی اس نے چابی کو ایک ڈسٹ بن میں پھینک دیا تھا۔

فلیٹ سے نکل کر کانت ہاؤس سے رخصت ہوتے ہوئے وہ کچھ دیر کو بیلے کے فلیٹ کے سامنے رکے تھے۔ جہاں انھوں نے ان دونوں میاں بیوی کی ہمدردی اور محبت کا شکریہ ادا کیا اور یانک نے اپنے اس عہد کو دہرایا تھا کہ وہ ایلین کو کبھی نہیں بخشے گا۔ بیلے محض سر ہلا کر ہی رہ گئی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک اور سوال کلبلا رہا تھا کہ وہ ایلین کے گھر کے دونوں پالتو جانور، کتا اور بندر کہاں تھے؟ وہ ریشمی بالوں والے چھوٹے سے سفید کتے کے بارے میں زیادہ پریشان تھی جسے میری آندرے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی تھی۔

"وہ کتا ایلین نے اپنی دوست نکوشی کو دے دیا تھا۔"

"اور بندر نپولین؟" یانک نے کندھے اچکا دیے۔ نپولین کے بارے میں کسی کو بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا۔

لیکن دوسرے دن صبح ہی نپولین کا پتا بھی چل گیا۔ صبح ہوتے ہی کوڑا اٹھانے والی گاڑی کانت ہاؤس کے سامنے آکر رکی۔ ایک بھنگی نے بلڈنگ کے سامنے رکھے ہوئے کوڑے دان کا ڈھکنا جیسے ہی اٹھایا وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ کوڑے دان میں نپولین کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر میری آندرے کے ہاتھ کا سلا ہوا جانگیہ موجود تھا اور اس کا گلا کٹا ہوا تھا۔

ہوائی جہاز کے ذریعے سلسلۂ ہمالیہ کی برفپوش چوٹیوں کے ساتھ ساتھ پرواز کرتے ہوئے دہلی سے کھٹمنڈو تک زیادہ سے زیادہ سوا گھنٹے میں پہنچا جاسکتا ہے لیکن نشے کی طلب میں ہندوستان کا رخ کرنے والے ہپّی عام طور پر دہلی سے کھٹمنڈو جانے کے لیے ہوائی جہاز کے بجائے بس کے سفر کو ترجیح دیتے ہیں۔ کہیں کہیں دریائے گنگا کے ساتھ ساتھ اور کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی بستیوں سے ہوتی ہوئی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک بالآخر نیپال کی حدود میں داخل ہوکر ہمالیہ کی بلندیوں پر تیرتے ہوئے بادلوں کو چھوتی ہوئی کھٹمنڈو پہنچ جاتی ہے۔ بس کے ذریعے یہ راستہ تین دن میں طے کیا جاسکتا ہے۔

تین دن کا یہ سفر اگرچہ تکلیف دہ تھا لیکن اینا بیلا کو ذرا سی بھی پشیمانی نہیں تھی۔ دہلی سے روانہ ہونے سے ایک دو دن پہلے اس کی ملاقات دو آسٹریلین لڑکیوں میٹی اور کورا سے ہوئی تھی۔ جو بس کے ذریعے کھٹمنڈو جانے کا پروگرام بنا رہی تھیں۔ انھوں نے اینا بیلا کو بھی اپنے ساتھ اس سفر کی دعوت دی۔ جسے اس نے بخوشی قبول کرلیا تھا اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ اس کا یہ فیصلہ درست ہی ثابت ہوا تھا کیونکہ اس سفر کے دوران اسے ہندوستان کے انتہائی اندرونی علاقے دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ بھانت بھانت کے لوگوں کو دیکھ کر وہ بے حد محظوظ ہو رہی تھی۔ بس کسی اسٹاپ پر لمبے وقفے کے لیے رکتی تو مقامی باشندوں کے ساتھ بس کے مسافر بھی ایک جگہ جمع ہوکر حشیش پینے لگتے۔ وہ مختلف ٹولیوں میں دائروں کی صورت میں بیٹھ جاتے اور حشیش سے بھری ہوئی سلفی ان کے درمیان گردش کرتی رہتی حشیش کے دھوئیں کے مرغولے فضا پر بھی نشے کی سی کیفیت طاری کر دیتے۔

ایک چھوٹی سی بستی کے اسٹاپ پر بس تھوڑی دیر کے لیے رُکی تھی۔ دوسرے مسافروں کی طرح اینا بیلا بھی ٹانگیں سیدھی کرنے کو نیچے اُتر گئی۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد جب وہ دوبارہ بس میں سوار ہوئی تو اپنی سیٹ پر ایک نوجوان عورت کو بیٹھے دیکھ کر وہ چونک گئی۔ وہ ہندو تھی جس نے بلاؤز سے ملتی جلتی مختصر سی چولی اور پھولدار گھاگھرا پہن رکھا تھا۔ اس کا جسم چاندی کے بھاری زیورات سے لدا ہوا تھا۔ گلے میں مخصوص بناوٹ کے کئی قسم کے ہار تھے جن میں ایک تو طوق کی طرح گردن میں پھنسا ہوا تھا۔ کانوں میں کئی کئی بالیاں، ناک میں نتھنی اور دونوں بازوؤں میں کہنیوں تک چوڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ اینا بیلا چند لمحے متجسس نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر خاموشی سے اس خالی سیٹ پر جا بیٹھی جس کے ساتھ والی سیٹ پر ایک کنیڈین نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی گود میں کئی قسم کے سیاحت کے کتابچوں کے علاوہ ایک عدد کیمرہ بھی رکھا ہوا تھا۔

تیئس سالہ لاڈی ڈوپار کا تعلق کینیڈا کے شہر مینی ٹوبا سے تھا۔ وہ اگرچہ پیشہ ور کوہ پیما نہیں تھا اور نہ ہی اسے کوہ پیمائی کا کوئی تجربہ تھا لیکن وہ اپنے طور پر ایورسٹ کی زیادہ سے زیادہ بلندی پر پہنچنے کی خواہش لے کر گھر سے نکلا تھا۔ اس کے بیگ میں ساگر ماتا کی لاتعداد تصویریں اور نقشے موجود تھے۔ ایورسٹ کو یہ نام نیپالیوں نے دیا تھا جس کے لغوی معنی 'ہواؤں کی ماں' کے ہیں۔

بس اب اس راستے پر تھی، جہاں دور دور تک بلند پہاڑی چوٹیاں نظر آرہی تھیں۔ کوئی بلند تر پہاڑی چوٹی دیکھ کر لاڈی اپنی سیٹ سے اٹھ کر ڈرائیور کے پاس پہنچ جاتا اور اس چوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کرتا کہ کیا یہی ماؤنٹ ایورسٹ ہے۔ ڈرائیور ہر مرتبہ نفی میں سر ہلا دیتا۔

ماؤنٹ ایورسٹ کا فاتح سر ایڈمنڈ ہیلاری اور ان کا شرپا گائیڈ ٹینزنگ نارگے، لاڈی کا آئیڈیل تھے۔ وہ راستے بھر اینا بیلا کو ان کی خطرناک مہمات کے بارے میں دلچسپ کہانیاں سناتا رہا۔ ٹرین یا بس کے ذریعے طویل سفر کرنے والے مسافر عام طور پر جلد ہی دوستی کے رشتے سے منسلک ہوجاتے ہیں۔ اینا بیلا اور لاڈی بھی ایک دوسرے سے بے تکلف ہو چکے تھے اور بالآخر تیسرے روز جب بس نے انھیں کھٹمنڈو پہنچایا تو وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اپنائیت محسوس کرنے لگے تھے کھٹمنڈو پہنچنے کے بعد بھی اینا بیلا نے لاڈی کا دامن تھامے رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

لاڈی ڈوپار کا تعلق کینیڈا کے ایک ایسے خاندان سے تھا۔ جو فرانسیسی اور کنیڈین خون کی آمیزش سے معرضِ وجود میں آیا تھا۔ اس کی پرورش ایک دور افتادہ علاقے میں ہوئی تھی۔ جہاں اس کے باپ نے دو سو ایکڑ رقبے پر پولٹری فارم بنا رکھا تھا لیکن شہر سے میلوں دور اور ذرائع آمد و رفت نہ ہونے کے باعث اسے بڑی حد تک مالی دشواریوں کا سامنا ہو رہا تھا۔

ممکن ہے لاڈی بھی اپنے باپ کے ساتھ زندگی بھر اس فارم پر مرغیاں پالتا رہتا لیکن ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران اُسے ایک مرتبہ مطالعاتی دورے پر فرنچ ڈیری کمیونٹی جانے کا موقع ملا۔ پیرس میں تین ماہ کے قیام کے دوران حصولِ تعلیم کے ساتھ وہ کام بھی کرتا رہا اور جب واپس لوٹا تو اس کے پاس نہ صرف اچھی خاصی رقم موجود تھی بلکہ وہ فرانسیسی زبان بھی روانی سے بولنے لگا تھا۔

اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ وہ اب تک کینیڈا کے دور افتادہ علاقے میں واقع اپنے باپ کے مرغیوں کے فارم پر وقت ضائع کرتا رہا تھا جبکہ زندگی کی رنگینیاں پوری دنیا میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس کے باپ کا خیال تھا کہ اب وہ کالج کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس کی ذمے داریاں سنبھال لے گا لیکن لاڈی نے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔ ونّی پیگ یونیورسٹی سے ایک سال تک پولیٹیکل سائنس اور نفسیات کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ شمالی کینیڈا چلا گیا۔ جہاں چاندی کی کانوں میں کام کرکے اس نے اتنی رقم جمع کرلی کہ وہ کم از کم چھ ماہ تک دنیا کی سیاحت کرسکتا تھا۔

۱۹۷۴ء میں لاڈی اپنے چھوٹے بھائی بیدی کو ساتھ لے کر دنیا کی سیاحت پر روانہ ہوگیا۔

یورپ کی سیاحت کے دوران دونوں بھائی اکٹھے ہی رہے لیکن مشرقِ وسطیٰ میں پہنچتے ہی ان کے راستے الگ ہوگئے انھوں نے طے کیا تھا کہ ۱۹۷۶ء کے اوائل میں بنکاک یا نیوزی لینڈ میں پھر اکٹھے ہوجائیں گے اور اس دوران وہ کینیڈا میں مقیم اپنی والدہ کو ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے کا وسیلہ بنائیں رکھیں گے۔

دسمبر ۱۹۷۵ء کے پہلے ہفتے کے دوران لاڈی نے دہلی سے فون پر اپنی والدہ سے بات کی اور بتایا کہ ہندوستان ان جیسے لوگوں کے لیے قطعی موزوں نہیں ہے۔ یہاں اسے قدم قدم پر مختلف مسائل اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اب وہ کھٹمنڈو جا رہا ہے جہاں وہ دنیا کی بلند ترین پہاڑی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ کو بہت قریب سے دیکھ سکے گا۔

لاڈی کا خیال تھا کہ وہ فروری کے پہلے ہفتے میں بنکاک پہنچ جائے گا۔ جہاں چھوٹے بھائی بیری سے ملاقات کا امکان تھا۔ اخراجات کی اسے فکر نہیں تھی۔ وہ بہت محتاط ہوکر خرچ کر رہا تھا۔ اور اب بھی اس کے پاس بارہ سو ڈالر موجود تھے اور اسے یقین تھا کہ وہ کم از کم تین مہینے اور گھوم پھر کر دنیا کی رنگینیاں دیکھ سکے گا۔ اس کے بیگ میں ان فلموں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی جن میں وہ دنیا کے مختلف خطّوں کے خوبصورت اور سنسنی خیز مناظر محفوظ کر چکا تھا اور اسے یقین تھا کہ وطن پہنچ کر وہ تصویروں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب شائع کرسکے گا جس کا کم از کم ایک باب اس کی نئی دوست اینا بیلا کے بارے میں مع تصاویر ہوگا۔

فریک اسٹریٹ، شہر کے وسط میں واقع دربار اسکوائر سے ملحق وہ علاقہ ہے جہاں کبھی رات نہیں ہوتی۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں کے علاوہ یہاں ایسی دکانیں بھی ہیں۔ جہاں سوئی سے لے کر ہاتھی تک دستیاب ہوسکتا ہے لیکن غیر ملکی خصوصاً یورپین سیّاحوں کو ہر دکان یا ہوٹل میں داخل ہونے کے لیے جھکنا پڑتا ہے۔ نیپالیوں کے قد عام طور پر چھوٹے ہوتے ہیں اور عمارتوں کے دروازے بھی اسی لحاظ سے بنائے جاتے ہیں۔ مگر منشیات کے طالب یورپین سیاح کسی ہوٹل یا نائٹ کلب میں داخل ہونے کے لیے جھکنے کی معمولی سی زحمت گوارہ کرلیتے ہیں۔ آسانی سے منشیات کے حصول کی وجہ سے ہی فریک اسٹریٹ کا یہ علاقہ چوبیس گھنٹے غیر ملکی سیّاحوں کی توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے۔

لاڈی اور اینا بیلا کو اورینٹل لاج نامی ایک گھٹیا سے ہوٹل میں کمرہ مل گیا۔ اس ہوٹل میں زیادہ تر یورپین ہپیّوں کی آمد و رفت تھی۔ جنہیں یہاں حشیش وغیرہ آسانی سے دستیاب ہوجاتی تھی۔

کھٹمنڈو اینا بیلا کو مجموعی طور پر پسند آیا تھا۔ سڑکوں پر گھومتے ہوئے زرد چوغوں والے بدھ بھکشو، مخصوص لباس والی تبّتی عورتیں، جگہ جگہ بازیگری کے کھیل تماشے، ہر چیز اس کے لیے نئی تھی جس سے وہ پوری طرح محظوظ ہو رہی تھی لیکن لاڈی کو سخت مایوسی ہوئی تھی۔ ان کے آنے سے صرف ایک روز پہلے گائیڈ کی رہنمائی میں سیّاحوں کی ایک پارٹی ماؤنٹ ایورسٹ کی قدمبوسی کے لیے روانہ ہوچکی تھی۔ لاڈی کو افسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک دن پہلے ہی یہاں کیوں نہیں پہنچ گیا۔ اب دوسری پارٹی دس دن بعد روانہ ہونے والی تھی لیکن اس کے ساتھ یہ شرط بھی تھی کہ اگر موسم مناسب ہوا تو یہ پارٹی روانہ کی جاسکے گی بصورتِ دیگر یہ پروگرام منسوخ کر دیا جائے گا۔ لاڈی اکیلا ہی ایورسٹ کے دامن میں جانے کی سوچ رہا تھا لیکن محکمہ سیاحت کے ایک آفیسر نے سختی سے اسے منع کر دیا۔ کیونکہ دُھند کی وجہ سے انتہائی دشوار گزار راستوں پر کسی رہنما کی مدد کے بغیر چلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کوئی غلط قدم اسے تحت الثریٰ میں بھی پہنچا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ڈاکوؤں کے خطرے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ گزشتہ سال ایک امریکی نوجوان منع کرنے کے باوجود اکیلا ہی اس مہم پر نکل کھڑا ہوا تھا۔ رات گزارنے کے لیے اس نے دھان کے ایک کھیت کے کنارے پڑاؤ ڈالا تھا لیکن صبح اس کا سر تن سے جدا پایا گیا۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد ایک اور امریکی جوڑا ہمالیہ کی ترائی میں لاپتا ہوگیا اور کوشش کے باوجود ان کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ نیپال کے لوگ عام طور پر بڑے پرسکون اور امن پسند واقع ہوئے ہیں۔ شہری حدود میں وہ قانون کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ لیکن شہروں سے دور جہاں ہمالیہ کے دامن میں لاتعداد چھوٹے چھوٹے قبائل بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ ان قوانین کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ان کے اپنے قوانین ہیں اور وہ انہی کو ترجیح دیتے ہیں۔

اینا بیلا اور لاڈی اکثر اکٹھے ہی گھومتے لیکن کبھی کبھی وہ الگ راستوں پر بھی نکل جاتے۔ لاڈی کا زیادہ وقت کیفے گوون میں گزرتا جہاں چائے کی چسکیوں کے دوران وہ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں سے ایورسٹ کے بارے میں باتیں سنتا رہتا۔ کبھی وہ یاک اینڈ ییٹی ریسٹورنٹ میں چلا جاتا جو کسی زمانے میں رائل پیلس کا حصّہ ہوا کرتا تھا مگر ان دنوں بورس لسنوچ نامی ایک روسی کے قبضے میں تھا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ ایورسٹ کی چوٹی پر برفانی انسان ییٹی سے ملاقات کر چکا ہے۔ وہ اپنے گاہکوں کو متاثر کرنے کے لیے اکثر اپنی ایورسٹ کی اس فرضی مہم اور برفانی انسان سے ملاقات کی من گھڑت داستانیں سنایا کرتا تھا۔

اینا بیلا عام طور پر صبح دیر سے سو کر اٹھتی۔ ناشتہ آنٹ جین نامی گھریلو قسم کے ریسٹورنٹ میں کرنے کے بعد شہر کے قلب میں واقع دربار اسکوائر کی طرف نکل جاتی جہاں لاتعداد ہپّی کسی پگوڈا یا ٹمپل کی چوڑی پتھریلی سیڑھیوں پر بیٹھے دھوپ تاپتے ہوئے نظر آتے۔ ان کے آس پاس بکریاں اور بندر اس طرح منڈلاتے رہتے کہ بعض اوقات جانوروں اور انسانوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا۔

ایک دن اینا بیلا، لاڈی کو بھی مجبور کر کے ایک ٹمپل میں لے گئی جو حسنِ تعمیر کے علاوہ زندہ دیوی کی وجہ سے بھی خاصی شہرت رکھتا تھا۔ روایت تھی کہ صدیوں پہلے اس ملک کا بادشاہ رعایا کو درشن دینے کے لیے ہاتھی پر سوادِ شہر کے ایک علاقے سے گزر رہا تھا کہ اس کی نظر ایک خوبصورت لڑکی پر جم گئی جس کی عمر اس وقت بارہ سال سے بھی کم تھی۔ اس رات بادشاہ نے اپنے آدمیوں کے ذریعے اس کمسن خوبصورت لڑکی کو اغوا کرا لیا۔ دوسری صبح اس لڑکی کی لاش محل کی دیوار کے قریب پڑی ہوئی ملی۔

بادشاہ کو اس ظلم کی بہت ہی خوف ناک سزا ملی۔ بادشاہ نے اسے دیوتاؤں کی ناراضگی سمجھ کر اس عمر اور اس کی شکل سے ملتی جلتی لڑکی تلاش کرنے کا حکم دیا۔ ملک بھر میں کئی روز کی تلاش کے بعد بالآخر ایک ایسی لڑکی مل ہی گئی۔ بادشاہ نے ایک عظیم الشان پگوڈا تعمیر کرایا اور اس لڑکی کو زندہ دیوی کے نام سے پگوڈا میں بٹھا دیا اور اعلان کرا دیا کہ اس زندہ دیوی کی پرستش کی جائے۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ سنِ بلوغت کو پہنچنے کے بعد اس کی جگہ کسی اور لڑکی کو دے دی جائے اور اس طرح صدیوں سے زندہ دیوی کا یہ سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ نیپال کے باشندے آج بھی اس زندہ دیوی کی پرستش کرتے ہیں۔ نئی دیوی کی تلاش میں بڑی چھان بین سے کام لیا جاتا ہے۔ عام طور پر چار پانچ سال کی کسی ایسی لڑکی کو منتخب کیا جاتا ہے جو بے داغ حسن کی مالک ہو۔ منتخب ہونے والی ایسی چند لڑکیوں کو باری باری ایک ایسے نیم تاریک ہال میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جہاں پگوڈا کے پجاری چہروں پر خوفناک شکلوں والے نقاب چڑھا کر مختلف طریقوں سے اسے خوف زدہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو لڑکی جرأت اور بے خوفی کے اس امتحان میں پوری اُترتی ہے۔ اسے زندہ دیوی کی حیثیت سے منتخب کیا جاتا ہے اور سنِ بلوغت کو پہنچنے تک کی ساری عمر اسے اسی 'دیوی گھر' کی چار دیواری میں بسر کرنا ہوتی ہے جہاں بڑے پجاری اسے مذہبی تعلیم اور دیوی گھر کے آداب سے روشناس کراتے ہیں۔ ان پجاریوں کے علاوہ کسی اور کو دیوی گھر کے اس حصے میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ایک سال بعد زندہ دیوی کو جلوس کی شکل میں کھٹمنڈو کی سڑکوں پر گھمایا جاتا ہے۔ اس مذہبی تقریب کے بعد زندہ دیوی کو باقاعدہ طور پر ٹمپل میں بٹھا دیا جاتا ہے لیکن وہ بہت کم عام لوگوں کے سامنے آتی ہے۔

اس خلائی دور میں اینا بیلا کے لیے یہ ساری باتیں بڑی حیرت انگیز تھیں۔ صرف اسی پر کیا منحصر، کھٹمنڈو کی ہر چیز اسے حیرت زدہ کیے دے رہی تھی۔ ایک روز وہ دونوں پرانے شہر کی سیر کرتے ہوئے ایک ایسے احاطے میں پہنچ گئے جس کے وسط میں ایک فوّارہ چل رہا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک پتھر پر سولہ مختلف زبانوں میں کوئی تحریر لکھی ہوئی تھی۔ اس پتھر کے ساتھ ہی ایک چھوٹے سے نوٹس بورڈ پر تحریر تھا کہ جو شخص بھی سولہ زبانوں کی اس تحریر کا ترجمہ کرے گا۔ پانی کی دیوی اس پر مہربان ہوگی اور زندگی بھر دنیا میں کسی بھی جگہ وہ کوئی بھی نلکا کھولے گا۔ اس سے پانی کے بجائے دودھ برآمد ہوگا۔

ایک رات تین بجے کے قریب لاڈی نے اینا بیلا کو جگا دیا اور بتایا کہ ابھی ابھی اسے نوجوانوں کی ایک پارٹی سے دعوت ملی ہے جو شہر کے مشرقی علاقے میں ایک ایسی جگہ جا رہے ہیں۔ جہاں سے صبح کی پہلی روشنی میں ماؤنٹ ایورسٹ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ چھ بجے وہ سات ہزار فٹ کی بلندی پر ایک مسطح چٹان پر کھڑے سورج کی پہلی کرن کا انتظار کر رہے تھے۔ سردی کی شدّت سے اینا بیلا پر کپکپاہٹ طاری تھی لیکن لاڈی کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔

بالآخر ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد طلوع ہونے والے سورج کی روشنی سے دنیا کے اندھیرے چھٹنے لگے لیکن بادلوں کے ایک نئے پرے اور دُھند کی دبیز چادر نے ایورسٹ کی چوٹی کو دنیا کی نگاہوں سے چھپائے رکھا۔ لاڈی چوٹی کے بہت نیچے کے ایک حصّے کی جھلک دیکھنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔

کھٹمنڈو کا قدیم ترین ٹمپل، جس کی سیڑھیاں کسی زمانے میں بھینٹ چڑھائے جانے والے انسانوں کے خون سے سرخ رہا

کرتی تھیں، موجودہ دور میں غیر ملکی سیّاحوں کی توجہ کا مرکز تھا۔ وہ کنگلے، قلّاش، ہپّی ٹورسٹ جو کسی ہوٹل کے اخراجات برداشت کرنے سے قاصر تھے۔ رات انہی سیڑھیوں پر بسر کرتے۔ دن میں بھی یہاں ہپیّوں کا جمگھٹا سا لگا رہتا۔ فضا میں حشیش آلود دھوئیں کے مرغولے اُڑتے رہتے۔

یہ اس روز کی بات ہے۔ جب لاڈی اور اینا بیلا ٹہلتے ہوئے اس طرف آ نکلے تھے۔ وہ دونوں بھی دوسرے ہپیّوں کی طرح سیڑھیوں پر بیٹھ گئے لیکن ان کی حالت قلاش ہپیّوں سے قطعی مختلف تھی۔ انھیں یہاں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک اور جوڑا ان کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔ وہ میری آندرے اور چارلس سوبھراج تھے۔

چارلس سوبھراج کی پُراسرار سرگرمیاں اور قدم قدم پر ناموں کی تبدیلی کسی حد تک پیچیدگی پیدا کر سکتی ہے لیکن اس کے کردار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اسے سمجھنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔

چند روز قبل وہ میری آندرے کے ہمراہ سولتی اوبیرائے ہوٹل میں داخل ہوا تھا۔ جہاں آنے والے ہر مہمان کو وی آئی پی کی حیثیت حاصل تھی۔ اس ہوٹل سے ملحق کاسینو کو محدود پیمانے پر جوئے کا سرکاری اجازت نامہ بھی حاصل تھا لیکن اجازت نامے میں محدود کا لفظ محض رسمی کارروائی کے طور پر شامل کیا گیا تھا جبکہ اکثر لوگ یہاں اپنا سب کچھ ہار جاتے تھے۔ ایک دو مثالیں ایسی بھی تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ بعض لوگ یہاں اپنی بیویوں کو بھی ہار چکے تھے۔

کاسینو میں آج تک کوئی ہنگامہ نہیں ہوا تھا۔ لوگ نہایت خاموشی سے بازیاں لگاتے اور اپنا سب کچھ ہار کر اسی خاموشی سے باہر نکل جاتے۔ یہاں آنے والوں میں زیادہ تعداد پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کی تھی جو بڑی بڑی امیدیں لے کر آتے تھے لیکن جب کاسینو سے باہر نکلتے تو ان کی جیبیں خالی ہوتیں۔

چارلس سوبھراج بھی اس کاسینو میں اپنا سب کچھ ہار چکا تھا اور اب وہ ایسے شکار کی تلاش میں تھا جس سے کچھ حاصل کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے اس نے فریک اسٹریٹ کا انتخاب کیا تھا۔ چارلس کا شمار ایسے شکاریوں میں کیا جا سکتا ہے جو دور تک اپنے شکار کا تعاقب کرتے ہیں اور اس وقت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے جب تک کہ اسے اپنے دام میں پھانس نہ لیں۔

اجے چودھری بھی کھٹمنڈو میں موجود تھا لیکن وہ سولتی اوبیرائے کے بجائے درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں قیام پذیر تھا۔ اس کے باوجود وہ سائے کی طرح چارلس کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ عام لوگوں کے سامنے انھوں نے کبھی ایک دوسرے سے شناسائی ظاہر نہیں کی تھی لیکن ذرا سی توجہ کے بعد کسی کے لیے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہوتا کہ چارلس سے دو قدم پیچھے رہنے والا اجے چودھری اس کے اشارے کا منتظر رہتا تھا۔

لاڈی اور اینا بیلا سے تعارف حاصل کرنے میں چارلس کو ذرا بھی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں اس نے جس اخلاق اور خلوص کا مظاہرہ کیا تھا۔ لاڈی اور اینا بیلا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے تھے۔ دوپہر کا کھانا انھوں نے اپنے ان نئے دوستوں کے ساتھ سولتی اوبیرائے کے ڈائننگ ہال میں کھایا تھا اور دن بھر ان کی کرائے کی سفید ٹویوٹا پر شہر کی سیر کرتے رہے تھے۔ لاڈی اور اینا بیلا کی ان دنوں ایسی حیثیت بھی نہیں تھی کہ فریک اسٹریٹ ہی کے کسی درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ میں ایک وقت کے کھانے کے بارے میں سوچ سکتے۔ شہر کے کسی دور دراز علاقے میں جانے کے لیے انھیں سائیکل رکشہ بھی لینا ہوتا تو اس کے لیے بھی گھنٹہ بھر سوچنے میں گزار دیتے۔ چہ جائیکہ اوبیرائے میں کھانے کے بعد وہ چم چماتی ہوئی کار میں شہر کی سیر کرتے رہے تھے۔

اس شام جب وہ اپنے ہوٹل واپس پہنچے تو اینا بیلا بہت خوش تھی۔ اس نے میٹی اور کورا کو دن بھر کی تفصیل سناتے ہوئے بتایا کہ ان کے نئے دوست بہت دولتمند ہیں۔ ویتنامی نقوش کا حامل مرد جواہرات کا بیوپاری ہے اور اس کی بیوی فرانس کی رہنے والی ہے۔ جواہرات کا یہ تعلق ہی دراصل ان کی دوستی کا باعث بنا تھا۔ چارلس ایک ماہر جوہری تھا۔ اینا بیلا اور لاڈی نے دہلی میں قیام کے دوران کچھ قیمتی پتھر خریدے تھے۔ جن کی کوالٹی کے بارے میں انھوں نے چارلس کی رائے بھی لی تھی۔

دوسرے دن اینا بیلا نے میٹی اور کورا کو بتایا کہ چارلس کی رائے میں دہلی کے جوہریوں نے انھیں ٹھگ لیا تھا۔ لاڈی کا ہیرا جسے اس نے بڑی احتیاط سے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ نقلی ثابت ہوا۔ اس طرح اینا بیلا کے خریدے ہوئے یاقوت بھی نقلی ثابت ہوئے تھے۔ اس حقیقت کے انکشاف کے بعد اینا بیلا کا موڈ آف ہو گیا تھا اور اس نے عہد کیا تھا کہ دہلی واپس جا کر وہ اس جوہری سے ان ہیروں کی قیمت واپس لے گی۔ چارلس نے بھی اس سلسلے میں اس کی مدد کا وعدہ کیا تھا۔

لاڈی کا موڈ بھی آف ہو چکا تھا لیکن جب اس نے یہ سنا کہ موسمیات کے ماہرین کی پیشگوئی کے مطابق کرسمس تک ایورسٹ کی چوٹی پر چھائے ہوئے بادل چھٹ جائیں گے تو وہ سارا غصّہ بھول گیا۔ صرف پانچ دن ہی کی تو بات تھی۔ اس نے جب اینا بیلا کو یہ بات بتائی تو وہ بھی خوشی کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکی۔ اسے

اپنے دوست کی خوشی عزیز تھی۔ جس کے لیے ایورسٹ کی چوٹی کے نظارے کے مقابلے میں دنیا کے قیمتی سے قیمتی ہیرے کی بھی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

۲۲ دسمبر کی صبح کھٹمنڈو سے چند کلومیٹر دور تبتّی سرحد کی طرف جانے والی چائنیز ہائی وے کے کنارے چند گھروں پر مشتمل کسانوں کی ایک چھوٹی سی بستی کا ایک کمسن بچّہ اپنے کُتّے کے ساتھ کھیلتا ہوا بستی سے دور نکل گیا۔ کبھی وہ کُتّے کو پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑتا اور کبھی کُتّا اس کے پیچھے پیچھے چھلانگیں لگانے لگتا ایک مرتبہ لڑکے نے کُتّے کو پکڑنا چاہا تو کتّا دوڑتا ہوا اس سے بہت دور پتھروں کی آڑ میں چلا گیا۔ لڑکا کچھ دیر وہیں کھڑا کُتّے کو بلانے کے لیے آوازیں دیتا رہا لیکن جواب میں کُتّے کی نہ تو آواز سنائی دی اور نہ ہی وہ واپس آیا۔ پتھروں کے دوسری طرف دھویں کی ایک لکیر سی اٹھتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ لڑکا دوڑتا ہوا پتھروں کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ کُتّا ایک چھوٹے سے ڈھیر میں کچھ سونگھ رہا تھا۔ دھواں بھی اسی ڈھیر سے اُٹھ رہا تھا۔ لڑکا پہلے تو یہی سمجھا کہ شاید وہ کوئی مُردہ جانور ہے لیکن جیسے ہی قریب پہنچا اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ وہ جلی ہوئی ایک انسانی لاش تھی جس سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ کمسن لڑکا مدد کے لیے چیختا ہوا بستی کی طرف دوڑ پڑا۔

آسمان کی بلندیوں پر چھائے ہوئے بادل اور دھند چھٹ گئی تھی۔ نیلگوں آسمان کے پس منظر میں ایورسٹ کی برفپوش چوٹی انتہائی سحر انگیز منظر پیش کر رہی تھی۔ لاڈی ایورسٹ کی چوٹی کو نہیں دیکھ سکا تھا لیکن ایورسٹ کی چوٹی اس کی ادھ جلی لاش کو دیکھ رہی تھی۔

۲۲ دسمبر کی صبح دفتر میں آنے کے بعد الیستھم ابھی اپنے کاموں کی طرف پوری طرح توجہ بھی نہیں دے پایا تھا کہ چند نوجوان امریکی سیاح اس کے دفتر میں داخل ہوئے اور اسے اس افواہ سے آگاہ کیا جس کے مطابق شہر کے نواح میں ایک امریکی نوجوان کی جلی ہوئی لاش دریافت ہوئی ہے۔ الیستھم کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

دیہی اسپتال کی طرف جاتے ہوئے جہاں ادھ جلی لاش پہنچا دی گئی تھی، الیستھم دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ مرنے والا اگر واقعی امریکی ہے تو خدا کرے جلد سے جلد اس کی شناخت ہو جائے اور اس کے رشتے داروں کا بھی پتا چل جائے اور اگر وہ لاش کی مقامی تدفین پر بھی آمادگی ظاہر کر دیں تو وہ بہت سی الجھنوں سے بچ سکتا ہے۔

دوسرے دن الیستھم ایک بار پھر اسپتال پہنچ گیا۔ ادھ جلی لاش کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔ اسپتال سے واپسی پر وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا آنکھیں بند کیے سوچ رہا تھا کہ وہ لاش کس کی ہو سکتی ہے۔ دبیز دھند کی وجہ سے کار کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ چند گز سے زیادہ فاصلے کی چیز دیکھنا بھی محال ہو رہا تھا۔ دفعتاً کار کو ہلکا سا جھٹکا لگنے سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"وہ کیا ہے؟ اس طرف۔" ڈرائیور نے کار کی رفتار کم کرتے ہوئے ایک طرف اشارا کیا۔

سڑک کے کنارے سے چند گز کے فاصلے پر کچھ دیہاتی ایک جگہ جمع تھے۔ دھند میں ان کے متحرک ہیولے بڑا پراسرار منظر پیش کر رہے تھے۔ الیستھم نے کار رکوالی۔ چند لمحے اپنی سیٹ پر بیٹھا متجسّس نگاہوں سے اس طرف دیکھتا رہا لیکن دھند کی وجہ سے کوئی چیز واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ تجسّس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ کار سے باہر آگیا اور سڑک سے اتر کر کھیت میں چلتا ہوا دیہاتیوں کے اس جمگھٹے کے قریب پہنچ گیا۔ دیہاتی اسے دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئے۔ الیستھم جیسے ہی آگے بڑھا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ پیٹ میں گرہیں سی پڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

اس کے سامنے دھان کے کھیت میں ایک اور لاش پڑی ہوئی تھی۔ لاش جل کر راکھ ہو چکی تھی اور صرف جسم کی بناوٹ ہی سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کسی عورت کی لاش تھی جس کی آنکھیں جلنے کے بعد بھی اس طرح کھلی ہوئی تھیں جیسے وہ خلا میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

وہ رات الیستھم نے کانٹوں پر لوٹتے ہوئے گزاری۔ ایک لمحے کو بھی آنکھیں بند نہیں کر سکا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے بار بار جلی ہوئی ان لاشوں کے بھیانک چہرے گھوم جاتے اور اس کا دل کانپ اٹھتا۔ اسے قونصل کی حیثیت سے کھٹمنڈو آئے ہوئے صرف تین ہفتے ہوئے تھے اور اسے دو ایسی لاشوں کا سامنا کرنا پڑا تھا جن کی شناخت بھی ممکن نہیں تھی۔ اس کے خیال میں نیپال میں نئی ذمّے داریوں کی یہ ابتدا اس کے لیے کوئی نیک شگون نہیں تھا۔

کھٹمنڈو کی پولیس فریک اسٹریٹ پر واقع چھوٹے چھوٹے لاتعداد ہوٹلوں اور مہمان خانوں سے دونوں مرنے والوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لاشوں کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹر کے بیان کے مطابق وہ دونوں یورپین تھے۔ لاش کو جلانے سے پہلے مرد کا گلا اس طرح کاٹا گیا تھا کہ اس

کا سر کھال کے ایک پتلے سے تسمے کے ذریعے دھڑ سے منسلک رہ گیا تھا۔ جبکہ عورت کے سینے میں بائیں جانب کسی وزنی تیز دھار آلے سے کم از کم چار ضربیں لگائی گئی تھیں جس سے نہ صرف دو پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں بلکہ کچھ آنتیں بھی کٹ گئی تھیں۔ جن سے خون کا فوارہ بہہ نکلا تھا۔ اس کے بعد پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی گئی تھی۔

باوردی پولیس والے اور سادہ پوش سراغ رساں ہر جگہ تحقیق کرتے پھر رہے تھے۔ بالآخر فریک اسٹریٹ کے اورینٹل لاج نامی ایک گھٹیا سے ہوٹل کے ڈیسک کلرک نے انکشاف کیا کہ اس کے ہوٹل کے کمرہ نمبر نو میں قیام پذیر دو مہمان لاپتا ہیں۔ ان میں لاڈی ڈوپار نامی مرد کا تعلق کنیڈا سے تھا جبکہ اس کی ساتھی لڑکی اینا بیلا امریکہ کی رہنے والی تھی۔ پھر پولیس اس ہوٹل میں مقیم میٹی اور کورا تک بھی پہنچ گئی۔

میٹی اور کورا پولیس سے ہر طرح تعاون کرنے کو تیار تھیں لیکن انھیں ان دونوں سے صرف ایک کارآمد بات معلوم ہو سکی تھی۔ میٹی اور کورا کے بیان کے مطابق لاڈی اور اینا بیلا کا زیادہ وقت اپنے نئے دوستوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ مرد ویتنامی نقوش کا حامل تھا جبکہ اس کی بیوی فرانسیسی تھی اور وہ لوگ کسی بہت بڑے ہوٹل میں رہائش پذیر تھے۔ میٹی کے بیان کے مطابق ویتنامی چہرے والا مرد جواہرات کا بیوپاری تھا اور ان کے پاس سفید رنگ کی کرائے کی ایک ٹویوٹا کار بھی موجود تھی۔ انھیں یہ ساری باتیں اینا بیلا نے بتائی تھیں۔

ان معلومات کے بعد پولیس کی تحقیقات کا دائرہ قدرے محدود ہو گیا۔ کھٹمنڈو میں بڑے ہوٹلوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ پولیس کو امید تھی کہ وہ جلد ہی جواہرات کے ویت نامی بیوپاری اور اس کی فرانسیسی بیوی کا پتا چلا لیں گے۔ الیستھم بھی پولیس کی تحقیق میں ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس نے میٹی اور کورا سے درخواست کی کہ وہ اس کے ساتھ چل کر ان لاشوں کو دیکھ لیں۔ تاکہ شناخت میں کچھ مدد مل سکے۔

میٹی اور کورا نے دونوں لاشوں کو شناخت کر لیا اور الیستھم اور نیپالی پولیس اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ لاڈی اور اینا بیلا کی موت کسی حادثے کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ انھیں قتل کیا گیا تھا۔ ان کی تحقیقات جاری رہیں لیکن اگلے دو تین روز میں حاصل ہونے والی معلومات میں کم از کم ایک اطلاع ایسی تھی جو پولیس کی تحقیقات کو غلط راستے پر ڈال سکتی تھی۔ اس نئی صورت حال نے انھیں بری طرح الجھا دیا تھا۔

ایئرپورٹ پر تحقیقات کے دوران مسافروں کی روانگی کی دستاویزات کے ریکارڈ سے ایک ایسا فارم بھی دستیاب ہوا کہ کنیڈا کا رہنے والا لاڈی ڈوپار ۲۲ دسمبر کی رات کو بنکاک کے لیے پرواز کر گیا تھا۔ فارم پر اس کے دستخط بھی موجود تھے۔ اسی روز صبح سویرے اینا بیلا کی جلی ہوئی لاش دستیاب ہوئی تھی۔

دو اور دو چار کا فارمولا دنیا میں ہر جگہ رائج ہے۔ نیپالی پولیس کو بھی یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ لاڈی ڈوپار اپنی دوست اینا بیلا کو قتل کر کے پہلی پرواز سے کھٹمنڈو سے فرار ہو گیا تھا۔ کھٹمنڈو پولیس نے اسی روز نہ صرف انٹرپول کے پیرس ہیڈکوارٹر بلکہ ایشیا کے تمام ممالک کے ایئرپورٹس کو مطلع کر دیا کہ اس نام کا شخص بعض معاملات میں تفتیش کے لیے نیپالی پولیس کو مطلوب ہے۔

کھٹمنڈو میں امریکی قونصل الیستھم نے بھی اگرچہ طوعاً و کرہاً نیپالی پولیس کی اس منطق کو قبول کر لیا تھا لیکن اس کا ذہن اب بھی الجھا ہوا تھا۔ اگر لاڈی ڈوپار، اینا بیلا کو قتل کرنے کے بعد واقعی ملک سے فرار ہو گیا تھا تو وہ جلی ہوئی لاش کس کی تھی جو اینا بیلا کی لاش سے ایک دن پہلے اسی ناقابلِ شناخت حالت میں ملی تھی؟

نیپالی پولیس مئی ۱۹۷۶ء سے پہلے کسی ٹھوس نتیجے تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ نہایت باریک بینی سے تحقیقات مکمل کرنے کے بعد بالآخر چارلس سوبھراج، میری آندرے اور اجے چودھری کے خلاف دوہرے قتل کے الزام میں گرفتاری کے باقاعدہ وارنٹ جاری کر دیے گئے۔ یہ فیصلہ اگرچہ بہت تاخیر سے ہوا تھا لیکن اس میں پولیس کا قصور بھی نہیں تھا۔ دراصل چارلس کی سرگرمیاں ہی ناقابلِ حل معمّہ تھیں۔

حقیقت یہی تھی کہ ۲۳ دسمبر ۱۹۷۵ء کی رات چارلس انتہائی عجلت میں کھٹمنڈو سے بنکاک پرواز کر گیا تھا۔ کھٹمنڈو سے فرار ہوتے ہوئے اس نے لاڈی ڈوپار کا پاسپورٹ استعمال کیا تھا۔ جس کی لاش اسپتال کے سرد خانے میں پڑی تھی اور ابھی تک اس کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔ چارلس کی عیّاری کا اندازہ لگانے کے لیے اگلی چند سطریں قابلِ توجہ ہیں۔

بنکاک میں صرف ایک رات گزارنے کے بعد چارلس کھٹمنڈو واپس آگیا۔ اس مرتبہ اس نے ایک بار پھر ہینک بنٹا نجا کا پاسپورٹ استعمال کیا تھا۔ جسے کئی روز پہلے ہی وہ بنکاک میں موت کے گھاٹ اتار چکا تھا اور اس وقت تک اس کی لاش کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف چوبیس گھنٹے بعد وہ میری آندرے کے ساتھ کھٹمنڈو واپس کیوں آگیا تھا؟

"یہ اس کی عیاری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔" کئی ماہ بعد ایک نیپالی پولیس آفیسر نے اس سوال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ "ہمارے خیال میں وہ کھٹمنڈو سے فرار اس لیے ہوا تھا کہ اینا بیلا کے قتل کا شبہ لاڈی ڈوپار کی طرف منتقل ہو سکے۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ بنکاک میں ان ہیروں کو فروخت کرنا چاہتا تھا جو اس نے لاڈی اور اینا بیلا کو قتل کر کے حاصل کیے تھے۔ ان ہیروں کی مالیت دو ہزار ڈالر سے کم نہیں ہو سکتی تھی۔ تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ شاید وہ بنکاک اس لیے گیا تھا کہ وہاں کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر سکے کہ بنکاک میں کسی قتل کے سلسلے میں اس کا نام تو نہیں لیا جا رہا؟ ایک امکانی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بنکاک پہنچ کر اسے کھٹمنڈو میں ہونے والی قتل کی ان وارداتوں کے سلسلے میں کوئی بات پریشان کرتی رہی ہو۔ کوئی ایسی معمولی سی بات جس سے پولیس اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے۔ ہو سکتا ہے وہ اس بات کا جائزہ لینے کے لیے صرف چوبیس گھنٹے بعد کھٹمنڈو لوٹ آیا ہو۔"

یہ نیپالی پولیس کے مفروضے تھے۔ حقیقت کیا تھی؟ اس کا انکشاف بہت بعد میں ہوگا۔ بہرحال، اس رات کھٹمنڈو سے فرار ہونے کے بعد بنکاک پہنچتے ہی چارلس نے کانت ہاؤس کا رُخ کیا اور اپنا فلیٹ تاریک اور خالی دیکھ کر ایک لمحے کو وہ سکتے کی سی کیفیت میں رہ گیا۔ وہ تینوں فرانسیسی جنہیں وہ فلیٹ میں چھوڑ کر گیا تھا، غائب تھے اور اس وقت تک غالباً وہ پیرس پہنچ چکے تھے۔ دوسرا فلیٹ بھی خالی تھا۔ وہ کچھ دیر تک اپنے خالی فلیٹ میں کھڑا صورتِ حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا پھر فون کا ریسیور اٹھا کر دوسری منزل پر رہنے والی بیلے کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

فون پر چارلس کی آواز سنتے ہی بیلے کی روح فنا ہو گئی یہ جان کر کہ دنیا کا خطرناک ترین آدمی اس سے صرف چند گز کے فاصلے پر موجود ہے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے لیکن وہ اپنے اعصاب کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کھٹمنڈو اور وہاں کے موسم کے بارے میں بے معنی سے سوالات کرنے لگی۔ اس نے میری آندرے کے بارے میں بھی ایک دو سوالات کیے تھے مگر چارلس نے کسی ایک بات کا بھی جواب نہیں دیا تھا۔

"یہ لوگ کہاں ہیں؟" چارلس نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس کا لہجہ انتہائی سرد تھا۔ "ڈومنک اور اس کے دونوں ساتھی کہاں ہیں؟"

بیلے کے لیے یہ سوال غیر متوقع نہیں تھا۔ اس سلسلے میں وہ بہت پہلے ایک کہانی گھڑ چکی تھی لیکن اب وہ سوچ رہی تھی کہ کیا اس کا لہجہ اس کا ساتھ دے سکے گا۔

"وہ تو ایک دو دن پہلے اچانک ہی ہانگ کانگ جا چکے ہیں۔" وہ لہجے کو پرسکون بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "جاتے ہوئے ڈومنک نے بتایا تھا کہ تم نے ٹیلی گرام کے ذریعے ان تینوں کو فوری طور پر ہانگ کانگ پہنچنے کا حکم دیا تھا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" چارلس نے فوراً ہی جواب دیا۔ اس کے لہجے سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ اس نے بیلے کی بات کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ "ان کے پاس نہ تو پاسپورٹ تھے اور نہ ہی کرائے کے لیے رقم۔"

"ممکن ہے رقم ان کے گھر والوں نے بھیج دی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہیں پر کسی کاروباری ذریعے سے مطلوبہ رقم حاصل کر لی گئی ہو۔" بیلے نے کہا۔

جواب میں چارلس کی ہلکی سی غراہٹ ابھری۔ "لیکن انھیں میری ضرورت تھی۔" اس کی غراہٹ کراہ میں بدل گئی۔ "وہ مجھ سے محبت کرتے تھے، وہ میرا خاندان تھے، مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتے تھے۔" بیلے کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے ہلکی سی سسکی لی ہو لیکن اسی لمحے اس کی آواز ایک بار پھر غراہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ "وہ مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتے۔ میں انھیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا اور حقیقت معلوم کیے بغیر نہیں رہوں گا۔"

فون بند ہو چکا تھا۔ ریسیور رکھتے ہوئے بیلے کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ خوف و دہشت سے اس کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ سیموئیل اپنی ڈیوٹی پر تھا اور ایک بجے سے پہلے اس کی واپسی کی توقع نہیں تھی۔ اس نے ایک بھاری کرسی اٹھا کر بند دروازے کے سامنے رکھ دی، اور سیموئیل یا پولیس کو فون کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی۔ کہ بیرونی راہداری میں قدموں کی آواز سن کر اچھل پڑی۔ سناٹے میں قدموں کی یہ آواز بم کے دھماکوں کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ آواز اسی کے دروازے کی طرف آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ دبے قدموں چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بیلے کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جسم کے مسام پسینہ اگلنے لگے لیکن قدموں کی وہ آواز اس کے دروازے سے آگے بڑھ گئی اور چند سیکنڈ بعد ہی فضا پر ایک بار پھر سناٹا طاری ہو گیا۔ بیلے نے اطمینان کا سانس لیا لیکن یہ سکوت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا۔ قدموں کی وہ آواز واپس آتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس مرتبہ اس کے دروازے کے سامنے رک گئی۔ بیلے کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اسی لمحے دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ پہلے آہستگی سے پھر

اس میں یکدم شدت پیدا ہو گئی۔ جیسے کوئی جنونی انداز میں دروازے پر گھونسے برسا رہا ہو۔

بیلے پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ سیموئیل یا پولیس کو فون کرنے کی ہمت بھی نہ کر سکی کہ اس طرح اس کی آواز سن کر گھر میں اس کی موجودگی کا اندازہ لگا لیا جائے گا۔ بیلے کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ خوف کی شدّت بڑھتی جا رہی تھی۔ متوقع چیخ روکنے کے لیے اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ کو سختی سے دبا رکھا تھا۔

دروازہ پیٹنے والا شاید مایوس ہو چکا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اس کے دور ہوتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی جو رفتہ رفتہ رات کے سناٹے میں مدغم ہو گئی۔ فضا پر ایک بار پھر سکوت غالب آ گیا۔ بیلے نڈھال سی ہو کر بستر پر گر گئی اور تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

کھٹمنڈو میں پولیس کی تحقیقات جاری تھیں۔ شہر کے تمام بڑے بڑے ہوٹلوں اور کرائے پر کاریں فراہم کرنے والی ایجنسیوں سے پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔ اس سلسلے میں پولیس کو بالکل ہی مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کچھ ایسی بہت معمولی سی باتیں سامنے آ رہی تھیں جن سے تحقیقاتی گاڑی کو آگے بڑھانے میں مدد مل رہی تھی۔

جلی ہوئی لاشیں ملنے کے مقام سے قریب ہی رہنے والے ایک دیہاتی نے پولیس کو بتایا کہ اس روز اس نے اس علاقے میں سفید رنگ کی ایک کار کو مشتبہ حالت میں گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔ کار کا پورا نمبر تو اسے معلوم نہیں تھا لیکن نمبر پلیٹ کا پانچ کا ایک ہندسہ اسے یاد رہ گیا تھا۔ اسی پانچ کے ہندسے کے سہارے تحقیقات کرتی ہوئی پولیس گورکھا ٹریول ایجنسی کے دفتر تک پہنچ گئی جہاں یہ انکشاف ہوا کہ سفید رنگ کی ٹویوٹا کار ۲۳ دسمبر کو ایک ایسی عورت واپس کر کے گئی تھی جس کا لہجہ فرانسیسی تھا۔ ایجنسی کے ریکارڈ کے مطابق ۵۰۰۱ نمبر کی یہ کار سولتی اوبیرائے میں قیام پذیر ہینک بنٹانجا نامی ایک سیاح نے کرائے پر لی تھی۔ کار کی تلاشی کے دوران ڈکی میں سے چند مشتبہ چیزیں برآمد ہوئیں جن میں ایک پتلون، تاریک شیشوں کی عینک، ٹوپی اور کیمرے کے لینس کا کور شامل تھا۔ کار سے ان چیزوں کے دریافت ہوتے ہی پولیس نے ہوٹل سولتی اوبیرائے کی طرف دوڑ لگا دی۔ جہاں ٹریول ایجنسی کے ریکارڈ کے مطابق، ہینک بنٹانجا قیام پذیر تھا۔

دستک کے جواب میں دروازہ کھولتے ہوئے چارلس کے چہرے کے تاثرات بگڑے ہوئے تھے۔ اس نے آج دن بھر ہوٹل کے کمرے میں آرام کا پروگرام بنایا تھا اور یہ مداخلت اسے پسند نہیں آئی تھی لیکن مہمانوں کے سوالات کے جواب تو اسے دینا ہی پڑے تھے۔ اس نے ایمسٹرڈم کے رہنے والے بنٹانجا ہینک کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا جبکہ اپنی ساتھی لڑکی کا نام اس نے کارنیلیا بتایا تھا۔

چند رسمی سوالوں کے بعد انھیں سینٹرل پولیس اسٹیشن لے آیا گیا۔ جہاں ابتدائی پوچھ گچھ کے دوران چارلس سوبھراج اپنے آپ کو ایک معزز اور قابلِ احترام شخصیت ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے بیان کے مطابق وہ یورپ کی ایک یونیورسٹی میں 'سوشل سائنس' کا پروفیسر ہے اور ان دنوں مشرقِ بعید کے مطالعاتی دورے پر آیا ہوا ہے۔ اس کی ساتھی کارنیلیا ایک اسکالر اور ریسرچ اسسٹنٹ ہے۔ اس نے اعتراف کیا کہ شہر کی تفریح اور خانقاہوں کی زیارتوں کے لیے انھوں نے سفید رنگ کی ایک ٹویوٹا کار کرائے پر حاصل کی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے بڑی سختی سے اینا بیلا اور لاڈی ڈوپار نامی لوگوں سے ملاقات کی نفی کی تھی۔ اس نے تو انھیں کبھی دیکھا تک نہیں تھا اور نہ ہی اس سے پہلے کبھی یہ نام سنے تھے۔

بات کرتے ہوئے چارلس کا لہجہ بڑا ٹھوس، بارعب اور چہرہ بڑا پُرتمکنت تھا جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اسے اس طرح جھوٹے الزام میں پکڑ کر پولیس اسٹیشن لایا جانا پسند نہیں آیا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر یہ بھی نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ سولتی اوبیرائے جیسے ہوٹل میں قیام کرنے والے یہ معزز لوگ فریک اسٹریٹ پر واقع گھٹیا ہوٹلوں میں قیام کرنے والے ہپّی قسم کے لوگوں سے ملنا پسند کرتے ہوں گے۔ چارلس نے ریسٹورنٹ اور کاسینو میں کرنسی کے تبادلے کی رسیدیں بھی پیش کیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ پولیس کے خیال کے مطابق جس وقت اینا بیلا یا لاڈی کو قتل کیا گیا تھا۔ اس وقت چارلس اور اس کی ساتھی ریسٹورنٹ یا کاسینو میں موجود تھے۔

چارلس بڑے اطمینان سے پولیس والوں کے ہر سوال کا جواب دیتا رہا۔ اس کے اعصاب پوری طرح قابو میں تھے۔ اور کسی موقع پر بھی اس نے ذرا سی گھبراہٹ یا بدحواسی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ البتہ جب ایک پولیس آفیسر میری آندرے کو الگ پوچھ گچھ کے لیے دوسرے کمرے میں لے جانے لگا تو اس وقت چارلس کے چہرے کے تاثرات ایک لمحے کو تبدیل ہوئے تھے لیکن اس نے اپنی اس کیفیت پر فوراً ہی قابو پا لیا اور پولیس آفیسر سے بحث کرنے لگا کہ انھیں پہلے ہی بہت زیادہ ذہنی اذیت پہنچائی جا چکی ہے اور پھر یہ کرسمس کا موقع ہے۔ ان کا مقدّس تہوار، نیپال میں اگرچہ کرسمس نہیں منایا جاتا لیکن وہ دونوں

عیسائی ہیں اور کم از کم اس روز تو انھیں پریشان نہ کیا جائے۔
چارلس کا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا اور پولیس نے مزید پوچھ گچھ جاری رکھنے کے بجائے انھیں جانے کی اجازت دے دی لیکن یہ بھی کہا کہ تحقیقات کے سلسلے میں بعد میں بھی کسی وقت ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ وہ پولیس کو اطلاع دیے بغیر شہر سے باہر نہیں جائیں گے۔
پولیس آفیسر پریمن بزرا، چارلس سوبھراج کو ایک بار پھر پوچھ گچھ کے لیے ہوٹل سے پکڑ لایا۔ مگر دو گھنٹوں کی مسلسل بازپرس کے بعد بھی وہ چارلس سے کچھ دریافت نہ کر سکا۔ بالآخر اسے ہوٹل واپس پہنچا دیا گیا۔
پریمن بزرا کے لیے وہ رات بڑی اذیت دہ ثابت ہوئی وہ ایک لمحہ کو بھی نہیں سو سکا تھا۔ کبھی وہ بستر پر کروٹیں بدلتا اور کبھی اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ بنٹا نجاہینگ نامی وہ شخص اس کے ذہن پر مسلط تھا جس سے آج دوپہر مسلسل دو گھنٹوں تک وہ بازپرس کرتا رہا تھا۔ اسے اعتراف کرنا پڑا کہ وہ شخص آہنی اعصاب کا مالک ہے۔ وہ بڑے سکون، اطمینان اور پُراعتماد لہجے میں اس کے ہر سوال کا جواب دیتا رہا تھا۔ کسی موقع پر بھی اس نے معمولی سی گھبراہٹ یا بدحواسی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ جبکہ اس پر قتل کی دو وارداتوں میں ملوث ہونے کا شبہ کیا جا رہا تھا۔ وہ ایک تجربہ کار پولیس آفیسر تھا اور جانتا تھا کہ اگر کسی شخص کو معمولی سی چوری کے شبہے میں بھی پولیس اسٹیشن لایا جاتا تو وہ تھر تھر کانپنے لگتا تھا مگر بنٹا نجاہینگ نامی یہ شخص ان سے قطعی مختلف ثابت ہوا تھا لیکن اس کے برعکس اس کی ساتھی لڑکی خوفزدہ سی تھی۔ پریمن بزرا کے ذہن میں بار بار یہ سوال اُبھر رہا تھا کہ لڑکی خوفزدہ اور نروس کیوں تھی؟ لیکن اسے اپنے اس سوال کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ صبح وہ ان دونوں سے ایک بار پھر پوچھ گچھ کرے گا۔ اگرچہ اس میں کسی قسم کی کامیابی کا زیادہ امکان نہیں تھا لیکن ایک فرض شناس پولیس آفیسر ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے وہ اس معاملے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہتا تھا۔
دوسرے دن صبح سویرے پولیس آفیسر پریمن بزرا نے ہوٹل سولتی اوبیرائے کے کمرہ نمبر ۱۴۱۵ کے دروازے پر دستک دی تو اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے دوبارہ دستک دی مگر اس مرتبہ بھی خاموشی ہی رہی۔ اس سے پہلے ہوٹل میں داخل ہوتے ہی اس نے دربان اور ڈیسک کلرک سے اس امر کی تصدیق کر لی تھی کہ بنٹا نجاہینگ اور اس کی دوست اپنے کمرے میں موجود تھے لیکن دروازے پر دستک کے جواب میں خاموشی بڑی معنی خیز محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا لابی کی طرف نکل گیا۔
لیکن وہ دونوں نہ تو لابی میں نظر آئے اور نہ ہی کسی پبلک روم میں۔ پریمن بزرا کی تشویش بڑھنے لگی۔ اس نے منیجر کو جا پکڑا اور اسے کمرہ نمبر ۱۴۱۵ کا تالا کھولنے کا حکم دیا۔
”حیرت ہے“ منیجر تالے میں چابی گھماتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”دروازہ اندر سے مقفل ہے؟ وہ دونوں ابھی سو رہے ہوں گے اور میں اپنے مہمانوں کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔“
”دروازہ توڑ دو“ پریمن بزرا کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔
اس کے لہجے نے منیجر کو چونکا دیا۔ وہ چند لمحے بزرا کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر مدھم لہجے میں بولا ”اگر کوئی بات ہوئی تو اس کا ذمّے دار کون ہوگا؟“
”میں ہر قسم کی ذمّے داری قبول کرنے کو تیار ہوں۔ توڑ دو دروازہ“ پریمن بزرا نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔
دروازہ توڑ دیا گیا لیکن کمرہ خالی تھا۔ اس کمرے میں قیام کرنے والے مہمانوں کا سامان اگرچہ موجود تھا لیکن وہ خود غائب تھے۔ غالباً رات کے کسی حصّے میں وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر ہوٹل سے جا چکے تھے لیکن کمرے کے تفصیلی معائنے کے بعد پریمن بزرا اس نتیجے پر پہنچا کہ لڑکی تو آمد و رفت کے عام راستے سے نکلی ہوگی جبکہ اس کے ساتھی نے دروازہ اندر سے مقفل کر کے کھڑکی کے راستے فرار کو ترجیح دی تھی۔ وہ چوتھی منزل سے مختلف کمروں کی کھڑکیوں کے چھجّوں اور دیوار کی ابھری ہوئی اینٹوں کے سہارے نیچے اترا تھا۔ کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے پولیس آفیسر پریمن بزرا اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ لڑکی کے رویّے کے بارے میں شبہ ہونے کے بعد اس نے رات ہی کو انھیں کیوں نہیں جا پکڑا تھا۔
چند منٹ کے اندر ہی اندر ایئرپورٹ کو کھٹمنڈو سے روانہ ہونے والے تمام غیر ملکی مسافروں کو چیک کرنے کے سلسلے میں ہدایت جاری کر دی گئی۔ شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں پر پھیلی ہوئی پولیس ہر غیر ملکی سیّاح کو روک کر پریشان کر رہی تھی لیکن یہ سب کچھ بہت تاخیر سے ہو رہا تھا۔ ان کے مطلوبہ افراد اس وقت تک ایک ٹیکسی میں بڑی تیز رفتاری سے ہندوستان کی سرحد کی طرف جا رہے تھے۔ ٹیکسی میں میری آندرے کے علاوہ اجے چودھری بھی موجود تھا۔
نیپال کے چھوٹے سرحدی شہر پہنچ کر چارلس نے ٹیکسی ڈرائیور کو کچھ رقم دیتے ہوئے فوری طور پر واپس چلے جانے کا حکم دیا۔ ڈرائیور کو ملنے والی رقم اگرچہ اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن اس کی اشک شوئی کے لیے کافی تھی۔
وہ ۲۹ دسمبر کا دن تھا۔ وہ تینوں پیدل ہی سرحد کی طرف چل پڑے جو اس قصبے سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ان تینوں نے

جعلی پاسپورٹوں پر الگ الگ سرحد پار کی۔ چارلس نے چوکی پر متعین ایک نیپالی سیکیورٹی گارڈ کے پوچھنے پر بتایا کہ وہ ماہرِ حیوانیات ہے اور اس علاقے میں جنگلی جانوروں کے مطالعے کی مہم پر نکلا ہوا ہے۔
وہ کسی دشواری کے بغیر سرحد عبور کر کے ایک ہندوستانی قصبے میں پہنچ گئے۔ جہاں چند گھنٹے قیام کرنے کے بعد چارلس نے ایک کسان سے ایک گھنٹے کی واپسی کے وعدے پر تین گھوڑے کرائے پر لیے اور وہ تینوں اس وقت تک گھوڑوں پر سفر کرتے رہے جب تک کہ تھکن سے نڈھال گھوڑوں نے آگے بڑھنے سے انکار نہ کر دیا۔ گھوڑے ایک کھیت میں چھوڑ کر وہ پیدل آگے بڑھتے رہے۔ آثار بتا رہے تھے کہ قریب ہی کوئی قصبہ موجود ہے چارلس کا یہ خیال غلط نہیں نکلا۔ خوش قسمتی سے قصبے میں ایک ٹیکسی نظر آ گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور عام طور پر قریبی دیہاتوں کے چکّر لگایا کرتا تھا۔ لیکن زیادہ کرائے کے لالچ میں وہ انھیں کئی میل دور دریا کے گھاٹ پر لے جانے پر آمادہ ہو گیا۔ دریا کے دوسرے کنارے انھیں ایک اور ٹیکسی مل گئی۔ مختلف جگہوں پر وہ مختلف سواریاں بدلتے ہوئے پٹنہ پہنچ گئے اور جب پٹنہ سے ایئر انڈیا کے ڈی سی تھری طیارے سے پرواز کرتے ہوئے کلکتہ ایئرپورٹ پر اترے تو وہ ۱۹۷۵ء کی آخری شب تھی۔
سردی کی شدت سے رگوں میں خون منجمد ہوا جا رہا تھا۔ شہر تک پہنچتے ہوئے انھیں بے شمار ایسے لوگ نظر آئے جو پھٹے پرانے کمبلوں یا پتلی پتلی سی چادروں میں لپٹے گٹھریاں بنے فٹ پاتھوں پر پڑے تھے۔ بیشتر ایسے بھی تھے جن کے پاس اس شدّت کی سردی سے بچنے کے لیے چادر بھی نہیں تھی۔
تقریباً آدھے گھنٹے کی آوارہ گردی کے بعد چارلس ایک سستا سا ہوٹل تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میری آندرے کی طبیعت پہلے ہی خراب تھی۔ اس طویل سفر نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا تھا۔ بخار کی شدّت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور ٹانگوں میں اپنا بوجھ اٹھانے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ چارلس اسے سہارا دے کر کمرے میں لے آیا۔ جہاں اسپرنگوں والی آہنی چارپائی پر میلی سی چادر بچھی ہوئی تھی۔ چارپائی کی طرف بڑھتے ہوئے میری آندرے لڑکھڑا گئی۔ اگر چارلس اسے ایکدم نہ سنبھال لیتا تو وہ یقیناً گر پڑتی۔
میری آندرے بستر پر پڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ زندگی اسے اس مقام تک بھی لے آئے گی۔ جہاں اس کے پاس بے بسی اور محرومیوں کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس کے جسم پر بوسیدہ سا لباس تھا۔ پرس میں ایک پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ سوائے اس پاسپورٹ کے جو اس کا اپنا بھی نہیں تھا۔ چارلس نے اس سے اس کی شناخت تک چھین لی تھی۔
بنکاک میں بیلے اور اس کے شوہر سیموئیل کو ہر لمحہ یہی انتظار تھا کہ پولیس قاتلوں کی تلاش میں کب کانت ہاؤس پر دھاوا بولتی ہے۔ انھیں یقین تھا کہ ڈومنک، یانک اور جیکیس نے پیرس پہنچتے ہی انٹرپول کو ایلین گوتھر کی بربریت کے بارے میں اطلاع دے دی ہوگی۔ انھیں امید تھی کہ نئے سال کی آمد سے پہلے پہلے اس سلسلے میں کوئی عملی کارروائی ہو جائے گی مگر ۱۹۷۵ء کے آخری چند روز بھی خاموشی سے بیت گئے۔ جنوری کا مہینہ بھی گزرا جا رہا تھا اور اب بیلے پر مایوسی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ کسی معاملے میں کہیں سے کوئی مدد حاصل کر لینا اتنا آسان نہیں تھی۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ ایلین گوتھر کے فلیٹ سے فرار ہو کر پیرس پہنچنے والے تینوں فرانسیسی نوجوان اتنے دہشت زدہ تھے کہ انھوں نے اس معاملے میں مزید ملوث ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ ایلین گوتھر اکثر کہا کرتا تھا کہ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور اس سے دشمنی مول لینے والا کوئی شخص دنیا کے کسی بھی گوشے میں محفوظ نہیں رہ سکتا اور وہ تینوں کئی ماہ کی جسمانی اور ذہنی اذیت کے بعد ان ہاتھوں کی پہنچ سے دور ہی رہنا چاہتے تھے۔
ایک انجانے سے خوف نے بیلے کا ذہن تقریباً مفلوج کر رکھا تھا۔ دن میں سیموئیل کی عدم موجودگی میں اور رات کو سونے سے پہلے وہ اپنے فلیٹ کے دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بولٹ کر لیتی۔ سیموئیل اسے اکثر سمجھانے کی کوشش کرتا کہ اس خوف سے نجات کا واحد راستہ یہی ہے کہ وہ پانچویں منزل کے فلیٹ کے واقعات کو ذہن سے کھرچ ڈالے۔ بیلے کی عقل بھی اگرچہ اس بات کو تسلیم کرتی تھی لیکن دل پر طاری خوف کسی طرح بھی پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔
ایک دن صبح سویرے وہ کھڑکی میں کھڑی کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اب اسے اپنے گرد لپٹا ہوا خوف و دہشت کا یہ خول توڑ دینا چاہیے۔ ورنہ یہ خوف اگر اس کے تحت الشعور میں جم گیا تو اسے زندگی بھر سکون نہیں مل سکے گا۔ اس کے خیال میں اس خوف سے نجات حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ اس کی ابتدا ایلین گوتھر کے فلیٹ ہی سے کی جائے۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ کانت ہاؤس کے فلیٹوں کی دیکھ بھال کرنے والی ملازمہ راہداری میں نکل آئی۔ اس ملازمہ کے

پاس ایک ماسٹر کی بھی تھی جس سے ہر فلیٹ کا تالا کھولا جا سکتا تھا۔ اس ملازمہ سے بیلے کے تعلقات بھی خاصے خوشگوار تھے بیلے نے فوراً ایک کہانی گھڑلی اور چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد بولی۔

" ایلین گوتھر کے فلیٹ میں میری کچھ چیزیں پڑی ہوئی ہیں! وہ لوگ پتا نہیں کب لوٹیں گے۔ اگر تم کچھ دیر کے لیے اپنی چابی مجھے مستعار دے سکو تو بہت شکر گزار ہوں گی۔"

ملازمہ نے جرح کیے بغیر ماسٹر کی اس کے حوالے کر دی۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی اور حقیقت یہ تھی کہ وہ کئی روز پہلے ہی ایلین گوتھر کے فلیٹ میں ہونے والی سرگرمیوں کے بارے میں بہت کچھ جان چکی تھی لیکن اپنی ملازمت جانے کے خوف سے اس نے اس سلسلے میں کبھی لب کشائی نہیں کی تھی۔

بیلے جب فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی کیفیت اس وقت اس غوطہ خور کی سی تھی، جو سمندر کی تہ میں غرق شدہ جہاز کو کھنگالنے کے لیے سمندر کی گہرائی میں اتر رہا ہو۔ تاریکی نے ہر چیز کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سنسنی کی اس فضا میں اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایلین گوتھر بھی اس کے قریب ہی کھڑا گہرے گہرے سانس لے رہا ہو۔ یہ احساس شدت اختیار کرتا جا رہا تھا کہ ایلین گوتھر کسی بھی لمحہ تاریکی سے برآمد ہو کر اس کی گردن دبوچ لے گا۔

فلیٹ کی تلاشی لینے کے بعد اسے یقین ہو چلا تھا کہ ایلین گوتھر اینڈ کمپنی دراصل قاتلوں کا ایک ٹولہ ہے لیکن سوال تو یہ تھا کہ اس سلسلے میں وہ کیا کر سکتی تھی؟ اس نے بنکاک میں مقیم اپنے ایک فرانسیسی دوست کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس نے بیلے کو برطانوی سفارت خانے سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ اس نے اسے ایک برطانوی سفارت کار سے بھی ملوا دیا۔

برطانوی سفارت کار پوری توجہ سے بیلے کی بات سن رہا تھا لیکن آخر میں بیلے نے محسوس کیا کہ اس آفیسر کو بیلے کی باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی اور وہ اسے جلد سے جلد رخصت کر دینا چاہتا تھا۔

بیلے کے جانے کے بعد برطانوی سفارت خانے کے اس افسر نے ایک بار پھر اس کی باتوں پر غور کیا۔ ایک دو چیزیں ایسی تھیں جن پر توجہ دی جا سکتی تھی اور غالباً یہی سوچتے ہوئے اس نے تھائی پولیس کو تحریری طور پر اس صورتِ حال سے مطلع کر دیا لیکن اسے اپنی رپورٹ کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کی رپورٹ پر یا تو سرے سے توجہ ہی نہیں دی گئی تھی یا یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کاغذوں کے انبار میں دب کر نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہو۔

" میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ ایسی باتوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔" سیموئیل نے یہ بات اس وقت کہی تھی جب بیلے نے پہلی مرتبہ اسے برطانوی سفارتی افسر سے رابطے اور اس رپورٹ کے بارے میں بتایا تھا۔ اس نے بہرحال بیلے کے اس جذبے کی تعریف بھی کی تھی اور ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ اب وہ شرلاک ہومز بننے کا خیال ذہن سے نکال دے کیونکہ تھائی لینڈ میں مزید قیام کے سلسلے میں ویزے کی تجدید کے دن قریب آ رہے تھے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کے نام پولیس کے ریکارڈ پر آ جائیں۔ "اب سب کچھ بھول جاؤ۔" اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اب ایلین گوتھر اور اس کے ساتھی یہاں کبھی واپس نہیں آئیں گے۔"

بیلے نے سیموئیل کی باتوں کو تسلیم کرتے ہوئے اس معاملے میں خاموشی اختیار کرنے کا وعدہ کر لیا تھا لیکن ان باتوں کو ذہن سے نکالنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ خصوصاً رات کے وقت جب وہ سیموئیل کے انتظار میں اپنے فلیٹ میں اکیلی بیٹھی ہوتی تو ایلین گوتھر کا بھوت اس پر دہشت سی طاری کر دیتا اور وہ کانپ اٹھتی اور پھر غیر ارادی طور پر بھاری فرنیچر گھسیٹ گھسیٹ کر مقفل دروازے کے سامنے ڈھیر کر دیتی۔

۷ جنوری ۱۹۷۶ء کو جب چارلس سوبھراج اور اس کے ساتھی گوا کے شہر پاناجی میں داخل ہوئے تو ہر طرف غیر ملکی سیاح گھومتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے جن میں زیادہ تعداد نوجوان ہپیوں کی تھی لیکن چارلس کے اندازے کے مطابق ان میں بیشتر ایسے تھے جن کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں تھی اور انھیں منشیات کا لالچ دے کر نہایت آسانی سے کاٹا جا سکتا تھا۔

چند گھنٹوں کے اندر ہی اندر برک مارکیٹ کے علاقے میں گھومتے ہوئے چارلس کی خوردبین نگاہوں نے تین ایسے فرانسیسی نوجوانوں کا انتخاب کر لیا۔ جو مختلف دکانوں پر گھوم پھر کر مختلف اشیا دیکھ رہے تھے۔ مشرق میں گوا کو پہلی عیسائی کالونی ہونے کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ یہاں کے مقامی باشندے بھی عیسائیت سے زیادہ قریب تھے اور شہر کی بیشتر دکانوں میں مسیح کے چھوٹے چھوٹے مجسمے بھرے ہوئے تھے۔

وہ تینوں فرانسیسی نوجوان، جن کی عمریں بیس اور بائیس کے

درمیان تھیں، ایک وین میں سفر کر رہے تھے۔ ان کے طور طریقوں سے چارلس کو یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ ان کا تعلق پیرس کے ایک ایسے طبقے سے ہے جس کے دم سے سینٹ مائیکل بلے وارڈ کی رونق قائم تھی۔ وہ نہ صرف دولت مند تھے، بلکہ ان تینوں میں جنسِ مخالف کے لیے بھی خاصی کشش تھی۔ پہلی ہی بار وہ میری آندرے سے نہایت مہذب انداز میں ملے تھے اور کھٹمنڈو سے فرار ہونے کے بعد پہلی مرتبہ میری آندرے کو احساس ہوا کہ وہ واقعی کسی مہذب انسان سے متعارف ہو رہی تھی۔

رات کا اندھیرا پھیلنے تک ان میں دوستی کا رشتہ استوار ہو چکا تھا۔ اجے چودھری اگرچہ اس دوران ان سے دور ہی رہا تھا لیکن پھر اس طرح ان کے گروہ میں شامل ہو گیا جیسے اس کی ملاقات بھی محض اتفاق کا نتیجہ رہی ہو۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی وہ ساحل پر پہنچ گئے چارلس کو اعتراف کرنا پڑا کہ ایسی رنگینی اس نے دنیا کے کسی ساحل پر نہیں دیکھی تھی۔ دوپہر کا کھانا ایک جھونپڑا نما ریسٹورنٹ میں کھایا گیا جہاں ناریل کے تیل میں تلی ہوئی مچھلی کا ذائقہ خلافِ توقع بے حد لذیذ تھا۔ کھانے کے بعد وہ ناریل کے درختوں کے سائے میں آرام کرتے رہے اور پھر رات کے کھانے کے بعد حشیش اور الکحل کا دور شروع ہو گیا۔ چارلس اگرچہ ان کا پورا پورا ساتھ دے رہا تھا مگر حشیش کا دھواں یا الکحل کا ایک قطرہ بھی اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر سکا تھا۔ ایسے معاملات میں وہ خاصا ہوشیار ثابت ہوا تھا۔

دوسرے دن تینوں فرانسیسی نوجوانوں نے اعلان کیا کہ وہ گوا کے ایک دور افتادہ ساحلی شہر کاروار جا رہے ہیں۔ ان کے اس اچانک پروگرام نے چارلس کو گڑبڑا دیا لیکن وہ اتنی آسانی سے شکست تسلیم کرنے والا نہیں تھا۔

" ہم لوگ بھی اس طرف جانے کا پروگرام بنا رہے تھے لیکن ان علاقوں میں سواری کا حصول بڑا اہم مسئلہ ہے۔" چارلس نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "کیا تمھاری وین میں ہمارے لیے کوئی گنجائش نکل سکتی ہے؟"

" اوہ، کیوں نہیں۔" وین کے مالک آئر ڈی آمور نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

روانگی سے کچھ دیر پہلے چارلس اچانک ہی غائب ہو گیا اس کی واپسی آدھے گھنٹے سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اسکاچ وھسکی کی کوارٹر بوتل دیکھ کر تینوں فرانسیسیوں کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ ہندوستان میں اس کی قیمت پچاس ڈالر سے کم نہیں تھی اور گوا جیسے دور دراز علاقے میں تو یہ اور بھی مہنگی ہو سکتی تھی۔

دن بھر کے سفر کے بعد رات کو وین ایک ایسی جگہ رک گئی جس کے بارے میں کہا جا سکتا تھا کہ بحیرۂ عرب کے اس ساحل پر ان سے پہلے کسی اور کے قدم نہیں پہنچے ہوں گے۔ میری آندرے آگ جلا کر وہ دو مرغیاں روسٹ کرنے لگی جو راستے کی ایک بستی سے چارلس نے شکار کی تھیں۔ ڈی آمور نے ٹرانسسٹر ریڈیو آن کر دیا جس پر کسی دور دراز کے اسٹیشن سے راک این رول سے ملتی جلتی موسیقی نشر ہو رہی تھی۔

کھانے کے بعد حشیش اور وھسکی کا دور شروع ہو گیا۔ سمندر کی طرف سے آنے والی مرطوب ہوا کے جھونکوں اور حشیش اور اسکاچ وھسکی کے نشے نے تینوں فرانسیسی نوجوانوں پر مستی سی طاری کر دی وہ اٹھ کر ناچنے لگے۔ میری آندرے، اجے چودھری اور چارلس بھی رقص میں ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ انسانی آبادی سے میلوں دور یہ ویران اور سنسان علاقہ اس وقت جنگل میں منگل کا سماں پیش کر رہا تھا۔

"اے ایلین! تمھاری وھسکی بہت عمدہ ہے۔ پیرس سے نکلنے کے بعد پہلی مرتبہ ایسی اچھی شراب چکھنے کو ملی ہے۔" ایک فرانسیسی نوجوان نے جھومتے ہوئے کہا۔

" اور یہ وھسکی بہت تیز بھی ہے۔" دوسرے نوجوان نے تبصرہ کیا اور جھومتا ہوا ریت پر گر گیا۔ اس کے منہ سے بے معنی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

ڈی آمور بھی مستی میں جھوم رہا تھا اور پھر چند منٹ بعد وہ بھی اپنے دونوں ساتھیوں کی طرح ڈھیر ہو گیا۔

تقریباً چھتیس گھنٹے بعد انھیں ہوش آیا تو وہ ایک چھوٹے سے اسپتال میں تھے۔ ان کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور سر اس طرح بوجھل ہو رہے تھے جیسے منوں بوجھ [illegible] دیا گیا ہو۔ پوری طرح حواس میں آنے کے بعد جب انھوں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا تو یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ نہ صرف ان کی وین مکمل طور پر تباہ ہو چکی تھی بلکہ ان کے پاسپورٹ، نقد رقم، ٹریولرز چیکس کیمرے، ریڈیو ٹرانسسٹر اور اس قسم کی دوسری قیمتی چیزیں بھی غائب تھیں۔ ایلین گوتھر، اس کی بیوی اور ان کے ہندوستانی دوست کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ تینوں فرانسیسی نوجوانوں کی بپتا سننے کے بعد پولیس کو یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہ لگی کہ انھیں پلائی جانے والی وھسکی میں کوئی خواب آور دوا غالباً ویلیم شامل تھی، ان کے نیم غفیل ہوتے ہی انھیں نیند کے طاقتور انجکشن بھی دیے گئے تھے۔ انجکشنوں کی خالی شیشیاں تباہ شدہ وین سے دستیاب ہو گئی تھیں۔

پولیس کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ وین سے قیمتی چیزیں نکالنے

کے بعد ان تینوں بے ہوش فرانسیسی نوجوانوں کو وین میں ڈال کر اسے کم از کم ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑایا گیا تھا۔ پھر اس کا رخ ایک ساحلی چٹان کی طرف موڑ کر ایکسیلیریٹر پر بھاری پتھر رکھنے کے بعد ڈرائیور نے چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ غالباً یہ چاہتا تھا کہ وین چٹان سے ٹکرا کر قلابازیاں کھاتی ہوئی سمندر میں جا گرے اور پانی کی تہ میں پہنچ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نگاہوں سے اوجھل ہو جائے لیکن وین کا رخ اچانک ہی تبدیل ہو گیا اور وہ ایک خوفناک دھماکے سے ناریل کے ایک درخت سے ٹکرا کر تباہ ہو گئی۔ اس دھماکے کی آواز میلوں دور تک سنی گئی تھی مگر وین کے اندر موجود تینوں بے ہوش فرانسیسی نوجوانوں کو اس کا علم تک نہیں ہو سکا تھا۔

کئی میل دور ایک بستی کے لوگ دھماکے کی آواز سن کر تحقیقِ حال کے لیے اس طرف دوڑ پڑے اور کئی گھنٹوں کی جستجو کے بعد چند دیہاتی نوجوان اس تباہ شدہ وین تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے کھینچ تان کر تینوں فرانسیسی نوجوانوں کو تباہ شدہ وین سے باہر نکالا۔ ان کا خیال تھا کہ اس حادثے میں وہ تینوں ختم ہو چکے تھے لیکن ان میں زندگی کی رمق محسوس کر کے انھیں فوری طور پر پہلے بستی اور پھر قریبی قصبے کے اسپتال پہنچا دیا گیا جہاں تقریباً چھتیس گھنٹے بعد ان کی آنکھ کھلی تھی۔

چارلس سوبھراج کا یہ مختصر سا قافلہ بنگلور پہنچ گیا جہاں چند روزہ پڑاؤ کے بعد وہ مدراس کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان علاقوں میں غیر ملکی سیاحوں کے لیے زیادہ کشش نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں آنے والے سیاحوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اور ظاہر ہے ایسی فضا چارلس کی سرگرمیوں کے لیے قطعی موزوں نہیں تھی۔ اپنے کاروباری نقطۂ نظر سے کسی زرخیز علاقے کی تلاش میں شہر شہر گھومتے گھومتے وہ سنگاپور پہنچ گیا۔

چارلس کے ساتھ سنگاپور ایئرپورٹ پر جہاز سے اترنے والی میری آندرے کے پاس فرانسیسی نوجوان ایرک ڈی آمور کا پاسپورٹ تھا جسے اس کے دو ساتھیوں کے ساتھ بے ہوشی کی حالت میں وین میں ڈال کر اپنے تئیں ختم کر آئے تھے۔ میری آندرے نے اس پاسپورٹ پر اپنی تصویر لگائے جانے پر اعتراض کیا تھا۔ کہ مردانہ نام کے ساتھ زنانہ تصویر راز فاش کر دے گی۔

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" چارلس نے جواب دیا۔ "مشرقی لوگ مغربی ناموں کو نہیں سمجھ سکتے۔ کسی مغربی نام میں مؤنث یا مذکر کا امتیاز کرنا ان کے لیے ممکن نہیں۔"

چارلس کا خیال غلط نہیں نکلا تھا۔ سنگاپور ایئرپورٹ پر اس کے پاسپورٹ پر کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔

میری آندرے اب تک ہر چیز برداشت کرتی چلی آ رہی تھی لیکن سنگاپور پہنچتے ہی اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ غبارے کی طرح پھٹ پڑی۔

چارلس نے کسی ہوٹل کے بجائے وائی ایم سی اے ہوسٹل کا ایک کمرہ کرائے پر لے لیا تھا جس کا کرایہ بہت کم تھا لیکن وہاں زندگی کی بنیادی سہولتیں موجود نہیں تھیں۔ دیواروں پر جا بجا دھبے نظر آ رہے تھے جن کی وجہ سے یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ ان دیواروں پر کب اور کون سا رنگ کیا گیا ہوگا۔ روشنی اور ہوا کا مناسب انتظام نہ ہونے کے باعث کمرے میں سیلن اور گھٹن کا احساس نمایاں تھا۔

چارلس اور میری آندرے میں بات اسی کمرے سے شروع ہوئی تھی جو بڑھتے بڑھتے ذاتیات تک پہنچ گئی اور میری آندرے نے دل کا وہ غبار نکال ڈالا جو کئی دلنوں سے جمع ہو رہا تھا۔

"اگر تم نے مجھے جانے نہیں دیا" وہ چیختے ہوئے بولی۔ "اگر تم نے مجھے کنیڈا کا ٹکٹ لے کر نہ دیا اور مجھے اسی طرح لیے پھرتے رہے تو ایک دن میں پاگل ہو جاؤں گی۔ اب یہ سب کچھ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"میں تمھاری کیفیت سے واقف ہوں۔ تمھاری تکالیف کا احساس ہے۔ تم نے جس طرح میرا ساتھ دیا ہے۔ اس کے لیے میں تمھارا شکر گزار ہوں۔ اب تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں۔ یہ سب کچھ بھول جاؤ گی۔" چارلس اسے تسلی دیتا رہا اور اس کے ساتھ ہی جیب سے سنہری اومیگا گھڑی نکال کر میری آندرے کی کلائی پر باندھ دی۔

میری آندرے کو یقین تھا کہ چارلس کے یہ تھوڑے دن کبھی ختم نہ ہوں گے۔ البتہ کسی روز اس کا خاتمہ ضرور ہو جائے گا۔ وہ سسکیاں بھرتے ہوئے نجانے کس وقت نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔ اس کے سوتے ہی چارلس، اجے چودھری کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ایئرپورٹ کی طرف جا رہے تھے۔

میری آندرے ایک ہفتے تک وائی ایم سی اے ہوٹل کے اس سیلن زدہ کمرے میں پڑی سڑتی رہی۔ کئی مرتبہ اس نے سوچا کہ سنگاپور میں کنیڈا کے سفارت خانے پہنچ جائے اور اپنے پاسپورٹ کی چوری کی کہانی سنا کر نیا پاسپورٹ حاصل کر لے اور کسی نہ کسی طرح یہاں سے بھاگ نکلے لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ فرار کا موقع ہونے کے باوجود وہ راہِ فرار اختیار کرنے کی ہمت نہ کر سکی۔ کیونکہ یہاں پہنچتے ہی چارلس نے اسے وارننگ دی تھی کہ اس کی عدم موجودگی میں وہ فرار کا کوئی خیال بھی دل میں نہ لائے کیونکہ اس کا ایک سنگاپوری دوست چوبیس گھنٹے اس کی نگرانی کرتا رہے گا۔ چارلس

سے کوئی بات بھی بعید نہیں تھی لیکن میری آندرے اس خوف سے زیادہ چارلس کی محبت میں مبتلا تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اسے پانے میں ضرور کامیاب ہو جائے گی۔ چارلس جب بھی اس سے محبت کی دو باتیں کر لیتا۔ وہ سارے دکھ بھول کر اس سے نئی امیدیں وابستہ کر لیتی۔

میری آندرے اس حقیقت سے بھی پوری طرح آگاہ تھی کہ خطرات اس کے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں۔ سب سے بڑا خطرہ پاسپورٹ کی صورت میں اس کے اپنے پرس میں موجود تھا۔ ایرک ڈی آمور کا پاسپورٹ استعمال کرنے کے بعد اب وہ میری آندرے نہیں رہی تھی۔ وہ گوا میں ان تینوں فرانسیسی نوجوانوں کو جس حالت میں چھوڑ کر آئے تھے۔ اسے یقین تھا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی زندہ بچ گیا ہوگا۔ اس طرح پاسپورٹ کا راز بھی فاش ہو گیا ہوگا اور دنیا بھر کی پولیس اسے تلاش کر رہی ہوگی۔ ایسی صورت میں کسی ہوٹل میں داخلہ اس کے لیے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہ خطرہ وائی ایم سی اے ہوسٹل میں بھی موجود تھا۔ اس کا ذمّے دار چارلس تھا لیکن اس کے باوجود چارلس کے لیے اس کی چاہت میں اضافہ ہو رہا تھا اور اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کا یہ محبوب جو بزنس کا بہانہ کر کے سنگاپور سے گیا تھا۔ وہ بنکاک کے عالیشان ہوٹل میں سوزی کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا تو شاید وہ اس طرح بکھر جاتی کہ اس کا سمیٹنا مشکل ہو جاتا۔

اب یہاں ایک ایسے شخص کا تعارف ضروری ہے جو آگے چل کر اس کیس کا ایک نہایت اہم کردار ثابت ہوگا۔

ہرمن نپن برگ تھائی لینڈ میں ہالینڈ کے سفارت خانے میں سیکنڈ سیکرٹری کی حیثیت سے تعینات تھا۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ اس اہم عہدے پر فائز ہو سکتا ہے۔ وہ نہ صرف جھگڑالو بلکہ منہ پھٹ بھی تھا۔ جو کچھ کہنا ہوتا۔ بلا لحاظ و مروت کہہ ڈالتا۔ یہ دونوں چیزیں اگرچہ کسی ڈپلومیٹ کے لیے انتہائی خطرناک ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود ہرمن ایک نہایت کامیاب سفارت کار ثابت ہوا تھا۔

فروری ۱۹۷۶ء کے پہلے ہفتے کے دوران وہ اپنے دفتر میں بیٹھا ایمسٹرڈم سے آنے والی اس دن کی ڈاک دیکھ رہا تھا۔ کہ ایک خط پڑھ کر چونک سا گیا۔ یہ خط ایمسٹرڈم کے فارن آفس سے بھیجا گیا تھا جس میں ہینک بنٹانجا اور کارنیلیا کی تلاش کے سلسلے میں ہدایات دی گئی تھیں۔ ہرمن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس خط کو ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیتا لیکن وہ ایک ذمّے دار آفیسر تھا اور تھائی لینڈ میں آنے والے اپنے ہم وطنوں کو ہر قسم کی امداد فراہم کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ اس نے فوراً ہی اس سلسلے میں کام شروع کر دیا اور مقامی حکام سے رابطہ قائم کر کے ان دونوں کے بارے میں تحقیقات کرنے لگا۔ دس دن کی بھاگ دوڑ کے بعد اس نے تین اہم باتیں معلوم کیں۔

نمبر ۱ : بنکاک ایئرپورٹ کے امیگریشن کاؤنٹر کے ریکارڈ کے مطابق ہینک بنٹانجا اور کارنیلیا دسمبر کے شروع میں تھائی لینڈ آئے تھے۔

نمبر ۲ : بنکاک جنرل پوسٹ آفس میں غیر ملکیوں کے مخصوص شعبے میں ان کے نام گھر سے آنے والی ڈاک جمع تھی۔

نمبر ۳ : ان دونوں کے پاسپورٹ کی مدّت ختم ہونے والی تھی اور انھیں نئے پاسپورٹوں کے حصول کے لیے بنکاک میں اپنے ملک کے سفارت خانے سے رجوع کرنا چاہیے تھا جبکہ انھوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔

یہ تینوں باتیں ہرمن کے لیے حیرت انگیز ثابت ہوئی تھیں جبکہ اس کے خیال میں کوئی بھی شخص ایسی غیر ذمّے داری کا ثبوت نہیں دے سکتا تھا۔ ہرمن نے اپنے ریکارڈ آفس سے وہ فائل منگوا لیا جس میں تھائی لینڈ میں انتقال کرنے والے غیر شناخت شدہ افراد کی تفصیل، اخبارات کے تراشے اور اسی قسم کی چیزیں موجود تھیں۔ اس قسم کے فائل ہر سفارت خانے میں موجود ہوتے ہیں اور بعض معاملات میں یہ بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

بنکاک غالباً دنیا کا واحد شہر ہے جس کے سرکاری مُردہ خانے میں ہر وقت کم از کم چھ سو ایسی لاشیں موجود رہتی ہیں۔ جن کی شناخت نہ ہو سکی ہو۔ اسپتال جا کر ان لاشوں کا معائنہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس میں کئی دن لگ سکتے تھے لیکن فائل کے اوراق پلٹتے ہوئے ہرمن کی توجہ ان جلی ہوئی دو لاشوں کی تصویروں اور ان سے متعلق تفصیل پر مرکوز رہی جو ۱۶ دسمبر کو بنکاک سے چند میل دور دستیاب ہوئی تھیں اور ہرمن کے خیال میں اسی تاریخ کے لگ بھگ ہینک اور کارنیلیا کو بھی بنکاک میں موجود ہونا چاہیے تھا۔

فائل دیکھنے کے بعد ہرمن نے مُردہ خانے کو فون کیا اور اس خیال کا اظہار کیا کہ ان جلی ہوئی دو لاشوں کے سلسلے میں پولیس کا یہ مفروضہ درست نہیں کہ وہ آسٹریلیا کے باشندے تھے نجانے اس کے دل میں بار بار یہ خیال کیوں آ رہا تھا کہ یہی دونوں اس کے مطلوبہ افراد ہو سکتے ہیں۔ اس نے ٹیلیگرام کے ذریعے ہیگ (ایمسٹرڈم) کے فارن آفس سے درخواست کی کہ پہلی فرصت میں ہینک اور کارنیلیا کے دانتوں کا ریکارڈ بھیج دیا جائے۔

یہ ریکارڈ ملتے ہی اس نے بنکاک میں ہالینڈ کی رہنے والی ایک خاتون دندان ساز سے رابطہ قائم کیا اور اسے جلی ہوئی لاشوں کے دانتوں کا معائنہ کرنے پر آمادہ کر لیا۔ تھائی پولیس نے ایک نوجوان پولیس آفیسر کو ان کے ہمراہ کر دیا تھا تاکہ وہ مُردہ خانے میں جلی ہوئی ان لاشوں کی نشاندہی کر سکے۔

مُردہ خانے میں داخل ہوتے ہی کیمیکلز کی ناگوار سی بو کا بھبکا ان کے نتھنوں سے ٹکرایا۔ دونوں لاشیں لکڑی کی کھردری سطح والی میزوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ کوئلے کی طرح ان جلی ہوئی لاشوں کو شناخت کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔ دندان ساز خاتون اور ہرمن یہ خوفناک منظر دیکھ کر دہل اٹھے۔ مگر انھیں یہ ناگوار فریضہ تو انجام دینا ہی تھا۔ نوجوان پولیس آفیسر کی مدد سے خاتون دندان ساز بڑی مہارت سے لاشوں پر اپنا کام کرتی رہی اور ہرمن قریب کھڑا دیکھتا رہا۔ بالآخر کام سے فارغ ہو کر دندان ساز خاتون نے پورے وثوق سے اعلان کیا کہ یہ لاشیں ہینک بنٹانجا اور کارنیلیا ہی کی تھیں۔

دوسرے ہی روز ہرمن نے رپورٹ مرتب کر کے ایمسٹرڈیم بھیج دی۔ جس میں اس نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ممکن ہے ہینک اور کارنیلیا تھائی لٹیروں کے ہتھے چڑھ گئے ہوں۔ جن کے ہاتھوں وہ اس بھیانک انجام کو پہنچے۔ رپورٹ بھیجنے کے ساتھ ہی اس نے کیس بند کر دیا اور روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران اس نے اس واقعے کے سلسلے میں قانونی کارروائی کے لیے کیس تیار کر لیا تھا۔ اگرچہ اسے یقین تھا کہ تھائی پولیس اس سلسلے میں زیادہ سرگرمی نہیں دکھائے گی لیکن وہ اپنا کیس لے کر تھائی پولیس کے کرائم بیورو کے پاس پہنچ گیا اور اسے بتایا کہ اس کے ملک کے دو باشندوں کو اس سرزمین پر بیدردی سے قتل کیا گیا ہے۔ قاتلوں کی گرفتاری کے لیے پولیس کو اس کیس کی ازسرِنو تحقیقات شروع کرنا چاہیے۔ اس کی توقع کے عین مطابق متعلقہ پولیس آفیسر نے بڑی خوبصورتی سے اسے اس معاملے میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے ٹال دیا۔ آفیسر نے اگرچہ تحقیقات کا وعدہ کر لیا تھا لیکن کرائم بیورو کے دفتر سے نکلتے ہوئے ہرمن سوچ رہا تھا کہ وہ اس پولیس آفیسر کی توجہ حاصل نہیں کر سکا تھا۔

کوئی اور ہوتا تو اس موقع پر پیچھے ہٹ جاتا اور غیر ملکی پولیس پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کی کوشش نہ کرتا لیکن ہرمن نے آگے بڑھا ہوا قدم پیچھے ہٹانا نہیں سیکھا تھا۔ پولیس سے مایوس ہو کر اس نے اپنے طور پر تحقیقات کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اپنا کیس کم از کم اس حد تک مضبوط کر لینا چاہتا تھا کہ تھائی پولیس اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو جائے لیکن سب سے اہم سوال یہ تھا کہ تفتیش کا آغاز کہاں سے کیا جائے۔

اپنے والدین کے نام ہانگ کانگ سے لکھا ہوا کارنیلیا کا آخری خط پڑھتے ہوئے ہرمن کچھ چونک سا گیا۔ اس خط میں قیمتی پتھروں کے ڈیلر ایلین ڈوپیوس کا جس طرح تذکرہ کیا گیا تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ بنکاک میں قیام کے دوران ہینک بنٹانجا اور کارنیلیا کے اس شخص سے زیادہ روابط رہے تھے ممکن ہے، یہ شخص ایلین ڈوپیوس ان کی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ بتا سکے۔

ہرمن کے خیال میں ایلین ڈوپیوس کو تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ کیونکہ بنکاک میں فرانسیسی جیم ڈیلرز کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی لیکن پولیس، امیگریشن حکام اور جیم ڈیلروں کی ایسوسی ایشن سے رابطہ قائم کرنے کے بعد ہرمن کو احساس ہوا کہ وہ جہاں سے چلا تھا، اب بھی وہیں کھڑا ہے۔ کہیں سے بھی ایلین ڈوپیوس کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اسے مطلع کیا جائے۔ لیکن ہانگ کانگ سے ملنے والے جواب نے اسے سخت مایوس کیا تھا۔ دسمبر کے دوران اس نام کے کسی شخص نے حیات ایجنسی ہوٹل میں قیام نہیں کیا تھا۔ ہرمن کی تشویش بڑھ رہی تھی اور اب وہ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ ایلین ڈوپیوس نام کا کوئی شخص تھا بھی، یا یہ محض ایک فرضی نام تھا۔

ایک رات وہ بیلجیم کے سفارتخانے سے تعلق رکھنے والے ایک دوست کے ساتھ بیٹھا شراب کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس دوران مختلف موضوعات پر باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ اس کے دوست آرمنڈ نے بتایا کہ چند روز پہلے ایک مغربی سفارت خانے کا نچلے درجے کا ایک آفیسر آرٹ گیبرکس نامی اپنے ایک فرانسیسی دوست کے ساتھ لڑ پڑا تھا۔ ان کا یہ جھگڑا ایک نائٹ کلب میں ہوا تھا۔ اور اس وقت دونوں نشے میں تھے۔ ان کے دوست اب ان میں راضی نامے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر آرٹ گیبرکس کا مطالبہ ہے کہ زیادتی آفیسر کی تھی۔ پہلے اسے معافی مانگنی چاہیے۔

”یہ آرٹ گیبرکس کرتا کیا ہے؟“ ہرمن نے پوچھا۔

”اس کا ایکسپورٹ، تیل اور جواہرات کا بزنس ہے۔“

”جواہرات۔“ ہرمن چونک سا گیا۔ اس کے ذہن میں آرٹ گیبرکس کے ساتھ ایلین ڈوپیوس کا نام بھی گونجنے لگا۔ دونوں فرانسیسی تھے اور دونوں جواہرات کے بیوپاری تھے۔ کوئی بات اس کے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔

ہرمن نے آرٹ گیبرکس کے بارے میں تحقیقات شروع کر دی۔ چند روز کی دوڑ دھوپ کے بعد پتا چلا کہ گیبرکس دسمبر میں جاپان گیا تھا۔ ہرمن کا قیاس تھا کہ ممکن ہے ٹوکیو سے بنکاک واپس آتے ہوئے ہانگ کانگ میں قیام کے دوران ہینک اور کارنیلیا سے اس کی ملاقات ہوئی ہو۔ ہرمن کے لیے یہ بات بھی قابلِ توجہ تھی کہ گیبرکس نے بنکاک میں فرانسیسی سفارت خانے کو اپنے پاسپورٹ کی چوری یا گمشدگی کی اطلاع دی تھی اور انھی دنوں میں ہینک اور کارنیلیا کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس صورتِ حال کو سامنے رکھتے ہوئے ہرمن نے مفروضہ قائم کیا۔ اس کے نظریے کے مطابق ہانگ کانگ میں قیام کے دوران گیبرکس کی ملاقات ہینک اور کارنیلیا سے ہوئی۔ اس نے انھیں بنکاک آنے کی دعوت دی اور وہ لوگ جیسے ہی بنکاک پہنچے۔ گیبرکس نے انھیں قتل کر دیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس پر بدحواسی اور گھبراہٹ سی طاری ہو گئی۔ اس نے اپنے پاسپورٹ کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا دی جسے وہ اپنے اضطراب کی وجہ بنانا چاہتا تھا لیکن ہرمن کی یہ قیاس آرائی غلط ثابت ہوئی۔ بعد کی تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی کہ گیبرکس ایک کھرا بزنس مین تھا۔ اس کے خلاف کوئی پولیس ریکارڈ بھی موجود نہیں تھا۔ جن دنوں ہینک اور کارنیلیا ہانگ کانگ میں تھے۔ وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں ٹوکیو میں تھا اور واپسی پر ہانگ کانگ میں رُکے بغیر بنکاک آ گیا تھا۔ گویا ان دونوں سے کبھی اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

ہرمن کی یہ سرگرمیاں سفارت خانے کے افسرانِ بالا کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ آرٹ گیبرکس کی ناکام تحقیق کے بعد اس کے سفیر نے اسے اپنی یہ احمقانہ سرگرمیاں بند کر دینے کا حکم دیا کیونکہ اس کی حماقتوں سے سفارت خانے کے خلاف کسی اسکینڈل کو بھی ہوا مل سکتی تھی لیکن ہرمن نے اپنے سفیر کا یہ حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ ہالینڈ کے دو معصوم باشندوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور وہ قاتل یا قاتلوں کو اس جرم کی سزا دیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

چند روز بعد ہی ہالینڈ کے سفیر کو اطلاع ملی کہ ہرمن کی یہ غیر سفارتی سرگرمیاں سفارتخانے کے لیے تکلیف دہ بنتی جا رہی ہیں۔ سفیر نے اسے ایک بار پھر سرزنش کی۔ یہ معاملہ مقامی پولیس کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ ممکن ہے ہرمن دل برداشتہ ہو کر واقعی اس معاملے میں خاموشی اختیار کر لیتا لیکن سفیر سے اس ملاقات کے دوسرے ہی دن اس کے ایک مخبر نے اطلاع دی کہ آرٹ گیبرکس کے بارے میں تحقیقات کے دوران ایک اور مشتبہ نام سامنے آیا تھا اور دلچسپی کی بات یہ تھی کہ یہ بھی فرانسیسی تھا اور اس کے نام کے شروع کے حروف بھی اے اور جی تھے۔

” یہ کون ہے؟“ ہرمن نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”اس کا پورا نام ایلین گوتھر ہے اور وہ جیم ڈیلر ہے۔“

ٹیلی فون کے ریسیور پر ہرمن کی گرفت سخت ہو گئی۔ ”اس کا پتا کیا ہے۔ وہ کہاں رہتا ہے؟“ اس نے بے چینی سے پوچھا۔

جواب میں چند لمحے خاموشی رہی اور پھر دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا۔ وہ ہرمن پر سنسنی سی طاری کر دینے کے لیے کافی تھا۔ بالآخر وہ اپنے مطلوبہ آدمی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"ہیلو بیلے!"

یہ آواز سن کر بیلے کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی تیز دھار آلہ اس کے سینے کو چیرتا ہوا دل کی گہرائیوں تک اترتا چلا گیا ہو۔ اسے رگوں میں اپنا خون منجمد ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ یہ ۱۲ فروری ۱۹۷۶ کی بات تھی۔ وہ بنکاک کے اندرا ہوٹل میں بیٹھی لنچ کے لیے اپنے ایک دوست کا انتظار کر رہی تھی کہ پشت سے ابھرنے والی اس آواز نے اسے خوف و دہشت کی اس وادی میں دھکیل دیا جس سے وہ بچنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس وقت اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

میری آندرے اور چارلس سوبھراج اس کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ تھی اور کسی غیر معمولی بات کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کئی ہفتے بعد بنکاک واپس لوٹے تھے اور ان کی باتوں سے یہ انکشاف ہوا تھا کہ اپنے اپارٹمنٹ میں جانے کے بجائے فی الحال دو چار دن کے لیے انھوں نے ایک ہوٹل کا کمرہ کرائے پر لے لیا تھا۔ اس انکشاف پر بیلے کو حیرت بھی ہوئی تھی۔ کانت ہاؤس یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن پھر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اپنے فلیٹ میں جانے سے پہلے ایلین گوتھر صورتِ حال کا جائزہ لے کر پورا اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔ وہ انتہائی چالاک شخص تھا اور احتیاط کا کوئی بھی پہلو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"جب تم لوگ ہوٹل سے اپنے فلیٹ منتقل ہو جاؤ تو مجھے ضرور بتانا۔" بیلے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک ضروری کام کا عذر پیش کرتے ہوئے وہاں سے اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ جلد سے جلد ان لوگوں سے پیچھا چھڑا لینا چاہتی تھی لیکن چارلس نے اسے روک لیا۔

"اتنی بھی کیا جلدی ہے؟" وہ اس کی کلائی پر گرفت جماتے ہوئے بولا۔ "ہمارا ابھی یہاں سے سیدھے گھر جانے کا پروگرام ہے اکٹھے ہی چلیں گے۔"

"لیکن... " بیلے ہکلائی۔ "میں نے یہاں اپنے ایک دوست کو کھانے پر مدعو کر رکھا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، ہم انتظار کر لیں گے۔" چارلس نے معنی خیز مسکراہٹ سے جواب دیا۔

اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد میری آندرے اور چارلس کے ساتھ ایک ٹیکسی میں فلیٹ کی طرف جاتے ہوئے بیلے کا ایک ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر تھا۔ وہ کسی بھی ہنگامی صورتحال میں چلتی ٹیکسی سے کودنے کو تیار تھی لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

کانت ہاؤس کی لفٹ میں چارلس اس کے ساتھ جڑ کر کھڑا تھا۔ بیلے کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اس کے دل کی یہ دھڑکن اس کے خوف کا اظہار نہ کر دے۔ اسے شبہ تھا کہ چارلس اسے گھیرنے کی کوشش کرے گا مگر چارلس نے ڈومنک وغیرہ کے پراسرار طریقے پر غائب ہو جانے کے سلسلے میں ایک دو سرسری سے سوالوں کے علاوہ کوئی بات نہیں کی۔ اس کے برعکس اس نے بیلے اور سیموئیل کو رات کے کھانے پر مدعو کر لیا۔ بیلے کوشش کے باوجود انکار نہ کر سکی۔ وہ اس وقت عجیب سی الجھن کا شکار تھی۔ دعوت قبول کر لینے کی صورت میں آئندہ بھی میل میلاپ کے جاری رہنے کا امکان تھا جبکہ صاف انکار کی صورت میں خدشہ تھا کہ چارلس اس کے بارے میں مشکوک ہو جائے گا یہی سوچ کر اس نے دعوت قبول کر لی تھی لیکن اس کے بعد اس نے معمول بنا لیا کہ رات کو دروازہ مقفل کر کے اس کے سامنے بھاری فرنیچر کا ڈھیر لگا دیتی اور سونے سے پہلے ویلیم کی دو تین گولیاں نگل لیتی تاکہ چند گھنٹوں کے لیے سکون کی نیند لے سکے۔

وہ مارچ کے شروع کے دن تھے۔ رات اپنا نصف سفر طے کر چکی تھی۔ بیلے گہری نیند میں تھی لیکن دفعتاً اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے نیند ہی میں یہ احساس ہوا تھا۔ جیسے دروازے پر دستک دی جا رہی ہو۔ اس نے متوحش نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ گہرا سناٹا طاری تھا۔ وہ اپنا وہم سمجھ کر دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ اس کا واہمہ نہیں تھا۔ اس مرتبہ دروازے پر دستک کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ سیموئیل موجود نہیں تھا اور دفعتاً اسے خیال آگیا کہ سیموئیل ابھی تک ڈیوٹی سے واپس نہیں آیا تھا۔ وہ عام طور پر آدھی رات کے لگ بھگ ہی لوٹا کرتا تھا۔ دروازے کی ایک چابی اس کے پاس بھی موجود رہتی تھی اور وہ بیلے کو جگائے بغیر دروازہ کھول لیا کرتا تھا لیکن لگتا تھا کہ آج وہ اپنی چابی لے جانا بھول گیا تھا جس کی وجہ سے اسے دروازہ کھلوانے کے لیے دستک دینے کی ضرورت پیش آئی تھی۔

بیلے نے بستر سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا لیکن احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے وہ زنجیر نہیں ہٹائی تھی جو دروازے کے پوری طرح وا ہونے میں مانع تھی۔ دروازے کے سامنے سیموئیل کے بجائے ایک اجنبی کو دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خوف یکدم ہی اس پر غالب آ گیا تھا اور وہ بڑی مشکل سے اپنی چیخ روک سکی تھی۔ اسے اس طرح بدحواس دیکھ کر اجنبی کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ آگئی اور اس نے جلدی سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔

"گھبراؤ نہیں۔" وہ شخص دوستانہ لہجے میں بولا۔ "میں تم لوگوں کی مدد کے لیے آیا ہوں۔ پانچ منٹ کے اندر اندر تیار ہو جاؤ۔ تاکہ تمھیں اور تمھارے شوہر کو کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دیا جائے۔"

بیلے پھٹی پھٹی سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ خوف کی شدّت سے اس کے منہ سے کوئی بات تک نہیں نکل رہی تھی۔ اجنبی نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ وہ اس کی الجھن دور کرنے کے لیے بدستور دوستانہ لہجے میں بولا۔

"ہم نے تمھاری باتوں پر یقین کر لیا ہے اور وقت آ گیا ہے کہ اس دہشت گردی کو روکنے کے لیے کوئی ٹھوس قدم اٹھایا جائے۔"

اس شخص کے اطمینان دلانے کے باوجود بیلے نے اس وقت تک دروازہ پوری طرح نہیں کھولا جب تک کہ سیموئیل بھی نہیں پہنچ گیا اور پھر اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ کانت ہاؤس کے سامنے کھڑی ہوئی سیاہ رنگ کی ایک مرسیڈیز میں بیٹھ گئے جس نے انھیں بنکاک کے نواحی علاقے میں واقع ایک چھوٹے سے مکان میں پہنچا دیا۔ جہاں ایک خوبرو نوجوان نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔

"میرا نام ہرمن ہے۔" اس نوجوان نے اپنا شناختی کارڈ دکھاتے ہوئے تعارف کرایا۔ اس کے ایک مخبر نے ہی اسے بیلے اور سیموئیل کے بارے میں بتایا تھا کہ ہینک اور کارنیلیا کے بارے میں ان سے کچھ کارآمد باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔

ہرمن انھیں دوسرے کمرے میں لے گیا۔ جہاں تقریباً چھ آدمی پہلے ہی سے موجود تھے اور وہ سب کسی نہ کسی مغربی ملک کے سفارت خانے سے وابستہ تھے۔ مغربی ممالک کے ان جونیئر سفارت کاروں کا یہ گروہ ہرمن ہی کی کوششوں سے معرضِ وجود میں آیا تھا۔ جسے اس نے ایکشن کمیٹی کا نام دیا تھا۔

ہرمن اور اس کے ساتھی تقریباً دو دن تک ان سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ بیلے کو اپنی کہانی اس دوران کم از کم سو مرتبہ دہرانی پڑی تھی۔ اس نے ایلین گوتھر کی پراسرار سرگرمیوں کے علاوہ ان لوگوں کے بارے میں بھی بتایا جو اس کے فلیٹ میں آتے ہی پراسرار طور پر بیمار ہو جاتے تھے اور پھر اچانک ہی غائب ہوتے رہے تھے۔ بیلے نے اس ڈچ جوڑے کا تذکرہ بھی بڑی تفصیل سے کیا جو صرف ایک رات کے لیے ایلین کا مہمان بنا تھا اور جن کے بارے میں وہ دیر تک سوچتی رہی تھی اور اس کے ذہن میں بار بار یہ خیال کچوکے لگاتا رہا تھا کہ جب وہ ایلین کے فلیٹ میں گئی تھی تو وہاں اس جوڑے کو دیکھ کر بعد میں احساس ہوا تھا کہ مرد کے ہاتھ کرسی کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور پھر صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ دونوں اس فلیٹ سے غائب ہو چکے تھے۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ دونوں جا چکے ہیں لیکن بعد میں بیلے نے ان کے پاسپورٹ ایلین گوتھر کی تجوری میں دیکھے تھے۔

بیلے نے جب یہ بتایا کہ ایلین گوتھر کرسمس منانے کے لیے اچانک ہی کھٹمنڈو چلا گیا تھا تو ہرمن مضطربانہ انداز میں انگلیاں چٹخانے لگا۔ ایشیا کے تقریباً تمام بڑے بڑے انگریزی اخبارات کا مطالعہ بھی اس کے سفارتی فرائض میں شامل تھا۔ اسے اچانک ہی یاد آگیا کہ اس نے کسی اخبار میں نیپال میں قتل کی دو وارداتوں کے بارے میں کچھ پڑھا تھا اور یہ دسمبر ہی کی بات تھی۔

اس تعاون پر ہرمن نے بیلے کا شکریہ ادا کیا لیکن اس کے ساتھ ہی کمیٹی کے ایک ممبر نے بیلے سے سوال کیا کہ اس معاملے میں اس نے اب تک زبان کیوں بند رکھی تھی اور کسی ذمے دار شخص سے رابطہ قائم کیوں نہیں کیا تھا؟

"میں نے بہت کوشش کی تھی۔" بیلے نے کہا۔ "جنوری میں، میں نے برطانوی سفارت خانے سے رابطہ قائم کر کے ایک آفیسر کو اس خوفناک صورت حال سے آگاہ کیا تھا لیکن اس نے من گھڑت کہانی سمجھ کر میری بات پر کان نہیں دھرا۔ فرانسیسی سفارت خانے والوں کا رویّہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ برطانوی سفارت کار کو تو میں نے کارنیلیا کی ڈائری کا پھٹا ہوا ایک ورق بھی دکھایا تھا لیکن اس نے میری بات کو افسانہ سمجھ کر ٹال دیا۔"

بیلے کی بات سے ہرمن کو دکھ ہوا۔ کسی سفارت کار سے ایسی غیر ذمے داری کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی لیکن بیلے اس کے سامنے موجود تھی اور وہ حقیقت کو جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔ بیلے نے جو کچھ بھی بتایا تھا۔ وہ اگرچہ بہت کافی تھا لیکن تھائی پولیس کو قائل کرنے کے لیے کسی ٹھوس ثبوت کی ضرورت تھی۔

"ہمیں نہ صرف ان لوگوں کی تصویریں حاصل کرنا ہوں گی بلکہ فلیٹ میں ان کی لمحہ لمحہ سرگرمیوں پر بھی نگاہ رکھنا ہوگی۔" ہرمن

بیلے کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "مجھے احساس ہے کہ میں تم پر کچھ زیادہ ہی بوجھ ڈال رہا ہوں لیکن یہ کام تمھارے سوا کوئی اور کر بھی نہیں سکتا۔"

بیلے نے سیموئیل کی طرف دیکھا۔ صورتِ حال کی نزاکت کا احساس تو سیموئیل کو بھی تھا لیکن بے خطر اس معاملے میں کود پڑنے سے ان کی زندگیوں کو بھی خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔

"مجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہے لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ ایکشن کمیٹی ہمیں کیا تحفظ دے سکتی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہم، تم لوگوں سے زیادہ دور نہیں رہیں گے۔" ہرمن نے کہا۔ "اس کمرے میں موجود ایکشن کمیٹی کا کوئی بھی ممبر کسی قسم کی اطلاع ملنے پر پانچ منٹ کے اندر اندر تمھارے پاس پہنچ سکتا ہے یا کسی بھی سفارت خانے کے حفاظتی گارڈز کو بھیجا جاسکتا ہے۔"

"ہم ذرا تنہائی میں مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔" سیموئیل نے کہا اور تھوڑی دیر کے لیے انھیں تنہا چھوڑ دیا گیا۔ وہ دونوں میاں بیوی کھسر پھسر کرتے رہے۔ دور کھڑا ہوا ہرمن ان کے چہروں سے کسی قسم کے تاثرات کا اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

بیلے، ایکشن کمیٹی کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دینے پر آمادہ ہوگئی۔ اس کے اگلے چند روز نہایت مصروف گزرے وہ پانچویں منزل پر واقع ایلین گوتھر کے فلیٹ میں آنے جانے والے ہر شخص کے بارے میں معلومات ایک کاپی میں نوٹ کرتی رہی جب بھی کوئی مہمان اس فلیٹ میں جاتا۔ بیلے بھی کسی نہ کسی بہانے میری آندرے کے پاس پہنچ جاتی۔ اس دوران وہ بڑی باریک بینی سے ہر چیز کا جائزہ لیتی رہتی۔ اس نے ایلین گوتھر کے دونوں فلیٹوں کا ایک مکمل نقشہ بھی تیار کرلیا تھا جس میں سرخ نشانات کے ذریعے ان جگہوں کی نشاندہی کی گئی تھی جہاں ایلین گوتھر کی تجوری رکھی ہوئی تھی یا لکڑی کا وہ بکس رکھا تھا جس میں اس کے اندازے کے مطابق ان لوگوں کے سفری کاغذات وغیرہ بھرے ہوئے تھے جو چند روز ایلین گوتھر کے پاس مہمان رہنے کے بعد پراسرار طور پر غائب ہوگئے تھے۔

بیلے نے بالکونی میں ایک ایسی جگہ لانگ لینس والا کیمرہ بھی نصب کرلیا تھا۔ جہاں سے نہ صرف سوئمنگ پول اور اپارٹمنٹ ہاؤس کے مین گیٹ میں داخل ہونے والوں بلکہ گیراج میں آنے جانے والوں کی تصاویر بھی کھینچی جاسکتی تھیں۔ بیلے نے تالاب کے کنارے سن باتھ لیتی ہوئی میری آندرے کی کئی تصویریں کھینچ لی تھیں۔ اس نے اجے چودھری کی ایک دو تصویریں بھی کیمرے میں محفوظ کرلی تھیں لیکن ابھی تک وہ ایلین گوتھر کی کوئی تصویر کھینچنے میں کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔ وہ جب بھی ایلین کو فوکس میں لینے کی کوشش کرتی، حیرت انگیز طور پر وہ سامنے سے ہٹ جاتا۔ اب تک اس کی صرف ایک تصویر کھینچ سکی تھی لیکن وہ بھی اس قدر دھندلی اور نامکمل کہ اسے شناخت کرنا ممکن نہیں تھا۔

ایک روز ایلین گوتھر گیراج سے نکل رہا تھا کہ بالکونی میں چھپی ہوئی بیلے نے کیمرہ اس پر مرکوز کردیا۔ وہ اسے فوکس میں لے کر بٹن دبانا ہی چاہتی تھی کہ اس کا ہاتھ کپکپا گیا۔ ایلین اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ بیلے ایک جھٹکے سے سیدھی ہوگئی۔ ایلین کی نظریں اسی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ دوسرے ہی لمحے ایلین کو واپس آتے دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

بیلے نے کیمرہ چھپا دیا لیکن ایلین گوتھر اس کے فلیٹ میں نہیں آیا۔ اس دوپہر جب بیلے، آندرے کے فلیٹ میں بیٹھی باتیں کررہی تھی کہ ایلین گوتھر بھی اچانک پہنچ گیا۔ بیلے کا دل خوف کے باعث ہولے ہولے کپکپا رہا تھا لیکن ایلین گوتھر نے یہ تک دریافت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ صبح بالکونی میں کھڑی وہ کس کی تصویریں کھینچ رہی تھی۔

ہر رات بیلے اپنی کارگزاری کی رپورٹ ایکشن کمیٹی کو پیش کرتی۔ ایکشن کمیٹی کے اجلاس اب ہرمن کے گھر پر ہوا کرتے تھے۔ جہاں فلم کی ڈیولپنگ کا انتظام بھی موجود تھا۔ لیکن اس رات جب فلم ڈیولپ کی گئی تو بیلے یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس میں ایلین گوتھر کی تصویر نہیں تھی۔

ایلین گوتھر کے فلیٹ میں بیلے کی آمد و رفت بدستور جاری تھی۔ اس دوران اس نے محسوس کیا تھا کہ میری آندرے کچھ بدل رہی تھی۔ اب وہ اپنے اور ایلین کے بارے میں بہت کم زبان کھولتی تھی۔ ایلین سے بھی میری آندرے کا رویہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ ایک دن دوپہر کو بیلے کی موجودگی میں وہ دونوں آپس میں لڑ پڑے ایلین نے میری آندرے پر اپنے بکس میں سے چند قیمتی پتھروں کی چوری کا الزام لگایا تھا۔ جس کی میری آندرے نے تردید کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ حلق پھاڑتے ہوئے چیخی۔

"ہاں، میں نے چرائے ہیں تمھارے ہیرے۔ مجھے تمھارے ساتھ رہتے ہوئے ایک سال ہوچکا ہے لیکن تم نے مجھے مسلسل فریب اور دکھوں کے سوا کیا دیا ہے۔ اگر میں کینیڈا میں ہوتی تو میری ایک تنخواہ مقرر ہوتی لیکن یہاں دن رات غلاموں کی طرح کام کرنے کے باوجود میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں ہے۔ میں غلاموں کی سی زندگی بسر کررہی ہوں لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ ہاں میں نے ہیرے لیے ہیں اور آئندہ بھی جو کچھ ہاتھ لگا اسے اپنے قبضے میں کرلوں گی۔"

بیلے نے ایکشن کمیٹی کی اگلی میٹنگ میں جو رپورٹ پیش کی اس میں آندرے اور ایلین گوتھر کے اس جھگڑے کے علاوہ ان کے فلیٹ میں ایک نئے آدمی کی آمد کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ وہ ایک فرانسیسی بزنس مین جین ڈوسم تھا اور بیلے کے اندازے کے مطابق اس کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ چہرے پر افسردگی اور آنکھوں میں بھی اداسی کی جھلک نمایاں تھی۔

جین ڈوسم سے بیلے کی ملاقات اگرچہ چند منٹ تک ہی محدود رہی تھی مگر اس مختصر سی مدت میں ہی وہ اس کے بارے میں چند باتیں معلوم کرنے میں کامیاب ہوچکی تھی وہ پیرس میں مکانوں کی خرید و فروخت کا منافع بخش کاروبار کررہا تھا۔ اس کی ایک عدد خوبصورت بیوی اور دو بچے بھی تھے۔ اگرچہ اس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں۔ وہ چاہتا تو بنکاک کے کسی بھی بڑے ہوٹل میں قیام کرسکتا تھا لیکن بقول اس کے اس نے ایلین کے اخلاق سے متاثر ہوکر اس کے فلیٹ میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ وہ دونوں اکثر اکیلے ہی کاروباری سلسلے میں کہیں نکل جاتے۔

بیلے کے اندازے کے مطابق اجے چوہدری کو جین ڈوسم کی آمد اور مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔ کیونکہ اس کے آجانے سے اس کی اپنی اہمیت کم ہوگئی تھی۔ چارلس بھی اب مختلف معاملات میں جین ڈوسم کو ترجیح دینے لگا تھا۔ ڈوسم دراصل آرٹس سے متعلق کچھ چیزیں خریدنے کے لیے بنکاک آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر مشرقی فن کے شہ پاروں کا یہ بزنس منافع بخش ثابت ہوا تو مکانوں کی خرید و فروخت کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی جاری رکھے گا۔ بنکاک میں ایک ہوٹل میں قیام کے دوران بار روم میں چارلس سوبھراج سے آمنا سامنا ہوگیا۔ اس پہلی ہی ملاقات میں چارلس نے بھرپور تاثر دیا تھا۔ اس نے جو منصوبے بنا رکھے تھے ان پر عمل کرتے ہوئے آدمی دنوں میں نہیں تو مہینوں میں لکھ پتی ضرور ہوسکتا تھا۔ وہ چارلس کے اسی سنہرے جال میں پھنس گیا اور پیرس واپس جانے کا ارادہ ترک کرکے بنکاک ہی میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ہوٹل کا کمرہ چھوڑ کر کانت ہاؤس منتقل ہوگیا تھا۔ نئے کاروبار کے سلسلے میں بنکاک کے سب سے بڑے کاروباری مرکز میں واقع ایک بلڈنگ میں دفتر حاصل کرنے کے لیے اس نے چارلس کو ایک بڑی رقم بھی مستعار دے دی تھی۔ دوسروں کی موجودگی میں ان دونوں کی گفتگو کبھی بھی سرگوشیوں سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ مارچ کے اوائل میں بیلے کے کان میں بھی یہ بھنک پڑ گئی کہ ایلین گوتھر عنقریب ایک بہت بڑے جیولرز اسٹور کے افتتاح کا پروگرام بنا رہا ہے۔

"مجھے حیرت ہے کہ جین ڈوسم جیسا شخص ایلین گوتھر کی باتوں میں کیسے آگیا ہے۔" ایک رات بیلے نے سیموئیل سے بات کرتے ہوئے کہا۔ "وہ ایک ذہین آدمی ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھتا ہے لیکن اس سے یہ حماقت کیسے ہوگئی؟"

"راتوں رات دولت مند بننے کی ہوس انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔" سیموئیل نے جواب دیا۔ "کسی کے پاس خواہ کتنی ہی ذہانت کیوں نہ ہو، وہ دولت کے فریب میں آجاتا ہے۔"

ہرمن کی نیندیں حرام ہوچکی تھیں۔ سوچ سوچ کر اس کا ذہن الجھتا جا رہا تھا اور راتیں جاگ کر گزرتیں۔ صبح جب اپنے سفارتی فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں دفتر آتا تو شب بیداری کے باعث اس کی آنکھیں سرخ اور چہرہ ستا ہوا ہوتا۔

بیلے کی کھینچی ہوئی بعض تصویریں ہرمن کے لیے بڑی کارآمد ثابت ہورہی تھیں۔ اس نے بیلے کو مشورہ دیا کہ پینتیس ایم۔ ایم کا کیمرہ ہر وقت اپنے ہینڈ بیگ میں چھپائے رکھے اور ایلین گوتھر کے فلیٹ کے اندرونی حصوں کی کچھ تصویریں کھینچنے کی کوشش کرے۔

دوسرے دن ایلین گوتھر جیسے ہی اپنے نئے دوست جین ڈوسم کے ساتھ کانت ہاؤس سے باہر نکلا۔ چند منٹ بعد ہی بیلے پانچویں منزل کے فلیٹ میں میری آندرے کے ساتھ بیٹھی کافی کی چسکیاں لے رہی تھی۔ چند چسکیاں لینے کے بعد وہ ٹائلٹ کے بہانے دوسرے کمرے میں گھس گئی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کرلیا اور ایک کونے میں ڈھیر کی صورت میں پڑی ہوئی مختلف

چیزوں کی تصویریں کھینچنے لگی۔ کیمرہ استعمال کرتے ہوئے اس کے ہاتھ واضح طور پر کپکپا رہے تھے۔

اس رات ہرمن کے مکان پر فلم ڈیولیپ ہوکر سامنے آئی تو بیلے اپنی کامیابی پر مسکرائے بغیر نہیں رہی تھی۔ تصویریں بہت صاف آئی تھیں۔ اس نے مختلف چیزوں کے ڈھیر والی تصویریں کارنیلیا کا ہینڈ بیگ شناخت کرلیا تھا۔

۱۰ مارچ کی صبح بیلے جیسے ہی پانچویں منزل کے فلیٹ میں داخل ہوئی چارلس سے ٹکراتے بچی۔ وہ بڑی عجلت میں دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ جاتے ہوئے وہ میری آندرے کو غالباً کسی ریزرویشن کے سلسلے میں کچھ بتا رہا تھا۔

"تم لوگ کہیں جارہے ہو کیا؟" بیلے نے کچھ دیر بعد میری آندرے سے پوچھنے کی کوشش کی۔

"کیا کہہ سکتی ہوں؟" میری آندرے کے لہجے میں تلخی تھی۔ "ہر آدھے گھنٹے میں وہ دس مرتبہ اپنے پروگرام بدلتا ہے۔ ابھی وہ ملائشیا میں چند روز کی چھٹیوں کا پروگرام بنا کر نکلا ہے لیکن اس کی بات پر یقین تو اسی وقت کرسکتی ہوں جب جہاز ہمیں لے کر ٹیک آف کر جائے گا۔"

بیلے وہاں چند منٹ سے زیادہ نہ رک سکی۔ ایک ضروری کام یاد آجانے کا بہانہ کرکے میری آندرے کے فلیٹ سے نکل کر اپنے فلیٹ میں آگئی اور اس کے چند منٹ بعد وہ پیدل ہی تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی ہرمن کو ان کے اس پروگرام کی اطلاع دینے کے لیے ہالینڈ کے سفارتخانے کی طرف جارہی تھی۔

یہ اطلاع ہرمن کو چونکا دینے کے لیے کافی تھی۔ اس کے پاس چارلس کے خلاف اگرچہ خاصا مواد جمع ہوچکا تھا لیکن کوئی ٹھوس اور ناقابلِ تردید ثبوت اب بھی نہیں تھا جس کی بنیاد پر کسی کے گلے میں پھندہ ڈالا جاسکتا۔ لیکن اس کے خیال میں ایلین گوتھر پر ہاتھ ڈالنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ اسے نکل جانے کا موقع فراہم کرکے ممکن ہے اسے اپنی اس حماقت پر کفِ افسوس ملنا پڑتا۔ یہ سوچتے ہی اس نے تھائی پولیس کے کرائم بیورو سے فون پر رابطہ قائم کیا اور چند سیکنڈ بعد ہی وہ پُروقار اور ٹھوس لہجے میں جنرل سُوؤِت سے باتیں کرتے ہوئے اسے بتا رہا تھا کہ قاتلوں کا ایک گروہ تھائی لینڈ میں خوفناک سرگرمیوں میں مصروف ہے جن کے ہاتھوں نہ صرف غیر ملکی سیاح اپنی جانیں کھو رہے ہیں بلکہ تھائی لینڈ کی سیاحت کی صنعت بھی بُری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ جنرل سُوؤِت اس کی باتوں سے صرف اس حد تک متاثر ہوا کہ اس نے اپنے دو جونیئر آفیسروں کو اس کے پاس بھیج دیا جنھوں نے بڑی توجہ سے اس کی باتیں سنیں۔ ہرمن نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ کے علاوہ بیلے کی کھینچی ہوئی تصویریں اور کارنیلیا اور ہینک بنٹانجا کی لاشوں سے متعلق رپورٹیں بھی دکھائیں اور بالآخر وہ ان دونوں جونیئر آفیسروں کو قائل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

"میرا مشورہ ہے کہ ان لوگوں کو فرار کا موقع دینے سے پہلے ہی گرفتار کرلیا جائے۔" ہرمن نے آخر میں کہا۔

اور پھر وہ رات ان کے لیے بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ ہرمن اپنی ایکشن کمیٹی کے ممبروں کے تعاون سے تھائی پولیس آفیسروں کے ساتھ مختلف منصوبے بناتا رہا۔ انھیں یہ پتا ہی نہیں چل سکا تھا کہ رات کی تاریکی کب چھٹی اور صبح کی روشنی کب طلوع ہوئی تھی۔

دوسرے دن سہ پہر ٹھیک چار بجے سات پولیس والے کانٹ ہاؤس کی پانچویں منزل پر جانے کے لیے لفٹ میں سوار ہو رہے تھے۔

پولیس والوں کو دروازہ توڑنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ جب وہ پانچویں منزل پر پہنچے تو چارلس سوبھراج کے فلیٹ کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ ساتوں پولیس والے ریوالور تانے دروازے میں گھس گئے۔ اس وقت میری آندرے ایک کرسی پر بیٹھی فلسفے کی ایک کتاب پڑھ رہی تھی اور چارلس اپنی میز پر بیٹھا لیمپ کی روشنی میں چند قیمتی پتھروں کا معائنہ کر رہا تھا تاکہ ان کی قسم اور کوالٹی کا تعین کرسکے۔ پولیس کو دیکھ کر چارلس کے ذہن میں ایک دم ڈاکوؤں کا خیال ابھرا اور وہ کراٹے کا ایک خطرناک انداز اختیار کرتے ہوئے مقابلے کے لیے تیار ہوگیا لیکن جب ان میں سے ایک نے چیخ کر 'پولیس' کہا تو چارلس کے ہاتھ نیچے گر گئے اور وہ میری آندرے کی طرف مُڑ کر سرگوشیانہ انداز میں بڑبڑایا۔

"مجھے رابرٹ کے نام سے مخاطب کرنا۔"

چارلس نے اسی لمحے اپنی شخصیت تبدیل کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو رابرٹ گرینز کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتا تھا۔ رابرٹ گرینز وہی امریکی سیّاح تھا جسے وہ ہانگ کانگ کے شیرٹن ہوٹل میں بے ہوش کرکے پاسپورٹ سمیت اس کا سب کچھ لے اُڑا تھا۔

ریڈ کرنے والی پولیس پارٹی تقریباً تین گھنٹے تک فلیٹ کی تلاشی لیتی رہی۔ انھوں نے فلیٹ کو اس طرح تہہ و بالا کردیا جیسے چنگیز یا ہلاکو کا کوئی فوجی دستہ یہاں آن گھسا ہو۔ بیسیوں کاغذ کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔ انھوں نے نہ صرف بستروں کے گدّے تک اُدھیڑ ڈالے بلکہ باورچی خانے میں لگے ہوئے شیلف بھی اکھاڑ دیے۔ میری آندرے کرسی پر بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی اور چارلس پولیس کی اس کارروائی کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے بار بار احتجاج کے ساتھ ان سے سرچ وارنٹ کا مطالبہ کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو

ایک معزز امریکی شہری ظاہر کرکے پولیس کے خلاف چارہ جوئی کی دھمکی دینے سے بھی باز نہیں آیا لیکن پولیس والے اس کی باتوں پر کان دھرنے کے بجائے اپنی کارروائی میں مصروف رہے۔

شام سات بجے کے قریب چارلس کے پورٹیبل سیف سمیت انھیں پولیس اسٹیشن لے آیا گیا۔ فلیٹ میں تلاشی کے دوران پولیس والے کوشش کے باوجود اس سیف کو کھولنے میں کامیاب نہیں ہوسکے تھے۔ رات دس بجے ایک جونیئر پولیس آفیسر نے ہرمن سے فون پر رابطہ قائم کیا۔

"وہ لوگ گرفتار ہوئے یا نہیں؟" ہرمن نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

"وہ لوگ اس وقت یہاں موجود ہیں۔" دوسری طرف سے جواب ملا۔ "ایک عورت اور دو آدمی لیکن یہاں کی صورتِ حال خاصی پیچیدگی اختیار کرچکی ہے۔ آپ نے جس آدمی کو ایلین گوتھر بتایا تھا وہ تو رابرٹ پال گرینز نامی ایک امریکی نکلا۔"

"امریکی!" ہرمن کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔

"جی ہاں امریکی۔" پولیس آفیسر نے جواب دیا جو فون پر اس گفتگو کے ساتھ اپنے سامنے رکھے ہوئے پاسپورٹ کو بھی دیکھ رہا تھا جس پر جعلی ہونے کا شبہ تک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ "اس پاسپورٹ کے مطابق دسمبر میں جن دنوں بنکاک میں ہینک بنٹانجا اور کارنیلیا کو قتل کیا گیا تھا رابرٹ گرینز ان دنوں سری لنکا میں موجود تھا۔"

"تم لوگوں نے فلیٹ کی تلاشی بھی لی ہوگی۔ کچھ ملا؟" ہرمن نے پوچھا۔

"نہیں۔ ایسی کوئی چیز نہیں دستیاب ہوسکی جسے ان کے خلاف ثبوت کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ پاسپورٹ اصلی ہی ہے؟" ہرمن کے لہجے میں اب کچھ تلخی سی آگئی تھی۔

"ہم اس سلسلے میں مختلف ذرائع سے اپنا اطمینان کرچکے ہیں۔" دوسری طرف سے جواب ملا۔

ہرمن پر ایک بار پھر مایوسی طاری ہونے لگی۔ وہ کئی دنوں سے اس کیس پر کام کر رہا تھا۔ اس نے جو مضبوط قلعہ تعمیر کیا تھا۔ وہ ریت کا گھروندہ ثابت ہوا جو پانی کی پہلی لہر کے ساتھ ہی زمین بوس ہو رہا تھا۔

"یہ شخص چوری کے پاسپورٹس کے کاروبار اور ان کے استعمال کا ماہر ہے،" وہ فون پر تقریباً چیختے ہوئے بولا۔ "وہ اپنی شناخت اس طرح بدل لیتا ہے جیسے ہم دن میں دو مرتبہ کپڑے بدلتے ہیں۔ میرا مشورہ ہے بلکہ میں درخواست کروں گا کہ اس سلسلے میں مزید تحقیق کی جائے۔ امریکی سفارت خانے سے کسی کو بلا لو جو پاسپورٹ کی تصدیق کرسکے۔"

"ہم پاسپورٹ چیک کرچکے ہیں جناب!" پولیس آفیسر نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ "اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس وقت تو انھیں گھر جانے کی اجازت دے دی جائے اور پھر کل صبح اس معاملے کو آگے بڑھایا جائے۔"

ہرمن کے ہاتھ سے فون کا ریسیور گرتے گرتے بچا۔ "گھر جانے کی اجازت دے دی جائے؟" وہ چیخا۔ "میری یہ بات نوٹ کرلو کہ اگر ایک مرتبہ انھیں چھوڑ دیا گیا تو آئندہ ان کی صورت تک نہیں دیکھ سکو گے۔"

پولیس آفیسر صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے بتانے لگا کہ ان کے گھر سے لایا جانے والا پورٹیبل سیف ابھی تک نہیں کُھل سکا تھا۔ اس لیے یہ طے کیا گیا ہے کہ یہ لوگ کل صبح ساڑھے دس بجے تھانے پہنچ جائیں گے اور ان کی موجودگی میں کسی ماہر سے سیف کھلوایا جائے گا۔

"کیا تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ وہ لوگ کل صبح تھانے پہنچ جائیں گے؟" ہرمن کے لہجے میں طنز تھا۔ "کیا یہ ممکن نہیں کہ اس سیف میں دو چار سیر ہیروئن بھری ہوئی ہو یا اس میں ایسے دس بیس پاسپورٹ موجود ہوں جن کے مالکوں کو یہ لوگ ٹھکانے لگا چکے ہیں۔"

"یہ تینوں صبح تھانے پہنچ جائیں گے۔" پولیس آفیسر نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "انھوں نے وعدہ کیا ہے اور پھر ان کے پاسپورٹ ہمارے پاس رہیں گے۔ ظاہر ہے پاسپورٹ کے بغیر وہ کہیں نہیں جاسکیں گے۔"

ہرمن نے .... ایک اور کوشش کی۔ اس نے درخواست کی کہ کم از کم رابرٹ گرینز اور اس کی ساتھی کو اس وقت تک پولیس کی تحویل میں رکھا جائے جب تک کہ امریکی سفارتخانے کا کوئی آدمی ان کے پاسپورٹس کے اصلی ہونے کی تصدیق نہیں کردیتا لیکن پولیس آفیسر نے معذوری کا اظہار کردیا۔

"ان کی رہائی کا حکم جنرل سُوؤِت نے دیا ہے۔ ہم اپنے طور پر کچھ نہیں کرسکتے۔"

پولیس آفیسر کے اس جواب کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہوگیا۔

ہرمن نے بیلے کو بھی فون پر صورتِ حال سے آگاہ کردیا جس کے جواب میں بیلے نے انکشاف کیا کہ ایلین گوتھر اور اس کے ساتھی کانٹ ہاؤس واپس پہنچ چکے ہیں اور اس وقت بھی ان کے فلیٹ کی ساری بتیاں جل رہی ہیں۔ روشنی اس کے فلیٹ کی بالکونی سے بھی نظر آرہی ہے۔

"وہ لوگ غالباً ایسی چیزیں ضائع کر رہے ہیں جنھیں ان کے خلاف ثبوت کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہو۔" ہرمن کا لہجہ مایوس کن تھا۔

لیکن بیلے کو کسی ثبوت کی موجودگی یا اس کی تلفی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس پر شدید خوف طاری تھا اور وہ اپنے چاروں طرف خطرات کو رینگتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ اس نے گھر کا آدھے سے زیادہ فرنیچر ڈھیر کی صورت میں مقفل دروازے کے سامنے جمع کر رکھا تھا۔ اس نے کم از کم آج کی رات جاگتے رہنے کا فیصلہ کیا تھا اسی لیے وہ بار بار تیز و تلخ کافی پی رہی تھی تاکہ نیند آنکھوں کے قریب نہ پھٹک سکے۔ اس نے یہ بھی طے کر رکھا تھا کہ آج کی رات کسی گڑبڑ کے آثار نظر آئے تو کل پہلی دستیاب فلائٹ سے بنکاک کو خیرباد کہہ دے گی۔

دوسرے دن مقررہ وقت پر چارلس سوبھراج پُر وقار انداز میں چلتا ہوا پولیس اسٹیشن میں داخل ہوا میری آندرے اور... اجے چوہدری بھی اس کے ہمراہ تھے۔ ان کی موجودگی میں پولیس کے ایک ماہر نے تالا توڑ کر تجوری کھولی لیکن وہ کسی مفلس کی جیب کی طرح خالی تھی۔ اس میں ہیروئن یا پاسپورٹ تو کیا ایک تنکا تک نہیں تھا۔ اسی لمحہ چارلس، پولیس آفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا اب ہم جا سکتے ہیں؟" وہ کلائی پر بندھی ہوئی سونے کی گھڑی کے شیشے پر ہولے ہولے انگلی مارتے ہوئے بولا۔ "اب سے ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے ایک کاروباری میٹنگ پر جانا ہے اور میرا خیال ہے اب ہمیں یہاں روکے رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔"

ٹھیک اسی وقت ایک شخص پولیس اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا۔ وہ امریکی سفارت خانے کی ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی کا ایجنٹ سام آنسن تھا۔ اس شعبے میں سفارت خانے کے پاس تیس ایجنٹ تھے جو امریکہ اور یورپ کو ہیروئن کی اسمگلنگ کی روک تھام کے سلسلے میں چوبیس گھنٹے بنکاک کے گلی کوچوں میں گھومتے رہتے تھے۔

سام آنسن گہری نظروں سے رابرٹ پال گرینر کے پاسپورٹ کا جائزہ لے رہا تھا جس پر چارلس سوبھراج نے بڑی مہارت سے اپنی تصویر چسپاں کر رکھی تھی۔

سام آنسن، چارلس سے مختلف سوالات کرتا رہا اور چارلس بڑے پُرسکون انداز میں ہر سوال کا جواب دے رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک ماہرِ لسانیات ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کے والدین ایشیا سے امریکہ منتقل ہو گئے اور ان دنوں وہ امریکہ کی ریاست لووا میں مقیم تھا۔ اس نے اس بات پر ناراضگی کا اظہار کیا تھا کہ تھائی پولیس اسے بلاوجہ پریشان کر رہی ہے اور اب اپنے سفارت خانے کے ایک ذمے دار آفیسر کے آجانے سے اسے کچھ اطمینان ہوا تھا اور اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ اب اسے تھائی پولیس کے ہاتھوں مزید پریشانی نہیں اٹھانی پڑے گی۔

لیکن سام آنسن کی بازپرس کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

"لووا کے کسی شہر میں رہتے ہو؟" اس نے ایک اور سوال کیا۔

"اوک پارک۔" چارلس نے بلاجھجک جواب دیا۔ یہ تیر اس نے اگرچہ اندھیرے میں پھینکا تھا مگر عین نشانے پر لگا تھا۔ اس نے رابرٹ پال گرینر کے پاسپورٹ پر اس کے گھر کا پتا زبانی یاد کر رکھا تھا لیکن اس وقت کسی حد تک گڑبڑا جانے کے باعث وہ شہر کا نام بھول گیا تھا اور اوک پارک کا نام اس نے محض اندازے کی بنا پر ہی لے دیا تھا۔

"میرے خیال میں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔" سام آنسن اس کیس کے انچارج پولیس آفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "پاسپورٹ کی اصلیت مشکوک لگتی ہے۔ اس لیے ان لوگوں کو اس وقت تک روکنا ہے جب تک کہ پاسپورٹ سیل کا کوئی آدمی یہاں آکر پاسپورٹ کا معائنہ نہیں کر لیتا۔"

سام آنسن کے جانے کے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد جب امریکی سفارت خانے کے پاسپورٹ سیل کا ایک ماہر پولیس اسٹیشن پہنچا تو چارلس اور اس کے ساتھی غائب تھے۔ کچھ دیر پہلے انھیں دفتر کے باہر برآمدے میں پڑے ہوئے بینچ پر بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا گیا تھا۔ راہداری میں پولیس والوں اور دفتر کے اسٹاف کے علاوہ ان لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری تھی جو اپنی شکایات لے کر یہاں آرہے تھے۔ چارلس اور اس کے ساتھیوں کو اس راہداری میں بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہنا ایسا ہی تھا جیسے کسی پرندے سے یہ کہہ کر قفس کا دروازہ کھول دیا جائے کہ وہ اڑنے کی کوشش نہ کرے۔ چارلس اور اس کے ساتھیوں کو غائب پا کر ایک پولیس آفیسر نے بڑے اطمینان سے تبصرہ کیا کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے باہر نکل گئے ہوں گے اور جب ان کی تلاش شروع ہوئی تو وہ لوگ پولیس کی پہنچ سے بہت دور نکل چکے تھے۔

اس کے کئی روز بعد ایک روز فون کی گھنٹی بجنے پر بیلے نے جیسے ہی ریسیور اٹھایا دوسری طرف سے چارلس کی آواز سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ چارلس کی آواز پُرسکون اور لہجے میں دوستی کا عنصر نمایاں تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت ان دنوں ملائشیا میں ہے اور جب تک بنکاک کی صورت حال معمول پر نہیں آجاتی وہ گوشۂ گمنامی میں رہیں گے۔ بیلے کے دماغ میں

آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی چارلس کی باتیں سن رہی تھی۔

"تھائی لینڈ کے پولیس والے پاگل ہیں۔ انھوں نے مجھ پر غیر ملکی سیاحوں کو لوٹنے اور انھیں قتل کرنے کا الزام لگایا ہے۔ لیکن انھیں یہ نہیں معلوم کہ میں نے کتنے بیمار لوگوں کا علاج کر کے انھیں اذیت سے نجات دلائی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ کسی نے میرے بارے میں غلط رپورٹ لکھوائی ہو گی۔ بہرحال، ہم سب خیریت سے ہیں اور بہت جلد واپس آجائیں گے۔ میں نے 'گرینڈ شیف' کو کچھ رقم دی تھی تاکہ وہ ہمیں بھول جائے۔ مجھے یقین ہے کہ جب ہم واپس آجائیں گے تو ہمارا نام تھائی پولیس کے ذہن سے اتر چکا ہو گا۔"

بیلے کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ گرینڈ شیف کا لفظ پولیس کے ایک اعلیٰ رتبہ آفیسر کے لیے مخصوص تھا۔ چارلس نے گفتگو کے دوران یہ بھی بتایا کہ اسے پولیس سے نجات حاصل کرنے کے لیے پندرہ ہزار ڈالر کی قربانی دینا پڑی تھی اور بیلے کے خیال میں یہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ چارلس جیسے شخص کی گرفتاری کے لیے کئی مغربی سفارت خانوں کے سینئر آفیسر متحد ہو کر دن رات کام کرتے رہے تھے اور انھوں نے کیس کو پکے ہوئے پھل کی طرح پلیٹ میں سجا کر پولیس کے سامنے پیش کیا تھا اور تھائی پولیس نے بڑے اطمینان سے اسے نکل جانے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ اور اب پولیس والے لکیر کو پیٹنے کی کوشش کر رہے تھے جب کہ سانپ نکل چکا تھا۔

بیلے کی راتیں جاگ کر گزر رہی تھیں۔ اسے ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا کہ کسی بھی لمحہ اس کے فلیٹ کا دروازہ کھلے گا اور چارلس اندر گھس آئے گا۔ چند ہی روز بعد اسے دنیا کے مختلف مقامات سے چارلس کے بھیجے ہوئے ویو کارڈ ملنے لگے۔ کبھی سوئٹزر لینڈ، کبھی جرمنی اور کبھی اٹلی۔ ہر کارڈ میں چارلس اسے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی خیریت کی اطلاع دیتا اور یہ نوید بھی سناتا کہ وہ یورپ میں کامیابی سے اپنا 'کاروبار' جاری رکھے ہوئے ہے اور بہت جلد وہ بنکاک واپس آنے والا ہے۔

بیلے کو ملنے والے چارلس کے یہ ویو کارڈ ہرمن کے لیے اطمینان کا باعث تھے۔ ان خطوط کے ذریعے وہ کم از کم اس کی سرگرمیوں سے کسی حد تک آگاہ ہو رہا تھا۔ چارلس کے کاغذات میں اسے پیرس کے نواح میں رہنے والے جین ڈوسم کے گھر اور چارلس کی ماں سونگ کے پتے مل گئے تھے جو اپنے معذور شوہر کے ساتھ اب بھی مارسلز ہی میں مقیم تھی۔

"مجھے یقین ہے کہ اب وہ لوگ فرانس کا رخ کریں گے۔" ہرمن نے پُر وثوق لہجے میں کہا۔

بیلے نے اس کی رائے سے اختلاف نہیں کیا کیونکہ ایک مرتبہ چارلس نے اسے بتایا تھا کہ بعض ضروری کاغذات کی عدم موجودگی کے باوجود فرانس میں داخل ہونا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ چارلس نے اس کا طریقہ بھی بتایا تھا۔ شام آٹھ بجے کے لگ بھگ سوئٹزر لینڈ اور فرانس کی سرحد پر ٹریفک کا اژدہام رہتا تھا۔ اس وقت سرحدی چوکی کے محافظ آنے جانے والوں کے ضروری کاغذات چیک کرانا بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ کرائے کی کار کے ذریعے ایسے موقع پر نہایت آسانی سے فرانس کی سرحد میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔

ہرمن کا خیال تھا کہ چارلس کے بارے میں تھائی پولیس کو مزید کچھ بتانا بے کار ہو گا۔ ظاہر ہے بنکاک پولیس پیرس کی پولیس سے رابطہ قائم کرنے کی زحمت نہیں کرے گی۔ خوش قسمتی سے بیلے کا ایک پادری دوست انھی دنوں فرانس واپسی کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ ہرمن سے تعاون پر بھی آمادہ تھا۔ ہرمن نے اس کیس کی ایک تفصیلی رپورٹ اور ڈوسم اور چارلس کی ماں سونگ کے پتے اس کے حوالے کرتے ہوئے ہدایت کی کہ فرانس پہنچتے ہی یہ کاغذات پولیس کے حوالے کر دیے جائیں۔ یہ پتے بیلے ہی نے فلیٹ کی تلاشی کے دوران حاصل کیے تھے۔

پادری نے پیرس پہنچتے ہی ہرمن کی ہدایت کے مطابق یہ رپورٹ فرانسیسی پولیس کے حوالے کر دی لیکن یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ فرانسیسی پولیس نے نہ تو اس کیس میں دلچسپی کا اظہار کیا اور نہ ہی سونگ یا ڈوسم کے گھر والوں سے کسی قسم کا رابطہ قائم کرنا ضروری سمجھا۔

ہرمن کا یہ خیال سو فیصد درست ثابت ہوا کہ چارلس اب فرانس کا رخ کرے گا کیونکہ جن دنوں ہرمن کی رپورٹ فرانسیسی پولیس کے پاس پہنچی تھی ان دنوں چارلس، میری آندرے اور ڈوسم کے ہمراہ فرانس میں داخل ہو چکا تھا۔

بیلے اور سیموئیل بھی پیرس پہنچ گئے۔

بنکاک میں خوف و دہشت کی جو فضا قائم ہو چکی تھی۔ اس میں بیلے کو اپنا سانس گھٹتا ہوا سا محسوس ہونے لگا تھا۔ دماغ میں ہر وقت سنسناہٹ سی رہتی۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے چاروں طرف بدروحیں منڈلا رہی ہوں۔ تنہائی میں تو یہ احساس کچھ اور بھی شدت اختیار کر جاتا۔ چارلس کے خوف نے اس کا ذہن ماؤف کر رکھا تھا۔ ہرمن اور اس کے دوستوں نے اگرچہ اسے تحفظ کا یقین دلانے کی کوشش کی تھی مگر بیلے خوف کی اس فضا میں اب مزید ایک لمحہ رہنے کو بھی تیار نہیں تھی۔ مجبوراً سیموئیل کو بھی اس کے ساتھ واپس آنا پڑا۔

چارلس کے فلیٹ سے دستیاب ہونے والی پامسٹری کی وہ

کتاب بیلے ساتھ لے آئی تھی جو چارلس نے ہندوستان سے خریدی تھی اور اکثر اس کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ میری آندرے نے بتایا تھا کہ چارلس اسے بھی یہ کتاب پڑھنے پر مجبور کیا کرتا تھا۔ پیرس پہنچنے کے دوسرے ہی دن بیلے نے ایک ماہرِ روحانیات سے رابطہ قائم کیا اور کتاب اس کے حوالے کرتے ہوئے بولی۔

"میں اس کتاب کے مالک کے بارے میں تمھاری ماہرانہ رائے جاننا چاہتی ہوں۔"

ماہرِ روحانیات نے کتاب ہاتھ میں لے کر آنکھیں بند کر لیں لیکن چند ہی لمحوں بعد کتاب اس طرح ہاتھ سے پھینک دی جیسے وہ زہریلا بچھو ہو۔ اس کے چہرے پر خوف و ہراس کے عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"یہ کتاب فوراً ضائع کر دو۔ جلا دو یا اسے کالے کپڑے میں لپیٹ کر رکھو۔" بوڑھی ماہرِ روحانیات کپکپاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"لیکن ... تمھارا علم اس کتاب کے مالک کے بارے میں کیا کہتا ہے؟" بیلے نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"زنجیریں ....." ماہرِ روحانیات نے جواب دیا۔ "زنجیریں .... جیل اور .... جنگل .... سنسان جنگل ...."

"میں اس کتاب کے مالک کے مستقبل کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔" بیلے نے اصرار کیا۔

ماہرِ روحانیات کے چہرے کے تاثرات یکدم بدل گئے۔ وہ بیلے کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتی ہوئی دروازے تک لے آئی اور باہر کا راستہ دکھاتے ہوئے بولی۔ "موت۔"

بیلے کے لیے ماہرِ روحانیات کا یہ رویہ بڑا عجیب تھا۔ دوسرے دن اس نے ہینڈ رائٹنگ کے ایک ماہر سے رابطہ قائم کیا اور چارلس اور میری آندرے کی تحریریں دکھاتے ہوئے ان کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کی۔

"یہ شخص،" ہینڈ رائٹنگ کے ماہر نے چارلس کی تحریر کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ "بچپن اور لڑکپن میں کرب و اذیت کا شکار رہا ہے اور اب وہ پوری دنیا سے اپنی محرومیوں کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ اور یہ" اس نے میری آندرے کی تحریر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کسی عورت کی ہینڈ رائٹنگ ہے۔ یہ اگرچہ زیادہ انتہا پسند نہیں لیکن اب اسے بھی اخلاقی قدروں کا پاس نہیں رہا۔"

❦❦❦

بنکاک پولیس ہیڈ کوارٹرز کی عمارت سے نکلتے ہی چارلس اور اس کے ساتھیوں نے کرائے کی کار میں اس سڑک کا رخ کیا تھا جو بلند پہاڑوں میں سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی ملائشیا کی سرحد کی طرف چلی گئی تھی۔ سرحدی قصبے میں پہنچتے ہی انھوں نے کار چھوڑ دی۔ چارلس نے میری آندرے اور ڈوسم کو ہدایت کی کہ وہ پیدل چلتے ہوئے سرحد پار کریں۔

سرحد کے دوسری طرف وہ ایک بار پھر اکٹھے ہو گئے اور ٹیکسیوں اور بسوں میں طویل سفر کرتے ہوئے پینانگ پہنچ گئے۔ جہاں ایک ہفتے تک وہ فرضی ناموں سے ایک گھٹیا سے ہوٹل میں دبکے رہے۔ میری آندرے اور ڈوسم کا زیادہ وقت سوتے ہوئے گزرتا۔ شاید اس طرح وہ اپنے اعصاب کو مکمل طور پر سکون پہنچانا چاہتے تھے۔ دو تین روز کے آرام کے بعد میری آندرے واقعی کچھ سکون سا محسوس کرنے لگی مگر اس کا یہ سکون زیادہ عرصہ تک برقرار نہ رہ سکا کیونکہ یہاں ان کی آمد کے چوتھے ہی روز سوزی بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی لیکن میری آندرے کانٹوں پر لوٹنے لگی۔ چارلس نے اگرچہ آج تک اسے کچھ نہیں دیا تھا مگر وہ چارلس کے پاس کسی دوسری عورت کا وجود بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اسی روز چارلس سے الجھ پڑی۔

"تم نے مجھے جلانے کے لیے اس حرافہ کو بھی بلا لیا ہے۔" وہ چیختے ہوئے بولی۔ "آج تمھیں ہم دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ سوزی یا میں۔"

چارلس نے اس مرتبہ بھی وہی حربہ استعمال کرنے کی کوشش کی کہ سوزی صرف کاروبار میں معاونت کے لیے یہاں آئی ہے اس سے زیادہ اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں مگر اس بار یہ حربہ کارگر ثابت نہ ہو سکا اور اسے سوزی کو بنکاک واپس بھیجنا پڑا۔ سوزی کو روانہ کرتے وقت اس نے اسے ایک ریڈیو، کیمرہ، ایک قیمتی ہیرہ اور کچھ رقم دیتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ ...... چند روز بعد وہ بھی بنکاک پہنچ جائے گا۔

سوزی کے جانے کے دوسرے ہی دن اجے چوہدری آ دھمکا۔ اس کی آمد میری آندرے کے لیے حیرت انگیز تھی۔ بنکاک پولیس اسٹیشن سے فرار ہونے سے ایک دن پہلے چارلس نے اسے قیمتی پتھر خریدنے کے لیے شانتا بیری بھیجا تھا اور اسے ان کے فرار کا قطعی علم نہیں تھا لیکن جس طرح وہ سیدھا یہاں چلا آیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ چارلس کے پاس بے شمار وسائل تھے جنھیں استعمال کا طریقہ بھی وہ جانتا تھا۔ اجے چوہدری صرف چند جواہرات لانے میں کامیاب ہو سکا تھا اور وہ بھی متوسط کوالٹی کے۔ مگر چارلس کو اپنا کاروبار جاری رکھنے اور ایشیا کی پولیس کو فریب دینے کے لیے متوسط کوالٹی کے یہ چند پتھر بھی کافی تھے۔ چارلس نے انھیں بتایا کہ چند روز بعد ہی وہ یورپ پہنچ جائیں گے جہاں یہ پتھر کم از کم چالیس ہزار ڈالر میں فروخت ہو سکیں گے۔ چارلس نے میری آندرے سے وعدہ کیا تھا کہ یورپ پہنچتے ہی وہ کسی بھی ملک کے کینیڈین سفارت خانے سے اسے نیا پاسپورٹ لے دے گا۔

"اگر تم واقعی کینیڈا جانا چاہتی ہو تو اس مرتبہ میں تمھیں روکنے کی کوشش نہیں کروں گا۔"

چارلس کا یہ وعدہ میری آندرے کے لیے خوش آئند ثابت ہوا وہ نئے تصورات میں کھو گئی۔

یورپ کی طرف پرواز کرتے ہوئے میری آندرے پر انکشاف ہوا کہ اجے چوہدری ان کے ساتھ نہیں تھا۔ جین ڈوسم کے بارے میں تو وہ جانتی تھی کہ وہ الگ فلائٹ سے جا چکا ہے اور جنیوا میں ان سے ملے گا۔ لیکن اجے چوہدری کے ساتھ نہ ہونے سے اسے حیرت ہو رہی تھی۔ وہ تقریباً ایک سال سے ان کے ساتھ تھا اور میری آندرے اس سے کسی حد تک مانوس بھی ہو چکی تھی۔ اس نے جب چارلس سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے ٹالتے ہوئے اپنا چہرہ ایک کتاب کی آڑ میں چھپا لیا جسے وہ بہت دیر سے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اجے کہاں ہے؟" میری آندرے نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ایک رات پہلے اس نے چارلس اور اجے چوہدری کو رقم اور جواہرات کے لین دین کے سلسلے میں ایک دوسرے سے جھگڑتے ہوئے سنا تھا مگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ایسی باتیں روز کا معمول بن چکی تھیں۔

میری آندرے کے اصرار پر چارلس نے کتاب چہرے کے سامنے سے ہٹا کر خونخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اس قسم کے احمقانہ سوال کر کے اسے پریشان نہ کرے۔ میری آندرے کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اجے چوہدری بھی اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ ممکن ہے اس کی جلی ہوئی لاش ملائشیا کے کسی جنگل میں پڑی سڑ رہی ہو۔

❦❦❦

یورپ کے بجائے اپنے آپ کو کراچی کے ہوائی اڈے پر دیکھ کر میری آندرے حواس باختہ سی ہو گئی۔ اس کا ٹکٹ چارلس ہی کے پاس تھا اور چارلس نے اسے بتا تھا کہ وہ سیدھے یورپ جا رہے ہیں لیکن کراچی کے ہوائی اڈے پر طیارے سے اترتے دیکھ کر میری آندرے الجھ سی گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات چارلس کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ نہ رہ سکے۔ اس نے بتایا کہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں وہ صرف ایک دو دن یہاں رکیں گے پھر یورپ روانہ ہو جائیں گے۔ ان نازک لمحات پر میری آندرے نے چارلس سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا تھا کیونکہ چارلس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ کسی معمولی سی بات پر ناراض ہو کر وہ یورپ کا پروگرام ہی منسوخ کر دیتا۔

کراچی میں قیام کے لیے بھی چارلس نے ایک ایسے گھٹیا سے ہوٹل کا انتخاب کیا تھا جہاں چند اور ہپی بھی مقیم تھے لیکن خلافِ معمول یہاں چارلس نے ہپیوں کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ دن بھر شہر میں گھومتے رہتے۔ چارلس ایک دو مرتبہ میری آندرے کو ہوٹل میں چھوڑ کر کیماڑی کی بندرگاہ اور ائیرپورٹ بھی گیا تھا میری آندرے اس کی عدم موجودگی میں ہوٹل کے کمرے میں بند رہتی اور کبھی تنہائی سے گھبرا کر شہر کی سیر کو نکل جاتی۔

ایک دن چارلس اسے ہاکس بے لے گیا۔ شہر سے کئی میل دور ساحل کا یہ حصہ غیر ملکیوں کی توجہ کا مرکز تھا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے ہٹس تھے جو تقریباً سارے کے سارے کرائے پر اٹھے ہوئے تھے۔ ساحل پر مقامی باشندوں کی تعداد تو کم تھی البتہ غیر ملکی زیادہ تھے۔ چارلس چلتے چلتے اس غیر ملکی لڑکی کے پاس رک گیا جو گیلی ریت پر تولیا بچھائے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر پیراکی کا لباس تھا۔ وہ یقیناً خوبصورت تھی لیکن تنہا بھی اور حسبِ معمول چارلس کو اس سے تعارف حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

وہ میری ایلن ایتھر تھی جو کچھ عرصہ پہلے تک ایک نرس کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہی تھی لیکن محبت میں ناکام ہو کر یہ صدمہ بھلانے کے لیے آسٹریلیا چھوڑ کر مشرقی فضاؤں میں چلی آئی تھی اور کئی روز سے کراچی میں تھی۔ میری آندرے کو مقامی عورتوں کی طرح اس کی ناک میں سونے کی کیل دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ سر کی ذرا سی جنبش سے کیل کا ہیرہ چمک اٹھتا۔

ایلن ایتھر سے ملاقات پر میری آندرے نے چارلس سے شدید احتجاج کیا تھا مگر چارلس نے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا تھا کہ فی الحال وہ ایلن ایتھر سے زیادہ تعلق نہیں رکھے گا لیکن یورپ سے واپسی پر اسے کاروبار کے سلسلے میں ایلن جیسی لڑکی کی ضرورت پڑے گی اور چارلس کا خیال تھا کہ اگر ایلن ایتھر کو ڈھنگ کا لباس پہنا کر چند زیورات سے بھی آراستہ کر دیا جائے تو وہ بڑے بڑے صنعتکاروں اور وڈیروں کو بھی اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر سکتی ہے۔

ایلن ایتھر کے ہٹ میں چائے پیتے ہوئے چارلس نے اپنے کاروبار کا ذکر چھیڑ دیا۔ ایلن ایتھر بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے میری ایلن کو ملازمت کی پیشکش بھی کر دی۔

"فی الحال ہم ایک کاروباری دورے پر یورپ جا رہے ہیں۔" چارلس اس کی رضامندی پا کر بولا۔ "چند ہفتوں میں لوٹ آئیں گے۔ کیا اس وقت تم فوری طور پر ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہو سکتی ہو؟"

"میں تمھارا انتظار کروں گی۔" ایلن ایتھر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی جمع پونجی ختم ہو رہی تھی اور اسے واقعی کسی کام کی ضرورت تھی اور وہ اس غیر متوقع پیشکش کو ٹھکرا کر ایک اچھا موقع ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ایلن ایتھر سے بات پکی ہو چکی تھی۔ اس کے دوسرے دن

کراچی سے سوئٹیزرلینڈ کے لیے جہاز میں پرواز کرتے ہوئے چارلس کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ اس کی جیب میں چالیس ہزار ڈالر کی مالیت کے جواہرات تھے اور وہ کراچی میں ایک ایسی خوبصورت لڑکی کو اپنا منتظر چھوڑ آیا تھا جو کاروباری نقطۂ نگاہ سے اس کے لیے سونے کی چڑیا ثابت ہو سکتی تھی۔

چارلس اور میری آندرے چوری کردہ پاسپورٹس کے ذریعے سوئٹیزرلینڈ کی حدود میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے پاس کریڈٹ کارڈ بھی چوری کے تھے۔ چوری کے پاسپورٹوں پر چارلس نے اصل تصویریں ہٹا کر اپنی اور میری آندرے کی تصویریں اس مہارت سے چسپاں کی تھیں کہ ان کے بارے میں جعلی ہونے کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔ میری آندرے کے لیے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ حیرت کا جھٹکا تو اسے اس وقت لگا جب جین ڈوسم کو ایک نئی کار کے ساتھ ایئرپورٹ پر اپنا منتظر پایا۔ کار کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی شوروم سے نکلی ہو۔ جنیوا میں صرف ایک دن رکنے کے بعد چارلس دوسرے روز شام کے وقت اپنے مختصر سے قافلے کی رہنمائی کرتا ہوا فرانس کی حدود میں داخل ہوا۔

پیرس پہنچتے ہی چارلس نے سب سے پہلے فیلکس کو فون کیا۔ فیلکس کا تقریباً کئی سال سے چارلس سے کوئی رابطہ نہیں رہا تھا لیکن چارلس کی آواز پہچاننے میں اس نے کوئی غلطی نہیں کی۔ ایک لمحے کو تو وہ سکتے میں رہ گیا تھا۔ اس کے ذہن میں سب سے پہلے یہی سوال ابھرا تھا کہ چارلس فرانس کی حدود میں داخل کیسے ہوا تھا؟ اس کی فرانسیسی شہریت منسوخ کی جا چکی تھی اور متعدد جرائم کے سلسلے میں وہ اب بھی فرانسیسی پولیس کو مطلوب تھا۔ بہرحال فون پر رسمی سی گفتگو کے بعد فیلکس نے اسے فلیٹ پر آنے کی دعوت دی اور جب وہ میری آندرے کے ساتھ فلیٹ میں داخل ہوا تو فیلکس نے بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔

گفتگو کے دوران فیلکس نے بتایا کہ اس کا سوتیلا بھائی آندرے استنبول کی جیل سے رہا ہو کر فرانس آ گیا تھا۔ اسے اگرچہ اٹھارہ سال کی سزا ہوئی تھی لیکن چند ماہ بعد ہی ترکی کی نئی حکومت نے بعض قیدیوں کی عام رہائی کا حکم دے دیا تھا اور اس طرح آندرے کو بھی چند ماہ بعد نجات مل گئی تھی۔ لیکن فیلکس نے اس کی بیٹی شوبرا اور ماں سونگ کے بارے میں قطعی لاعلمی کا اظہار کیا تھا حالانکہ وہ ان کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ اس کا بھائی آندرے ان دنوں پیرس ہی میں موجود تھا اور ایک نئی زندگی اپنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا کہ پیرس میں قیام کے دوران چارلس کا آندرے سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ اسے خدشہ تھا کہ چارلس، آندرے کو بہکا کر دوبارہ غلط راستے پر نہ ڈال دے۔

"تمھاری زندگی کیسے گزر رہی ہے چارلس؟" فیلکس نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا "میں اصلیت جاننا چاہتا ہوں۔ مبالغہ آمیزی نہیں۔"

"میری زندگی الجھی ہوئی گتھی کی طرح پیچیدہ ہے۔" چارلس نے جواب دیا "بہت سے لوگ صرف مجھ پر انحصار کرتے ہیں، انھیں میری ضرورت ہے۔" اپنی اس بات میں مزید تاثر پیدا کرنے کے لیے اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور جین ڈوسم کے نمبر ڈائل کرنے کے بعد اسے ہدایت کی کہ وہ گاڑی لے کر آ جائے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے اور فیلکس کے درمیان بے اعتمادی کی خلیج حائل ہو چکی ہے جسے پاٹنا ممکن نہیں رہا۔

کچھ ہی دیر بعد میری آندرے بھی پہنچ گئی اور اس کے چند منٹ بعد ڈوسم گاڑی لے کر آ گیا۔ فلیٹ کے دروازے پر انھیں رخصت کر کے فیلکس کھڑکی میں کھڑا ہو گیا اور دیر تک چمکتی ہوئی سیڈان کو دیکھتا رہا جو لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ چارلس کی اب تک کی باتوں سے اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی تھی کہ شیطانی قوتیں اب بھی اسے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔

"خدا حافظ چارلس!" وہ گاڑی کو ایک موڑ پر نگاہوں سے اوجھل ہوتے دیکھ کر بڑبڑایا اور پھر سب سے پہلے اس کے ذہن میں جو خیال آیا وہ، یہ تھا کہ اسے پہلی فرصت میں فلیٹ کے دروازے کا تالا تبدیل کر دینا چاہیے۔

"ماما!"

"کون؟ تم کون بول رہے ہو؟" سونگ ریسیور پر وہ آواز سن کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ وہ کچھ دیر پہلے پائیں باغ میں لیمن کے پودوں کو پانی دے رہی تھی اور فون کی گھنٹی کی آواز سن کر اندر آئی تھی۔

"میں چارلس بول رہا ہوں ماں!"

سونگ کے ہاتھ سے فون کا ریسیور گرتے گرتے بچا۔ چارلس مارسلز کیسے پہنچ گیا؟ حقیقت تو یہ تھی کہ اس نے کئی برسوں سے چارلس کے بارے میں نہ تو کچھ سوچا تھا اور نہ ہی کچھ سنا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ چارلس کسی جیل میں پڑا سڑ رہا ہو گا۔

چارلس کی کال ریسیو کرنے کے فوراً ہی بعد اس نے لباس تبدیل کیا اور برآمدے میں کھڑی ہو کر سڑک پر دیکھنے لگی۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ ہی دیر بعد چمکتی ہوئی ایک سیڈان سڑک پر آ کر رکی۔ دروازہ کھلا اور چارلس نیچے اترا۔ قیمتی لباس میں وہ کسی کمپنی کا باس ہی لگ رہا تھا۔ وہ ہاتھ میں بریف کیس سنبھالے جیسے ہی آگے بڑھا سونگ بیٹے کو آغوش میں لینے کے لیے دوڑی لیکن

اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے پر عمل پیرا ہوتی، چارلس نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ میرے دوست بھی ہیں۔"

اس کے یہ بن بلائے مہمان تین دن تک دھرنا دیے بیٹھے رہے۔ یہ تین دن اس کی طویل زندگی کے بدترین دن ثابت ہوئے تھے۔ میری آندرے کو اس نے شروع ہی سے ناپسند کر دیا تھا۔ وہ دن بھر بستر پر لیٹی احکامات جاری کرتی رہتی۔ ان کے آنے سے گھر پر ایک عجیب ناگوار سی فضا طاری رہنے لگی تھی۔ اسے چاروں طرف سے سرگوشیاں سی سنائی دیتی رہتیں۔ چارلس کا انداز بھی بڑا پُراسرار تھا۔ وہ ہر وقت کمرے میں بیٹھا میری آندرے سے سرگوشیاں کرتا رہتا اور اگر اتفاق سے سونگ وہاں پہنچ جاتی تو وہ فوراً ہی گفتگو کا موضوع بدل دیتے۔ اس کے علاوہ سونگ نے ایک اور بات نوٹ کی تھی کہ چارلس کا زیادہ وقت مختلف لوگوں سے فون پر باتیں کرتے ہوئے گزرتا۔ اس کی باتوں میں بڑی بڑی رقموں، جواہرات اور مختلف ایئرلائنز کے شیڈول کا ذکر ضرور ہوتا۔ اس گروہ کا تیسرا رکن جین ڈوسم، چارلس سے قطعی مختلف تھا اور سونگ کو حیرت تھی کہ اس جیسا شریف النفس آدمی اپنے منافع بخش کاروبار اور بیوی بچوں کو نظرانداز کر کے چارلس جیسے خطرناک آدمی کا غلام کیوں بن گیا تھا۔

سونگ کے شوہر الفانسو کی حالت قابلِ رحم تھی۔ کمرے کے باہر کسی معمولی سی آواز سے بھی اسے اپنے دماغ پر ہتھوڑے سے برستے ہوئے محسوس ہوتے چہ جائیکہ تینوں بن بلائے مہمان دن رات ہنگامہ سا مچائے رکھتے۔ ان تین دنوں میں الفانسو پر کئی مرتبہ دورہ پڑ چکا تھا۔ سونگ تین دن تک تو یہ سب کچھ برداشت کرتی رہی لیکن چوتھے دن اس نے چارلس سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب وہ اپنے دوستوں کو لے کر یہاں سے رخصت ہو جائے۔ اس نے ایک اور بات بھی محسوس کی تھی کہ قیمتی لباس اور دروازے پر نئی گاڑی کے باوجود چارلس کی مالی حالت بہتر نہیں تھی۔ اس کا اندازہ اس نے اس بات سے بھی لگایا تھا کہ یہاں آنے کے دوسرے ہی روز میری آندرے نے لپ اسٹک وغیرہ خریدنے کے لیے سونگ سے بیس فرانک ادھار لیے تھے جن کی واپسی کی اسے توقع نہیں تھی۔ سونگ نے جب انھیں گھر چھوڑنے کو کہا تو چارلس ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"میرے لیے تمھارا یہ رویہ غیر متوقع نہیں ہے۔" وہ سونگ کو گھورتے ہوئے بولا "تمھیں مجھ سے کبھی بھی محبت نہیں رہی میرا بچپن بھی اس محرومی میں گزر گیا اور اب بھی میں تمھاری سوئی ہوئی ممتا کو نہیں جگا سکا۔"

"میں تمھیں اپنے تمام بچوں سے زیادہ چاہتی ہوں۔" سونگ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "لیکن تم نے کبھی مجھے ماں سمجھا ہی نہیں۔ تم نہیں جانتے میں نے تمھارے لیے کیسے کیسے دکھ اٹھائے ہیں۔"

"میرے لیے دکھ اٹھائے ہیں؟" چارلس کے ہونٹوں پر زہریلی سی مسکراہٹ آ گئی "ان دکھوں کا اندازہ میں بھی لگا سکتا ہوں۔ کیا یہ غلط ہے کہ تم نے سائیگون ہی میں مجھے لاوارث سمجھ کر پھینک دیا تھا۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا اور مجھے ممتا کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ تم ہمیشہ مجھے اجنبیت کا احساس دلاتی رہیں۔ مجھے کمرے میں رسیوں سے باندھ کر رکھا گیا۔ مجھ پر کوڑے برسائے گئے۔ یہی ہے نا تمھاری محبت؟ میں نے جب بھی تمھاری ضرورت محسوس کی تم نے مجھے کتے کی طرح دھتکار دیا۔ تمھاری اس محبت کو میں کس طرح بھول سکتا ہوں۔"

"تم فوراً اس گھر سے نکل جاؤ۔" سونگ دہاڑی۔ چارلس کی باتوں سے وہ بری طرح بجھ گئی تھی "اس سے پہلے کہ میں تمھیں اور تمھارے دوستوں کو یہاں سے نکالنے کے لیے پولیس کی مدد طلب کروں تم انھیں لے کر یہاں سے دفعہ ہو جاؤ۔"

اس سے پہلے کہ چارلس کوئی جواب دیتا میری آندرے آڑے آ گئی۔ اور کچھ دیر بعد جب وہ تینوں باہر کھڑی ہوئی سیڈان میں بیٹھ رہے تھے۔ سونگ ایک بار پھر چارلس کو مخاطب کرتے ہوئے چیخی۔

"آئندہ اس طرف آنے کی کوشش مت کرنا اور یہ بھول جاؤ کہ تمھاری کوئی ماں بھی ہے۔"

"کاش، واقعی میری ماں نہ ہوتی۔" چارلس نے بڑبڑاتے ہوئے جین ڈوسم کو اشارہ کیا اور سیڈان ایک زبردست جھٹکے سے حرکت میں آ گئی۔

اس واقعے کے چند روز بعد سونگ کو مارسلز کے ایک وکیل کا خط ملا جس میں انکشاف کیا گیا تھا کہ دو روز قبل شہر میں دھوکا دہی کی ایک واردات، جس میں ایک دولتمند عورت اپنی خطیر رقم سے محروم ہو چکی ہے، کے سلسلے میں چارلس سوبھراج نامی ایک شخص پولیس کو مطلوب ہے۔ اس کے بارے میں اگر کوئی خبر ہو تو فوری طور پر مطلع کیا جائے۔

سونگ نے وہ خط چھپا کر رکھ دیا تاکہ کسی اور کی نظروں میں نہ آ سکے۔ اور پھر وکیل کو جواب میں ایک مختصر سا خط لکھ دیا۔

"چارلس سوبھراج کا نام میرے لیے قطعی اجنبی ہے۔ ہمارے خاندان سے اس شخص کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

اُدھر پیرس میں دو دن گزارنے کے بعد جب چارلس اور اس کے ساتھی سیڈان میں ایک نواحی سڑک سے گزر رہے تھے کہ چارلس نے جین ڈوسم کو حکم دیا کہ سیڈان کا رُخ مشرق کی طرف موڑ دیا جائے۔ پچھلی سیٹ پر چارلس کے ساتھ بیٹھی ہوئی میری آندرے

نے چونک کراس کی طرف دیکھا اور گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں اور کنیڈا واپسی کے تصور کو ذہن سے کھرچنے کی کوشش کرنے لگی۔

ترکی اور ایران کے راستے ہوتے ہوئے تیسرے ہفتے کے اختتام پر وہ پاکستان پہنچ گئے۔ نئی سیڈان اس طویل سفر کے لیے بڑی آرام دہ ثابت ہوئی تھی۔ زاہدان سے پاکستانی سرحد میں داخل ہونے کے بعد کوئٹہ اور درّہ بولان سے گزرتے ہوئے سیڈان کراچی کی طرف جانے والی شاہراہ پر مڑ گئی۔

میری ایلن ایتھر ہاکس بے کے ساحل پر چارلس کی منتظر تھی وہ کراچی میں صرف دو دن رکے اور ایلن ایتھر کو لے کر نئے سفر پر روانہ ہو گئے۔ چارلس نے ایک بار پھر تھائی لینڈ کا پروگرام بنایا تھا۔

جین ڈوسم اور ایلن ایتھر پچھلی سیٹ پر تھے ـــ چارلس اسٹیئرنگ کے سامنے تھا اور میری آندرے پسنجر سیٹ پر بیٹھی ایشیا ویک' کے تازہ شمارے کا مطالعہ کر رہی تھی۔ کراچی سے نکلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد سپرہائی وے پر گاڑی رک گئی۔ سامنے گاڑیوں کی ایک لمبی قطار تھی اور چند پولیس والے ہر گاڑی کو چیک کر رہے تھے۔ میری آندرے نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا اور پھر میگزین کی طرف متوجہ ہو گئی۔ لیکن اگلا صفحہ پلٹتے ہی اسے رگوں میں اپنا خون منجمد ہوتا محسوس ہونے لگا۔ اس صفحے پر تاریخوں اور جگہوں کے حوالے سے تھائی لینڈ میں ان کے گھناؤنے کارناموں کی مکمل تفصیل درج تھی۔ اس مضمون کی ایک ذیلی سرخی نے میری آندرے کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔

”تھائی پولیس قتل، ڈکیتی اور رہزنی کی متعدد وارداتوں کے سلسلے میں ایلین گوتھر اور اس کی کنیڈین دوست مونیکا کو سرگرمی سے تلاش کر رہی ہے۔ ان کے بارے میں انٹرپول کو بھی مطلع کر دیا گیا ہے۔“

میری آندرے نے میگزین چارلس کے سامنے ڈال دیا۔ وہ مضمون پڑھتے ہوئے چارلس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نمودار نہیں ہوئے۔ مضمون پڑھنے کے بعد اس نے میگزین دوبارہ میری آندرے کی گود میں ڈال دیا اور محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔

”کیا یہ چیکنگ ؟“ میری آندرے خوف کی شدت سے جملہ مکمل نہ کر سکی ـــ

”احمقانہ باتیں مت کرو۔“ چارلس نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا تاکہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایلن ایتھر اور جین ڈوسم اس کی آواز نہ سن سکیں ”یہ چیکنگ معمول کے مطابق ہے۔ ممکن ہے محض کاغذات چیک کیے جا رہے ہوں اور یہ مضمون۔“ اس نے میگزین کی طرف اشارہ کیا۔

”جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اخبارات اور نیوز میگزین اپنی اشاعت بڑھانے کے لیے اس قسم کی سنسنی خیز خبریں چھاپتے رہتے ہیں۔“

”لیکن اس کے باوجود تھائی لینڈ کی حدود میں داخل ہونا ہمارے لیے خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔“ میری آندرے کے لہجے میں... تشویش تھی۔

چارلس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی ”نہ تو میرا اصل نام ایلین گوتھر ہے اور نہ ہی تم مونیکا ہو۔ ایسی صورت میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”لیکن میگزین میں شائع ہونے والی میری اور تمھاری ان تصویروں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں سرحد ہی پر دھر لیا جائے گا۔“

”مجھ پر اعتماد کرو۔“ چارلس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”یہ ایشیا ہے اور میں ایشیائی پولیس سے نمٹنے کے طور طریقے اچھی طرح جانتا ہوں۔“

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ روڈ بلاک سے نکل گئے۔ پولیس کو ایسے ڈاکوؤں کی تلاش تھی جو گزشتہ روز کراچی کا ایک بنک لوٹنے کے بعد روپوش ہو گئے تھے۔ غیر ملکیوں سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

لاہور سے ہندوستان کی سرحد میں داخل ہونے سے پہلے چارلس نے وہ میگزین اٹھا کر کار کی کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا۔ اس نے تھائی لینڈ کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا۔ اب اس نے چند روز ہندوستان ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ آرام کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ رقم بھی جمع کی جا سکے۔ یہ صورتِ حال چارلس کے لیے ایسی ہی تھی، جیسے راستے میں پتھر دیکھ کر آدمی راستہ بدل لیتا ہے۔ اس نے سوچا تھا کہ چند روز ہندوستان میں گزارنے کے بعد اگر بنکاک کی صورتِ حال معمول پر آ گئی تو وہ اس طرف کا رُخ کرے گا بصورتِ دیگر تائیوان اور فلپائن کے راستے تو اس کے لیے کھلے ہی تھے۔

میری آندرے ہندوستان میں بھی خطرہ محسوس کر رہی تھی۔ اس نے چارلس کو ہندوستان میں داخلے سے باز رکھنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن چارلس نے اس کے خدشات کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

”ہندوستان جیسے بڑے ملک میں ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ تمھارے ذہن پر تھکن سوار ہے۔ میرا خیال ہے تمھیں کچھ دیر کے لیے سو جانا چاہیے۔“ چارلس نے کہتے ہوئے سڑک پر نظریں جما دیں اور میری آندرے نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

تھائی پولیس سے مایوسی کے ساتھ ہی ہرمن اس ملک کے

پریس پر بھی نوحہ کناں تھا۔ کوئی یورپی ملک ہوتا تو اخبارات طوفان اُٹھا چکے ہوتے مگر ہینک اور کارنیلیا کے قتل کے بعد ڈیڑھ سال تک تھائی لینڈ کے اخبارات نے قتل کی ان بہیمانہ وارداتوں کے سلسلے میں ایک لفظ تک نہیں لکھا جس سے ہرمن اس نتیجے پر پہنچا کہ یہاں کی صحافت کا معیار یا تو اتنا کمتر تھا کہ اخبارات حالات سے قطعی بے خبر تھے یا وہ کسی دباؤ کے تحت اس موضوع پر قلم نہیں اٹھانا چاہتے تھے لیکن مئی ۱۹۷۶ء میں بنکاک پوسٹ کے ایک رپورٹر نے فون پر ہرمن سے رابطہ قائم کیا اس کا پہلا خیال درست ثابت ہوا یعنی اخبارات کو اب تک ان واقعات کا علم تک نہیں ہو سکا تھا۔ قتل کی ان وارداتوں کے ڈیڑھ سال بعد اخبار کے اس رپورٹر کو کہیں سے ہرمن کی ایکشن کمیٹی کی بھنک مل گئی تھی۔ وہ اپنے اخبار کے لیے ہرمن سے انٹرویو لینا چاہتا تھا۔ ہرمن کا شمار بھی ان سفارت کاروں میں ہوتا تھا جنھیں اخبارات کے ذریعے بیان بازی کا اختیار نہیں تھا لیکن اس کے باوجود اس نے بنکاک پوسٹ کے رپورٹر کو مایوس نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اخبارات میں خبروں کی اشاعت سے ایلین گوتھر اینڈ کمپنی کو کم از کم وارننگ تو مل ہی جائے گی اور ممکن ہے ایسی خبریں پڑھنے کے بعد غیر ملکی سیّاح بھی محتاط ہو جائیں۔ ۷ مئی کو بنکاک پوسٹ میں آٹھ کالموں پر مشتمل سنسنی خیز خبر شائع ہوئی جس نے تہلکہ مچا دیا۔ خبر میں اس امر کی نشاندہی بھی کی گئی تھی کہ ہینک اور کارنیلیا کے قتل کے بعد رات کو ایلین گوتھر جب کانٹ ہاؤس میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں پیٹرول کا ایک ڈبا بھی دیکھا گیا تھا۔

اس کے دو دن بعد بنکاک پوسٹ نے ایک اور سنسنی خیز خبر شائع کی جس کے مطابق وٹیالی حکیم، کارمائن کاروا اور جنیفر کے قتل میں بھی ایلین گوتھر کا ہاتھ ظاہر کیا گیا تھا۔ اس خبر کے ساتھ لاشوں کی جلی ہوئی تصویریں بھی شاملِ اشاعت تھیں۔ ان سنسنی خیز خبروں کی اشاعت سے بنکاک میں موجود غیر ملکی سیاح جوق در جوق واپسی کا رُخ کرنے لگے۔ اس سنگین صورتِ حال نے حکومت کو اس معاملے میں مداخلت کرنے پر مجبور کر دیا۔ فوراً ہی اعلیٰ سطح کا اجلاس بلایا گیا جس کے بعد پولیس چیف لیفٹیننٹ جنرل مونٹشائی نے اخباری نمائندوں کے سوالات کے جواب میں صرف ایک جملہ کہا۔

”یہ تھائی لینڈ کی تاریخ کا افسوسناک ترین واقعہ ہے۔ ہم نے فوری تحقیقات کا حکم دے دیا ہے۔“

تھائی پولیس نے یہ قدم اگرچہ بہت تاخیر سے اٹھایا تھا لیکن ہرمن بہرحال مطمئن تھا کہ اس کی بھاگ دوڑ کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ تو نکلا۔

کرنل سمپول سوتھیمائی، تھائی لینڈ کے جنوبی شہر چیانگ مائے میں چھٹیاں گزار رہا تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ جنرل کا ٹیلیگرام ملا کہ وہ دنیا کا ہر کام چھوڑ کر بنکاک پہنچ جائے تاکہ غیر ملکی سیاحوں کے قتل عام کا یہ کیس اس کے سپرد کیا جا سکے۔ اس کیس کی تحقیقات کے لیے کرنل سمپول کا انتخاب اس لحاظ سے باعثِ اطمینان تھا کہ تھائی لینڈ جیسے ملک میں جہاں بدعنوانیوں اور رشوت ستانی کا دور دورہ تھا، جہاں قومی بجٹ کا پندرہ سے بیس فیصد حصہ بدعنوان افسروں کی جیبوں میں منتقل ہو جاتا تھا، کرنل سمپول ایسا شخص تھا جس پر اس معاملے میں اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ وہ دیانتدار اور اُصول پرست آدمی تھا۔ سیاسی نقطۂ نگاہ سے اگر اس میں ذرا سی بھی لچک ہوتی تو وہ نہایت آسانی سے وزیرِ اعظم کے عہدے تک پہنچ سکتا تھا لیکن وہ اصولوں کے معاملے میں بڑا اکھڑ تھا اور جھکنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ ذہانت کے بل بوتے پر ترقی کرتا ہوا کرنل کے عہدے پر پہنچا تھا اسے تھائی لینڈ انٹرپول ڈویژن کا سربراہ ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔

سمپول کی عمر اگرچہ پینتالیس کے لگ بھگ تھی لیکن قابلِ رشک صحت کے باعث وہ اپنی عمر سے بہت کم نظر آتا تھا۔ اسے بلا مبالغہ نوجوانوں کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا تھا۔ مردانہ وجاہت کا ایک شاہکار مگر آنکھوں میں بے پناہ اُداسی۔ وہ نہ تمباکو نوشی کا عادی تھا اور نہ ہی شراب نوشی کو پسند کرتا تھا انگریزی اور فرانسیسی سمیت متعدد زبانیں اس روانی سے بولتا کہ اس پر اہلِ زبان ہونے کا شبہ

ہوتا۔ وہ منشیات کی اسمگلنگ کے سدباب اور بین الاقوامی فراڈ کے موضوعات پر لندن میں اسکاٹ لینڈ یارڈ اور نیویارک میں ایف بی آئی کے ماہرین سے تربیت بھی حاصل کر چکا تھا۔ جس روز چارلس سوبھراج اور میری آندرے کو پوچھ گچھ کے لیے پولیس اسٹیشن لایا گیا تھا، اس وقت اگر کرنل سمپول وہاں موجود ہوتا تو چارلس وغیرہ اتنی آسانی سے وہاں سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو پاتے لیکن ان کی قسمت ہی اچھی تھی کہ کرنل سمپول ان دنوں کسی اور کیس کے سلسلے میں شہر سے باہر تھا۔

تھائی لینڈ میں غیر ملکی سیاحوں کے قتل کی خبر کرنل سمپول کے لیے نئی نہیں تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اس سال کے شروع ہی میں اس کی فرانسیسی بیوی نیکول کو اپنے حلقۂ احباب سے اس قسم کی اطلاعات ملی تھیں کہ بنکاک میں بعض غیر ملکی سیاحوں کو بیدردی سے قتل کیا جا رہا ہے مگر پولیس نے قاتلوں کے خلاف ابھی تک کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ نیکول نے جب یہی بات سمپول سے پوچھی تو وہ محض سر ہلا کر رہ گیا تھا۔ اسے سب کچھ معلوم تھا لیکن وہ اپنے طور پر کچھ کرنے سے قاصر تھا۔

کرنل سمپول نے سب سے پہلے ہرمن سے رابطہ قائم کیا تھا۔ وہ اپنی تحقیقات کا آغاز اس کے بیان سے کرنا چاہتا تھا لیکن تھائی پولیس نے ہرمن کے ذہن پر کوئی مثبت تاثر نہیں چھوڑا تھا۔ پولیس کے چکر میں وہ پہلے ہی اپنا بہت سا وقت ضائع کر چکا تھا اور اس کے خیال میں یہ بھی وقت ضائع کرنے والی بات ہی تھی۔ وہ کرنل سمپول کے ساتھ بھی بڑی رکھائی سے پیش آیا۔

”ہم نے یہ کیس ایک پلیٹ میں سجا کر آپ کی پولیس کو پیش کیا تھا لیکن“ ہرمن نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ ”پولیس نے ان کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانے کے بجائے انھیں بڑی آسانی سے نکل جانے کا موقع فراہم کر دیا۔“ ہرمن نے اس شبہے کا اظہار بھی کیا تھا کہ اس معاملے کو دبانے کے لیے پولیس نے رشوت کھائی تھی۔ ”مجھے اب یہاں کی پولیس پر کوئی اعتماد نہیں رہا۔ اس لیے میں اب مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔“

”پلیز، مسٹر ہرمن!“ کرنل سمپول پرسکون لہجے میں بولا۔ ”تمھیں یہاں کی پولیس کے سلسلے میں جن تلخ تجربات سے دوچار ہونا پڑا ہے اس کا مجھے افسوس ہے۔ میں شروع سے اس کیس کی تحقیقات کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے تمھارا تعاون بہت ضروری ہے اور میں یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ اس مرتبہ تمھارا وقت رائیگاں نہیں جائے گا۔“

”لیکن۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ پولیس واقعی دیانتداری کا مظاہرہ کرے گی۔“ ہرمن کے لہجے کی تلخی بدستور تھی۔ اس کی نظریں کرنل سمپول کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ یہ پولیس افسر بھی اپنے ساتھیوں سے مختلف نہیں ہو سکتا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ہرمن کو...... اپنا یہ خیال بدلنا پڑا۔ اس کے خیال میں اس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور کرنل سمپول سے بھرپور تعاون پر آمادہ ہو گیا۔

کرنل سمپول چند روز تک ہرمن کی تیار کردہ فائل کا مطالعہ کرتا رہا جس میں اس کیس کے سلسلے کی ایک ایک تفصیل موجود تھی۔ بعض دستاویزات پڑھتے ہوئے سمپول جیسے شخص کے رونگٹے کھڑے ہو گئے وہ فوراً ہی جنرل مونسٹائی کے پاس پہنچ گیا۔

”یہ سب کچھ اگرچہ ناقابلِ یقین سا لگتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہرمن کی باتوں کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔“ وہ فائل جنرل کو دکھاتے ہوئے بولا۔ ”میرے خیال میں اب ہمیں حرکت میں آ جانا چاہیے۔ مزید تاخیر خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔“

”مجھے تم سے اتفاق ہے۔“ جنرل نے فائل کے سرسری سے مطالعے کے بعد کہا۔ ”مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”صرف آٹھ آدمی۔“ کرنل سمپول نے جواب دیا۔ ”پولیس فورس کے بہترین جوان۔ جن کا انتخاب میں خود کروں گا اور اس سلسلے میں کسی کی مداخلت کو بھی پسند نہیں کروں گا۔“

جنرل کے لیے کسی اعتراض کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ اس کے خیال میں سمپول ہی ایسا شخص تھا جس پر مکمل اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ اخبارات کے ذریعے اس کیس کو خاصی شہرت مل چکی تھی اور اعلیٰ فوجی افسران کی طرف سے اس پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ وہ ہر صورت میں ایلین گوتھر، مونیکا اور راجے چودھری کو جلد سے جلد آہنی سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتا تھا۔ اگر وہ لوگ ملک سے فرار ہو چکے تھے تو ان کی واپسی کے لیے وہ ہر قسم کے ذرائع استعمال کرنے کو تیار تھا۔ اس قسم کے خطرناک مجرموں سے نمٹنے کے لیے تھائی لینڈ کے قانون میں بڑی گنجائش موجود تھی۔ قانون کی ایک شق کے مطابق ایسے مجرموں کو مقدمہ چلائے بغیر فوری طور پر موت کی سزا دی جا سکتی تھی اور اس کا طریقہ کار یہ تھا کہ ایسے لوگوں کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیا جاتا۔

جون کے وسط میں اس قافلے نے مختصر سے عرصہ کے لیے دہلی میں قیام کیا جہاں ایلین ایتھر نے پہلی مرتبہ چارلس کی سرگرمیوں میں عملی طور پر حصہ لینا شروع کیا اس روز چارلس نے اسے بنا سنوار کر وائی ایم سی اے ہوٹل کی لابی میں بھیج دیا۔ متوسط درجے کے اس ہوٹل میں زیادہ تر غیر ملکی سیاحوں کی آمد و رفت تھی۔ پہلے ہی روز ایلین ایتھر تین فرانسیسی سیاحوں کو شکار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ انھوں نے کھانا اکٹھے ہی کھایا تھا لیکن کھانے کے فوراً ہی بعد تینوں فرانسیسی پیٹ میں گڑبڑ محسوس کرنے لگے۔ وہ ایلین ایتھر کو لے کر اپنے کمرے

میں آ گئے۔ ایلن ایتھر نے اپنے ہینڈ بیگ میں رکھی ہوئی دوا نکال کر تھوڑی تھوڑی مقدار میں ان تینوں کو کھلا دی اور یقین دلایا کہ اس دوا کے کھانے کے چند ہی منٹ بعد ان کے پیٹ کی تکلیف جاتی رہے گی۔

ایلن ایتھر کی دی ہوئی دوا کھانے کے بعد ان پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور چند منٹ بعد ہی وہ دنیا و مافیہا سے غافل ہو چکے تھے۔ چوبیس گھنٹے بعد جب اُن کی آنکھ کھلی تو تن کے کپڑوں کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔

ایلن ایتھر کے اس پہلے کارنامے سے حاصل ہونے والی رقم چند سو ڈالر سے زیادہ نہیں تھی لیکن چارلس نے زیادہ عرصے تک دہلی میں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور اس قافلے کو لے کر بمبئی پہنچ گیا۔ اپنے ساتھیوں کو ایک گھٹیا سے ہوٹل میں ٹھہرانے کے بعد کسی ایسے شکار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جس سے خسارہ پورا ہو سکنے کی توقع ہوتی۔ اس کی مالی حالت خاصی ناگفتہ بہ ہو چکی تھی اور تین افراد کا بوجھ اس کے کندھوں پر تھا۔

مختلف سڑکوں پر ٹہلتا اور ہوٹلوں میں تاک جھانک کرتا ہوا وہ ایک ایسے ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جو فلمی ستاروں کی آمد و رفت کے باعث پورے شہر میں معروف تھا۔ یہاں اگرچہ انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے ایکسٹرا قسم کے فنکار ہی آتے تھے لیکن شہر کے نوجوانوں کا خیال تھا کہ وہ اُنھی کے توسط سے انڈسٹری تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ فلموں میں کام کرنے کے شوقین نوجوان چوبیس گھنٹے یہاں جمع رہتے۔ اٹھنے بیٹھنے کے انداز سے کوئی اپنے آپ کو دلیپ کمار ثابت کرنے کی کوشش کرتا اور کوئی راجکپور۔ اس ریسٹورنٹ میں داخل ہونے والا ہر نوجوان دل میں یہ امید لے کر آتا کہ شاید وہ کسی فلمساز کی نظروں میں آ جائے۔

یہاں آنے والوں میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو اپنے آپ کو فلمساز یا ہدایتکار ظاہر کر کے نوجوانوں کو بیوقوف بنا کر ان کی جیبوں سے کچھ نہ کچھ نکلوانے کی کوشش کرتے رہتے۔

چارلس ایک میز پر بیٹھا گہری نظروں سے وہاں آنے جانے والوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ بالآخر اس کی نظریں ایک لڑکی پر جم گئیں جو اپنی میز پر تنہا بیٹھی بار بار چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ غالباً برطانوی تھی۔ خاصی حسین تھی لیکن اس کے لباس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بدحالی کا شکار ہے۔ چارلس چند لمحے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اٹھ کر اس کی میز پر آ گیا۔ حسبِ معمول تعارف حاصل کرنے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

اس کا نام باربرا اسمتھ تھا۔ عمر بمشکل بیس سال رہی ہو گی۔ اس کی زبان میں ہلکی سی لکنت تھی لیکن گفتگو میں اس سے کوئی ناگوار تاثر نہیں ملتا تھا۔ چارلس کے خیال میں وہ اس کے بزنس کی بساط کا ایک بہترین مہرہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اس نے اسی لمحے باربرا اسمتھ کو اپنی کمپنی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک لمبا تڑنگا غیر ملکی ان کی میز پر پہنچ گیا اور الجھی ہوئی نگاہوں سے چارلس کی طرف دیکھنے لگا لیکن باربرا نے جب اپنے اس نئے دوست کا تعارف کرایا تو وہ بڑی گرمجوشی سے چارلس سے ہاتھ ملاتے ہوئے ان کی باتوں میں شریک ہو گیا۔

باربرا اسمتھ ان دنوں ہو گے کوریگ کے ساتھ ہی رہ رہی تھی۔ کوریگ کا قد ساڑھے چھ فٹ سے کم تو کسی طرح نہیں رہا ہو گا۔ جسم بھاری بھرکم مگر افیون کی کثرتِ استعمال سے گال پچکے ہوئے اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ وہ بیلجیم کا باشندہ تھا جو تقریباً دس سال قبل ہندوستان کی سیاحت کے لیے آیا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ گوا کے ساحل پر گھومتے ہوئے اس نے ایک پرتگالی لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ لڑکی بھی غالباً کسی ایسے ہی آدمی کی تلاش میں تھی۔ کوریگ سے کمبل کی طرح ایسے لپٹی کہ اس کے لیے شادی کے سوا کوئی چارا نہ رہا۔ شادی کے بعد وہ گوا ہی میں آباد ہو گئے۔ کوریگ نے ساحل پر ایک جھونپڑا خرید کر چھوٹا سا ریسٹورنٹ کھول لیا جو بہت جلد ہپّی قسم کے سیاحوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ کوریگ صبح سے رات تک کولھو کے بیل کی طرح کام میں جتا رہتا جبکہ اس کی بیوی اطمینان سے بیٹھی حکم چلاتی رہتی۔

کوریگ کو اداکاری کا شوق تھا مگر ظاہر ہے گوا کے ساحل پر اس شوق کی تکمیل ممکن نہیں تھی۔ اسے جب بھی موقع ملتا بمبئی بھاگ آتا جہاں کسی فلم میں کوئی چھوٹا موٹا کردار مل جاتا۔

کوریگ کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہوتے ہی چارلس نے بھی اپنے اس منصوبے کا اعلان کر دیا کہ وہ ایک اسٹیج ڈرامے کے لیے مناسب چہروں کی تلاش میں ہے۔ اگر ڈرامہ کامیاب ہو گیا تو وہ فلمسازی کا آغاز کر دے گا۔ اس نے کوریگ اور باربرا کو اپنی کمپنی میں شمولیت کی پیشکش کر دی جسے انھوں نے فوراً ہی قبول کر لیا۔ ان میں سے کسی نے یہ پوچھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی کہ ڈرامے میں ان کا کردار کیا ہو گا۔

اس روز چارلس کے ساتھ ایک نئی لڑکی کو دیکھ کر میری آندرے کی بھویں تن گئیں۔ کمرے میں آتے ہی چارلس نے باربرا کو باتھ روم میں دھکیل دیا اور جب وہ نہا کر لباس تبدیل کر کے باہر نکلی تو اس کا حسن نکھر آیا تھا۔ دوسری کرسی پر ایلن ایتھر بیٹھی ہوئی تھی۔ میری آندرے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ ان دونوں میں زیادہ حسین کون تھی۔ ان کے سامنے

وہ اپنے آپ کو انتہائی کمتر محسوس کرنے لگی۔ وہ اکتیس سال کی ہو چکی تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اور اجڑا اجڑا سا چہرہ۔ ان دونوں خوبصورت لڑکیوں کی موجودگی میں وہ اپنے آپ کو سو سال کی بڑھیا محسوس کرنے لگی جس میں کسی کے لیے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔

بنکاک میں۔ کرنل سمپول اپنے ترتیب دیے ہوئے اسکواڈ کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ تھائی پولیس لوگوں کی نظروں میں اپنا اعتماد کھو چکی ہے۔ اس کیس میں کامیابی حاصل کر کے پولیس کا کھویا ہوا اعتماد بحال کرنا ہے۔

"ہم اسوقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک قاتلوں کے اس گروہ کو آہنی سلاخوں کے پیچھے نہ پہنچا دیں۔"

اگلے چند روز تک کرنل سمپول اور اس کے ساتھی انہی خطوط پر تحقیقات کرتے رہے جن پر ہرمن اور اس کے ساتھیوں نے رپورٹ مرتب کی تھی۔

مئی کے آخر میں تھائی لینڈ کی حکومت نے ایلین گوتھر، میری آندرے عرف مونیکا اور راجے چوہدری کے خلاف قتل، ڈکیتی، جعلسازی اور چوری و رہزنی کے الزام میں گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیے۔ یہ وارنٹ بیس سال کی مدت کے لیے کارآمد تھے۔ اس کے ساتھ ہی کرنل سمپول نے انٹرپول کے پیرس ہیڈکوارٹر کو ان تینوں کے بارے میں مطلع کرتے ہوئے درخواست کی کہ دنیا بھر کی پولیس کو ان کے بارے میں آگاہ کر دیا جائے۔

انٹرپول کے پیرس ہیڈکوارٹر سے کرنل سمپول کے اس ٹیلیگرام کی نقلیں فوری طور پر دنیا کے تمام دارالحکومتوں کو بھیج دی گئیں اور کرنل سمپول کو بھی اس کارروائی سے مطلع کر دیا گیا۔ انٹرپول سے پیغام ملتے ہی کرنل سمپول نے ہرمن کو صورتِ حال سے مطلع کر دینا ضروری سمجھا۔

"مجھے یقین ہے کہ اب وہ لوگ زیادہ عرصے تک روپوش نہیں رہ سکیں گے۔ ان کی گرفتاری کے لیے میں تم سے زیادہ بے چین ہوں۔"

کرنل سمپول اپنی اب تک کی کارکردگی سے مطمئن تھا لیکن اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اپنے دفتر میں بیٹھا متوقع نتائج کا انتظار کرتا رہے۔

چارلس سوبھراج کے گروہ میں شامل ہونے والی دونوں نئی لڑکیاں اس کے لیے کارآمد ہونے کے ساتھ مزاج میں ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھیں۔ میری ایلین ایتھر محبت کا فریب کھا چکی تھی۔ اس صدمے کو بھلانے ہی کے لیے اس نے اپنا وطن چھوڑ کر دنیا کی آوارہ گردی شروع کی تھی لیکن محبت کا یہ زخم مندمل ہونے کے بجائے ناسور کی طرح اس کے سینے میں پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ شاعری اور فلسفے کی کتابوں میں کھو کر اپنے اس دکھ کو بھلانے کی کوشش کرتی رہتی۔ باربرا اسمتھ اس لحاظ سے اس سے قطعی مختلف تھی کہ اسے ابھی تک ایسا کوئی روگ نہیں لگا تھا۔ اس کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔ اس کے مطالعے کا ذوق صرف ان اخبارات تک محدود تھا جن میں نئے شادی شدہ جوڑوں کی تصویریں بکثرت چھپتیں۔ وہ ان تصویروں کو دیکھ کر بچوں ہی کی طرح خوش ہوتی تھی۔

ایلین ایتھر کے برعکس باربرا لاابالی طبیعت کی تھی۔ اس کی ماں انگریز تھی اور باپ پاکستانی۔ باربرا کی پیدائش بھی پاکستان ہی میں ہوئی تھی لیکن وہ ابھی چند ماہ ہی کی تھی کہ ماں کا انتقال ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے باپ نے پاکستان چھوڑ دیا۔ وہ مختلف ممالک میں گھومتا ہوا بالآخر دوبارہ انگلینڈ پہنچ گیا۔ اس وقت باربرا کی عمر صرف تین سال تھی۔ وہ انگلینڈ میں بھی کسی ایک جگہ ٹک کر نہ بیٹھ سکے۔ وہ باپ کے ساتھ شہر بہ شہر گھومتی رہی۔ بالآخر جون ۱۹۷۵ء میں باربرا نے اپنے باپ کا ساتھ چھوڑ دیا اور چپکے سے فرانس جانے والی لانچ میں بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے کوئی مقصد نہیں تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ پیرس کے ایفل ٹاور کے قریب گھومتے ہوئے باربرا کی ملاقات کلفورڈ نامی ایک نوجوان لڑکے سے ہو گئی۔ جو اسے لیے ہوئے دو دن پیرس کی سڑکوں اور گلیوں میں گھومتا رہا۔ کلفورڈ نے بھی زندگی کے کسی راستے کا تعین نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں یورپ کے مختلف ممالک کی آوارہ گردی کرتے ہوئے مشرقِ وسطیٰ پہنچ گئے۔ وہاں چند روز ٹھوکریں کھانے کے بعد انھوں نے افغانستان کا رُخ کیا جہاں کابل میں وہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ کلفورڈ نے افغانستان ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا جبکہ باربرا درۂ خیبر سے پاکستان میں داخل ہو کر واہگہ کے راستے ہندوستان کی سرحد میں داخل ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کرے گی کیونکہ وہ انگلینڈ واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔

گوا کے ساحل پر پہنچ کر باربرا نے قدرے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ جگہ اسے پسند آئی تھی۔ اس نے ایک ہٹ کرائے پر لے لیا اور سکون سے دن گزارنے لگی۔

باربرا گوا میں بھی زیادہ دن نہیں رہ سکی۔ کرسمس کے فوراً ہی بعد گوا میں منشیات کے خلاف پولیس نے ایک زبردست مہم شروع کر دی۔ باربرا کے برطانوی دوستوں نے پڑاؤ اٹھا دیا اور باربرا نے بھی گوا کو خیرباد کہہ کر بمبئی کا رُخ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ عرصے بمبئی میں کام کر کے رقم جمع کرنے کے بعد تھائی لینڈ اور پھر

ملائشیا کی طرف نکل جائے گی لیکن اس دوران دو معمولی سے حادثے پیش آ گئے جنھوں نے باربرا کے ارادوں پر پانی پھیر دیا۔
بمبئی میں اس نے طلبہ کے ایک ہوسٹل میں قیام کیا تھا۔ ایک روز وہ نہانے کے لیے نچلے ہال میں واقع باتھ روم چلی گئی اور جب چند منٹ بعد واپس لوٹی تو اس کے ہینڈ بیگ سے تین سو ڈالر کی وہ رقم غائب تھی جو اس نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ تفصیلی جائزہ لینے پر انکشاف ہوا کہ اس کے سامان سے بعض اور قیمت چیزیں بھی غائب تھیں اور پھر اسی رات جب وہ سڑکوں پر ماری ماری پھر رہی تھی اچانک ہی باد و باراں کے طوفان نے گھیر لیا۔ وہ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگی۔ ہوسٹل پہنچنے پر یہ اندوہناک انکشاف ہوا کہ اس کا پاسپورٹ پانی میں بھیگ کر بیکار ہو چکا تھا۔ دوسرے دن وہ بھیگا ہوا پاسپورٹ لے کر... برطانوی سفارت خانے پہنچ گئی تاکہ نیا پاسپورٹ حاصل کر سکے لیکن جب نئے پاسپورٹ کے لیے ڈھائی سو روپے فیس کے طور پر طلب کیے گئے تو وہ مُنہ لٹکائے واپس آ گئی۔ اس کے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ اس روز پہلی مرتبہ باربرا کو احساس ہوا کہ ہندوستان جیسے ملک میں پیسے کے بغیر ایک قدم اٹھانا بھی ممکن نہیں ہے۔ اسی روز اتفاق سے اس کی ملاقات ہو گئے کوریگ سے ہو گئی جس نے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے اس کی تھوڑی بہت مدد کر دی — اس کے تیسرے روز وہ کوریگ کے ساتھ اس ریسٹورنٹ میں چائے پینے کے لیے ہی گئی تھی کہ چارلس سوبھراج سے ٹکراؤ ہو گیا۔
باربرا اور کوریگ سے ملاقات کے فوراً ہی بعد چارلس نے ایک نیا منصوبہ ترتیب دینا شروع کر دیا تھا جس میں کوریگ کو ایک ڈپلومیٹ کی حیثیت سے مرکزی کردار ادا کرنا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے اس کی ظاہری حالت پر توجہ دی جاتی۔ اور ظاہر ہے چارلس جیسا شخص ایسی باتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کوریگ کو تقریباً دو گھنٹے تک گرم پانی کے ٹب میں بٹھائے رکھا جس سے اس کی جلد کی رنگت نکھر آئی۔ باربرا نے اس کے بال خود کاٹے تھے اور اس کے لیے دو قیمتی سوٹ شہر کے بہترین درزی سے تیار کرائے تھے۔ جین ڈوسم کو اس کی ٹریننگ کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ یہ کٹھن ترین مرحلہ تھا۔ کسی ڈپلومیٹ کے لیے دو چار زبانیں جاننا ضروری تھا۔ کوریگ کو بھی انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی اور ہندی کے چند ضروری الفاظ سکھائے جانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ وہ بعض اوقات ان چاروں زبانوں کے الفاظ کو ایک ہی جملے میں سمونے کی کوشش کرتا۔ جین کئی روز تک اسے یہ سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ کسی جملے کی ادائیگی کس طرح ہونا چاہیے۔ بالآخر اس نے چارلس کو رپورٹ دی کہ کوریگ سے کام لیا جا سکتا ہے
بمبئی جیسے شہر میں ڈکیتی کے لیے تاج محل ہوٹل سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی جو تقریباً گزشتہ ایک صدی سے دولتمند سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس روز چارلس ہوٹل کے شاپنگ آرکیڈ میں واقع جیولری اسٹور کا جائزہ لینے کے لیے ہی لابی میں داخل ہوا تھا لیکن فوراً ہی ہوٹل کے ایک ہاؤس ڈیٹیکٹو کی نظروں میں آ گیا۔ چارلس نے بھی خطرے کو بھانپتے ہوئے فوراً ہی وہاں سے نکل جانے میں عافیت سمجھی تھی۔ ماضی میں بمبئی میں قیام کے دوران اس نے اکثر تاج محل کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائے رکھا تھا اور پہچان لیے جانے کا اندیشہ بہرحال موجود تھا۔
دوسرے ہی دن چارلس نے اپنے قافلے کو دہلی روانگی کا حکم دے دیا جہاں وہ پہلے ہی ۱۹۷۱ء میں اشوکا ہوٹل میں جواہرات کی ڈکیتی کے سلسلے میں پولیس کو مطلوب تھا۔ صرف چند ہفتے پہلے وہ وائی ایم سی اے ہوٹل میں تین فرانسیسی نوجوانوں کو لوٹنے کی واردات کا ارتکاب کر چکا تھا۔ اگرچہ ابھی تک اس واردات کا تعلق چارلس سے نہیں جوڑا جا سکا تھا لیکن اس کے باوجود اس کا دہلی جانے کا فیصلہ بڑا احمقانہ تھا مگر اسے اپنے اس کنبے کی پرورش کے لیے رقم کی ضرورت تھی اور اس کے خیال میں دہلی جیسے شہر میں رقم کے حصول کے مواقع موجود تھے۔
ایلین ایتھر اور باربرا کو ہوائی جہاز کے ذریعے ایک دو روز پہلے ہی دہلی بھیج دیا گیا جہاں چارلس کی ہدایت کے مطابق انھیں تھری اسٹار لودھی ہوٹل میں قیام کے ساتھ حالات پر بھی نگاہ رکھنا تھی۔ شہر میں جواہرات کی بڑی بڑی دکانوں، ہوٹلوں اور ان غیر ملکی سیاحوں پر نگاہ رکھنا بھی ان کی ڈیوٹی میں شامل تھا جو چارلس کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتے تھے۔
سیڈان کار میں چارلس، میری آندرے اور جین ڈوسم کے علاوہ بھاری بھرکم کوریگ بھی موجود تھا۔ سڑک کے راستے دہلی تک دو دن کا سفر تھا۔ وہ لوگ آگرہ پہنچ کر تاج محل کے قریب واقع ایک چھوٹے سے ہوٹل میں رک گئے تاکہ چند گھنٹے آرام کر سکیں۔ میری آندرے کی طبیعت خراب تھی اور وہ مسلسل طویل سفر کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔
دہلی میں ایلین ایتھر اور باربرا ان کی منتظر تھیں۔ ان دو دنوں میں وہ اگرچہ ایسے سیاحوں کا کھوج نہیں لگا سکی تھیں جو چارلس کے لیے عمدہ شکار ثابت ہو سکتے لیکن انھوں نے امپیریل ہوٹل کے شاپنگ آرکیڈ میں واقع ایک ایسے جیولری اسٹور کا سراغ لگا لیا تھا جو اس کمی کو پورا کر سکتا تھا۔ ہوٹل کے سامنے ایک وسیع و عریض خوبصورت لان بھی تھا جہاں شام کے وقت خاصی چہل پہل رہتی۔ غیر ملکی سیاحوں کے علاوہ شہر کے بعض امرا بھی اپنی بیگمات یا دوستوں

کے ساتھ یہاں چلے آتے تھے۔
ایلین ایتھر اور باربرا ہوٹل کے جیولری اسٹور میں جا چکی تھیں۔ انھوں نے شوکیسوں میں سجے ہوئے جواہرات دیکھتے ہوئے اسٹور کی انتظامیہ کو یہ تاثر دیا تھا کہ ان کا ایک ڈپلومیٹ دوست ایک دو روز میں دہلی آنے والا ہے جو لاکھوں روپے کی مالیت کے جواہرات خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ انھوں نے سرگوشیوں میں دکاندار کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ ان کا سفارتکار دوست شہرت کو پسند نہیں کرتا اس لیے اس کی آمد کو راز ہی میں رکھا جائے۔
ایلین ایتھر اور باربرا کی یہ کارکردگی چارلس کے لیے اطمینان بخش تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کا منصوبہ کامیاب ہو گا۔ یوں بھی اس کے پاس پیسے ختم ہو چکے تھے اور اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔
جون کا مہینہ اختتام پذیر تھا۔ قیامت خیز گرمی سے پورا شہر تنور کی طرح دہک رہا تھا۔ اس روز تھرمامیٹر کا پارہ ۱۱۴ کے ہندسے کو چھو رہا تھا اور چالیس افراد اس قیامت خیز گرمی کے باعث لقمۂ اجل بن چکے تھے۔ میری آندرے کی حالت بھی کچھ بہتر نہیں تھی۔ اس نے اس خدشے کا اظہار بھی کیا تھا کہ اگر ایسی ہی گرمی پڑتی رہی تو وہ چند روز سے زیادہ نہیں رہ سکے گی۔
"ٹھیک ہے تم کمرے میں آرام کرو۔" چارلس نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "ویسے بھی اب تم سے کوئی کام نہیں لیا جا سکتا۔"
کوریگ بھی گرمی کی شکایت کر رہا تھا۔ بمبئی تو وہ اکثر آتا رہتا تھا اور وہاں کے موسم سے بھی آشنا تھا اور اس کے خیال میں وہ ڈپلومیٹ کا رول بمبئی میں زیادہ بہتر ادا کر سکتا تھا لیکن دہلی میں گرمی کی شدت کے ساتھ ایک انجانا سا خوف بھی اس کے ذہن پر مسلط تھا۔ اس نے ایلین ایتھر اور باربرا کے سامنے اپنے اس خوف کا اظہار کیا تو وہ بھی سوچنے پر مجبور ہو گئیں۔ کوریگ کے یہ خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ وہ کسی طرف سے بھی ڈپلومیٹ نہیں لگتا تھا۔ نہ گفتگو سے نہ شکل و صورت سے اور نہ ہی انداز و اطوار سے۔ اس پر ستم یہ کہ جواہرات کے بارے میں اس کی معلومات بالکل صفر تھیں۔ اسے اگر پلاسٹک کا کوئی موتی تھما کر یہ کہا جاتا کہ یہ سچا موتی ہے تو وہ بلا جھجک اسے تسلیم کر سکتا تھا۔
چارلس تک جب یہ بات پہنچی تو اس کا دماغ گھوم گیا۔ وہ کوریگ پر اب تک اچھی خاصی رقم خرچ کر چکا تھا اور اسے اس طرح آسانی سے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ کوریگ کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ اسے کوئی خطرہ نہیں۔ اسے دکان میں داخل ہونے کے بعد صرف یہ تاثر دینا ہے کہ دولت اس کے گھر کی لونڈی ہے۔ اسے صرف اس وقت تک دکان میں رہنا ہے جب تک کہ چارلس نہیں پہنچ جاتا۔ اس دوران اسے زیادہ بولنے کی بھی ضرورت نہیں
ہو گی —
ایک دن صبح سویرے ہی میری آندرے نے چارلس کو بتایا کہ وہ کنیڈا ٹیلی فون کرنا چاہتی ہے کیونکہ اس کا باپ دل کا مریض ہے اور وہ گھر والوں سے اس کی خیریت معلوم کرنا چاہتی ہے۔ چارلس اس وقت کسی اور کام میں مصروف تھا اور ظاہر ہے وہ میری آندرے کے ساتھ ٹیلی فون آفس تک نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے میری آندرے پر یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ اس کی عدم موجودگی میں وہ کنیڈا فون نہیں کر سکتی تھی۔ چارلس کے انکار پر میری آندرے کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ چارلس کو پہلی مرتبہ اس پر ترس آ گیا اور اس نے کوریگ کو میری آندرے کے ساتھ کر دیا۔ کوریگ کو سختی سے ہدایت تھی کہ وہ فون بوتھ میں میری آندرے کو اکیلا نہ چھوڑے اور اس بات کا بھی خیال رکھے کہ وہ فون پر کوئی ایسی بات نہ کہنے پائے جو اُن کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہو مگر ٹیلی فون آفس پہنچتے ہی میری آندرے نے کسی طرح کوریگ کو آمادہ کر لیا کہ وہ فون بوتھ سے باہر رہے۔ چارلس کی ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کرنا کوریگ نے بھی ضروری نہیں سمجھا۔ وہ فون بوتھ کے باہر کھڑا سوچ رہا تھا کہ اسے بھی اپنی بیوی کو ٹیلی فون کرنے کا موقع

مل سکتا ہے یا نہیں۔ دفعتاً اس کی نظریں میری آندرے کے پرس پر جم گئیں جسے میری آندرے نگرانی کی ہدایت کرتے ہوئے کاؤنٹر پر ہی چھوڑ گئی تھی۔ کوریگ کی نیت بدل گئی اور اس نے فوراً ہی ایک فیصلہ کرلیا۔ اس میں نہ تو ڈپلومیٹ کا رول ادا کرنے کی صلاحیت تھی اور نہ ہی وہ جواہرات کی اس مجوزہ ڈکیتی میں حصّہ لینا چاہتا تھا۔ وہ ان کا ساتھ چھوڑ کر جلد سے جلد گوا پہنچنا چاہتا تھا مگر اس کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی اور اب اسے چارلس کے شکنجے سے نکلنے کا سنہری موقع مل رہا تھا۔ اس نے میری آندرے کا پرس اٹھالیا جس میں ایک سو پچاس ڈالر نقد، چار پاسپورٹ، ایک طلائی چین کے علاوہ ایک عدد قیمتی گھڑی بھی موجود تھی۔ وہ چند لمحے کن انکھیوں سے ٹیلی فون بوتھ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا ٹیلی فون آفس سے باہر نکل کر تیز تیز قدموں سے ایک طرف چلنے لگا۔ اس کا رُخ لودھی ہوٹل کی طرف تھا۔

کوریگ کو یقین تھا کہ اس کے تمام ساتھی دولتمند سیاحوں کی تلاش میں شہر کی سڑکوں پر گھوم رہے ہوں گے اور اسے لودھی ہوٹل میں کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا۔ اس کا یہ خیال درست نکلا۔ اس گروہ کا کوئی بھی شخص ہوٹل میں نہیں تھا۔ کوریگ نے ہر وہ چیز ایک سوٹ کیس میں جمع کرنا شروع کردی جو اس کے خیال میں قیمتی ہوسکتی تھی۔ ان میں چند سو ڈالر نقد، ایک کیمرہ، ایک ریڈیو اور چند ٹریولرز چیک بھی شامل تھے۔ اس نے سوٹ کیس ہاتھ میں لٹکایا اور عقبی دروازے سے باہر نکل گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک بس میں بیٹھا دہلی سے دور ہوتا جارہا تھا۔

چارلس کو رقم اور قیمتی اشیا کے کھو جانے کا افسوس نہیں تھا۔ اسے غصّہ تو اس بات پر آرہا تھا کہ کوریگ انھیں دھوکا دے کر بھاگا تھا۔ حالانکہ اس کے خیال میں کوریگ کو اس کی ضرورت تھی۔ وہ مختلف زبانوں میں گالیاں بکتے ہوئے اپنے غصّے کا اظہار کرتا رہا پھر دوسرے دن صبح سویرے ہی جین ڈوتم کو ساتھ لے کر کوریگ کی تلاش میں گوا روانہ ہوگیا۔

وہ دو دن تک گوا کے مختلف علاقوں میں کوریگ کو تلاش کرتے رہے مگر انھیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوسکی۔ کوریگ نے جس ساحل پر اپنی رہائش کا پتا بتایا تھا وہ بھی فرضی ثابت ہوا۔ بالآخر غصّے میں کھولتا ہوا چارلس دہلی واپس آگیا۔ وہ اپنے اس منصوبے پر اب تک تین ہزار ڈالر خرچ کرچکا تھا جس میں کوریگ کے لیے سوٹ اور دیگر اخراجات بھی شامل تھے اور اب نہ صرف اس کا منصوبہ خاک میں مل گیا تھا بلکہ اس کی مالی حالت بھی مخدوش ہوچکی تھی۔

چارلس جیسے ہی گوا سے رخصت ہوا کوریگ کو بھی پتا چل گیا کہ دو آدمی اسے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ کوریگ کو یقین تھا کہ وہ زندگی بھر روپوش نہیں رہ سکے گا۔ کسی نہ کسی دن اس کی گردن چارلس کی گرفت میں آ ہی جائے گی۔ وہ چند روز تک تو ساحل پر اپنے ایک خفیہ ٹھکانے میں دُبکا بیٹھا رہا پھر بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایک تفصیلی خط لکھا۔ لفافے پر دہلی کا پتا تحریر کیا اور کانپتے ہاتھوں سے لفافہ سپردِ ڈاک کردیا۔

انٹرپول اگرچہ بین الاقوامی پولیس کی تنظیم ہے لیکن یہ جان کر حیرت ہوگی کہ دنیا کی اس منظم ترین آرگنائزیشن کے پاس کسی مجرم کو گرفتار کرنے یا کسی مشتبہ شخص سے پوچھ گچھ کے اختیارات نہیں ہیں۔ نہ ہی اس کے سادہ پوش ایجنٹ تاک جھانک کرتے نظر آتے ہیں۔ البتہ اس تنظیم کے پاس ایسے سراغرسانوں کی کمی نہیں جن کا دائرۂ کار صرف تحقیقات تک محدود ہے۔ پال ڈلسرٹ کا شمار بھی انھی سراغرسانوں میں ہوتا ہے جو مئی ۱۹۷۶ء کے آخری ہفتے کی ایک صبح اپنی میز پر بیٹھا بنکاک سے آنے والے متعدد ٹیلی گرافک پیغامات کا جائزہ لے رہا تھا۔

پال ڈلسرٹ کچھ عرصے پہلے تک پیرس پولیس کے ہومی سائڈ شعبے سے وابستہ تھا۔ وہ قتل کے لاتعداد پیچیدہ کیسز حل کرچکا تھا۔ اس کی اس ذہانت کی بدولت ہی اس کی خدمات انٹرپول کو سونپی گئی تھیں۔ بنکاک سے موصول ہونے والے ان پیغامات پر کارروائی کی ابتدا اس نے اس طرح کی تھی کہ پیرس سے فلپائن تک ہر ملک کی پولیس کو قاتلوں کے اس گروہ کے بارے میں تفصیلات فراہم کرتے ہوئے اس نے یہ بھی پوچھا تھا کہ تھائی لینڈ کی طرح ان کے علاقوں میں تو اس قسم کی کوئی واردات رونما نہیں ہوئی تھی جسے ابھی تک حل نہ کیا جاسکا ہو؟ دنیا بھر کی پولیس کو پیغامات بھیجنے کے بعد اس نے کمپیوٹر کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ایلین گوتھر کے بارے میں کہیں کوئی ریکارڈ موجود ہے یا نہیں؟ کمپیوٹر کے مطابق انٹرپول کے ریکارڈ پر اس نام کے تین آدمی موجود تھے لیکن ان سب کی عمریں، حلیہ، قومیت اور دیگر تفصیلات اس ایلین گوتھر سے قطعی مختلف تھیں جو تھائی لینڈ کی پولیس کو مطلوب تھا۔

اگلے چند روز میں اپنے پیغام کے جواب میں پال ڈلسرٹ کو ہانگ کانگ، کھٹمنڈو، نئی دہلی اور کراچی سے اتنے ٹیلیگرام موصول ہوئے کہ وہ چکرا کر رہ گیا۔

انسپکٹر پال ڈلسرٹ کو پولیس میں خدمات انجام دیتے ہوئے پچیس برس ہوچکے تھے۔ اس دوران اس نے قتل کی ایسی پیچیدہ گتھیاں بھی سُلجھائی تھیں جنھیں ناقابلِ حل سمجھ کر نظرانداز کیا جاچکا تھا۔ اس کے دماغ میں اتنی یادداشتیں جمع ہوچکی تھیں کہ اس کے

محکمے کے لوگ اسے چلتا پھرتا کمپیوٹر کہہ کر مخاطب کرنے لگے تھے۔ اس نے میز پر رکھا ہوا پیڈ اپنے سامنے کھینچا اور اس پر مختلف نام لکھنے لگا۔ اس میں ان جرائم پیشہ افراد کے نام بھی شامل تھے جو لوگوں کو بے ہوش کرکے لوٹنے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ وہ ہر نام لکھنے کے بعد اپنے دماغ کے خانوں کو ٹٹولتا اور اگر اس نام کے مالک کا چہرہ مشرقی چہرے سے مختلف ہوتا تو وہ اس نام کو کاٹ دیتا۔ اس نے فہرست سے وہ نام بھی کاٹ دیے جن کا جعلی پاسپورٹوں کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بالآخر فہرست میں صرف چھ نام باقی رہ گئے۔ دن بھر کی مغزپچی کے بعد اس کی توجہ صرف ایک نام تک محدود ہو کر رہ گئی۔ یہی وہ نام تھا جو ایلین گوتھر کے بارے میں حاصل ہونے والی تفصیلات پر فٹ بیٹھتا تھا۔ پال ڈلسرٹ نے اپنے ایک ماتحت کو بلا کر اسے ایک خاص فائل لانے کا حکم دیا اور چند منٹ بعد جب فائل اس کی میز پر پہنچ گئی تو اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نام کے بارے میں اس کا اندازہ غلط نہیں نکلا تھا۔

فائل کے مطالعے سے انکشاف ہوا کہ انٹرپول نے ۱۹۷۳ء میں اس شخص کے بارے میں دنیا بھر کی پولیس سے کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ شخص متعدد نام اپنا چکا تھا جن میں بیشتر نام وہ تھے جن کے مالک اس کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتر چکے تھے۔ اس کے چہرے کے نقوش مشرقی تھے اور اس کی سرگرمیوں کا دائرہ پورے ایشیا پر محیط تھا اور اس کا اصل نام بھوانی گورمکھ سوبھراج تھا۔

یہ فائل یکم جولائی ۱۹۷۶ء کو انسپکٹر پال ڈلسرٹ کے سامنے آئی تھی۔ اس نے فوری طور پر کوئی قدم اٹھانے کے بجائے ایک دو دن مزید انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے اس کے بارے میں اچھی طرح سوچ لینے کا عادی تھا۔

ایلین ایتھر اور باربرا دہلی میں گھوم پھر کر شکار تلاش کررہی تھیں ان کا زیادہ وقت ایئرپورٹ لابی میں گزرتا جہاں غیرملکی خصوصاً فرانسیسی سیاح ان کی توجہ کا مرکز تھے۔ ایک ٹورسٹ انفارمیشن سنٹر سے انھیں یہ اطلاع ملی کہ فرانسیسی سیاحوں کا ایک بہت بڑا گروپ یکم جولائی کے لگ بھگ دہلی پہنچنے والا ہے۔ اطلاع کے مطابق اس گروپ میں تقریباً ساٹھ فرانسیسی عورتیں اور مرد شامل تھے۔ گوا سے واپسی پر جب چارلس کو یہ خبر سنائی گئی تو اس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک اٹھی تھیں۔

چارلس کے لیے یہ اطلاع ایسی ہی تھی جیسے کسی خزانے کی نشاندہی کردی گئی ہو لیکن اس جیسے شخص کے کاروبار میں روپے پیسے کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ آنے والے فرانسیسی سیاحوں پر جال پھینکنے کے لیے اسے خطیر رقم کی ضرورت تھی۔ سب سے پہلے اسے اپنے ساتھیوں کے لیے نئے لباس درکار تھے۔ ہوٹل کے بل ادا کرنے تھے، معقول تعداد میں قیمتی پتھر ہونا بھی بہت ضروری تھے اور یہ قیمتی پتھر فرانسیسی سیاحوں کے ہاتھوں فروخت کرنے کے لیے انھیں متاثر کرنا ضروری تھا۔ اس کا طریقہ یہی تھا کہ ان کی خاطر مدارات کی جاتی اور چند چھوٹے موٹے تحائف بھی پیش کیے جاتے بصورتِ دیگر انھیں ٹھگ سمجھ کر دھتکار دیا جاتا۔

چارلس اپنے ساتھیوں سمیت تقریباً روزانہ ہوٹل تبدیل کررہا تھا۔ بالآخر جون کے آخر میں یہ ٹولہ رنجیت ہوٹل پہنچ گیا۔ تھری اسٹار سہولتوں کے باعث یہ ہوٹل دوسروں سے قدرے بہتر تھا۔ رنجیت ہوٹل میں رہائش کے لیے انھوں نے فرضی نام استعمال کیے تھے۔ فرانسیسی سیاحوں کے گروپ کے آنے سے پہلے پہلے چارلس کم از کم ایک ایسی واردات ضرور کرنا چاہتا تھا جس سے معقول رقم ہاتھ آجاتی۔ اس کا یہ شکار بھی ایک فرانسیسی ہی ثابت ہوا۔

جین سولومن کی عمر پچیس سے زیادہ نہیں تھی۔ دُبلا پتلا سا پارلش نوجوان تھا۔ اس کا انتخاب کرنے کے بعد چارلس نے سولومن پر وہ سنہری جال پھینک دیا جس سے مرد نکلنا بھی چاہیں تو نہیں نکل سکتے۔ وہ اس وقت ہوٹل کے بار روم میں تھا کہ ایلین ایتھر اور باربرا نے اسے گھیر لیا۔ وہ جلد ہی ان دونوں سے بے تکلف ہوگیا۔ کچھ ہی دیر بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق چارلس بھی پہنچ گیا۔ وہ چاروں اس طرح گھل مل گئے جیسے بہت پُرانی شناسائی ہو۔ اور جب چارلس نے کناٹ سرکل کے ایک ریسٹورنٹ میں رات کے کھانے کی دعوت دی تو سولومن انکار نہ کرسکا۔ اتنے ہمدرد، خوش اخلاق میزبان اور دو حسین لڑکیوں کا ساتھ۔ وہ اس دعوت کو کس طرح مسترد کرسکتا تھا۔

ریسٹورنٹ میں کھانے کے دوران باربرا اور ایلین نے سولومن کو اپنی طرف متوجہ کیے رکھا اور چارلس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک مخصوص سیال کے چند قطرے سولومن کی پلیٹ میں انڈیل دیے۔ کھانے کے بعد بازار میں گھومتے ہوئے سولومن کی حالت بگڑنے لگی۔ پیٹ میں شدید مروڑ اٹھنے کے ساتھ اس پر غنودگی بھی حملہ آور ہورہی تھی۔ اسے جیسے تیسے کھینچ تان کر اس کے ہوٹل کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ سولومن پر نیم مدہوشی طاری تھی۔ دو دن بعد ہوٹل کی روم سروس کا ایک ملازم کمرے میں داخل ہوا تو سولومن برہنہ حالت میں بالکونی میں پڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ آگے کو پھیلا ہوا تھا جیسے کوئی مدد حاصل کرنا چاہتا ہو۔ زندگی سے سولومن کا رابطہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اسے فوری طور پر اسپتال پہنچا دیا گیا لیکن

اس شام غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی جین سولومن بھی موت کے اندھیروں میں گم ہو گیا۔

رقم ہاتھ آتے ہی چارلس اپنے ساتھیوں کو لے کر بڑی عجلت اور خاموشی سے ہوٹل سے نکل گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سیڈان میں لدے آگرہ کی طرف جا رہے تھے جہاں ساٹھ فرانسیسی سیاحوں پر مشتمل وہ گروپ تاج محل کی سیر کو آنے والا تھا۔

دہلی پولیس کی کرائمز برانچ کے سربراہ این۔ تُولی نے گھنٹی کی آواز سُن کر فون کا ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف کنیڈین سفارتخانے کا ایک آفیسر تھا جس سے تُولی کے دوستانہ مراسم بھی تھے۔

”ہمیں گوا سے ایک خط ملا ہے“ کنیڈین سفارتخانے کے آفیسر نے بتایا۔ ”میں تو اس سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکا ممکن ہے تم کچھ سمجھ سکو۔“

”ٹھیک ہے۔ خط بھجوا دو۔ میں دیکھ لوں گا۔“ تُولی نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

وہ ہو گے کوریگ کا خط تھا جس نے انگریزی، فرانسیسی، پُرتگالی اور ہندی زبانوں کے بیک وقت استعمال سے کنیڈا کے سفارتخانے کو دہلی میں موجود ایک خطرناک گروہ ”چارلس اینڈ کمپنی“ کے عزائم کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی تحریر اگرچہ الجھی ہوئی تھی لیکن پیغام واضح تھا۔ چارلس اور اس کے ساتھی ایک جیولری اسٹور کو لوٹنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ اس منصوبے میں ناکامی کی صورت میں وہ ایک بنک پر توجہ دیتے۔

پیغام اگرچہ واضح تھا لیکن سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ کوریگ نے یہ اطلاع دینے کے لیے پولیس کے بجائے دہلی میں کنیڈا کے سفارتخانے کا انتخاب کیوں کیا تھا؟ یوں بھی پولیس اور مختلف سرکاری محکموں کو اس قسم کے خطوط ملتے رہتے تھے۔ جنھیں عام طور پر ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا جاتا تھا مگر تُولی اس خط کو نظر انداز نہ کر سکا۔ اس کی چھٹی حس اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ تھائی لینڈ میں قتل کی پراسرار وارداتوں کے سلسلے میں انٹرپول کا ٹیلیگرام اسے مل چکا تھا لیکن اس وقت وہ اس خط اور انٹرپول کے ٹیلیگرام میں کوئی شعوری یا لاشعوری تعلق قائم نہیں کر سکا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک بات تھی کہ خط لکھنے والے شخص سے رابطہ قائم کیا جائے۔

دفتر کے ضروری کام نمٹانے کے بعد تُولی پہلی پرواز سے گوا روانہ ہو گیا۔ اس کا شمار ان لوگوں میں کیا جا سکتا تھا جو کسی بھی معاملے میں وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتے۔

پچاس سال کی عمر ہونے کے باوجود دُبلا پتلا تُولی نوجوانوں کی طرح چاق و چوبند نظر آتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر اگرچہ ہر وقت خفیف سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی لیکن آنکھوں کی چمک میں بڑا تضاد تھا۔ وہ کسی شخص کو ایک نظر دیکھتے ہی اس کے بارے میں بتا سکتا تھا کہ اس کا تعلق زندگی کے کس طبقے سے ہو سکتا ہے۔

گوا پہنچ کر تُولی کو کوریگ کا مکان تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ دستک کے جواب میں دروازہ کوریگ ہی نے کھولا تھا۔ ایک پولیس والے کو دیکھ کر کوریگ کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔ اس نے نہ صرف اپنے کوریگ ہونے سے انکار کر دیا بلکہ کنیڈین سفارتخانے کو لکھے جانے والے خط کے بارے میں بھی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔

”ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“ تُولی نے نرم لہجے میں کہا۔ ”خط لکھ کر تم نے حقیقتاً بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ آؤ، ذرا ساحل پر ٹہلتے ہیں۔ شاید اس طرح میری کوئی بات تمھاری سمجھ میں آسکے۔“

کوریگ چند لمحے الجھی ہوئی نگاہوں سے تُولی کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کے ساتھ چل دیا۔

دو دن کی مسلسل کوشش کے بعد تُولی بالآخر کوریگ کی زبان کھلوا لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ کوریگ کے خلاف کسی قسم کا الزام عائد نہیں کیا جائے گا۔ تُولی، میری آندرے کے پرس کی چوری اور ہوٹل سے چارلس وغیرہ کے سامان کی چوری کو بھی نظر انداز کرنے کو تیار تھا۔

”میرا خیال ہے، تم نے چوروں کے ہاں معمولی سی چوری کر کے کوئی جرم نہیں کیا۔“ تُولی اسے اعتماد میں لیتے ہوئے بولا۔ ”حالات کے پیشِ نظر کم از کم میں اس معاملے میں تمھیں موردِ الزام نہیں ٹھہراؤں گا۔ وہاں سے فرار حاصل کرنے اور پھر خط لکھ کر تم نے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اب میں ان لوگوں کے بارے میں تفصیل سے جاننا چاہتا ہوں۔“

کوریگ کا ذہن اُلجھن کا شکار تھا۔ پولیس کی یقین دہانی کے باوجود وہ چارلس کی طرف سے خوفزدہ تھا۔ وہ کسی بھی وقت گوا پہنچ کر اس کے یا اس کے بیوی بچوں کے خلاف انتقامی کارروائی کر سکتا تھا۔ تُولی نے وعدہ کیا کہ جب تک حالات بہتر نہیں ہو جاتے مقامی پولیس کوریگ اور اس کے گھر والوں کی حفاظت کرے گی۔

”مجھ پر اعتماد کرو۔“ تُولی نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”ہر شخص کی زندگی میں ایک لمحہ ایسا ضرور آتا ہے۔ جب اسے کسی دوسرے پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔“

کوریگ چند لمحے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کی زبان حرکت میں آگئی اور وہ چارلس اینڈ کمپنی کے عزائم سے پردہ اٹھاتا چلا گیا۔

انسپکٹر طولی اپنی اس تفتیش کے دوران ہو گے کوریگ سے چند ایسے گروپ فوٹوگراف حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جن میں چارلس سوبھراج اور میری آندرے کی تصویریں بھی شامل تھیں۔ کوریگ سے فوری طور پر مزید معلومات حاصل ہونے کی توقع نہیں تھی چنانچہ وہ فوراً ہی بمبئی روانہ ہو گیا جہاں پہنچتے ہی اس نے تصویریں انلارج کر کے بڑے بڑے ہوٹلوں کے سیکیورٹی آفیسروں میں تقسیم کر دیں۔

”ان میں سے کوئی بھی شخص نظر آئے۔“ وہ انہیں سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”دن ہو یا رات کا پچھلا پہر، بلا تاخیر مجھے مطلع کر دیا جائے۔“

بمبئی میں اس کام سے فارغ ہوتے ہی وہ دہلی پہنچ گیا اور تصویروں کی مزید کاپیاں بنوا کر انھیں پورے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے ہوٹلوں کو بھجوا دیا اور ان کی انتظامیہ کو ہدایت کر دی کہ ان میں سے کسی بھی شخص کو دیکھتے ہی قریبی پولیس اسٹیشن پر اطلاع دی جائے۔ انسپکٹر طولی، چارلس اور اس کے ساتھیوں کے خلاف پورے ملک میں جال پھیلا رہا تھا لیکن وہ اس حقیقت سے قطعی بے خبر تھا کہ اس کے مطلوبہ افراد اس کے دفتر سے چند بلاک کے فاصلے پر موجود ایک ایسا منصوبہ بنا رہے تھے جو اگر کامیاب ہو جاتا تو جرائم کی دنیا میں سب سے بڑا اور بھیانک ترین منصوبہ سمجھا جاتا۔

❖❖

۵ جولائی ۱۹۷۶ء کی دوپہر وکرم ہوٹل کا ایک پبلک روم غیر ملکی سیاحوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ساٹھ افراد پر مشتمل فرانسیسی سیاحوں کا ایک گروپ جس میں زیادہ تر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شامل تھیں، ایشیا کے مختلف ممالک کی سیاحت کرتا ہوا یہاں آکر ٹھہرا ہوا تھا۔ موسم کے تیور اس روز بگڑے ہوئے تھے۔ بارش نے زندگی کے نظام کو تلپٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ سڑکوں پر پانی اس طرح بہہ رہا تھا جیسے سیلاب کے بند ٹوٹ گئے ہوں۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جو اس خوفناک موسم میں باہر نکلنے کا تصور کر سکتے تھے لیکن سیاحوں کے اس گروپ کے چند نوجوان اس صورتِ حال کو بھی خاطر میں لانے کو تیار نہیں تھے۔ دہلی میں ان کا قیام چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ لوگ رات دو بجے کی فلائیٹ سے بنکاک جانے والے تھے اور اس مختصر سے وقت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ ایسے مہم جُو نوجوان برآمدے میں کھڑے بارش کا زور ٹوٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے دوسرے ساتھیوں نے ہوٹل ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔

فرانسیسی سیاحوں کے اس گروپ میں ایک ایسا شخص بھی شامل تھا جس سے ان کی ملاقات آگرہ میں ہوئی تھی۔ وہ پہلی مرتبہ تاج محل کی سیر کے دوران ان سے ملا تھا۔ کسی کو یاد نہیں تھا کہ پہلے اس شخص کی ملاقات کس سے ہوئی تھی، لیکن اس کا انداز ایسا تھا جیسے ہر ایک سے پُرانی شناسائی ہو۔ وہ کسی ماہر گائیڈ کی طرح انھیں تاج محل کے بارے میں معلومات فراہم کرتا رہا۔ شہر کے سستے ہوٹلوں اور تحائف کی سستی دکانوں تک ان سیاحوں کی رہنمائی بھی اسی نے کی تھی اور حقیقت یہ تھی کہ وہ شخص ان فرانسیسی سیاحوں کے لیے بڑا مددگار ثابت ہوا تھا۔ اس نے ڈینیئل شمٹ کے نام سے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ اپنے تعاون سے ہندوستان میں ان کے قیام کو یادگار بنا دے گا۔ ایسی یاد جسے وہ زندگی کے کسی لمحے بھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔

رات کو جب سب لوگ کھانے کے لیے وکرم کے ڈائننگ ہال میں جمع ہوئے تو ڈینیئل شمٹ اس گروپ کے منیجر ریباڈ کو ایک طرف لے گیا۔

”کیا تمھیں معلوم ہے کہ تھائی لینڈ میں تمھارے آدمیوں کو کس قسم کی صورتِ حال کا سامنا ہو سکتا ہے؟ وہاں پیچش کی بیماری عام ہے۔ غیر ملکی تو بہت آسانی سے اس بیماری کا شکار ہو سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ یہ بیماری لگ جائے تو پیچھا نہیں چھوڑتی۔“

”پیچش تو نہیں لیکن فرانس سے روانگی سے پہلے ڈاکٹر نے اس گروپ کے ممبروں کو مختلف ممکنہ بیماریوں کے بارے میں بتاتے ہوئے احتیاطی تدابیر سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ میرا خیال ہے اگر یہ لوگ احتیاط کا دامن تھامے رکھیں تو انھیں کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔“ ریباڈ نے بتایا۔

”صرف یہی کافی نہیں۔“ شمٹ نے کہا۔ ”میرے پاس کچھ ایسی ادویات موجود ہیں جن کے استعمال سے اس خوفناک بیماری کو قریب آنے سے روکا جا سکتا ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے سیاہ رنگ کا ایک

چھوٹا سا بیگ کھولا، جس میں مختلف اقسام کی گولیاں اور کیپسول بھرے ہوئے تھے۔

ریباڈ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ ایشیا کے مختلف ممالک کی سیاحت کر چکا تھا اسے کبھی پیچش جیسی بیماری سے دوچار ہونے کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے خود تو شمٹ کی تیار کردہ گولیوں کے استعمال سے صاف انکار کر دیا لیکن یہ رضامندی بھی ظاہر کر دی کہ گروپ کا کوئی رکن اگر یہ ادویات استعمال کرنا چاہے تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ شمٹ نے فرداً فرداً گروپ کے تمام ممبروں سے رابطہ قائم کرنا شروع کر دیا۔ ان میں بیس افراد تو ایسے تھے جنہوں نے فوراً ہی اس کی دی ہوئی گولیاں اور کیپسول نگل لیے ... ڈینیل شمٹ اپنی اس جزوی کامیابی پر دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ وہ چارلس سوبھراج تھا جس نے کبھی ناکام رہنا نہیں سیکھا تھا۔ اس کا دستِ راست جین مائر عرف جین ڈوسم بھی اس وقت اس کے ساتھ موجود تھا۔

تمام لوگ رات کے کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ چارلس محتاط نگاہوں سے ایک ایک کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ گروپ کے منیجر نے اعلان کیا کہ تمام لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا کر اپنا سامان وغیرہ تیار کر لیں تاکہ عین روانگی کے وقت کوئی گڑبڑ نہ ہو سکے۔ چارلس نے بھی تجویز پیش کی کہ روانگی سے پہلے انہیں تھوڑی بہت نیند لے لینا چاہیے کیونکہ ظاہر ہے انہیں سفر کے دوران آرام کا موقع نہیں مل سکے گا لیکن کوئی بھی کمروں میں جانے کو تیار نہیں تھا۔ گروپ کا ہر رکن ہندوستان میں اپنے ان آخری لمحات سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ ایک نوجوان نے گٹار بجانا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی دو لڑکیاں اپنی جگہ سے اٹھ کر ناچنے لگیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر چارلس اپنے آپ میں عجیب سا اضطراب محسوس کرنے لگا۔ اس کے لیے کم از کم ان بیس افراد کا اپنے کمروں میں جانا ضروری تھا، جو اس کی دی ہوئی گولیاں کھا چکے تھے کیونکہ کچھ ہی دیر میں یہ گولیاں اپنا اثر دکھانے والی تھیں۔ ڈائننگ ہال کے بجائے اگر وہ لوگ اپنے کمروں میں جا کر بے ہوش ہوتے تو اس کا منصوبہ کامیاب ہو سکتا تھا۔ بصورتِ دیگر اس معاملہ کے منفی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ انہیں اپنے اپنے کمروں میں جانے کے لیے آمادہ کرنے کی ایک اور کوشش کرنے لگا۔

وہ انگڑائی لیتے ہوئے بولا "اب بہت دیر ہو چکی ہے سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا کر تھوڑی بہت نیند لے لیں۔" وہ ان بیس افراد کو لفٹ کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا تھا جو گولیاں کھا چکے تھے۔

"ابھی تو رات شروع ہوئی ہے" ایک نوجوان نے احتجاج کیا "اتنی جلدی کسی کو بھی نیند نہیں آئے گی۔"

چند منٹ گزر گئے۔ چارلس کے دماغ میں سنسنی بڑھ رہی تھی۔ وہ کوئی دوسرا قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک لڑکی کی چیخ سن کر چونک گیا۔ اس لڑکی کے ساتھ دوسری کرسی پر بیٹھا ہوا اس کا نوجوان ساتھی اچانک ہی میز پر اوندھا گیا تھا۔ اس کے سر کی ٹکر سے گلاس الٹ گیا اور شراب میز پر بہہ نکلی۔ ابھی لوگ اس صورتِ حال کو سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ قریب ہی کھڑا ہوا ایک دوسرا نوجوان کٹے ہوئے درخت کی طرح لہرا کر فرش پر گرا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے کرسی پر بیٹھا ہوا ایک تیسرا آدمی کرسی سمیت لڑھک گیا۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ چند لمحوں تک صورتِ حال کسی کی سمجھ ہی میں نہ آسکی۔ لوگ یکے بعد دیگرے گر رہے تھے۔ ایک شخص کو چکر آیا تو اس نے اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے میز کا سہارا لینا چاہا لیکن اس کے ہاتھ میں صرف میز پوش ہی آسکا۔ میز پوش کھنچنے سے میز پر رکھے ہوئے برتن نیچے گر کر چھناکے کی آواز سے ٹوٹ گئے۔

"یہ ... یہ مر رہا ہے ... سب مر رہے ہیں ..." ایک لڑکی خوفزدہ انداز میں چیختے ہوئے بولی۔

"منیجر کو بلاؤ" ایک اور خوفزدہ سی آواز گونجی۔

گروپ کے منیجر کی بیوی ایک گرے ہوئے نوجوان پر جھک گئی "زہر" وہ دوسرے ہی لمحے خوفزدہ آواز میں چیخی "اسے زہر دیا گیا ہے ... سب کو زہر دیا گیا ہے۔"

اس دوران میں کسی نے منیجر کو اطلاع کر دی تھی۔ پستہ قامت ہندو منیجر جیسے ہی ڈائننگ ہال میں داخل ہوا، یہاں کی صورتِ حال دیکھ کر بری طرح بوکھلا گیا۔ اچھے بھلے انسان اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے اس طرح گر رہے تھے، جیسے کسی بند کمرے میں ... ڈی ڈی ٹی چھڑکنے کے بعد مکھیاں گرتی ہیں۔ اس کے قریب فرش پر گری ہوئی ایک لڑکی نے اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ دوسرے ہی لمحے لڑکی کے دانت منیجر کی پنڈلی میں پیوست ہو چکے تھے۔ منیجر تکلیف سے بلبلا اٹھا۔ وہ اپنی ٹانگ چھڑا کر ہوٹل کے کچن کی طرف دوڑا۔ بدحواسی کے باوجود اس کے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آیا تھا کہ کہیں ان لوگوں کو سرو کیا جانے والا کھانا تو زہریلا نہیں تھا لیکن وہ ابھی ڈائننگ ہال کے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ کسی نے لپک کر اسے بازو سے تھام لیا۔ اس دوران میں شاید کسی کے ذہن میں یہ بات ..... آگئی تھی کہ صرف وہی لوگ بے ہوش ہو کر گر رہے تھے جنہوں نے شمٹ کی دی ہوئی گولیاں کھائی تھیں۔ چنانچہ اس نے اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے چارلس کو گرفت میں لے لیا تھا۔ چارلس کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو ان کی گرفت

سے چھڑانے میں کامیاب ہو گیا اور پاگلوں کی طرح ڈائننگ ہال میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ وہ بار بار کراٹے کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر جان سے مار دینے کی دھمکیاں دیتے ہوئے بھاگ نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا لیکن دفعتاً تین فرانسیسی نوجوانوں نے دھمکیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ تینوں جونک کی طرح اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے تھے۔ اسی دوران چند اور نوجوان پھرتی سے آگے بڑھے اور چارلس کو بے بس کر دیا۔ اسی دوران جین ڈوسم موقع پا کر ہوٹل سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ہوٹل کے سامنے اس کی سیڈان کھڑی تھی۔ اس نے کار میں بیٹھتے ہی انجن اسٹارٹ کیا اور اسے پوری رفتار سے ایک طرف دوڑا دیا۔

پولیس جب ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی تو فرانسیسی سیاحوں نے چارلس کو ایک کرسی پر باندھ رکھا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر ان سب کو جان سے مار دینے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس کا گولیوں اور کیپسولوں سے بھرا ہوا سیاہ رنگ کا بیگ اس وقت ایک فرانسیسی نوجوان کے قبضے میں تھا۔

❖❖

فون کی گھنٹی نے انسپکٹر طولی کو بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ کرائمز برانچ کے نائٹ ڈیوٹی آفیسر کی کال تھی۔

"اس وقت زحمت دینے پر معافی چاہتا ہوں جناب!"

ڈیوٹی آفیسر نے اس کی آواز سنتے ہی کہا "وکرم ہوٹل میں ایک سنسنی خیز واقعہ پیش آیا ہے جہاں ساٹھ افراد پر مشتمل فرانسیسی سیاحوں کا ایک گروپ ٹھہرا ہوا ہے۔ آج رات کا کھانا کھانے کے کچھ ہی دیر بعد متعدد سیاح یکے بعد دیگرے بے ہوش ہو ہو کر گرنے لگے۔ جنہیں فوری طور پر اسپتال پہنچا دیا گیا۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے ایک مشتبہ فرانسیسی کو گرفت میں لے رکھا ہے۔ میں نے آپ کو اس واقعے کی اطلاع دینا اس لیے ضروری سمجھا کہ ... ممکن ہے وہ آپ کے مطلوبہ آدمیوں میں سے کوئی ہو۔"

"بہت اچھا کیا تم نے۔ اس شخص کے بارے میں تمہارا خیال درست بھی ہو سکتا ہے۔ میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔" انسپکٹر طولی کی آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی۔ اسے وکرم ہوٹل پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ یہاں کی صورتِ حال سے آگاہ ہو کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ گولیوں سے متاثر ہونے والے سیاحوں کو اسپتال پہنچا دیا گیا تھا جہاں ان کے معدے صاف کرنے کے بعد ان کی حالت کے بارے میں اطمینان کا اظہار کیا گیا تھا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ گولیوں نے ڈائننگ ہال ہی میں ان پر اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اگر وہ اپنے کمروں میں جا کر بے ہوش ہوتے تو پھر کسی کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔ ان کے دوسرے ساتھی ٹولیوں کی صورت میں ہوٹل کی لابی میں کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر خوف و ہراس کے تاثرات نمایاں تھے۔ ان میں سے بیشتر اب تک نہیں سمجھ سکے تھے کہ یکایک یہ سب کچھ کیسے اور کیا ہو گیا تھا۔ گروپ کا منیجر ریباڈ انسپکٹر طولی کو ایک کمرے کی طرف لے گیا۔ اس نے طولی کو خبردار کر دیا تھا کہ جس مشتبہ شخص کو انہوں نے پکڑ رکھا ہے وہ اژدہا بھیلسے کی طرح بپھرا ہوا ہے اور کسی غفلت یا بے پروائی کی صورت میں خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

ڈینیل شمٹ کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ غصّے اور جذبات کی شدّت سے اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ انسپکٹر طولی نے جب اپنا تعارف کرایا تو وہ چیختے ہوئے بولا "یہ لوگ میرے بارے میں بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔" وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ لہجہ فرانسیسی تھا۔ اس کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ انسپکٹر طولی کو مترجم کی حیثیت سے ایک فرانسیسی سیاح کی خدمات حاصل کرنا پڑیں۔ "بہتر ہوگا کہ مجھے فوری طور پر چھوڑ دیا جائے۔" شمٹ نے اسی لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا "دوسری صورت میں نتائج کی ذمّے داری تم لوگوں پر عائد ہوگی۔ میں ایک فرانسیسی شہری اور معزّز بزنس مین ہوں اور میرا سفارت خانہ اپنے ایک باوقار شہری کی اس ہتک کو نظر انداز نہیں کرے گا۔ میں اس ہوٹل اور دہلی پولیس کے خلاف ہتکِ عزّت اور ہرجانے کا مقدمہ دائر کر دوں گا۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟" انسپکٹر طولی نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔ اس کی نظریں شمٹ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"کیا کہہ سکتا ہوں۔" شمٹ نے کندھے اُچکا دیے "غالباً ہوٹل کے کچن سے زہریلا کھانا فراہم کیا گیا تھا جسے کھاتے ہی میرے بیشتر دوست بے ہوش ہو ہو کر گرنے لگے۔"

انسپکٹر طولی چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر ہوٹل کے منیجر کو اشارہ کرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ لوگوں سے دُور ہٹ کر اس نے منیجر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا اس شخص کے ساتھ کچھ خوبصورت لڑکیاں بھی تھیں؟"

"پتا نہیں، میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔" منیجر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

انسپکٹر طولی نے دوسرے فرانسیسی سیاحوں سے بھی سوال پوچھا تو اس مرتبہ اسے مایوسی نہیں ہوئی۔

"ہاں" ایک نوجوان نے جواب دیا "اس سے ہماری پہلی ملاقات آگرہ میں ہوئی تھی اور اس کے ساتھ تین خوبصورت لڑکیاں

بھی تھیں۔اس کی طرح وہ بھی ہر ایک سے بہت جلد بے تکلف ہو گئی تھیں لیکن آج یہ افسوسناک واقعہ پیش آیا تو وہ لڑکیاں اس کے ساتھ نہیں تھیں۔"

"اوہ!" انسپکٹر طولی کو چونک جانا پڑا۔"اس شخص سے تمھاری ملاقات آگرہ میں ہوئی تھی۔تو کیا یہ شروع سے تمھارے گروپ میں شامل نہیں تھا؟"

"نہیں۔"اس مرتبہ گروپ کے منیجر ریباڈ نے جواب دیا۔"ڈینیئل شمٹ سے ہماری ملاقات آگرہ ہی میں ہوئی تھی، وہ بہت جلد ہم میں گھل مل گیا تھا۔" انسپکٹر طولی فوراً ہی کمرے میں واپس آگیا جہاں چارلس موجود تھا۔

"تمھیں ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن تک چلنا ہوگا۔ہم اس سلسلے میں تم سے کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔" طولی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گا،میں..."

چارلس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی انسپکٹر طولی نے دو ہٹے کٹے پولیس والوں کو اشارہ کیا۔ انھوں نے رسّی کھول کر... چارلس کو بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اٹھا لیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے ہوٹل سے باہر لے گئے۔چارلس چیخنے کے ساتھ اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے بڑی طرح مچل رہا تھا لیکن پولیس والوں کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔

❖❖

انسپکٹر طولی کم و بیش پچیس سال سے پولیس کی ملازمت میں تھا۔اس عرصے میں اسے ہر قسم کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا تھا لیکن یہ شخص جو اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا ان سب سے قطعی مختلف ثابت ہو رہا تھا۔پوچھ گچھ کے دوران انسپکٹر طولی کو کئی مرتبہ بڑی شدّت سے یہ احساس ہوا تھا کہ وہ کسی غلط آدمی کو پکڑ لایا ہے اور صبح ہوتے ہی فرانسیسی سفارت خانے کا پورا عملہ اس کے دفتر پر دھاوا بول دے گا۔چارلس کا رویّہ بڑا... متاثر کن تھا۔پہلے چند گھنٹے تو اس نے زبان کو حرکت تک نہ دی تھی۔البتہ اس کے چہرے کے تاثرات ہر لحظہ بگڑتے جا رہے تھے جیسے اسے یہ سب کچھ بڑا ناگوار گزر رہا ہو۔پھر وہ فرانسیسی زبان میں چیخنے چلاّنے لگا۔اس نے مطالبہ کیا تھا کہ فرانسیسی سفارتخانے کو مطلع کیا جائے تاکہ انھیں معزّز فرانسیسی شہریوں کے ساتھ پولیس کی زیادتیوں کا علم ہو سکے۔مگر انسپکٹر طولی جیسا گرگِ باراں دیدہ ان جھانسوں میں آنے والا نہیں تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم انگریزی بھی میری طرح بہت شُستہ بول سکتے ہو مسٹر شمٹ!" وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔"اگر نہیں تو تمھاری فرانسیسی کو سمجھنے کے لیے کسی معقول مترجم کی تلاش میں کئی ہفتے لگ سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔میں انگریزی بول سکتا ہوں۔" چارلس نے کہا۔انسپکٹر طولی کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی تھی۔"مگر تمھاری طرح شُستہ نہیں۔"

رات بھر کی پوچھ گچھ کے دوران چارلس اپنے موقف پر اڑا رہا۔اس کا پہلا مطالبہ تھا کہ اس کی شناخت کی تصدیق کے لیے پیرس کو کیبل کیا جائے۔ وہ اپنے اس اصرار پر بھی قائم رہا کہ وہ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتا ہے اور پیرس کے تجارتی حلقوں میں اسے عزّت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ ہندوستان میں اپنے دفتر کی برانچ کھولنے کے لیے صورتِ حال کا جائزہ لینے آیا تھا جس سے بیسیوں ہندوستانیوں کو روزگار مہیّا ہوتا لیکن حالات کی ستم ظریفی ہی تھی کہ وہ دہلی کے جاہل اور وحشی پولیس والوں کا تختۂ مشق بنا ہوا تھا۔اس نے پیرس سے شائع ہونے والے ایک فیشن میگزین کا نام بتاتے ہوئے تجویز پیش کی کہ اسے فون کر کے اس کے بارے میں تصدیق کر لی جائے۔ فون کے اخراجات وہ خود برداشت کرنے کو تیار تھا۔اس نے اپنے لیے وکیل کا مطالبہ بھی کیا تھا۔

"ہر کام اپنے وقت پر ہو جائے گا۔" انسپکٹر طولی نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔"تمھارا پاسپورٹ کہاں ہے؟"

چارلس کے چہرے کے تاثرات میں ایک لمحے کو تغیّر سا پیدا ہوا لیکن پھر اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور پُرسکون لہجے میں بولا۔"پاسپورٹ میری جیب میں تھا۔وکرم ہوٹل کے ہنگامے میں کہیں گر گیا ہوگا۔ہوٹل کے اس احمق منیجر سے پوچھو، شاید اسے کہیں پڑا ہوا مل گیا ہو۔"

"تمھارا قیام کہاں ہے؟ ہوٹل کا نام بتاؤ۔"

"میں اب تمھارے کسی احمقانہ سوال کا جواب نہیں دوں گا۔" چارلس نے کہتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

"یہ سب کیا ہے؟" انسپکٹر طولی نے اس کے بیگ کی تلاشی لیتے ہوئے کہا جس میں مختلف اقسام کی گولیاں اور کیپسول بھرے ہوئے تھے۔

"دوائیں ہیں۔" چارلس نے اطمینان سے جواب دیا۔"وہ کوئی احمق ہی ہوگا جو ہندوستان کی سیاحت کے دوران حفاظتی ادویات اپنے پاس نہ رکھے۔"

"مونیکا کون ہے؟" انسپکٹر طولی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے یہ سوال اچانک ہی کیا تھا۔چارلس نے کوئی جواب نہیں دیا۔"مونیکا نام کی ایک لڑکی کو آگرہ میں تمھارے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ہماری اطلاع کے مطابق تمھارے ساتھ دو اور لڑکیاں بھی تھیں۔ وہ کون ہیں؟"

"مجھے اب تک لاتعداد لڑکیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن میں نے کبھی کسی کا نام یاد رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔" چارلس نے جواب دیا۔

"کیا تم کبھی گرفتار ہوئے ہو؟" انسپکٹر طولی نے ایک اور سوال کیا۔

"بالکل نہیں۔" چارلس نے اس مرتبہ جواب دینے میں دیر نہیں لگائی۔"میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ میں فرانس کا ایک معزّز شہری اور نیک نام بزنس مین ہوں۔ مجھ سے زندگی میں سب سے بڑی غلطی یہی ہوئی ہے کہ ہندوستان جیسے گھٹیا ملک میں چلا آیا۔میں تمھیں ایک بار پھر بتا دینا چاہتا ہوں کہ دہلی پولیس کو اپنی اس حماقت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔میں یہ معاملہ اندرا گاندھی کے سامنے پیش کر کے اسے تم لوگوں کی کارکردگی سے ضرور آگاہ کردوں گا۔"

صبح سات بجے کے قریب طولی نے پوچھ گچھ کا یہ سلسلہ ختم کر دیا اور اس کے اشارے پر چارلس کو لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ چارلس نے ہنگامہ تو بہت کیا مگر طولی کو اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ وہ مزید پوچھ گچھ کرنے سے پہلے انٹرپول کی تیار کردہ فائل کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔چارلس کی شناخت کا ایک آسان طریقہ تو یہ تھا کہ وہ اس کی انگلیوں کے نشانات لے کر کیبل کے ذریعے انٹرپول کے پیرس ہیڈکوارٹر سے اس کی تصدیق کر لیتا لیکن ہندوستانی قانون کے مطابق کسی مشتبہ شخص کے فنگر پرنٹس اس وقت تک نہیں لیے جا سکتے تھے جب تک کہ عدالت کی طرف سے اس پر فردِ جرم عائد نہ کر دی جائے۔

دوسرا ذریعہ وہ فوٹوگراف تھے جو ہوگے کوریگ نے اسے دیے تھے۔ وہ گروپ فوٹوگراف تھے اور دُور سے کھینچے ہوئے تھے۔ ان میں چارلس کی شباہت تو تھی مگر مہرِ تصدیق ثبت نہ کی جا سکتی تھی۔

انسپکٹر طولی انٹرپول کی فائل کا مطالعہ کر رہا تھا اور اس کی ہدایت پر اس کے لاتعداد ماتحت دہلی کے ہوٹلوں میں ان یورپین لڑکیوں کو تلاش کر رہے تھے جنھیں آگرہ میں چارلس کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔دہلی میں سیکڑوں ہوٹل، اسٹوڈنٹس ہوسٹل اور لاتعداد پرائیویٹ گیسٹ ہاؤسز کی وجہ سے اس تلاش میں کئی دن لگ سکتے تھے لیکن اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔اس کے ساتھ ہی ایئرپورٹ اور ریلوے اسٹیشن کی نگرانی بھی شروع کر دی گئی تھی۔

❖❖

چارلس کے بارے میں معلوم ہونے کے بعد میری ایلن ایستھر نے گروہ کی کمان سنبھال لی اور وہ لوگ کناٹ سرکل کے قریب ایک تھرڈ کلاس ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دے دیا تھا کہ کوئی بھی ہوٹل سے باہر جانے کی کوشش نہ کرے۔چارلس کی طرف سے کوئی پیغام ملنے کے بعد ہی اگلا قدم اٹھایا جائے گا۔ لیکن میری آندرے انٹرنیشنل ٹیلیفون آفس جانے پر مُصر تھی۔ وہ اپنے قریب المرگ باپ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے کینیڈا ٹیلیفون کرنا چاہتی تھی مگر ایلن ایستھر نے اسے سختی سے روک دیا۔

"نہیں، تم میری اجازت کے بغیر اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلو گی۔"

"تم کون ہو مجھے روکنے والی۔میں جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی۔" میری آندرے پیر پٹختی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ ایلن ایستھر اس کے راستے میں آنے کی کوشش کرے گی مگر ایسا نہیں ہوا اور ایستھر اپنی جگہ پر کھڑی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ٹیلیفون آفس پہنچتے ہی میری آندرے نے کیوبک سٹی میں اپنی بہن ڈینس کے نام کال بک کرا لی۔کال کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد ہی مل سکی تھی۔ ڈینس سے بات کرتے ہوئے وہ اپنے لہجے کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔اس نے محتاط الفاظ میں صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے ڈینس سے درخواست کی تھی کہ ہندوستان سے نکلنے میں اس کی مدد کرے۔میری آندرے کے محتاط لہجے کے باوجود ڈینس کو صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ لگانے میں کچھ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ابھی چند روز قبل ہی کینیڈا کے تقریباً تمام اخبارات نے یہ خبر شائع کی تھی کہ مونیکا لیکرک نامی ایک کینیڈین نرس قتل کی مختلف وارداتوں کے سلسلے میں ایشیائی پولیس کو مطلوب ہے۔ڈینس نے یہ خبر اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے پڑھی تھی۔ وہ خبر پڑھتے ہی گھر کی طرف بھاگی تھی کہ گھر میں آنے والے اخبار کو اپنے باپ تک پہنچنے سے پہلے ہی غائب کر دے کیونکہ خدشہ تھا کہ یہ خبر پڑھتے ہی باپ کی حرکتِ قلب بند نہ ہو جائے لیکن ڈینس کی یہ بھاگ دوڑ بیکار ثابت ہوئی، اگسٹن کو اس کے پہنچنے سے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا۔ان کے جاننے والے بار بار اس سلسلے میں فون کر کے ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے۔یہاں تک کہ رائل کینیڈین پولیس بھی فون پر اس سلسلے میں اگسٹن سے رابطہ قائم کر چکی تھی۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔میری آندرے تو ایسی نہیں تھی۔ اس نے تو کبھی کسی چیونٹی کو بھی نہیں مارا تھا۔اس کا قتل کی متعدد وارداتوں میں ملوّث ہونا ناقابلِ یقین سی بات تھی۔

میری آندرے نے فون پر ڈینس سے درخواست کی کہ برنارڈ کو بھیج دے تاکہ وہ اس کی مدد سے ہندوستان سے نکل سکے لیکن

ڈینس نے اسے مشورہ دیا کہ وہ وقت ضائع کیے بغیر دہلی میں کینیڈین سفارت خانے پہنچ جائے اور صورتِ حال سے آگاہ کرکے مدد حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

"میں ایسا نہیں کر سکتی" میری آندرے نے جواب دیا۔ "مجھے شبہ ہے کہ سفارت خانے والے میری کوئی مدد کرنے کے بجائے مجھے پولیس کے حوالے کر دیں گے" اس کے برعکس میری آندرے کو یقین تھا کہ اس کا پرانا دوست برنارڈ جس کے ساتھ وہ پہلی مرتبہ ایشیا کی سیاحت پر نکلی تھی، اسے اس مصیبت سے نکالنے میں مددگار ثابت ہو سکے گا۔ ڈینس نے وعدہ کر لیا کہ وہ برنارڈ کو اس سلسلے میں آمادہ کرنے کی کوشش کرے گی۔

ان لوگوں کے پاس ایک پھوٹی کوڑی تک نہیں بچی تھی۔

دوسرے دن اخراجات چلانے کے لیے جین ڈوسم اور تینوں لڑکیوں نے اپنی اپنی چیزیں بیچنا شروع کر دیں۔ چارلس کے سوٹ کیس میں سے دو تین کیمرے اور ریڈیو ٹرانسسٹر دستیاب ہو گئے تھے۔ ایک ہیئر ڈرائر، چند ملبوسات اور جوتے وغیرہ بیچنے کے بعد بھی انہیں صرف آٹھ سو روپے مل سکے۔ ایلین ایستھر کی ہدایت پر وہ سب ہوٹل اوبرائے کے سوئمنگ پول کے پاس پہنچ گئے کیونکہ ایلین کے کہنے کے مطابق چارلس نے کسی ایمرجنسی کی صورت میں ان لوگوں کو وقتاً فوقتاً وہاں جا کر انتظار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

وہ چاروں ہوٹل اوبرائے کے سوئمنگ پول کے پاس بیٹھے متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ میری آندرے کی نظریں ہر نئے چہرے کی طرف اٹھ جاتیں لیکن اسے ہر مرتبہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔ بالآخر وہ اٹھ کر وہاں سے بھاگ نکلی۔ دوسرے دن اس نے پھر کینیڈا فون کیا۔ تقریباً دس گھنٹے کے انتظار کے بعد لائن مل سکی تھی۔ ڈینس نے خوشخبری سنائی کہ برنارڈ ہندوستان جانے پر آمادہ ہو گیا ہے اور سات جولائی یعنی کل کی سیٹ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے جیسے ہی سیٹ ملی، دہلی پوسٹ آفس کے غیر ملکیوں کے شعبے کے پتے پر فلائیٹ کے بارے میں ٹیلی گرام کے ذریعے اطلاع دے گا۔ گفتگو کے اختتام پر فون کا ریسیور رکھتے ہوئے میری آندرے کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ اس کی مصیبت کے دن ختم ہونے والے تھے۔

روایت ہے کہ کل کبھی نہیں آتی۔ میری آندرے کو جس کل کا انتظار تھا، وہ بھی نہیں آئی اور نہ ہی برنارڈ کی طرف سے کوئی اطلاع ملی۔ پوسٹ آفس میں غیر ملکیوں کے شعبے سے متعدد بار مایوس کن رابطہ قائم کرنے کے بعد وہ ایئرپورٹ پہنچ گئی اور کئی گھنٹوں تک غیر ممالک سے آنے والی پروازوں کو چیک کرتی رہی، بالآخر مایوسی کے لبادے میں لپٹی اس تھرڈ کلاس ہوٹل میں واپس

آ گئی۔ کاؤنٹر پر اپنا نام بتاتے ہوئے اس نے معلوم کیا کہ اس کے لیے کوئی پیغام تو نہیں آیا۔ یہاں بھی اسے مایوسی ہی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کاؤنٹر سے ہٹ کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی ہی تھی کہ دو آدمیوں نے اس کا راستہ روک لیا۔

"مونیکا؟" ایک آدمی نے کہتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

میری آندرے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا مگر دوسرے آدمی نے ایک بار پھر اس کا راستہ روک کر اپنا شناختی کارڈ اس کے چہرے کے سامنے لہرایا۔ وہ دونوں انسپکٹر طولی کے ماتحت تھے۔ ان میں سے ایک نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے... میری آندرے کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی۔ اس کے چند منٹ بعد جب میری ایلین ایستھر ہوٹل میں داخل ہوئی تو اس کی کلائیوں میں بھی آہنی زیور پہنا دیا گیا۔ دونوں لڑکیوں نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا لیکن ان کی یہ ہنگامہ آرائی بیکار ثابت ہوئی۔ انہیں بھی انسپکٹر طولی کے دفتر پہنچا دیا گیا جہاں چارلس پہلے ہی موجود تھا اور سر توڑ کوشش کے باوجود پولیس ابھی تک اس کی زبان نہیں کھلوا سکی تھی۔ اسی شام پولیس نے جین ڈوسم کو بھی ڈھونڈ نکالا۔ اور پھر آدھی رات کے لگ بھگ باربرا اسمتھ کو بھی ایک گھٹیا سے نائٹ کلب سے گرفتار کر لیا گیا۔ یہ تمام گرفتاریاں ۷ جولائی ۱۹۷۶ء کو عمل میں آئی تھیں۔ باربرا اس وقت چرس آلود سگریٹ کے کش لگا رہی تھی۔ اس کا دماغ بہکا ہوا تھا۔ دو پولیس والوں نے جب اسے گرفتاری کی نوید سنائی تو وہ یہی سمجھی تھی کہ اسے چرس نوشی کے الزام میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ یہ حقیقت تو بہت دیر بعد اس پر آشکارا ہو سکی تھی کہ اس کے خلاف اصل الزامات کیا تھے۔

❖❖

"میرا خیال ہے اب تمہیں زبان کھول دینا چاہیے۔" انسپکٹر طولی نے اپنی تفتیش کے چھٹے دن چارلس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ہم تمہارے تمام ساتھیوں کو گرفتار کر چکے ہیں"

"میرا کوئی ساتھی نہیں" چارلس نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر جواب دیا۔ وہ اب بھی کسی جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح پرسکون تھا۔ اس کے جسم پر اب بھی وہی لباس تھا جو وہ گرفتاری کے وقت پہنے ہوئے تھا لیکن انسپکٹر طولی کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ شدید گرمی میں چھ دن تک مسلسل استعمال کے بعد بھی لباس پر ایک شکن تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس دوران میں اس کے وقار اور طنطنے میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس نے گھٹیا ہوٹل سے منگوایا جانے والا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ بعض اوقات اس پر انتہائی مایوسی طاری ہو جاتی اور وہ اپنا سر دیوار سے ٹکرانے لگتا.... کبھی

ہاتھوں میں پہنی ہوئی ہتھکڑیاں زور زور سے منہ پر مارنے لگتا۔ انسپکٹر طولی کا خیال تھا کہ اگر وہ اداکاری کی لائن اختیار کرتا تو اس کے پاس بہترین اداکاری کے بے شمار ایوارڈ جمع ہو چکے ہوتے۔ اس کی یہ اداکاری انسپکٹر طولی کے لیے نہ صرف متاثر کن تھی بلکہ تکلیف دہ بھی ثابت ہو رہی تھی۔

چارلس سے پوچھ گچھ کے دوران انسپکٹر طولی پولیس کے تمام بنیادی حربے آزما چکا تھا۔ کبھی نرمی کبھی سختی مگر چارلس اپنے موقف پہ قائم رہا۔ وہ اب بھی اپنے آپ کو ڈینیئل شمٹ ہی بتا رہا تھا۔ انسپکٹر طولی نے اسے بتایا کہ اس کے تمام ساتھی گرفتار ہو چکے ہیں اور وہ ان جرائم کی تمام تر ذمہ داری اسی پہ ڈال رہے ہیں۔

"اگر ایسا ہے تو انہیں میرے سامنے لاؤ۔ میں اپنی موجودگی میں ان کے بیانات سننا چاہتا ہوں" چارلس نے مطالبہ کیا۔

انسپکٹر طولی کو فوراً ہی پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ اس نے چارلس کو بلف کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ میری آندرے وغیرہ کو فی الحال اس کے سامنے نہیں لانا چاہتا تھا کیوں کہ اس کا امکان تھا کہ چارلس اشاروں کنایوں سے انہیں اپنی زبانیں بند رکھنے پر مجبور کر دیتا۔ چارلس کے تمام ساتھیوں کو کرائم برانچ کے مختلف کمروں میں رکھا گیا تھا۔ انسپکٹر طولی ہر روز الگ الگ ان سے ملاقات کرتا۔ میری آندرے کے بارے میں اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ چارلس کی طرح اس لڑکی کی زبان کھلوانا بھی زیادہ آسان ثابت نہیں ہو گا۔ ابتدائی چند گھنٹے خوف و دہشت میں مبتلا رہنے کے بعد اس نے اپنے آپ پر ایسا خول چڑھا لیا تھا جسے توڑنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے مطالبہ کیا تھا کہ کینیڈین سفارت خانے کو مطلع کر کے سفارت خانے کے ذریعے قانونی مشیر کا بندوبست کیا جائے لیکن اسے بتایا گیا کہ ہندوستانی قانون کے مطابق کسی ملزم کو پولیس کی تفتیش کے دوران قانونی مشیر کی خدمات حاصل کرنے کا حق نہیں دیا جا سکتا۔

جین ڈوسم بھی اگرچہ زیادہ تر خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا لیکن انسپکٹر طولی کے لیے وہ اتنا سخت ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس فرانسیسی نوجوان کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ نہ تو اس کا ماضی جرائم سے آلودہ تھا اور نہ ہی وہ اس گروہ میں زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ باربرا اور ایلین ایستھر بڑی بزدل ثابت ہوئی تھیں۔ پوچھ گچھ کے دوران وہ اکثر چیختی چلاتی اور روتی رہیں۔ انسپکٹر طولی ایک اچھے پولیس افسر کی طرح اس دیوار میں کوئی ایسا رخنہ تلاش کر رہا تھا جس سے دیوار کو زمین بوس کرنے میں مدد مل سکتی ہو۔ اسے یقین تھا کہ یہی دونوں لڑکیاں دیوار کا وہ رخنہ ثابت ہوں گی جس کی اسے تلاش تھی۔ انسپکٹر طولی کے حکم پر ایلین ایستھر اور باربرا کو ایک ہی کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا اور وہ دونوں سے بیک وقت پوچھ گچھ

کر رہا تھا۔ پانچویں دن وہ ان دونوں کے سامنے سلطانی گواہ کی حیثیت کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ اس کے خیال میں ایلین ایستھر ان دونوں میں زیادہ سخت تھی لیکن وہی ہتھیار پھینکتی ہوئی نظر آنے لگی۔ وہ بری طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ انسپکٹر طولی نے فوراً ہی ہمدردانہ رویہ اختیار کر لیا۔ ایلین نے روتے روتے اپنا سر میز پہ ٹکا دیا۔ طولی اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں گویا ہوا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے دماغ پہ بہت بڑا بوجھ ہے۔ اگر تم سب کچھ بتا دو تو تمہارے دل کا غبار چھٹ سکتا ہے"

"ٹھیک ہے" ایلین ایستھر نے سر اٹھاتے ہوئے شکست خوردہ سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا "میں بھی اسی گروہ کی رکن ہوں جن کی تمہیں تلاش تھی"

انسپکٹر طولی نے باربرا کی طرف دیکھا۔ باربرا نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا "ہم اپنا بیان لکھوانے کو تیار ہیں" باربرا کا یہ جملہ سنتے ہی انسپکٹر طولی کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک ابھر آئی۔ اس نے اردلی کو بلا کر اسٹینو گرافر کو طلب کر لیا۔

میری آندرے کو بھی خبر سنا دی گئی کہ اس کی دونوں ساتھی لڑکیوں نے دہلی میں متعدد ڈکیتیوں، سیاحوں کو بے ہوش کر کے لوٹنے کی وارداتوں اور رنجیت ہوٹل میں جین سولومن نامی نوجوان فرانسیسی سیاح کے قتل کا اعتراف کر لیا ہے۔

"یہ سب بکواس ہے" میری آندرے چیخی لیکن پھر اس نے اس طرح خاموشی اختیار کر لی جیسے منہ میں زبان ہی نہ رہی ہو۔ چند لمحات اسی خاموشی کی نذر ہو گئے پھر میری آندرے نے اپنے آپ کو بے گناہ قرار دیتے ہوئے ایک بار پھر کینیڈین سفارت خانے کی طرف سے اپنے لیے قانونی مشیر کا مطالبہ کیا اور ایک بار پھر خاموش ہو کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی لیکن اس بار بھی یہ خاموشی زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی "ہاں"

"میں سمجھا نہیں" انسپکٹر طولی نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے خوشی ہے سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں دوڑتے دوڑتے اتنی تھک چکی ہوں کہ مجھ میں اب ایک قدم اٹھانے کی سکت بھی نہیں رہی" میری آندرے نے کہتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا اور پھر اپنا بیان لکھوانے لگی۔ بتیس صفحات پر مشتمل اس بیان میں پہلی مرتبہ سیاحت کے لیے کینیڈا سے روانگی، سری نگر میں چارلس سوبھراج سے ملاقات، کینیڈا میں اس کے نام چارلس کے محبت بھرے خطوط، چارلس کے ساتھ ایشیا کے بیشتر ممالک کی آوارہ گردی اور چارلس کی غیر قانونی سرگرمیوں کے بارے میں سب کچھ بتا دیا لیکن اس نے یہ

اعتراف کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ بھی ان جرائم میں چارلس کی حصے دار تھی۔ چارلس کے ساتھ اس کی حیثیت ایک قیدی کی سی تھی، اور اپنے پاس کوئی رقم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسے چھوڑ بھی نہیں سکتی تھی۔ میری آندرے نے اپنے اس طویل بیان میں اس بات پر زور دیا تھا کہ وہ بے گناہ ہے اور چارلس کی ان سرگرمیوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن جب ان تینوں لڑکیوں کو دوسرے کمرے میں موجود ڈینیئل شمٹ کے سامنے لایا گیا اور تینوں نے اسے اپنے لیڈر کی حیثیت سے شناخت کر لیا تو چارلس نے اس وقت بھی صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔ وہ ہر لحاظ سے مطمئن اور پرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر انسپکٹر طولی کا دماغ گھوم گیا۔

گزشتہ دس ۔۔۔۔۔ دنوں سے وہ اس شخص کی زبان کھلوانے کے لیے ہر زبانی حربہ استعمال کر چکا تھا لیکن چارلس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلا تھا۔

"اگر میں تمہارا مطلوبہ آدمی ہوتا" چارلس نے انسپکٹر طولی کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا "تو بہت پہلے اعتراف کر چکا ہوتا۔ کوئی ایسا شخص جس سے واقعی کوئی جرم سرزد ہوا ہو زیادہ دیر تک اپنے مؤقف پر قائم نہیں رہ سکتا" چارلس نے یہ الزام بھی لگایا کہ انسپکٹر طولی کی عدم موجودگی میں اس کے ماتحت اس سے اعترافِ جرم کرانے کے لیے اسے بُری طرح پیٹتے ہیں لیکن یہ پولیس والے پٹائی اس ماہرانہ انداز میں کرتے ہیں کہ جسم پر کوئی ظاہری نشان نہیں آنے پاتا۔

وہ دسواں دن تھا۔ انسپکٹر طولی اگرچہ میری آندرے اور جلین ڈوسم وغیرہ کے بیانات حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا، لیکن چارلس کے اعتراف کے بغیر انہیں زیادہ اہمیت حاصل نہیں تھی۔ اس کے خیال میں یہ تو ایسا ہی تھا جیسے کسی جھیل کی چھوٹی چھوٹی بے ضرر مچھلیوں کو تو جال میں پھنسا لیا جائے لیکن خطرناک شارک آزاد گھوم رہی ہو۔ اس شام وہ اپنے دفتر کی میز پر سر جھکائے اونگھ رہا تھا کہ دفعتاً سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے ذہن میں اچانک ہی ایک پرانا کیس ابھر آیا تھا۔ اس کیس سے اگرچہ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن طولی نے اس کا تفصیلی مطالعہ ضرور کیا تھا۔ اس نے اردلی کو بلا کر ریکارڈ روم سے پیلے رنگ کی وہ فائل لانے کا حکم دیا جس میں اشوکا ہوٹل کی جیولری شاپ میں جواہرات کی ڈکیتی کے اس کیس کی پوری تفصیل موجود تھی جس میں ہوٹل کی ۔۔۔ ایک امریکی رقاصہ کو کئی دن تک یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک فائل کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نے فون کا ریسیور اٹھا کر ولنگٹن اسپتال کے نمبر ڈائل کیے۔ کچھ دیر تک کسی سے بات کرتا رہا پھر اردلی کو بلا کر حکم دیا کہ ڈینیئل شمٹ کو پیش کیا جائے۔

انسپکٹر طولی کے خیال میں اب فیصلہ کن لمحات آن پہنچے تھے۔

❖❖❖

"کیا تم کبھی اشوکا ہوٹل گئے ہو؟" انسپکٹر طولی کے اس سوال کے جواب میں چارلس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "تو پھر مجھے امید ہے کہ" انسپکٹر طولی معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں ۔۔۔۔ تمہیں جو کچھ بتانے والا ہوں وہ تمہارے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا" پھر وہ اسے بتانے لگا کہ کس طرح ڈاکوؤں نے ہوٹل کی امریکی رقاصہ کو اس کے کمرے میں یرغمال بنا کر کمرے کے فرش میں سوراخ کر کے نیچے جیولری شاپ تک پہنچنے کی کوشش کی تھی اور اس میں ناکام ہونے کے بعد اس کا مرکزی کردار ۔۔۔۔ مسٹر لولو کس طرح ائیر پورٹ پر پولیس کے ہاتھ آتے آتے رہ گیا تھا، لیکن بعد میں ریلوے اسٹیشن پر پکڑا گیا تھا۔ یہ دلچسپ کہانی سنانے کے بعد انسپکٹر طولی چند لمحے عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر اچانک ہی بولا "اپنی قمیص تو اوپر اٹھاؤ ذرا"

"کیا؟" چارلس بُری طرح چونک گیا۔

"میرا مطلب وہی ہے جو میں نے کہا ہے" انسپکٹر طولی کا لہجہ معنی خیز تھا۔ چارلس چند لمحے الجھی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا لیکن بہرحال اسے حکم کی تعمیل تو کرنا ہی پڑی تھی۔ طولی کی نظریں اس کے پیٹ پر جم گئیں۔ اسے اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی تھی۔

"میں یہی نشان دیکھنا چاہتا تھا" اس نے چارلس کے پیٹ پر زخم کے ایک پرانے نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا اپنڈی سائٹس کا آپریشن کب ہوا تھا؟"

"یہ اپنڈی سائٹس کے آپریشن کا نشان نہیں ہے" چارلس نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "میں ایک مرتبہ درخت سے گر گیا تھا۔ یہ زخم اس وقت لگا تھا۔ اگر تم چاہو تو فرانس میں میرے فیملی ڈاکٹر سے اس کی تصدیق کر سکتے ہو"

انسپکٹر طولی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ایسی مسکراہٹ کسی شکاری کے ہونٹوں پر عام طور پر اس وقت آتی ہے جب وہ شکار کو اپنے بچھائے ہوئے جال کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اس کے خیال میں اس تصدیق کے لیے فرانس میں اس کے فیملی ڈاکٹر سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے ہلکی سی تالی بجائی۔ دروازہ کھلا اور ولنگٹن اسپتال کا ایک ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ انسپکٹر طولی کے اشارے پر وہ چارلس کے زخم کے نشان کا معائنہ کرنے لگا پھر اس نے بتایا کہ یہ نشان اپنڈی سائٹس کے آپریشن ہی کا ہے۔ انسپکٹر طولی ڈاکٹر کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"کیا ۱۹۷۱ء میں تم نے ہی اس شخص کا آپریشن کیا تھا؟"

اس نے سوالیہ نگاہوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر کا جواب کچھ غیر واضح تھا۔ اس کے خیال میں یہ آپریشن اسی کے ہاتھ کا تھا۔ شکل بھی کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ گزشتہ پانچ برسوں میں وہ اس قسم کے سیکڑوں آپریشن کر چکا تھا۔

"ذہن پر زور دو۔" انسپکٹر طولی بولا "کیا تم عدالت میں تصدیق کر سکتے ہو کہ ۱۹۷۱ء میں اسپتال کے جیل وارڈ میں اس مریض کا آپریشن تم نے کیا تھا؟"

"نہیں۔" ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلا دیا "میں حلفیہ طور پر ایسا کوئی بیان نہیں دے سکتا جس سے کسی بے گناہ کے پھنسنے کا اندیشہ ہو۔"

ڈاکٹر کے اس بیان نے انسپکٹر طولی کو مایوس کیا تھا وہ اپنے آپ کو ایک بار پھر ناکامی کے دہانے پر محسوس کرنے لگا لیکن وہ بھی ہمت ہارنے والا نہیں تھا۔ وہ دوبارہ کمرے میں آ گیا۔ اس مرتبہ اس کے چہرے کے تاثرات بدلے ہوئے تھے۔ اس نے وہ فائل اٹھالی جس میں بھوانی گورکھ سوبھراج کے بارے میں انٹرپول کا فراہم کردہ مواد ریکارڈ کی صورت میں موجود تھا۔ وہ فائل سے پڑھ پڑھ کر چارلس کو بتانے لگا کہ یہ شخص ڈکیتی، غیر ملکی سیاحوں کو بیہوش کر کے لوٹنے اور قتل کی متعدد ہولناک وارداتوں کے سلسلے میں... تھائی لینڈ، نیپال اور ہانگ کانگ کی پولیس کو مطلوب ہے۔

"میری بات کان کھول کر سن لو۔" اس نے فائل رکھ کر چارلس کے چہرے پر نظریں جما دیں "اگر تم نے مجھ سے تعاون نہ کیا تو میں ان ممالک کی پولیس کے نمائندوں کو بھی یہاں بلا لوں گا تاکہ شناخت سے پوچھ گچھ کے سلسلے میں میری مدد کر سکیں۔"

"سوچ کیا رہے ہو؟" چارلس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اگر اس طرح تمہارا اطمینان ہو سکتا ہے تو ان سب لوگوں کو بھی بلا لو جن سے تمہیں کسی بھی قسم کی مدد کی امید ہو سکتی ہے۔ اس سے یہ تو ثابت ہو جائے گا کہ میں تمہارا مطلوبہ آدمی نہیں ہوں، اور اس طرح کم از کم میری جان تو چھوٹ جائے گی۔"

انسپکٹر طولی چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اردلی کو بلا کر چارلس کو حوالات میں بند کرا دیا اور خود باتھ روم میں گھس گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر بال بناتے ہوئے وہ آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر چونک سا گیا۔ چہرہ ستا ہوا تھا اور کئی دن کی شب بیداری سے آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ دو ہفتوں کی انتھک کوشش کے باوجود وہ چارلس سے ایک لفظ بھی معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ آج اگر چارلس نے زبان نہ کھولی تو کچھ عرصے کے لیے اسے تہاڑ جیل بھیج دے گا۔

اس رات جب وہ چارلس سے پوچھ گچھ کے لیے دفتر پہنچا تو اسے اپنے دل میں کچھ زیادہ خوش فہمی نہیں تھی لیکن اس نے ایک دوسرا طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دفتر پہنچتے ہی اس نے بہترین ہوٹل سے کھانا منگوا کر چارلس کو پیش کیا۔ دو ہفتوں کے دوران پہلی مرتبہ چارلس پوری رغبت سے کھانا کھا رہا تھا۔ انسپکٹر طولی چند لمحے متجسس نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر ہمدردانہ لہجے میں باتیں کرنے لگا اور بہت جلد اسے احساس ہو گیا کہ کسی کی زبان کھلوانے کے لیے ہمدردی اور شفقت سے بہتر اور کوئی رویّہ نہیں ہو سکتا۔ جب اس نے بچوں کے بارے میں دریافت کیا تو چارلس نے جلدی سے جیب سے شوبرا کی تصویر نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔

"یہ شوبرا ہے۔" وہ چہکا "میری بیٹی بہت معصوم اور پیاری سی ہے۔"

"واقعی، یہ تو بالکل اپنے باپ کی طرح ہے۔ بھولی بھالی اور پیاری سی۔" انسپکٹر طولی نے تعریف کی پھر چارلس سے اس کی بیوی کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ چارلس والہانہ انداز میں ہیلن کے بارے میں بتا رہا تھا اور انسپکٹر طولی کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ ہیلن کا نام چارلس کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا .... تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے تک گفتگو کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ طولی اس دوران یہ بھی محسوس کر چکا تھا کہ چارلس محرومیوں کا شکار رہا ہے۔ اسے بچپن میں وہ توجہ اور محبت نہیں ملی جس کا وہ مستحق تھا۔ اپنی پدرانہ شفقت اور ہمدردانہ رویّے کی بدولت چارلس اس کے سامنے موم کی طرح پگھل گیا۔ چارلس کو زندگی میں پہلی مرتبہ ایسی شفقت ملی تھی۔ انسپکٹر طولی کے چہرے میں اسے اس شخص کا چہرہ نظر آ رہا تھا جس کے لیے وہ ترس گیا تھا۔

"تم محض ایک ہمدرد انسان ہی نہیں ایسے باپ بھی ہو جس پر اولاد کو بجا طور پر فخر ہو سکتا ہے۔" چارلس نے کہا "تم ذہین پولیس آفیسر بھی ہو۔ مجھے خیال بھی نہیں تھا کہ ہندوستان میں کبھی پکڑا جاؤں گا تو تم جیسے زیرک و فہیم شخص سے سابقہ پڑے گا۔"

"بدقسمت ہے وہ باپ جس نے تمہاری قدر نہیں کی بیٹا۔" طولی اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے نرم لہجے میں بولا "اگر تم مجھے سب کچھ بتا دو تو تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

چارلس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر اس نے انسپکٹر طولی کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

انسپکٹر طولی نے انٹرپول کے پیرس ہیڈ کوارٹر کو ٹیلیگرام کے ذریعے چارلس سوبھراج اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری سے آگاہ کر دیا۔ جس کے جواب میں انٹرپول نے دنیا بھر کی پولیس کو یہ اطلاع پہنچا دی کہ متعدد سنگین وارداتوں میں ان کے مطلوبہ آدمی

پکڑے جا چکے ہیں۔ تھائی لینڈ پولیس کو بھی چارلس کی گرفتاری کی اطلاع مل چکی تھی۔

❖❖

ملزمان کے بیانات مکمل ہوتے ہی انسپکٹر طولی نے انہیں تہاڑ جیل روانہ کر دیا۔ چارلس ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کی حفاظت کے لیے بھی غیر معمولی انتظام کیا گیا تھا۔ انسپکٹر طولی ایک بار پھر قومی ہیرو کا درجہ اختیار کر چکا تھا۔ اس کے ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ بنکاک، پیرس، نیویارک اور دنیا بھر کے بڑے بڑے اخبارات کے رپورٹر ٹیلی فون پر چارلس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"کیا چارلس سوبھراج نے اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا ہے؟"

"چارلس نے متعدد افراد کو نشہ آور ادویات کھلا کر انہیں لوٹنے کا اعتراف تو کیا ہے لیکن کسی کے قتل کا الزام قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اس کے کہنے کے مطابق اس نے جتنے لوگوں کو بھی بے ہوش کر کے لوٹا تھا ان میں سے کسی کی موت اس کی دی گئی نشہ آور ادویات سے واقع نہیں ہوئی تھی۔ اگر کوئی مرا بھی ہوگا تو اس کی تمام تر ذمّے داری اجے چودھری پر عائد ہوتی ہے۔"

"اجے چودھری کہاں ہے؟ وہ بھی پکڑا گیا یا نہیں؟"

"اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ میری آندرے نے اپنے بیان میں شبہ ظاہر کیا ہے کہ ملائیشیا میں چارلس نے اسے بھی قتل کر کے لاش جلا دی تھی۔"

"چارلس اور اس کا گروہ طویل عرصے سے یہ سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا۔ وہ لوگ اس سے پہلے پکڑے کیوں نہیں گئے تھے؟"

"یہ کہنا غلط ہے کہ وہ کبھی گرفت میں نہیں آیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کئی مرتبہ پکڑا گیا تھا لیکن ہر مرتبہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ انتہائی ذہین اور مکّار شخص ہے۔ اس میں یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ وہ بہت جلد دوسروں کا اعتماد حاصل کر لیتا ہے۔ اس نے کبھی اپنے اصلی شناختی کاغذات استعمال نہیں کیے۔ وہ ہمیشہ جعلی پاسپورٹ پر سفر کرتا رہا ہے۔ وہ دوسروں کے پاسپورٹ پر اس مہارت سے اپنی تصویر لگاتا تھا کہ پاسپورٹ کے جعلی ہونے کا شبہ تک نہیں ہوتا تھا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں باک نہیں کہ اس جیسا شخص آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔"

❖❖

ان پانچوں کو "بین الاقوامی قاتلوں" کے نام سے دہلی کی تہاڑ جیل میں پہنچا دیا گیا تھا جہاں بقول شخصے پہلے ہی تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔

میری آندرے کو جیل کی ایک کوٹھری میں پہنچا دیا گیا۔ سیکورٹی ایکٹ کے تحت اسے قیدیوں کی اس کیٹیگری میں شامل کیا گیا تھا جنہیں لگے بندھے راشن کے علاوہ زندگی کی کوئی اور سہولت میسّر نہیں تھی۔ یہ کھانا بھی صرف اتنی مقدار میں ملتا تھا کہ روح اور جسم کے درمیان رشتہ قائم رہے۔ اسے دن بھر میں ایک چپاتی، آدھا کپ دودھ اور ایک پیالی دال کی ملتی تھی۔ اوڑھنے کو صرف ایک پرانا سا کمبل دیا گیا تھا جس پر میل اور چکنائی کے دھبّوں کے باعث اس کی اصل رنگت شناخت کرنا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ اسے کوئی ذاتی چیز اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہیں تھی اور نہ ہی کسی سے ملاقات کی اجازت تھی۔ اس کے نام کینیڈا سے آنے والے خطوط کئی کئی ہفتے جیل کے دفتر میں روک لیے جاتے۔ بہرحال، یہ بھی غنیمت تھا کہ یہ خطوط ضائع نہیں کیے جاتے تھے۔ اس کی رہائشی کوٹھری کیڑوں مکوڑوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ موٹے موٹے چوہے بھی پوری آزادی سے بھاگتے پھرتے تھے۔

میری آندرے اپنی کوٹھری کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا اور پورا کمرہ لٹو کی طرح گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس جیل میں قیدی عورتوں کی تعداد اگرچہ تین سو سے بھی اوپر تھی لیکن غیر ملکی عورتیں صرف پانچ تھیں۔ پہلی رات میری آندرے کے لیے بڑی قیامت خیز ثابت ہوئی۔ ان قیدی عورتوں کی فلک شگاف چیخیں بار بار اس کا دل دہلا دیتیں جو اس جیل میں رہتے ہوئے اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھیں اور میری آندرے رات بھر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی سوچتی رہی کہ وہ خود ان عورتوں کی صف میں کب شامل ہوگی۔

❖❖

چارلس نے بہت جلد اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر لیا۔ اسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا جیسے اس کی ساری زندگی جیل میں گزری ہو۔ اسے اگرچہ فی الحال قیدِ تنہائی میں رکھا گیا تھا لیکن وہ جیل کے محافظوں کو رشوت دے کر سی کلاس میں دو پاکستانی قیدیوں سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جو پاسپورٹ ایکٹ کے تحت مقررہ میعاد سے زیادہ ہندوستان میں قیام کے جرم کی سزا بھگت رہے تھے۔ چارلس گھنٹوں ان کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہتا۔ پھر چارلس کو پتا چلا کہ ٹیٹ نامی ایک ویت نامی مجرم بھی اس جیل میں سزا بھگت رہا ہے۔ چارلس نے محافظوں کو رشوت دے کر کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا کہ اسے بھی ٹیٹ کی کوٹھری میں بند کر دیا جائے۔

چارلس اور ٹیٹ بڑی گرمجوشی سے ملے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ وہ پیرس اور ہانگ کانگ میں کئی مرتبہ اکٹھے وارداتیں کر چکے تھے۔ ٹیٹ بھی چارلس ہی کی طرح

دُبلا پتلا اور تقریباً اُسی جیسی قد و قامت کا تھا۔ ویت نامی ہونے کے ناتے اس کے چہرے کے نقوش کسی حد تک چارلس سے ملتے تھے۔ وکرم ہوٹل سے چارلس کی گرفتاری سے چند ہفتے پہلے اسے انٹرپول کی طرف سے فراہم کردہ اطلاعات کی بنا پر چارلس ہی کے شُبے میں گرفتار کیا گیا تھا۔ ٹیٹ بھی اگرچہ چارلس ہی کی لائن کا آدمی تھا، لیکن وہ دہلی پولیس کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ، وہ شخص نہیں ہے جو ایشیا کے متعدد ممالک کی پولیس کو مطلوب ہے لیکن ہندوستانی پولیس ہاتھ آئے شکار کو اس قدر آسانی سے چھوڑنے والی نہیں تھی۔ ٹیٹ کو جعلی پاسپورٹ رکھنے کے الزام میں تہاڑ جیل پہنچا دیا گیا تھا۔

ٹیٹ نے پہلی مرتبہ چارلس کو پابہ سلاسل اپنی کوٹھری کی طرف آتے دیکھا تو اس کا خون کھول اٹھا تھا "تم ... تم حرامزادے!" ٹیٹ اسے دیکھتے ہی چیخا "محض تمھاری وجہ سے آج مجھے جیل کی سختیاں اٹھانا پڑ رہی ہیں۔ مجھے تمھارے شبے میں گرفتار کیا گیا تھا۔"

"دیکھ لو۔ میں جیل کی سختیوں میں تمھارا ہاتھ بٹانے کے لیے یہاں آگیا ہوں" چارلس نے کہا اور دونوں قہقہہ لگاتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

چند روز بعد دو نوجوان کینیڈین قیدیوں کو بھی اسی کوٹھری میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی چارلس نے بھی ہاتھ پیر پھیلانا شروع کردیے۔ اس نے رشوت خور محافظوں کے ذریعے جیل کے اندر اور باہر رابطوں کا ایک جال سا بُن دیا تھا۔ انہی محافظوں کے ذریعے وہ ایسی چیزیں بھی جیل میں درآمد کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جنہیں رکھنے کی اجازت بی کلاس کے قیدیوں کو تو کیا اے کلاس قیدیوں کو بھی حاصل نہیں تھی۔ کسی قیدی کو ریڈیو رکھنے کی اجازت نہیں تھی لیکن چارلس کے پاس نہ صرف تین ریڈیو سیٹ تھے بلکہ ایک عدد اسٹیریو ٹیپ ڈیک بھی موجود تھا۔ اسے روزانہ کے کھانے، اور ناشتے میں ضرورت سے زیادہ انڈے، دودھ، آلو اور پیاز وغیرہ کے علاوہ تازہ ذبح کی ہوئی مرغیاں بھی فراہم کی جا رہی تھیں۔ یہاں تک کہ اسے گائے کا گوشت بھی فراہم کیا جا رہا تھا، جس کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے لکھنے پڑھنے کے لیے اپنی ضرورت کے مطابق قلم کاغذ اور کچھ کتابیں بھی مل گئی تھیں۔ ہندوستانی قانون سے متعلق بعض اہم کتابوں کے علاوہ وہ مشہور جرمن فلسفی کارل گستاف ژنگ کی کتاب بھی جیل میں اسمگل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ کتاب پورے ہندوستان میں بین تھی مگر چارلس جیسے پُراسرار شخص کے لیے کوئی بات ناممکن نہ تھی۔ ژنگ اس کا پسندیدہ فلسفی تھا۔ وہ روزانہ رات کو مٹی کے تیل کے دیے کی روشنی میں اس کتاب کا مطالعہ کرتا تھا۔

بھاری بھرکم کینیڈین نوجوان پائرے چارلس کی ان پُراسرار قوّتوں کا قائل ہو گیا تھا کہ وہ جو چیز چاہتا تھا حاصل کر لیتا تھا۔ پائرے اور اس کے ساتھی روب کو پانچ سو ڈالر مالیت کی ہیروئن اسمگل کرنے کے جرم میں دہلی ایئرپورٹ سے گرفتار کیا گیا تھا۔

"تم دونوں احمق ثابت ہوئے ہو" چارلس نے ان کی رُوداد سُننے کے بعد کہا تھا "اگر تم چاہتے تو تھوڑی سی مزید رقم خرچ کر کے ہیروئن لے جانے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ میری طرف دیکھ لو۔ مجھ جیسا خطرناک قیدی جیل میں کس ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر رہا ہے۔"

پائرے اور روب کو واقعی حیرت تھی کہ چارلس کو یہ سب کچھ کیونکر حاصل تھا۔ ان لوازمات کے حصول کے لیے اس کے پاس رقم کہاں سے آتی تھی جب کہ ہر قیدی کی طرح جیل میں داخل ہوتے ہوئے چارلس اور اس کے ساتھیوں سے ہر چیز لے کر دفتر میں جمع کر لی گئی تھی۔ چارلس مسکرا کر رہ گیا۔ اس نے پائرے کے اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس کے اس راز سے صرف ٹیٹ واقف تھا۔ اس نے ایک روز چارلس کو مُنہ سے ایک چھوٹا سا نیلم نکالتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ چارلس نے اسے بتایا تھا کہ اس کے مُنہ میں کم از کم اڑسٹھ قیراط کے نیلم پوشیدہ ہیں جنہیں وہ ضرورت کے وقت برآمد کر سکتا ہے۔ خطرے یا تلاشی کی صورت میں وہ ان ہیروں کو پیٹ میں نگل لیتا ہے۔ اسے یہ پُراسرار قوت بھی حاصل ہے کہ وہ محض اُبکائی لے کر نگلے ہوئے ان قیمتی ہیروں کو اُگل بھی سکتا ہے۔ چارلس نے یہ انتظام بھی کر رکھا تھا کہ جیل کے عورتوں کے حصّے میں موجود میری آندرے کو چائے، انڈے، روسٹ مرغی، اور ضرورت کی دوسری چیزیں پہنچتی رہیں اور ظاہر ہے یہ انتظام بھی اس پُراسرار قوّت کی بدولت ہی تھا، جس پر چارلس کو فخر تھا۔ عدالت میں پہلی پیشی پر چارلس نے مجسٹریٹ کو بتایا تھا کہ میری آندرے بالکل بے گناہ ہے۔ وہ صرف محبّت کی مجرم ہے۔ اس کے علاوہ اس پر اور کوئی جرم عائد نہیں کیا جا سکتا لیکن مجسٹریٹ نے میری آندرے کے لیے چارلس کے اس دفاع میں زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔

❖❖

باربرا اسمتھ اور میری ایلین ایستھر چونکہ سلطانی گواہ بن چکی تھیں، اس لیے جیل میں انہیں بی کلاس دی گئی تھی۔ انہیں اگرچہ میری آندرے سے الگ رکھا گیا تھا مگر ان کی کوٹھری چند گز سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ میری آندرے کے لیے ان سے ملنے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ ابتدائی چند روز تک تو اس پابندی کا خیال رکھا گیا لیکن پھر بعد میں وہ تینوں وقتاً فوقتاً آپس میں ملنے لگیں۔ انہیں اپنا مقدمہ عدالت میں پیش ہونے کا انتظار تھا،

لیکن ایک تو ہندوستانی قانون کی کارروائیوں کا طریقۂ کار، اور دوسرے اندرا گاندھی کے نافذ کردہ داخلی سیکیورٹی ایکٹ کے باعث طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں اور انتظار کی گھڑیاں طوالت اختیار کرتی چلی گئیں۔ دن ہفتے اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے۔ ان پر اب مایوسی کی کیفیت طاری ہو رہی تھی اور ان کی نیّت بھی اب کچھ بدلنے لگی تھی۔

ایک روز میری آندرے نے جیل کے حکّام کو درخواست دی کہ میری ایلین ایستھر جو اس سے زیادہ قدآور اور طاقتور ہے، دو مرتبہ اس کی کوٹھری میں آکر اسے پیٹ چکی ہے۔ ایستھر کا کہنا ہے کہ میری آندرے کی وجہ سے اسے جیل کی ہوا کھانا پڑی تھی۔ میری آندرے نے اپنی درخواست میں لکھا کہ ایک مرتبہ ایلین ایستھر اس کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دینا چاہتی تھی۔ اگر اتفاق سے اس وقت اس سیکشن میں خاتون محافظ موجود نہ ہوتی تو ایستھر یقیناً اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی۔ میری آندرے نے اپنی درخواست میں یہ بھی لکھا تھا کہ وہ اس خونخوار عورت سے خوف محسوس کرنے لگی ہے لہٰذا اس کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔

ایلین ایستھر کو جب میری آندرے کی اس درخواست کا علم ہوا تو اس نے اس سیکشن کی قیدی عورتوں کو میری آندرے کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا کہ میری آندرے کئی مردوں کو قتل کر چکی ہے اور یہ کسی بھی وقت اس سیکشن کی قیدی عورتوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

سیکشن کی قیدی عورتوں کے رویّے کو محسوس کر کے ..... میری آندرے نے جیل حکام کے نام ایک اور درخواست لکھی۔ "ایلین ایستھر قیدی عورتوں کو میرے خلاف بہکا رہی ہے، تمام عورتیں اب مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھنے لگی ہیں جیسے میں ان کی بدترین دشمن ہوں۔ مجھے ان عورتوں سے خوف آنے لگا ہے۔ ڈر کے مارے میں سو بھی نہیں سکتی۔"

جیل حکّام نے اس سلسلے میں جب ایلین ایستھر اور باربرا سے باز پُرس کی تو انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ باربرا نے بڑے تیکھے لہجے میں کہا تھا۔

"ہم تو پہلے ہی پریشان ہیں، اس حرّافہ کو چھیڑ کر دوسری مصیبتوں کو دعوت نہیں دینا چاہتے۔"

انسپکٹر طولی کو جب اس صورتِ حال کا علم ہوا تو اس نے جیل حکّام کو سختی سے ہدایت کر دی کہ ایلین ایستھر اور باربرا اسمتھ پر خصوصی توجّہ دی جائے کیونکہ اس کے کیس کی کامیابی کا تمام تر انحصار انہی دونوں پر تھا۔

✿✿✿

۷ ار ستمبر ۱۹۷۶ء یعنی گرفتاری کے تقریباً دو ماہ بعد چارلس، میری آندرے اور جین ڈوسم کو دہلی کی ایک عدالت میں پیش کیا گیا جہاں مجسٹریٹ نے ان تینوں کو تین تین ہزار ڈالر کی ضمانتیں داخل کرانے کا حکم دیا لیکن مجسٹریٹ کا یہ حکم صرف کاغذی کارروائی اور قانون کی خانہ پُری کے لیے جاری کیا گیا تھا جب کہ اندرا گاندھی کے ایمرجنسی رولز کے تحت ہندوستان کی کوئی عدالت کسی ملزم کو ضمانت پر رہا کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ یوں بھی ہندوستانی پولیس انہیں ضمانت پر رہا ہونے کا موقع فراہم نہیں کرنا چاہتی تھی، کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ ..... ضمانت پر رہا ہوتے ہی یہ لوگ ملک سے فرار ہونے کی کوشش کریں گے۔

عدالت میں پیشی کے روز ایک دلچسپ واقعہ اس وقت رونما ہوا جب میری آندرے، چارلس کو دیکھتے ہی غبّارے کی طرح پھٹ پڑی تھی۔ گرفتاری کے بعد پہلی مرتبہ وہ ایک دوسرے کے سامنے آئے تھے۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیوں کے علاوہ چارلس کے پیروں میں بیڑیاں بھی تھیں۔ اس نے داڑھی بڑھا لی تھی اور جسم پر وہی سوٹ تھا جو وہ گرفتاری کے وقت پہنے ہوئے تھا لیکن مَیل اور سلوٹوں کی وجہ سے اس سوٹ کی بھی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ میری آندرے کو دیکھ کر چارلس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی اور وہ مجسٹریٹ کو مخاطب کر کے میری آندرے کے لیے جیل میں بہتر سہولتوں کی فراہمی کی درخواست کرنے لگا۔

"بند کرو اپنی بکواس" میری آندرے اسے دیکھتے ہوئے چیخی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے "نہیں چاہئیں مجھے تمھاری ہمدردیاں، میری ان مصیبتوں کے ذمّے دار تم اور صرف تم ہو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مجھے کبھی جیل کی ہوا بھی کھانا پڑے گی۔ تمھارے ساتھ رہتے ہوئے مجھے دُکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں ملا اور اب مجھے کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔"

عدالت سے باہر نکلتے ہی بنکاک کے ایک اخبار کے رپورٹر نے میری آندرے سے سوال کیا۔

"کیا یہ درست ہے کہ تم قتل کی ان وارداتوں کے سلسلے میں چارلس سوبھراج کی شریکِ کار تھیں یا اس کے خلاف اپنے دفاع میں کچھ کہنا چاہو گی؟"

"مجھے ان وارداتوں میں ملوّث کرنے کے لیے قانون کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں چارلس کے گروہ میں شامل تھی اور بس" میری آندرے نے جواب دیا۔

میری آندرے دوہری شخصیت کا شکار ہو چکی تھی۔ اپنی کوٹھری میں پہنچنے کے بعد میری آندرے اس میری آندرے سے قطعی مختلف ہو چکی تھی جس نے کمرۂ عدالت میں چارلس کو بُری طرح جھاڑ دیا تھا۔ وہ اپنی کوٹھری میں تنہا بیٹھی اس رویّے پر پچھتا رہی تھی جو اس نے عدالت میں چارلس

سے روا رکھا تھا۔ اس کے دل میں چارلس کے لیے ایک بار پھر محبت کا طوفان اُمڈ رہا تھا۔ اس نے بارہ صفحات پر مشتمل چارلس کے نام ایک طویل خط لکھا اور محافظ کو رشوت دے کر اسے کسی نہ کسی طرح چارلس تک پہنچا دیا۔

وہ تقریباً ایک سال سے تہاڑ جیل میں بند اپنے مقدمے کی کارروائی شروع ہونے کے منتظر تھے لیکن مقدمے کی باقاعدہ کارروائی کے ابھی کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے البتہ انھیں کبھی کبھار پارلیمنٹ اسٹریٹ کورٹ میں کسی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیا جاتا۔ کھنڈر نما اس پُرانی سی عمارت سے ملحق ٹین کی چھت والی اس وسیع و عریض عمارت میں وکیلوں کے دفاتر قائم تھے لیکن ایک روز بلڈوزروں کی مدد سے اس عمارت کو پیوند خاک کر دیا گیا۔ اس کے لیے سرکاری طور پر عمارت کے مخدوش ہونے کا عذر پیش کیا گیا تھا لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے قانون داں اندرا گاندھی کے خلاف متحد ہو چکے تھے اور دہلی کے قلب میں واقع سیکڑوں وکلاء کے دفاتر پر مشتمل اس عمارت کو اندرا گاندھی کی ہدایات پر مسمار کیا گیا تھا تاکہ اس کے مخالف قانون داں زیادہ سے زیادہ اذیت میں مبتلا رہیں۔ عمارت کے ڈھائے جانے کے بعد وکیل پیپل کے درختوں تلے اپنی اپنی بینچ بچھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔

چارلس اور اس کے ساتھیوں کو اس عدالت میں پیش کرنے کے لیے لایا جاتا جس کے باہر پیپل کے درختوں کے نیچے ہر صبح قانون کی منڈی لگتی تھی۔ وکیل اور ان کے منشی عدالت میں آنے والے لوگوں.. کے پیچھے اس طرح لپکتے جیسے چیل گوشت پر جھپٹتی ہے۔ جیل کے قیدیوں کو عام طور پر سیاہ رنگ کی اس بس میں لایا جاتا جس کی کھڑکیوں پر موٹی موٹی آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں، بس سے اتار کر انھیں اس حوالات میں پہنچا دیا جاتا جو کسی زمانے میں فوجی بیرک ہوا کرتی تھی۔ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہونے کیلیے اپنی باری کے انتظار میں میری آندرے خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھی رہتی۔ وہ اپنے ساتھ آنے والی دونوں محافظ عورتوں کو اکثر ماں کہہ کر مخاطب کرتی اور دونوں محافظ عورتیں بھی ہمیشہ اس سے نرمی اور شفقت سے پیش آتیں۔ جیسے ہی لوگوں کو پتا چلتا کہ چارلس اینڈ کمپنی کو عدالت میں پیشی کے لیے لایا گیا ہے تو سیکڑوں لوگ انہیں دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے۔ ایسے موقعے پر لاتعداد مسلح محافظوں کی موجودگی کے باوجود چارلس کو اپنے "بزنس" میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ اس کے جیل کے باہر کے ..... دوست اس موقع پر اس کے قریب رہنے کی کوشش کرتے اور چارلس اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مطلب کی قانون کی کوئی کتاب یا ضرورت کی دوسری چیزیں منگوانے میں کامیاب ہو جاتا لیکن چارلس کے قانونی مشیروں کو اس تک رسائی حاصل کرنے میں خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا بلکہ کبھی تو وکیل کو اپنے قیدیوں سے ملنے کی اجازت بھی نہ دی جاتی۔

دسمبر ۱۹۷۶ء کا کرسمس میری آندرے نے جیل کی کوٹھری میں گزارا۔ اس کا وزن نوّے پونڈ سے بھی کم رہ گیا تھا اور وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی۔ زہریلے کیڑے مکوڑوں نے کاٹ کاٹ کر اس کے جسم کو داغدار بنا دیا تھا۔ اس کی بصارت کمزور ہو رہی تھی، اور اسے خدشہ تھا کہ وہ بینائی سے محروم نہ ہو جائے۔ پچھلے دنوں اس کی چھوٹی بہن ڈینس کینیڈا سے آئی ہوئی تھی لیکن اس کے قیام کے دوران اسے میری آندرے سے صرف دو مرتبہ ملاقات کی اجازت دی گئی تھی اور اب وہ بھی واپس جا چکی تھی۔ حکّام نے پہلے تو ڈینس کو ملاقات کی اجازت دینے سے قطعی انکار کر دیا تھا لیکن جب میری آندرے نے چیخ چیخ کر طوفان کھڑا کر دیا تو اسے صرف اس شرط پر دو ملاقاتوں کی اجازت دی گئی کہ ملاقات کے موقع پر جیل کا کوئی نہ کوئی آفیسر ان کے پاس موجود رہے گا اور وہ صرف انگلش میں بات کریں گی۔

ڈینس پہلی ملاقات پر میری آندرے کو دیکھ کر سکتے میں رہ گئی تھی۔ ایک لمحے کو تو وہ اسے پہچان بھی نہ سکی تھی اور جب وہ ایک دوسرے سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں تو وہاں پر موجود جیل کا آفیسر بھی اس جذباتی منظر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

ڈینس اپنی بہن سے اس قدر مشابہت رکھتی تھی کہ اسے دیکھ کر ایک مرتبہ تو انسپکٹر طولی بھی چکرا گیا تھا۔ انسپکٹر طولی ہی کی مہربانی کی بدولت ڈینس کو ایک پیشی کے موقع پر عدالت میں آنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ اس وقت میری آندرے کے ساتھ چارلس بھی موجود تھا۔ عدالت کا کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا جس میں بید کی بنی ہوئی متعدد کرسیاں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔ ایک دیوار کے قریب کرسی پر نوجوان جج براجمان تھا جس کے سامنے کاؤنٹر نما لمبی میز بچھی ہوئی تھی۔ ملزمان کی پیروی کرنے والے وکلاء فائلیں رکھنے اور اپنی کہنیاں ٹیکنے کے لیے بھی اسی کاؤنٹر کو استعمال کرتے تھے۔ ملزمان اور وکلاء کے علاوہ ملزمان کے ملاقاتی، اخباری نمائندے اور متعدد ملنے سے دلچسپی رکھنے والے لوگ بھی اسی کمرے میں بھرے رہتے تھے۔

ڈینس نے پہلی مرتبہ اس شخص کو دیکھا تھا جو اس کی بہن کی زندگی کی بربادی کا باعث بنا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اور حیرت کے ملے جلے تاثرات تھے۔ چارلس سوبھراج کے بارے میں اس کے تاثرات بھی ملے جلے ہی تھے۔ وہ بیک وقت انتہائی مکار ہونے کے ساتھ معصوم بھی لگ رہا تھا۔ پیشی کے بعد چارلس سرکتا ہوا ڈینس کے قریب آ گیا اور اس کی طرف جھکتے ہوئے فرانسیسی زبان میں سرگوشی کی۔

"میری آندرے جن حالات سے دوچار ہے، مجھے اس کا افسوس ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ اسے کسی نہ کسی طرح اس مصیبت سے نجات دلا دی جائے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" ڈینس نے مدّہم لہجے میں جواب دیا۔

اس کے چند ہی روز بعد ڈینس واپس چلی گئی۔ سال بھی اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ میری آندرے اپنے آپ کو ایک بار پھر تنہا محسوس کرنے لگی۔ چند روز اور گزر گئے۔ ایک دن وہ اپنی کوٹھری میں سر جھکائے بیٹھی تھی کہ ایک آواز سن کر چونک گئی۔

"تو یہ، کیسی غلاظت ہے یہاں۔" میری آندرے نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ وہ ایک نئی قیدی عورت تھی جس کا قد بمشکل پانچ فٹ رہا ہو گا لیکن سرخ و سفید رنگت کے ساتھ وہ خاصی صحتمند تھی۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ اس نے جھٹکا دے کر کمزور و ناتواں سی محافظ عورتوں سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔ "ٹھیک ہے۔ اب مجھے تمھاری رہنمائی کی ضرورت نہیں۔" محافظ عورتیں اسے کوٹھری میں دھکیل کر ہنستی ہوئی واپس چلی گئیں۔

"میرا نام شیکر ہے۔" نووارد لڑکی شیکر میری آندرے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔ میری آندرے نے اگرچہ جواب بھی انگریزی زبان ہی میں دیا تھا لیکن اس کا لہجہ محسوس کر کے شیکر فوراً ہی فرانسیسی میں باتیں کرنے لگی۔ میری آندرے کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اس کی کوٹھری میں آنے والی یہ پہلی قیدی عورت تھی جو اس کی مادری زبان بول سکتی تھی۔

"اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو تم پہلے بھی اس جیل میں آ چکی ہو۔" میری اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"تمھارا اندازہ بالکل درست ہے ڈیئر۔" شیکر بے تکلفانہ انداز میں کہتے ہوئے کوٹھری کا جائزہ لینے لگی۔

اس کوٹھری کے ایک کونے میں ایک اور لڑکی بھی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ دھرما نامی اس لڑکی کا تعلق شمالی افریقہ سے تھا جسے کرنسی کے ناجائز کاروبار کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اسے تہاڑ جیل میں آئے ہوئے تقریباً ایک سال ہو چکا تھا۔ اس کا کیس ابھی تک عدالت میں پیش نہیں ہو سکا تھا اور یہاں کوئی اس کی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ وہ دن بھر دیوار سے ٹیک لگائے اس طرح بڑبڑاتی رہتی کہ آندرے کو بعض اوقات الجھن سی ہونے لگتی اور جب خاموشی اختیار کرتی تو صبح سے شام تک اس کی زبان کو حرکت تک نہ ہوتی۔ شیکر نے گھٹنوں کے بل جھک کر مسکراتے ہوئے دھرما کی طرف دیکھا اور اپنے آپ کو متعارف کرانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ دھرما خونخوار بلّی کی طرح غرّاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئی۔

"اوہو۔" شیکر کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "میں اب یہیں رہوں گی تمھارے ساتھ۔ اگر کبھی مدد کی ضرورت محسوس کرو تو بتا دینا۔"

"تم دوسری مرتبہ جیل میں آئی ہو مگر کیوں؟" میری آندرے نے پوچھا۔

"میں اسمگلر ہوں۔" شیکر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے بتایا کہ چند روز قبل اسے دہلی کے پالم ایئرپورٹ سے گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کے قبضے سے سات کلو حشیش اور تقریباً نصف کلو ہیروئن کے علاوہ تین ہزار کینیڈین ڈالر کی رقم بھی برآمد ہوئی تھی۔ حکام کا خیال تھا کہ وہ اسمگلروں کے کسی بین الاقوامی گروہ کی رکن ہے۔ تقریباً ایک ہفتہ مار پیٹ کے ذریعے اس کے ساتھیوں کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی رہی لیکن جب اس نے کچھ نہیں بتایا تو اسے کچھ عرصے کے لیے تہاڑ جیل بھیج دیا گیا۔

"تہاڑ جیل سے اب تو کچھ لگاؤ ہوتا جا رہا ہے۔" شیکر نے ڈھٹائی سے کہا۔ "اس مرتبہ میں نے یہاں آتے ہی دریافت کیا کہ جیل میں کوئی یورپین عورت موجود ہے یا نہیں۔ میری خواہش پر ہی مجھے تمھارے ساتھ رہنے کے لیے اس کوٹھری میں بھیجا گیا ہے۔"

شیکر نے جلد ہی ثابت کر دکھایا کہ بدترین حالات میں بھی کس طرح زندہ رہا جا سکتا ہے۔ تھوڑی دیر کوٹھری میں رکنے کے بعد شیکر جیل کے معائنے کو نکل گئی اور کئی گھنٹوں بعد جب واپس لوٹی تو کیلے، پیاز، ادرک، آلو اور اسی قسم کی چیزوں سے لدی پھندی تھی۔ اس کے پاس گوشت کا ایک پارچہ بھی تھا۔ اس رات میری آندرے، شیکر اور دھرما نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ جیل میں آنے کے بعد پہلی مرتبہ میری آندرے کو ڈھنگ کا کھانا کھانے کو ملا تھا۔

"کیا واقعی تم نے اتنے آدمیوں کو قتل کیا ہے جن کا تم پر الزام ہے؟" شیکر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بالکل نہیں۔" میری آندرے نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "کسی کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔"

"گڈ۔" شیکر کی آنکھوں میں چمک اُبھر آئی۔ "مجھے یقین ہے کہ تم جھوٹ نہیں بول رہیں۔"

شیکر ہر رات باقاعدگی سے حشیش بھرے سگریٹ پیتی۔ کبھی کبھار اسے افیون بھی مل جاتی۔ تہاڑ جیل میں سزا بھگتنے والی بیشتر عورتیں حشیش یا افیون استعمال کرتی تھیں۔ اس کا انھیں یہ فائدہ ضرور ہوتا تھا کہ رات کو سکون سے سو جاتی تھیں۔ بصورتِ دیگر رات کے سناٹے میں گونجنے والی نیم پاگل عورتوں کی چیخوں اور اپنی ماؤں کے ساتھ جیل میں رہنے والے بچّوں کے رونے بلبلانے کی آوازوں سے ان میں سے آدھی عورتیں تو ضرور پاگل ہو چکی ہوتیں۔

شیکر دن بھر جیل کے مختلف حصّوں میں گھومتی رہتی۔ وہ ایسے ممنوعہ علاقوں میں بھی بے دھڑک چلی جاتی جہاں قیدیوں کو جانے کی... اجازت نہیں تھی۔ "سب لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔ "کوئی محافظ مجھے روکنے کی کوشش کرتا ہے تو میں اس پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتی ہوں۔ پھر کسی کو مجھے ٹوکنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ یہ ہندوستانی لوگ یورپین عورتوں سے بہت ڈرتے ہیں۔"

جنوری میں شدید سردی کی لہر نے دہلی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ تہاڑ جیل کے قیدیوں کی حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی۔ چادر کی طرح پتلے کمبل میں رات گزارنا کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ قیدی رات بھر کمبل میں لپیٹے اکڑوں بیٹھے رہتے۔ جیل کی کوٹھریوں میں اگرچہ آگ جلانے کی اجازت نہیں تھی مگر شیکر جیل کے تمام اصولوں اور قوانین کو توڑنے پر تُلی ہوئی تھی اور وہ روزانہ جیل کے ڈپو سے تھوڑی بہت لکڑیاں لے آتی جو دن بھر کوٹھری میں سُلگتی رہتیں۔ رات بھی اسی طرح ان سُلگتی لکڑیوں کے سامنے بیٹھ کر گزار دی جاتی۔

شیکر کی عمل داری اب وسعت اختیار کر چکی تھی۔ اس نے جیل کے مردانہ حصّے تک بھی رسائی حاصل کر لی تھی جہاں عمدہ قسم کی منشیات دستیاب ہو سکتی تھیں۔ ایک روز اسی طرح جیل کے مردانہ حصّے میں گھومتے ہوئے اس کی ملاقات اپنے ایک پُرانے دوست سے ہو گئی اور اس کا یہ پُرانا دوست چارلس تھا۔ اس نے میری آندرے کو بتایا تو وہ بے چین سی ہو گئی۔ چارلس سے اس کی آخری ملاقات پالیمنٹ اسٹریٹ کورٹ میں ہوئی تھی۔ اس وقت بیڑیوں کی وجہ سے چارلس کی پنڈلیاں اور ٹخنے زخمی ہو چکے تھے لیکن اس کے بعد سے چارلس کے بارے میں اسے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔

"یہاں اس کا نام چارلس سوبھراج ہے لیکن میں اسے کسی اور نام سے جانتی ہوں۔" شیکر نے اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا۔

"وہ کیسا ہے؟" میری آندرے نے بیک وقت کئی سوال کر ڈالے۔ "اسے بیڑیوں سے نجات ملی یا نہیں؟ میرے بارے میں اس نے کوئی بات کی تھی؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔ تمھیں بہت یاد کرتا ہے۔" شیکر نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "جیل میں بند ہونے کے باوجود وہ گاڈ فادر کی طرح اپنی کوٹھری میں بیٹھا پورے برِّ اعظم ایشیا میں اپنے 'کاروبار' کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کے آدمی پورے ایشیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور دہلی شہر میں بھی اس کے لاتعداد کارندے موجود ہیں لیکن جہاں تک میں سمجھ سکی ہوں جیل سے باہر تین چار احمق قسم کے فرانسیسی نوجوان اس کی رہائی کے منتظر ہیں۔ وہ سب کے سب دہلی ہی میں ہیں اور اس کے چھوٹے موٹے کام کر دیتے ہیں۔" شیکر نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ایک گہری سانس لیتے ہوئے بتایا کہ اگر اندرا گاندھی کے داخلی سکیورٹی کے قوانین نافذ نہ ہوتے تو وہ بہت پہلے جیل سے رہائی پا چکی ہوتی۔ پھر اس نے ایک اور گہری سانس بھری۔ "کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اندرا گاندھی جیسی نازک اندام عورت اپنے آپ کو شعلہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گی۔"

ایک روز شیکر نے میری آندرے کو یہ خبر سنائی کہ اس کے نام کینیڈا سے آنے والے سیکڑوں خطوط جیل کے دفتر میں پڑے

ہیں۔ جیل کے ایک آفیسر کے کہنے کے مطابق سیکیورٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہونے والے کسی ملزم کو اس کے خطوط بھی نہیں دیے جا سکتے۔ میری آندرے کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ شیکر کی مدد سے ان خطوط کے حصول کے منصوبے بنانے لگی۔

"ایک منٹ۔" شیکر نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں بعد بولی۔ "یہ تو بہت آسان ہے۔ بھوک ہڑتال سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔"

"اس سے کیا فائدہ ہوگا؟" میری آندرے نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"تھوڑا سا ڈراما ان لوگوں کو ہلا کر رکھ دے گا۔ مجھے یقین ہے کہ بھوک ہڑتال کی خبر کسی نہ کسی طرح اخبارات تک بھی پہنچ جائے گی۔ ہندوستان جیسے ملک میں بھوک ہڑتال کو بڑا موثر ہتھیار سمجھا جاتا ہے۔ اگر تم نے اس قوم کے باپو گاندھی کے بارے میں کچھ پڑھا ہو تو تمھیں یاد ہوگا کہ یہ حربہ اس نے بھی استعمال کیا تھا۔ اگر وہ بوڑھا بھوک ہڑتال سے برٹش راج کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتا ہے تو تم بھی اپنے نام آئے ہوئے خطوط حاصل کر سکتی ہو۔"

میری آندرے کو شیکر کی یہ تجویز پسند آئی اور اس نے ... دوسرے ہی دن جیل کی خاتون محافظ کو بھوک ہڑتال کا الٹی میٹم دے دیا۔ اس نے تین مطالبات پیش کیے تھے۔ نمبر ایک اس کے نام آئے ہوئے تمام خطوط بلا تاخیر اس کے حوالے کیے جائیں۔ نمبر دو، اس کے جرائم کا چونکہ سیاست سے کوئی تعلق نہیں اس لیے اسے ایمرجنسی قوانین سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور نمبر تین یہ کہ اسے چند بنیادی سہولتیں مثلاً لکھنے کی میز، اسٹیشنری اور کوٹھری کی صفائی کے لیے وافر مقدار میں ڈیٹرجنٹ پاؤڈر فراہم کیا جائے تاکہ کوٹھری کو صاف ستھرا رکھ کر زہریلے کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہا جا سکے۔

خاتون محافظ کھانا واپس لے گئی اور اپنے انچارج کو آندرے کے اس الٹی میٹم سے آگاہ کر دیا۔ انچارج محافظ نے میری آندرے سے اس دھمکی کی تصدیق کے بعد اسسٹنٹ وارڈن کو مطلع کر دیا اور اس طرح مختلف مدارج طے کرتی ہوئی یہ خبر جیل کے اعلیٰ افسر تک پہنچ گئی۔ جیل کے افسرِ اعلیٰ رانا وانڈا کی عمر اگرچہ اڑتیس اُنتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی لیکن اس کا جسم بے تحاشا پھیل رہا تھا۔ وہ کسی بھاری بھرکم ڈرم کی طرح لڑھکتا ہوا میری آندرے کے پاس پہنچ گیا۔ ان کے مذاکرات بہت مختصر ثابت ہوئے۔ رانا وانڈا نے میری آندرے کو تنبیہ کی کہ بھوک ہڑتال سے صحت کی بربادی کے سوا اسے کچھ نہیں ملے گا۔

"گڈ۔" رانا وانڈا کے جاتے ہی شیکر نے کہا۔ "مجھے ابھی سے کامیابی کی کچھ امید نظر آنے لگی ہے۔ اسے ڈر ہے کہ تمھاری بھوک ہڑتال کی خبر کہیں اخبارات تک نہ پہنچ جائے۔"

تہاڑ جیل کے کسی قیدی کے لیے بھوک ہڑتال کرنا کچھ زیادہ مشکل اور جان جوکھوں کا کام نہیں۔ بہت کم خوراک ملنے کے باعث وہ تو پہلے ہی فاقہ کشی کا شکار ہوتے ہیں۔ میری آندرے کی بھوک ہڑتال کا پہلا دن خیریت سے گزر گیا۔ اس نے اپنے آپ میں کسی قسم کا کوئی فرق محسوس نہیں کیا تھا۔ پہلے دن کے اختتام پر جیل کی طرف سے اسے اضافی راشن، جس میں پھل اور بھنی ہوئی مرغی وغیرہ بھی شامل تھی، کی پیشکش کی گئی لیکن وہ اپنے مؤقف پر قائم رہی۔ محافظ عورت جب بھی کھانا لے کر آتی، شیکر کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میری آندرے فرش پر لیٹ جاتی اور اپنے آپ پر اس طرح نقاہت طاری کر لیتی جیسے کئی ہفتوں سے فاقہ کشی کا شکار ہو۔

"تمھارا یہ صبر ضرور رنگ لائے گا۔" شیکر اس کی حوصلہ افزائی کرتی۔ "مجھے یقین ہے کہ یہ خبر اخبارات تک بس پہنچنے ہی والی ہے۔ میں چشمِ تصور سے اخبارات کی شہ سرخیاں دیکھ رہی ہوں۔ "کینیڈین لڑکی تہاڑ جیل میں موت کے دہانے پر"۔ دیکھ لینا اخبارات میں ایسی خبریں چھپتے ہی اندرا گاندھی کے وزیر تک دوڑے آئیں گے۔" شیکر نے کہیں سے پوڈر لا کر میری آندرے کے چہرے پر مل دیا تھا جس سے اس کے چہرے کے تاثرات کچھ اور بھی خوفناک ہو گئے تھے۔

پہلے ہفتے کے اختتام تک پہنچتے ہی جیل کے عملے میں کھلبلی سی مچ گئی۔ افسران دن میں کئی کئی مرتبہ کوٹھری کے چکر لگا رہے تھے۔ وہ کبھی اسے سمجھانے کی کوشش کرتے اور کبھی دھمکیوں پر اُتر آتے لیکن میری آندرے اپنے مؤقف پر اڑی رہی۔ بارھویں دن میری آندرے کو اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ جہاں ڈاکٹر نے اسے متنبہ کیا کہ اگر اس نے بھوک ہڑتال جاری رکھی تو اس کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ میری آندرے نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ تہاڑ جیسی جیل میں زندہ رہنے کے بجائے موت کو گلے لگا لینا زیادہ آسان ہوگا۔

"تھوڑا سا کچھ کھا لو۔ صرف ایک ٹکڑا۔" نرس نے بسکٹوں کی ایک پلیٹ آندرے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ بسکٹ غالباً تازہ تھے۔ ان سے اُٹھنے والی خوشبو بڑی اشتہا انگیز تھی۔ آندرے نے نرس کی طرف دیکھا۔ پھر ایک بسکٹ اٹھا کر چھوٹا سا ٹکڑا دانتوں سے کاٹ کر بسکٹ دوبارہ پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولی۔

"بس اب تو خوش ہو؟ کیا اب میں واپس جاسکتی ہوں تاکہ اپنی کوٹھری میں سکون سے مر سکوں؟"

جیل کے وارڈن نے ایک اور حربہ استعمال کیا۔ اس نے چارلس کو بلوا لیا۔ چارلس، میری آندرے کی حالت دیکھ کر سکتے میں رہ گیا۔ اس کی خواہش پر اسے میری آندرے سے تنہائی میں بات کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ وہ میری آندرے کو سمجھانے لگا کہ اسے بھوک ہڑتال ختم کر دینی چاہیے کیونکہ اس کا ناتواں جسم بھوک کی مزید سختی برداشت نہیں کر سکتا۔ چارلس کے فلسفے میں خودکشی حرام تھی اور بھوک ہڑتال بھی خودکشی کی ایک کوشش ہی تھی۔ بالآخر چارلس کو ایک بار پھر جیل کے حکّام سے مذاکرات کرنا پڑے۔ صورتِ حال کی نزاکت کے پیشِ نظر جیل کے افسران نے میری آندرے کے دو مطالبات مان لیے اور جب چارلس نے میری آندرے کو بتایا کہ جیل حکّام نے اس کی ڈاک اس کے حوالے کرنے اور لکھنے کے لیے ضروری اسٹیشنری کی فراہمی پر آمادگی کا اظہار کیا ہے تو چارلس کے اصرار پر میری آندرے نے بھوک ہڑتال ختم کر دی۔ وہ اپنے محبوب کا کہنا تو نہیں ٹال سکتی تھی۔ بھوک ہڑتال ختم کرنے کے اگلے کئی ہفتوں تک میری آندرے کینیڈا سے آنے والے اپنے مدّاحوں کے خطوط پڑھتی رہی۔

اس واقعے کے چند ہی روز بعد شیکر ضمانت پر رہا ہو گئی۔ اس کی ضمانت کی رقم اس کے ایک دوست نے جمع کرائی تھی لیکن شیکر کو اس کا پاسپورٹ نہیں لوٹایا گیا تھا مبادا وہ اپنے کیس کا فیصلہ ہونے سے پہلے ملک سے فرار ہو جائے۔ جیل سے رہائی پاتے ہی وہ میری آندرے کی رہائی کے بارے میں سوچنے لگی۔ میری آندرے کے لیے وہ واقعی پریشان تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح اسے اس مصیبت سے نجات دلانا چاہتی تھی۔

شیکر ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ پارلیمنٹ اسٹریٹ کورٹ کا چکر لگا لیتی۔ اس طرح کبھی کبھار اسے ایک دو لمحوں کے لیے میری آندرے سے ملنے کا موقع بھی مل جاتا۔ البتہ چارلس سوبھراج سے وہ ہمیشہ کترا کر نکل جاتی۔ اس شخص کے لیے اس کے دل میں نفرت بڑھتی جارہی تھی۔

ایک رات وہ شکار کی تلاش میں سیلر زنائٹ کلب پہنچ گئی۔ ہال میں داخل ہوتے ہی اس کی توجہ اس میز کی طرف مبذول ہو گئی جہاں چند نوجوان امریکی سیّاح بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک نوجوان نے اشارے سے اسے بھی اپنی ہی میز پر بلا لیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی شیکر کی توجّہ دائیں طرف بیٹھے ہوئے نوجوان پر مبذول ہو گئی۔ مدّھم روشنی کے باوجود اس امریکی نوجوان کی آنکھوں کی سرخی نمایاں طور پر نظر آرہی تھی۔ وہ ریڈ آئی تھا جو آج ہی جیل سے رہا ہوا تھا۔ امریکی سفارت خانے نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اسے ایک دو دن میں نیا پاسپورٹ جاری کر دیا جائے گا۔ ریڈ آئی بہت خوش تھا کہ اس جہنّم سے نکل رہا تھا۔

شیکر اور ریڈ آئی جلد ہی ایک دوسرے سے بے تکلّف ہو گئے۔ باتوں باتوں میں یہ انکشاف بھی ہوا کہ دونوں تہاڑ جیل کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو چکے تھے اور یہ کہ دونوں میری آندرے اور چارلس کے دوستوں میں سے تھے۔ پھر چارلس سوبھراج ان کی گفتگو کا موضوع بن گیا۔

"اس جیسا شخص آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔" شیکر نے کہا۔ "کوئی اخبار ایسا نہیں جس میں اس کے بارے میں کوئی نہ کوئی خبر موجود نہ ہو۔ جب وہ عدالت میں پیش ہونے کے لیے آتا ہے تو جیل سے باہر اس کے گرگے غلاموں کی طرح اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے چارلس اب زیادہ عرصے جیل میں نہیں رہ سکے گا۔" ریڈ آئی بولا۔ "اس کے پاس تہاڑ جیل کے چھ نقشے موجود ہیں۔ وہ اس جیل کے بارے میں اتنا کچھ جان چکا ہے کہ اسے تعمیر کرنے والے بھی اتنا نہیں جانتے ہوں گے۔ چارلس فرار کا جو منصوبہ بنا رہا ہے، وہ کبھی ناکام نہیں ہو سکتا۔"

یہ محض ریڈ آئی کا خیال تھا کہ چارلس اپنے فرار کے منصوبے میں نہایت آسانی سے کامیاب ہو جائے گا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ تہاڑ جیل میں چارلس پر خصوصی نگاہ رکھی جارہی تھی۔ اس کی نگرانی کرنے والے محافظوں کو جلد جلد تبدیل کیا جارہا تھا۔ ہندوستان کے داخلی سیکیورٹی ایکٹ کی وجہ سے جیل کا اسٹاف کچھ اور بھی بدحواس ہو رہا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے رمیش نامی ایک شخص کو جیل میں لایا گیا تھا۔ اس پر چوری کا الزام تھا لیکن رمیش کا کہنا تھا کہ اسے دشمنی کی بناء پر جھوٹے الزام میں پھنسا کر جیل میں ٹھونسا گیا ہے۔ اس سلسلے میں عدالت نے اس کی ہر اپیل کو مسترد کر دیا تھا۔ قانونی سہارے سے مایوس ہو کر رمیش نے فرار کا منصوبہ بنایا اور جیل کی کوٹھری سے سرنگ کھودنا شروع کر دی۔ وہ بڑی رازداری سے کئی فٹ لمبی سرنگ کھودنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کی سرنگ اب دیوار کے نیچے پہنچ رہی تھی لیکن بدقسمتی سے اس روز جیل کا راشن لانے والا بھاری بھرکم ٹرک جیسے ہی سڑک کے اس حصّے پر پہنچا، جس کے نیچے سرنگ کھودی جاچکی تھی کہ یکایک سڑک بیٹھ گئی اور اس طرح ایک سو تیرہ دن کی شب و روز کی محنت کے بعد رمیش کا یہ راز فاش ہو گیا۔

اس واقعے نے جیل کے اسٹاف میں کھلبلی سی مچا دی تھی۔ بعض افسران سمیت پندرہ محافظوں کو فوری طور پر برطرف کر دیا گیا تھا اور یہ افواہ بھی سنی گئی تھی کہ ہندوستان کی وزیرِاعظم اندرا گاندھی نے جیل کے چیف ایڈمن کو وارننگ دی تھی کہ آئندہ اس قسم کا کوئی واقعہ رونما ہوا تو سیکیورٹی ایکٹ کے تحت اسے بھی جیل کی کسی کوٹھری میں بند کر دیا جائے گا۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے شیکر کو یقین تھا کہ چارلس سوبھراج جیل سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کرے گا۔ البتّہ اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ جیل سے عدالت آتے ہوئے راستے میں یا عدالت کے احاطے میں اگر وہ ایسی کوئی کوشش کرے تو اس میں کامیابی کے امکانات زیادہ روشن تھے۔

"ایک بات یقینی ہے۔" وہ ریڈ آئی کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "چارلس کی فطرت کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ جلّاد کا ہاتھ اپنی گردن تک پہنچنے کی اجازت نہیں دے گا۔ وہ یا تو فرار ہونے کے لیے ایسا طریقہ اختیار کرے گا جو یادگار ثابت ہو یا اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے گا لیکن ایسی صورت میں بھی وہ اکیلا نہیں جائے گا بلکہ لاتعداد لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر مرے گا۔ چارلس اپنا نام تاریخ کے صفحات پر رقم کرانا چاہتا ہے خواہ وہ کسی بھی رنگ میں ہو۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔" ریڈ آئی نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "وہ ایسا ہی ناقابلِ فہم اور عجیب آدمی ہے۔"

"عجیب۔" شیکر نے عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "وہ پاگل ہے، جنونی، دوہری شخصیت کا مالک۔ اوپر کا چارلس ذہین، خوش اخلاق، خوبرو اور دلکش شخصیت کا مالک ہے جبکہ اس کے اندر ایک ایسا چارلس چھپا بیٹھا ہے جو اپنے لیے خطرہ محسوس کرتا ہے تو کسی کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔"

"لیکن چارلس کا کہنا ہے کہ اس نے کبھی کسی کو قتل نہیں کیا۔" ریڈ آئی بولا۔ "وہ کہتا ہے اگر کوئی مرا بھی ہے تو اس کا قاتل وہ نہیں، اجے چودھری ہے۔"

"لیکن سوال یہ ہے کہ اجے چودھری کہاں غائب ہو گیا؟" شیکر تنک کر بولی۔ "پورے ایشیا کی پولیس نے اس کی تلاش میں زمین کا کونا کونا چھان مارا ہے لیکن اس کا کوئی سُراغ نہیں ملا۔ میں یہ بھی نہیں مان سکتی کہ اس نے خودکشی کر لی ہو گی۔" شیکر چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر اپنی گفتگو کا رُخ میری آندرے کی طرف موڑتے ہوئے بولی۔ "میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ میری آندرے قتل کی ان وارداتوں میں ملوث نہیں تھی۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ چارلس کی تمام سرگرمیوں سے واقف رہی ہو لیکن وہ اس کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی تھی۔ اس کے لیے اس جال سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔"

"ممکن ہے تمھارا خیال درست ہو۔" ریڈ آئی نے کہا۔ "لیکن ایک بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آسکی۔ چارلس نے میری آندرے میں کیا دیکھا تھا کہ اس پر فریفتہ ہو بیٹھا۔ شکل و صورت سے تو وہ ایسی نہیں کہ کوئی مرد اس پر دوسری نظر ڈالنے کے بارے میں بھی سوچ سکتا ہو۔"

"بات شکل و صورت کی نہیں۔" شیکر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "چارلس کی فطرت عجیب ہے۔ میری آندرے میں وہ صرف اس لیے دلچسپی لینے پر مجبور ہوا تھا کہ وہ اس سے قطعی مختلف ہے۔ وہ سیدھی سادی، صاف گو، مخلص اور محبّت کرنے والی عورت ہے جب کہ چارلس میں ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ اسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے آلۂ کار کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ وہ جب

اپنے "گاہکوں" سے میری آندرے کا تعارف اپنی بیوی کی حیثیت سے کراتا تو لوگ اس پر اعتماد کر لیتے۔"

ریڈآئی جواب دینے کے بجائے اطراف میں دیکھنے لگا۔ دفعتاً اس کی نظریں ویت نامی بدمعاش ٹیٹ پر جم گئیں جو چند آدمیوں کے ساتھ کونے کی ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے چہروں کو دیکھ کر کہا جاسکتا تھا کہ وہ چند سکّوں کے لیے بھی کسی کو قتل کر سکتے تھے۔ ٹیٹ کو بھی مشروط طور پر ایک روز قبل جیل سے رہائی ملی تھی۔ شیکرنے بھی ٹیٹ اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ لیا۔ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

"یہ سب لوگ ذہنی مریض ہیں۔ ان کی زندگیوں میں خلا ہے۔ ایک ایسا خلا جسے پُر کرنے کی یہ لوگ کوشش بھی نہیں کرتے اور چارلس جیسا شخص نہایت آسانی سے ایسے لوگوں کی خامیوں سے آگاہ ہو جاتا ہے اور پھر ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔" شیکر کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ اسے ایک پاکستانی سے ملنا تھا، جس نے ایک ہزار روپے کے عوض سویڈن کا جعلی پاسپورٹ فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ ریڈآئی نے کہیں نہ کہیں دوبارہ ملنے کا وعدہ کرتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ شیکر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی۔

"میں میری آندرے کو بھی یہاں سے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کروں گی، بشرطیکہ اس سے پہلے چارلس اس کی زندگی کا خاتمہ نہ کر دے۔"

"چارلس، میری آندرے کو قتل نہیں کرے گا۔" ریڈآئی نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ میری آندرے کے بارے میں اپنے آپ کو پہلے ہی مجرم محسوس کر رہا ہے۔"

"بکواس۔" شیکر بولی۔ "وہ میری آندرے کو تہاڑ جیل میں چھوڑ کر فرار کے منصوبے بنا رہا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت تو نہیں کہ وہ میری آندرے کے بارے میں اپنے رویّے پر شرمسار ہے۔ تم میری یہ بات ذہن نشین کر لو کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے ایک بار پھر اس معصوم لڑکی کو استعمال کرے گا۔"

یہ اطلاع انسپکٹر طولی کے لیے بڑی تشویش ناک تھی کہ باربرا اسمتھ اور میری ایلین الیستھر پر چارلس سوبھراج کی طرف سے دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ وہ اپنے پچھلے بیانات سے منحرف ہو جائیں۔ مخبر کی اطلاع کے مطابق چارلس سوبھراج نے ان دونوں لڑکیوں کو دھمکی دی تھی کہ اگر انھوں نے عدالت میں اس کے خلاف بیان دیا تو وہ اپنی موت کے پروانے پر دستخط کرنے کے مترادف ہوگا۔ یہ خبر ملتے ہی انسپکٹر طولی نے تہاڑ جیل کی طرف دوڑ لگا دی لیکن ایلین اور باربرا سے ملاقات کے لیے اسے خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ سیکیورٹی ایکٹ کے تحت کوئی بھی شخص، خواہ وہ کسی اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہی کیوں نہ ہو، متعلقہ مجسٹریٹ کے تحریری اجازت نامے کے بغیر کسی قیدی سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ انسپکٹر طولی سیکیورٹی ایکٹ کی شان میں قصیدے پڑھتا ہوا جیل سپرنٹنڈنٹ کے پاس پہنچ گیا اور بڑی بحث و تمحیص کے بعد اسے ان دونوں لڑکیوں سے ملنے کی اجازت مل سکی تھی۔

باربرا اور ایلین کو جب اس کے سامنے لایا گیا تو وہ انہیں دیکھ کر بُری طرح چونک گیا۔ دونوں کی حالت ابتر تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے انہیں قبر سے نکال کر لایا گیا ہو۔ مقدمے کے ابھی باقاعدہ طور پر عدالت میں پیش ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس میں مزید کئی ماہ بھی لگ سکتے تھے اور انسپکٹر طولی سوچ رہا تھا کہ کیا یہ دونوں لڑکیاں اس وقت تک اپنے اعصاب پر قابو رکھ سکیں گی یا نہیں؟ اور بالفرض اس وقت تک ان کی ذہنی کیفیت درست رہی تو کیا یہ چارلس اور آندرے کے وکیلوں کی جرح کا سامنا کر سکیں گی؟ کیوں کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ان کا کردار داغدار تھا۔ دونوں منشیات کی عادی تھیں اور دونوں چارلس کے گروہ میں شامل تھیں۔ اور محض اپنی جانیں بچانے کے لیے انھوں نے سلطانی گواہ بننا قبول کر لیا تھا اور ظاہر ہے چارلس اور میری آندرے کے وکیل اسی پوائنٹ کو زیادہ اہمیت دیں گے۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ چارلس سوبھراج تم لوگوں کو دھمکانے کی کوشش کر رہا ہے؟" انسپکٹر طولی نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

دونوں لڑکیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر باربرا حسبِ عادت مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں نے سنا ہے کہ چارلس صرف یہ جاننا چاہتا ہے کہ ہم اس کے خلاف عدالت میں کیا بیان دیں گے۔" اس کے قریب کھڑی ہوئی ایلین الیستھر نے سر ہلا کر باربرا کے بیان کی تائید کی۔ انسپکٹر طولی کا رویّہ اگرچہ شروع ہی سے ان دونوں لڑکیوں کے ساتھ ہمدردانہ رہا تھا لیکن وہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ دونوں اس سے خوفزدہ تھیں۔ اس وقت بھی انسپکٹر طولی کے نرم اور ہمدردانہ رویّے کے باوجود ان دونوں میں سے کسی نے یہ انکشاف نہیں کیا کہ انہیں تقریباً روزانہ ہی پُراسرار طریقے پر ایسے گمنام خطوط مل رہے تھے جن میں چارلس کے خلاف زبان بند رکھنے کی تنبیہہ کی گئی تھی۔

"مجھے یقین ہے کہ تم دونوں کسی کی دھمکیوں میں نہیں آؤ گی، اور وقت آنے پر عدالت میں وہی بیان دو گی جس کی قانون کو توقع ہے۔" انسپکٹر طولی نے ایک بار پھر باری باری ان کے چہروں کی طرف دیکھا۔

"میں اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں۔" باربرا مسکرائی۔ "بشرطیکہ یہ طویل انتظار مجھے پاگل نہ کر دے۔"

بنکاک پولیس کے چیف کرنل سمپول نے ایک خط کے ذریعے انسپکٹر طولی سے درخواست کی کہ چارلس اینڈ کمپنی کو تھائی لینڈ کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے۔ خط لکھنے کے چند روز بعد اس نے فون پر بھی انسپکٹر طولی سے اس سلسلے میں بات کی لیکن بدقسمتی سے تھائی لینڈ اور ہندوستان کی حکومتوں کے درمیان مجرموں کی واپسی کا کوئی مُعاہدہ نہیں تھا۔ چارلس سوبھراج کے سلسلے میں سمپول کا تجسّس انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ وہ اس شخص کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتا تھا جس نے طویل عرصے تک تھائی لینڈ میں قتل و غارت کا بازار گرم کیے رکھا تھا۔ بالآخر جب اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی تو وہ خود دہلی پہنچ گیا جہاں انسپکٹر طولی نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ انسپکٹر طولی نے بتایا کہ چارلس سوبھراج اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کو اگرچہ دس ماہ ہو چکے ہیں لیکن اندرا گاندھی کے سیکیورٹی ایکٹ کے باعث کیس ابھی تک باقاعدہ طور پر عدالت میں پیش نہیں ہو سکا۔

"یہ لوگ چونکہ تھائی لینڈ کی حدود میں قتل جیسے لاتعداد سنگین جرائم کا ارتکاب کر چکے ہیں اس لیے میری خواہش ہے کہ ان کے خلاف کیس بھی ہمارے ہی ملک کی کسی عدالت میں چلایا جائے۔" کرنل سمپول نے کہا۔

"ہندوستان میں بھی انھوں نے کچھ سنگین نوعیت کے جرائم کیے ہیں۔" انسپکٹر طولی اس کی بات سمجھتے ہوئے بولا۔ "اور بالفرض یہ لوگ یہاں بے گناہ ثابت ہوئے جس کی امید نہیں، تو میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ انہیں تھائی لینڈ کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے۔"

کرنل سمپول کی خواہش پر تہاڑ جیل میں چارلس سوبھراج سے اس کی ملاقات کا بندوبست کر دیا گیا۔ چارلس تقریباً آدھے گھنٹے تک پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت اس کے سامنے بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر پتھر ہی کی سی سختی تھی۔ اس نے کرنل سمپول کے الزام کی بڑی سختی سے تردید کی۔ "میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" اس کا لہجہ بڑا ٹھوس تھا۔ "میں تو ان لوگوں کو جانتا تک نہیں جن کے قتل کا الزام مجھ پر عائد کیا جا رہا ہے۔"

"میرے پاس پورا ریکارڈ موجود ہے۔" کرنل سمپول نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "اگر تم انہیں جانتے نہیں تھے تو وہ بنکاک میں تمھارے فلیٹ میں کیسے پہنچے تھے؟"

"کیا کہہ سکتا ہوں۔" چارلس نے بے پروائی سے کہا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ "ممکن ہے مجھے پھنسانے کے لیے انہیں کسی نے وہاں پہنچا دیا ہو۔" کرنل سمپول نے گھما پھرا کر اپنے سوالات بار بار دُہرائے مگر چارلس کا جواب ایک ہی تھا۔ "میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔"

"اس جیسا شخص آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔" کرنل سمپول نے اس ملاقات کے بعد تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسے اپنے آپ پر مکمل اعتماد ہے اور کہیں بھی ہاتھ ڈالنے کا موقع نہیں دیتا۔"

میری آندرے کرنل سمپول سے نہیں ملنا چاہتی تھی لیکن انکار کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ اس کے خیال میں بھارتی پولیس کا سلوک ہی کم اذیّت ناک نہیں تھا کہ اب مزید اذیّت کے لیے دوسروں کو بھی بلا لیا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں غصّے کی شدّت سے سُلگ رہی تھیں۔

"میرے وکیل سے بات کرو۔" وہ ہر سوال کے جواب میں یہی جملہ دُہرا دیتی۔ "دنیا کا کوئی قانون مجھے تمھارے سوالوں کے جواب دینے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ میں تھک چکی ہوں، تنگ آگئی ہوں پولیس کی ان کارروائیوں سے۔"

"تمھاری طبیعت کیسی ہے؟ یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟" کرنل سمپول نے ایک اور حربہ استعمال کیا۔

میری آندرے چونک سی گئی۔ ہندوستان کی پولیس سے تعلق رکھنے والے کسی شخص نے آج تک اس سے اس قسم کا کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ "ٹھیک ہوں۔" وہ تنک کر بولی۔ "میری صحت ویسی ہی ہے جیسی جیل میں رہنے والے کسی شریف آدمی کی ہونا چاہیے۔ اس جیل کے پالتو چوہوں نے جینا حرام کر رکھا ہے۔ رات کو جب بھی آنکھ لگتی ہے یہ خونخوار چوہے بڑی آزادی سے جسم کو روندنے لگتے ہیں اور کھٹمل اور کیڑے مکوڑے ہر چیز دن میں کئی مرتبہ ڈٹرجنٹ سے دھونے کے باوجود خون چوستے رہتے ہیں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے بازو اور ٹانگیں دکھائیں جن پر لاتعداد سرخ نشان نظر آ رہے تھے۔

کرنل سمپول چند لمحے ہمدردی کا اظہار کرتا رہا پھر نرم لہجے میں بولا۔ "بالفرض ہندوستان کی حکومت سے کوئی مُعاملہ طے پا جائے، اور تمہیں اور چارلس سوبھراج کو تھائی لینڈ کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے تو کیا تم سلطانی گواہ بننا پسند کرو گی؟"

"کیا ایسی صورت میں مجھے رہائی مل جائے گی؟" میری آندرے نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" کرنل سمپول نے دیانتداری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "اس سلسلے میں مجھے حکّام بالا سے بات کرنا پڑے گی۔ ممکن ہے اس مسئلے کا کوئی حل نکل ہی آئے۔"

میری آندرے نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر ایک موقع مل رہا ہے تو اس سے فائدہ ضرور اٹھانا چاہیے۔ یوں بھی چارلس سے اس کا لگاؤ اب کم ہوتا جا رہا تھا۔

اس سے اب کسی بھلائی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

وہ محتاط لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولی" ہندوستان کی پولیس اس معاملے میں مجھے پہلے ہی دھوکا دے چکی ہے۔ جس وقت مجھے گرفتار کیا گیا میں بیمار تھی اور پولیس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں چارلس کے خلاف بیان دُوں تو مجھے چھوڑ دیا جائے گا۔ انھوں نے میرا بیان انگریزی زبان میں تحریر کیا تھا۔ میری مادری زبان فرانسیسی ہے۔ میں انگریزی بول تو سکتی ہوں لیکن کسی تحریر کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتی۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ میرا وہ بیان نہ صرف چارلس بلکہ میرے بھی خلاف تھا۔"

" ہم تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیں گے " کرنل سمپول نے کہتے ہوئے ملاقات ختم کردی اور اسی روز تھائی لینڈ روانہ ہوگیا۔

چارلس سوبھراج کے منصوبے میں کوئی جھول نہیں تھا۔ اگر قیدیوں میں موجود ایک مخبر نے جیل کے حکام کو اس کے منصوبے کی اطلاع نہ دی ہوتی تو چارلس کسی دشواری کے بغیر بڑے اطمینان سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا لیکن یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ جس دن اس نے فرار کے اس منصوبے پر عمل کرنے کا پروگرام بنایا تھا اسی روز صبح سویرے مسلح محافظوں کا ایک دستہ اس کی کوٹھری میں گھس آیا۔ چارلس اس وقت دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ایک محافظ نے اسے اُٹھا کر دونوں بازو پشت پر جکڑ لیے، دوسرے نے رائفل کی نال اس کی گردن سے لگا دی اور باقی کوٹھری کی تلاشی لینے لگے۔ جس طرح وہ کام کر رہے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پہلے ہی سے جانتے تھے کہ انہیں جس چیز کی تلاش تھی وہ کہاں مل سکتی تھی۔

ایک طرف دیوار میں کیل پر خاکی رنگ کی ایک قمیص ٹنگی ہوئی تھی۔ محافظ نے قمیص اپنے قبضے میں کرلی۔ دوسرے کونے میں خاکی رنگ کی ایک پتلون بھی مل گئی۔ دیوار میں اینٹوں کے درمیان ایک چھوٹی سی دراڑ سے چند فوجی تمغے اور ایک فوجی میڈل بھی مل گیا۔ محافظوں نے کوٹھری کے ایک کونے کی زمین کھود کر ہارڈ بورڈ کا ایک ڈبہ بھی برآمد کر لیا جس میں وِگ، نقلی مونچھیں، پگڑی اور اسی قسم کی دوسری چیزیں موجود تھیں۔ ان تمام چیزوں کو دیکھ کر کوئی جاہل بھی سمجھ سکتا تھا کہ یہ کسی فوجی آفیسر کی مکمل یونیفارم تھی۔ گتّے کے ڈبے میں کاغذوں کی تہہ کے نیچے پوشیدہ آٹھ ہزار روپے کے کرنسی نوٹ بھی محافظوں کے ہاتھ لگ گئے۔ یہ تمام نوٹ بالکل نئے تھے جیسے ابھی ابھی بنک سے نکلوائے گئے ہوں۔ ان تمام چیزوں کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا تھا کہ چارلس کا جیل سے فرار کا منصوبہ واقعی شاندار تھا۔ وہ فوجی آفیسر کی وردی میں بڑے اطمینان سے ٹہلتا ہوا گیٹ سے نکل سکتا تھا اور کسی محافظ کو اسے روکنے کی جرأت بھی نہ ہوتی۔

جیل کے حکّام کو یقین تھا کہ چارلس نے یہ تمام چیزیں جیل سے باہر موجود اپنے ساتھیوں کی مدد سے جیل میں اسمگل کی ہوں گی۔ لیکن چارلس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ ان چیزوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی اسے یہ علم ہے کہ یہ چیزیں اس کی کوٹھری میں کس طرح پہنچی تھیں۔ اس کے احتجاج کے باوجود سزا کے طور پر چند ہفتوں کے لیے اسے قیدِ تنہائی میں ڈال دیا گیا۔ اس کے بعد اسے کبھی کسی ایک کوٹھری میں نہیں رکھا گیا۔ ہر تیسرے چوتھے دن اس کی کوٹھری تبدیل کر دی جاتی۔ انسپکٹر طولی کو جب اس واقعے کی اطلاع ملی تو اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔ اسے یقین تھا کہ اگر چارلس کا راز فاش نہ ہو جاتا تو وہ سکھ فوجی افسر کی وردی میں جیل سے نکل جانے میں کامیاب ہو جاتا اور اس کے ساتھ ہی جیل کے عملے پر قیامت ٹوٹ پڑتی اور عین ممکن ہے کہ وزیرِ قانون بھی اس کی زد میں آجاتا۔

" اگر یہی صورتِ حال رہی تو میں شاید زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکوں " ایلین نے کراہتے ہوئے کہا۔

" میں بھی اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی ہوں " باربرا کے منہ سے بھی کراہ سی نکلی۔ وہ دونوں ہر وقت اس اذیت ناک صورتِ حال پر باتیں کرتی رہتیں۔ انھوں نے تو یہ سوچ کر سلطانی گواہ بننا قبول کیا تھا کہ عدالت میں پہلی پیشی کے فوراً بعد ان کے لیے آزادی کے دروازے کھول دیے جائیں گے لیکن ایک سال گزر چکا تھا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ آئندہ کب تک انہیں جیل میں سڑنا پڑے گا۔

اس دوران باربرا کو لندن سے وقتاً فوقتاً لکھے جانے والے چند خطوط بھی ملے تھے لیکن ان خطوط نے بھی جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ اس کے باپ نے اسے کوئی تسلّی دینے کے بجائے ہر خط میں.. سرزنش کی تھی۔ وہ دونوں صورتِ حال سے اس حد تک مایوس ہو چکی تھیں کہ خودکشی کے بارے میں سوچنے لگیں۔ پہلے بات وقت گزاری کے لیے محض مذاق میں شروع ہوئی تھی لیکن پھر وہ سنجیدگی سے اپنے ہاتھوں اپنی زندگیوں کے خاتمے کے منصوبے بنانے لگیں۔ ایلین کے خیال میں خودکشی کے لیے اُسترے سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی تھی لیکن جیل میں کسی قیدی کے پاس ریزر بلیڈ نام کی کوئی چیز نہیں تھی مگر رشوت دے کر ایسی کوئی بھی چیز حاصل کی جاسکتی تھی۔ ان دونوں کے پاس چند سو روپے موجود تھے جو انھوں نے کسی ہنگامی صورتِ حال کے لیے چھپا رکھے تھے۔ باربرا نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کا مشورہ دیا تھا۔ اگرچہ اس مقصد کے لیے رسّی بھی موجود نہیں تھی لیکن گلے میں کمبل کی گرہ لگا کر بھی زندگی کا خاتمہ کیا جاسکتا تھا مگر ایلین نے اس کا یہ خیال مسترد کر دیا کیونکہ خودکشی کا یہ طریقہ نہ صرف

تکلیف دہ تھا بلکہ کامیابی بھی مخدوش تھی۔

ان کی موت کی خواہش شدید سے شدید تر ہوتی جارہی تھی، لیکن کوئی کارآمد اور مفید طریقہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس دوران ایلین کو جیل کے اسپتال میں کام کرنے کا موقع مل گیا۔ اسپتال میں نرسوں کی کمی کے باعث جیل کے حکّام نے ایلین کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ڈیوٹی کے دوران اسپتال میں اس کے کام سے سب ہی مطمئن تھے۔ وہ ایک تربیت یافتہ نرس تھی اور اسے اپنے کام میں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ وہ خود بھی اپنے کام سے مطمئن تھی اور حقیقت تو یہ تھی کہ اسے بڑا لطف آرہا تھا۔ اگر کراچی میں ہاکس بے کے ساحل پر چارلس سوبھراج سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو ممکن ہے اس وقت جیل میں سڑنے کے بجائے کسی اسپتال میں نرس کی حیثیت سے باقاعدہ کام کر رہی ہوتی۔ وہ ان لمحات کو کوسنے لگی جب چارلس سے ملاقات ہوئی تھی لیکن اب پچھتانے یا سوچنے کا وقت نکل چکا تھا۔

ایک دن جب وہ اسپتال سے لوٹی تو باربرا کو ایک طرف لے گئی اور دونوں دیر تک سرگوشیوں میں باتیں کرتی رہیں۔ اس روز اسپتال میں کام کرنے والی ایک اور قیدی لڑکی نے اسپتال کی ادویات والی الماری کا تالا توڑ ڈالا تھا۔ اسے غالباً مارفین کی تلاش تھی لیکن اتفاق سے ایلین ادھر آنکلی ــــ قدموں کی آواز سن کر وہ لڑکی الماری کو جوں کا توں کھلا چھوڑ کر بھاگ نکلی تھی۔ ایلین نے الماری بند کر کے تالا اس طرح لٹکا دیا تھا کہ اسے چھوئے بغیر کھلے ہونے کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔

" الماری میں خواب آور گولیاں اتنی مقدار میں موجود ہیں کہ اس جیل کی کم از کم نصف آبادی کو موت کی نیند سلایا جاسکتا ہے۔" ایلین کا لہجہ معنی خیز تھا" کہو کیا اب بھی تم خودکشی کے ارادے پر قائم ہو یا...؟ "

باربرا کی آنکھوں میں وحشت سی اُبھر آئی۔ وہ چند لمحے عجیب سی نگاہوں سے ایلین کو دیکھتی رہی پھر خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسی شام دونوں اسپتال پہنچ گئیں۔ ایلین نے باربرا کو باہر رُک کر نگرانی کی ذمّے داری سونپی اور خود اندر گھس گئی۔ دبے قدموں راہداری میں چلتی ہوئی ایلین دواؤں کے اسٹور والے کمرے کے سامنے رُک گئی۔ اس نے بڑی احتیاط سے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولنا چاہا لیکن دروازہ مقفّل تھا۔ وہ اپنی قسمت کو کوسنے لگی۔ اسٹور کا دروازہ عام طور پر اس وقت کھلا رہتا تھا کیونکہ مریضوں کو شام کی دوا دینے . . . . کے لیے نرسیں مطلوبہ دوائیں لینے آیا کرتی تھیں۔ دفعتاً ایلین کے ذہن میں ایک اور خیال اُبھرا۔ کامیابی کا امکان اگرچہ زیادہ واضح نہیں تھا لیکن کوشش کر دیکھنے میں کوئی ہرج بھی..

نہیں تھا۔ وہ ہیڈ نرس کے پاس پہنچ گئی اور یہ کہہ کر اسٹور کی چابی مانگی کہ ایک قیدی عورت کے زخمی کان کی صفائی کے لیے اسے کاٹن کی ضرورت ہے۔ زہریلے کیڑے مکوڑوں کے کاٹنے سے قیدیوں میں اس قسم کی شکایات عام تھیں۔ ہیڈ نرس مشتبہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ایلین نے بڑے پُرسکون لہجے میں بتایا کہ اگر تھوڑی سی توجّہ سے کوٹھری ہی میں اس عورت کی تکلیف کا علاج ہو سکتا ہے تو اسے اسپتال لانے کی ضرورت نہیں پڑے گی جہاں پہلے ہی مریضوں کی بھرمار ہے۔ بات ہیڈ نرس کی سمجھ میں آگئی اور اس نے کوئی... جرح کیے بغیر اسٹور روم کی چابی ایلین کے حوالے کر دی۔

اسٹور میں داخل ہوتے ہی ایلین تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی الماری کی طرف بڑھ گئی جس کا ٹوٹا ہوا تالا بدستور اسی طرح کنڈے میں لٹکا ہوا تھا۔ جس کا صاف مطلب یہی تھا کہ ابھی تک اس تالے پر کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ ایلین نے بڑے اطمینان سے الماری کا دروازہ کھولا اور باربی چوریٹ کے ڈبّے سے مٹھی بھر گولیاں نکال کر نرسنگ کے دستانوں میں ڈال لیں۔ اس وقت اس کا پورا جسم خزاں رسیدہ پتّے کی طرح ہولے ہولے کپکپا رہا تھا اور وہ اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ سب سے بڑی مشکل حل ہو چکی تھی اور اب اسے سکون کی موت مرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا لیکن وہ جیسے ہی دروازے کی طرف پلٹی ریذیڈنٹ میڈیکل آفیسر دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ایلین کو پہچان لیا مگر اسے فوری طور پر ایلین پر کوئی شبہ نہ ہو سکا۔ اس کے دریافت کرنے پر ایلین نے قیدی عورت کے زخمی کان والی وہی کہانی دہرا دی جو وہ ہیڈ نرس کو بھی سنا چکی تھی۔ ہیڈ نرس کی طرح ڈاکٹر نے بھی اس کی بات کا یقین کر لیا۔ مطمئن ہونے کے بعد ایلین نے دریافت کیا کہ اگر مریضوں کی دیکھ بھال کے سلسلے میں اس کی مدد کی ضرورت ہو تو وہ رُک جائے مگر ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلا دیا اور بتایا کہ کچھ دیر پہلے اسے ادویات والی الماری کا تالا ٹوٹا ہوا ملنے کی اطلاع ملی تھی اور وہ یہ دیکھنے آیا تھا کہ کسی نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی دوا تو نہیں چرالی تھی۔

" الماری کا تالا ٹوٹا دیکھ کر مجھے بھی شبہ ہوا تھا " ایلین الیستھر نے پُرسکون لہجے میں کہا" میں نے الماری چیک کر لی ہے ــ سب ٹھیک ہے "

ڈاکٹر نے مشتبہ نگاہوں سے ایلین کی طرف دیکھا لیکن کوئی جرح کرنے کے بجائے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ باربرا اسپتال کے باہر اس کی منتظر تھی۔

" میں گولیاں لے آئی ہوں " ایلین نے سرگوشی میں بتایا۔ " لیکن عین وقت پر آر۔ ایم۔ او بھی کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ ابھی تک

تو اسے مجھ پر کوئی شبہ نہیں ہوا تھا لیکن جیسے ہی کوئی مشکوک بات اس کے ذہن میں آئی وہ مجھے گھیرنے کی کوشش کرے گا۔ اب جلدی سے یہاں سے نکل چلو۔"

کسی نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی اور وہ اطمینان سے چلتی ہوئی اپنی کوٹھری میں پہنچ گئیں۔ ایلین کے دل کو دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ کسی بھی وقت کوئی آسکتا ہے لیکن شام کا اندھیرا پھیلنے تک جب ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ٹھیک سات بجے محافظ کوٹھریوں کے دروازے بند کر دیا کرتے تھے۔ ابھی سات نہیں بجے تھے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور دوسری کوٹھریوں میں رہنے والی قیدی عورتوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ایلین اور باربرا عام طور پر قیدی عورتوں سے بڑے اخلاق سے پیش آتیں اور گھنٹوں ان کے پاس بیٹھی رہتیں لیکن آج وہ اپنی کوٹھری میں آنے والی ہر عورت کو بڑی رکھائی سے فوراً ہی واپس چلے جانے پر مجبور کر رہی تھیں۔ بالآخر سات بج گئے اور کوٹھریوں کے دروازے بند ہونے لگے۔ جب ان کی کوٹھری کا دروازہ مقفل کیا گیا تو دونوں نے حسبِ معمول ہاتھ ہلا کر محافظ عورت کو شب بخیر کہا اور اس کے کچھ ہی دیر بعد ایلین نے آدھی گولیاں باربرا کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

"مجھے افسوس ہے کہ انہیں نگلنے کیلیے پانی یا اسی قسم کی کوئی اور چیز میسّر نہیں ہے۔" ایلین نے کہتے ہوئے ایک گولی زبان پر رکھ کر نگل لی، پھر دوسری اور پھر بہت سی گولیاں بیک وقت منہ میں ڈال کر انہیں چوستے ہوئے نگلنے کی کوشش کرنے لگی۔ ذائقہ اگرچہ کسیلا سا تھا مگر ظاہر ہے اب اسے ذائقے کی کیا پروا ہو سکتی تھی۔

باربرا دیوار سے ٹیک لگائے دونوں پیر پھیلائے بیٹھی تھی۔ وہ چند لمحے ایلین کی طرف دیکھتی رہی پھر خود بھی گولیاں نگلنے لگی۔ اس کا حلق خشک تھا اور گولیاں نگلنے میں اسے خاصی دشواری پیش آ رہی تھی لیکن پھر بھی کچھ دیر میں تقریباً اسّی گولیاں حلق سے اتارنے میں کامیاب ہو گئی۔ دفعتاً ایلین اپنی جگہ سے اٹھ کر کوٹھری کے دوسرے کونے میں چلی گئی جہاں ایک چھوٹے سے زنگ آلود ڈبّے میں مچھر اور کیڑے مکوڑے مارنے کی دوا پڑی ہوئی تھی۔ یہ دوا بھی کئی روز پہلے ایلین اسپتال سے چرا کر لائی تھی۔ ڈبّہ تقریباً بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے یہ بدبودار سیّال آدھا آدھا پی لیا۔

"میں نے زندگی میں کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی۔ خدا ہم پر رحم کرے۔" باربرا بڑبڑائی۔

"خدا نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا۔" ایلین نے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ گولیوں نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ ایلین آنکھیں کھلی رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ ان دونوں نے گولیاں نگلنے سے پہلے مختصر سے خطوط لکھ دیے تھے جن میں جیل کے انسانیت سوز حالات کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان کی پولیس کو اپنی موت کا ذمّے دار ٹھہرایا تھا۔ باربرا کو اچانک ہی کوئی بات یاد آگئی جسے وہ اپنے خط میں لکھنا چاہتی تھی۔ وہ گھسٹتی ہوئی اس جگہ پہنچ گئی جہاں کاغذ رکھا ہوا تھا۔ اس نے پنسل اٹھا کر چند الفاظ گھسیٹ دیے "چارلس سوبھراج دنیا کا خوفناک ترین آدمی ہے۔ لعنت ہو اس پر۔"

پنسل رکھنے کے ساتھ ہی وہ لڑھک گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور وہ اپنے آپ کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

ایک سال کے اذیّت ناک انتظار کے بعد ۴ جولائی ۱۹۷۷ء کو ان کے مقدمے کی باقاعدہ سماعت شروع ہو گئی۔ اس روز دہلی کے شہری مختلف انداز سے ملے جلے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ انتخابات میں اندرا گاندھی کی شکست ہندوستان کے بے شمار لوگوں کے لیے خوشی کا پیغام لائی تھی۔ جگہ جگہ مٹھائی تقسیم کی جا رہی تھی۔ رات کو اس قدر آتشبازی چھوڑی گئی کہ آسمان پر ہر طرف چنگاریاں سی پھوٹتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ یہ خبر بھی گرم تھی کہ اپنے دورِ حکومت میں اختیارات کے ناجائز استعمال اور بے شمار بدعنوانیوں کے سلسلے میں اندرا گاندھی کے خلاف باقاعدہ قانونی چارہ جوئی کی جانے والی ہے۔ دہلی میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جنہیں اندرا گاندھی کی شکست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کی توجہ تو چارلس سوبھراج اینڈ کمپنی کے خلاف اس مقدمے پر تھی جو اب باقاعدہ طور پر سماعت کے لیے عدالت میں پیش کر دیا گیا تھا۔ چارلس سوبھراج، میری آندرے اور ان کے فرانسیسی ساتھی جین ڈوسم پر فرانسیسی سیاح جین سولومن کے قتل کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ قانون سے تعلق رکھنے والے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہ کیس ایک مہینہ یا زیادہ سے زیادہ چھ ہفتوں میں ختم ہو جائے گا کیونکہ ملزمان کے خلاف استغاثے کے پاس ایسی ٹھوس شہادتیں موجود تھیں جن کی بنا پر مجسٹریٹ کو فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔

مجسٹریٹ کے سامنے اس پیشی کے بعد چارلس سوبھراج کا یہ مقدمہ پرانی دلّی کے تیس ہزاری کورٹ میں منتقل کر دیا گیا۔ پتھروں کی بنی ہوئی یہ پرانی عمارت اس لحاظ سے منفرد تھی کہ یہاں بعض تاریخی نوعیت کے مقدمات بھی فیصل ہو چکے تھے۔ اس عمارت کی تنگ و سرنگ نما راہداریاں دن میں بھی نیم تاریک رہتیں۔ راہداریوں کی بینچوں پر زیادہ تر بھکاری قابض رہتے یا پھر وکیلوں کے منشی موٹی موٹی فائلیں پھیلائے بیٹھے رہتے۔

میری آندرے کی طرف سے عدالت میں دو وکیل پیش

ہوئے تھے۔ ہندوستان کے ان چوٹی کے وکیلوں کا انتخاب کینیڈین قانون دان ریمنڈ نے کیا تھا۔ ان میں سے ایک ایس این چودھری تھا۔ وہ طویل قامت دبلا پتلا شخص تھا۔ چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی۔ اس پر وکیل کے بجائے پادری ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ وہ عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد بالآخر اس کیس کو بھی باقاعدہ سماعت کے لیے منتخب کر لیا گیا حالانکہ چارلس سوبھراج کا یہ مقدمہ آج سے بہت پہلے پیش ہو جانا چاہیے تھا لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ یہاں قائم ہونے والی ہر حکومت نے قانون کو اپنے ہاتھوں کا کھلونا سمجھا اور اس سے ہمیشہ نامناسب برتاؤ کیا جاتا رہا۔ ہر حکومت کو قانون اور عدالتوں سے زیادہ پارلیمنٹ سے دلچسپی رہی ہے۔ ایسی صورت میں..."

ایس این چودھری اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا جہاں ایک دم مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ سنائی دینے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ ابھر آئی۔ چند آدمیوں کے جلو میں اس کا دوسرا ساتھی، میری آندرے کا دوسرا وکیل فرینک انتھونی کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ فرینک انتھونی بھی اگرچہ اسی طرح دبلا پتلا ہی تھا لیکن عمر اور پیشے میں اس سے کہیں سینئر تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ انتھونی کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس نے آج تک کسی مقدمے میں شکست نہیں کھائی تھی۔ اس کیس میں گزشتہ ایک سال کے دوران وہ اگرچہ باقاعدہ طور پہ عدالت میں پیش نہیں ہوا تھا لیکن ہر پیشی پہ ہونے والی کارروائی کی ایک ایک تفصیل اس کے ذہن میں محفوظ تھی۔ اس کی ذہانت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ وہ ہر کیس میں کوئی نہ کوئی کمزوری یا خلا تلاش کر لیتا اور پھر اس معمولی سے نقطے کو بنیاد بنا کر استغاثے کی دھجیاں اڑا کے رکھ دیتا۔ پولیس اور سرکاری وکیل اس کے نام ہی سے گھبراتے تھے۔ قتل جیسے کسی کیس میں تو یہ لوگ اور بھی محتاط رہتے۔

استغاثہ کیس پر زیادہ ریسرچ نہیں کرتا۔ اسے صرف ایف آئی آر پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی ایسی شہادت کو چھپا کر رکھتے ہیں جسے عین وقت پر پیش کر کے کیس کا رخ اپنے حق میں موڑنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ملزمان کے وکیلِ صفائی چونکہ ایک ایک نقطے پر تحقیق و ریسرچ کرتے ہیں، اس لیے استغاثہ کی یہ شہادتیں بھی ان کے ٹھوس دلائل اور جرح کے سامنے ریت کی دیواریں ثابت ہوتی ہیں اور انتھونی بھی کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ کمرۂ عدالت میں چارلس کا وکیل اوپندر سنگھ بھی موجود تھا جو چارلس کی درخواست پر اس کے باپ بھوانی سوبھراج سے ملاقات کے لیے سائیگون بھی جا چکا تھا۔ یہ کئی سال پہلے کی بات تھی۔ اس کیس کے شروع میں بھی چارلس نے اسی کی خدمات حاصل کی تھیں اور پھر متعدد مواقع پر اوپندر سنگھ کو اپنے کیس سے برطرف کر چکا تھا لیکن وہ اس کی پیروی پر بضد تھا کیونکہ اس کے خیال میں یہ بہت بڑا کیس تھا اور اس میں کامیابی اس کی شہرت میں چار چاند لگا سکتی تھی۔

وکلا عدالت میں آ چکے تھے۔ کچھ دیر بعد ملزمان ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کے زیور پہنے کمرۂ عدالت میں داخل ہوئے۔ ان کی حفاظت کے لیے بڑے سخت انتظامات کیے گئے تھے۔ سب سے آگے جین ڈوسم تھا جس کی کیفیت اس اُلّو سے مختلف نہیں تھی جسے پکڑ کر روشنی میں بٹھا دیا گیا ہو۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ ایک وکیل نے اس سے دریافت کیا کہ اگر وہ کسی قسم کی بیماری میں مبتلا ہو تو اسے کوئی دوا لا دی جائے تو جین ڈوسم نے جواب دیا۔

"میری بیماری صرف یہی ہے کہ مجھے قتل کے ایک ایسے کیس میں ملوّث کیا جا رہا ہے جس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں اور ظاہر ہے اس بیماری کا فی الحال کوئی علاج نہیں ہے۔"

جین ڈوسم کے بعد کمرۂ عدالت میں داخل ہونے والی میری آندرے تھی۔ اخبارات کے ذریعے اس کیس کی خاصی شہرت ہو چکی تھی اور بہت سے لوگ زندگی کے اسٹیج پر کھیلے جانے والے اس خوفناک ڈرامے کی ہیروئن کو دیکھنے کے لیے عدالت میں آئے ہوئے تھے مگر میری آندرے کو دیکھ کر انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ مختصر سے قد کی دبلی پتلی اس لڑکی میں کسی کے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔ وہ اس چڑیا کی طرح سہمی ہوئی نظر آ رہی تھی جو اپنے جھنڈ سے بچھڑ گئی ہو۔ میری آندرے کمرۂ عدالت میں آزادی سے گھوم رہی تھی۔ محافظ عورتوں میں سے کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہی تھیں۔

سب سے آخر میں چارلس سوبھراج تھا۔ اس کے پیروں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی جس کی زنجیر کا دوسرا سرا ایک محافظ کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا چہرہ سُتا ہوا اور بال الجھے ہوئے تھے۔ اس نے جینز اور پولو شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی متجسّس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ بالآخر اس کی نظریں اس جگہ جم گئیں جو جج، اور اس کے پی اے کے لیے مخصوص تھی۔

ملزمان کی آمد کے کچھ ہی دیر بعد جج جوگندر ناتھ بھی اپنے چیمبر سے نکل کر کمرۂ عدالت میں اپنی مخصوص نشست پر پہنچ گیا۔ اس کی شخصیت اگرچہ زیادہ متاثر کن نہیں تھی لیکن عدالتی حلقوں میں اس کی دیانتداری ایک مثال کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس نے کرسی پر

بیٹھنے کے بعد چند منٹ صورتِ حال کا جائزہ لینے میں صرف کیے۔ پھر پراسیکیوٹر کو کیس پیش کرنے کا حکم دیا۔ پراسیکیوٹر نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے استغاثے کے پہلے گواہ کو عدالت میں پیش کیا۔

وہ باربرا اسمتھ تھی۔ اس رات تقریباً اسّی کے قریب خواب آور گولیاں کھانے کے باوجود اس کی مرنے کی خواہش پوری نہیں ہو سکی تھی اور اس وقت عدالت کے سامنے پیش ہوتے ہوئے اس کے چہرے پر خوف و دہشت کے تاثرات بہت نمایاں تھے۔

مئی کی وہ رات جب باربرا اور ایلین نے خودکشی کی نیت سے خواب آور گولیاں کھائی تھیں، اس لحاظ سے ان کے لیے مہربان ثابت نہیں ہو سکی تھی کہ انہیں موت کے دامن میں پناہ نہیں مل سکی تھی۔ دراصل اس رات ایک خاتون محافظ حسبِ معمول راؤنڈ کرتی ہوئی اس طرف سے گزری تو ان دونوں کو اس طرح فرش پر پڑے دیکھ کر چونک سی گئی تھی۔ یہ اس کے لیے خلافِ معمول بات تھی۔ کیونکہ باربرا اور ایلین رات گئے تک اندھیرے میں بیٹھی باتیں کرتی رہتیں تھیں۔ محافظ عورت راؤنڈ کے دوران جب بھی اس طرف آتی، کچھ دیر ان سے گپ شپ بھی رہتی لیکن وہ آج رات کے ابتدائی حصے ہی میں اتنا غفیل ہو چکی تھیں۔ دو تین مرتبہ پکارنے پر بھی جب کوئی جواب نہ ملا تو محافظ عورت کوٹھری کا تالا کھول کر اندر داخل ہو گئی اور پھر ان کی حالت دیکھتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ محافظ ایک لمحے کو تو یہی سمجھی تھی کہ اب وہ دونوں اس دنیا میں نہیں رہیں۔ انہیں فوری طور پر جیل کے اسپتال پہنچا دیا گیا جہاں آر ایم او نے ایک اور ڈاکٹر کی مدد سے ان کے معدے صاف کیے اور جیل کے وارڈن سے کہا۔

” اگر انہیں یہاں لانے میں مزید پانچ منٹ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو ان کی زندگیوں کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ بہرحال، اب خطرے کی کوئی بات نہیں ۔“

” تمہارا نام ؟ “ پولیس پراسیکیوٹر دلجیت سنگھ نے باربرا کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

” باربرا اسمتھ “ اس نے جواب دیا۔ باربرا اسمتھ اس وقت گواہوں کے کٹہرے میں کھڑی خوفزدہ ہرنی کی طرح چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا لہجہ دھیما تھا اور وکیلوں کو اس کی آواز سننے کے لیے کٹہرے کے قریب آنا پڑا تھا۔ ان سب سے الگ تھلگ اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا جج آگے کو جھکا بڑی توجہ سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ یہاں عدالتی کارروائی کے ریکارڈ کا طریقہ بھی باربرا کے لیے انوکھا ثابت ہوا تھا۔ مغربی عدالتوں کی طرح بیانات کو براہِ راست ریکارڈ کرنے کے بجائے جج پہلے ان کے بیان سنتا پھر اپنے الفاظ میں بیان کرتا جسے سکھ اسٹینو پرانے سے ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کرنے لگتا۔ پراسیکیوٹر باربرا سے سوالات کر رہا تھا اور باربرا کو لوگوں کے شور میں اپنے الفاظ جج تک پہنچانے کے لیے ایک ایک بات کو کئی کئی مرتبہ دہرانا پڑ رہا تھا۔ بالآخر وہ جج کے اشارے پر کٹہرے سے نکل کر کچھ اور آگے بڑھ گئی۔ یہاں چارلس بھی اس کے بالکل سامنے تھا، اور باربرا کو محسوس ہو رہا تھا جیسے چارلس کی سلگتی ہوئی نظریں اس کے سینے کو چیرتی ہوئی دل تک پہنچ رہی ہوں۔ وہ اس سے نگاہیں چرانے لگی۔

” چارلس سوبھراج سے تمہاری پہلی ملاقات کب ہوئی تھی ؟ “ پراسیکیوٹر دلجیت سنگھ نے پوچھا۔

” چارلس سے میری پہلی ملاقات جون ۱۹۷۶ء میں بمبئی میں ہوئی تھی “ باربرا نے جواب دیا۔

” متعارف کس نے کرایا تھا؟ “

” بلجیئم کے رہنے والے ایک شخص نے “ باربرا نے ہوگے کوریگ کا نام نہیں بتایا۔

” چارلس سوبھراج نے تمہیں اپنے بارے میں کیا بتایا تھا؟ “

” اس نے کہا تھا کہ وہ ایک بزنس مین ہے “ باربرا اب ٹیپ ریکارڈر کی طرح بول رہی تھی ” اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت بھی دی تھی “

” کیا میری آندرے، مونیکا کے نام سے بھی اپنے حلقے میں متعارف تھی ؟ “

” ہاں اسے اکثر و بیشتر اسی نام سے پکارا جاتا تھا “ باربرا نے جواب دیا۔

پراسیکیوٹر نے ایک لمحہ کو توقف کیا۔ اس کا خیال تھا کہ صفائی کے وکیل کی طرف سے کوئی اعتراض اٹھایا جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پراسیکیوٹر دلجیت سنگھ نے باربرا اسمتھ سے سوالات جاری رکھے ” تم دہلی کب آئی تھیں ؟ “

” میں ۱۸ جولائی ۱۹۷۶ء کو ایلین السیتھر کے ہمراہ دہلی پہنچی تھی۔ ہم دونوں کا کرایہ ایلین نے دیا تھا۔ اس وقت میں چارلس سوبھراج کو ایلین ہی کے نام سے جانتی تھی۔ ایلین نے دہلی کے لودھی ہوٹل میں قیام کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے کہا تھا کہ ہم اوبرائے اور امپیریل ہوٹل کی جیولری شاپس میں آمد و رفت کے ذریعے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کریں کہ وہاں پر کس قدر قیمتی چیزیں ہو سکتی ہیں “

” کیوں ؟ چارلس نے یہ ہدایت کیوں دی تھی ؟ “

” اس سلسلے میں اس نے کچھ نہیں بتایا تھا “ باربرا نے کہا، اور ہوگے کوریگ کے بارے میں بتانے لگی کہ کس طرح وہ ان سب کو دھوکا دے کر گویا فرار ہو گیا تھا اور چارلس اور جین ڈوسم اس کے تعاقب میں گئے تھے ” دہلی واپس آنے کے بعد چارلس نے ہمیں

رنجیت ہوٹل میں دو کمرے بک کرانے کی ہدایت کی تھی “ باربرا نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا ” ہم نے ۱۲۵ اور ۳۱۵ نمبر کے کمرے بک کرائے تھے۔ ہم سب نے دوپہر کا کھانا ہوٹل کے ریسٹورنٹ ہی میں کھایا تھا۔ کھانے کے بعد چارلس نے مجھے اور ایلین کو ہدایت کی تھی کہ ہم اس فرانسیسی سیاح سے بے تکلف ہونے کی کوشش کریں جسے کچھ دیر پہلے لابی میں دیکھا گیا تھا۔ وہ جین سولومن تھا “

اس موقع پر پراسیکیوٹر نے اپنی فائل سے جین سولومن کی پاسپورٹ سائز کی دو تصویریں نکال کر سب کو دکھائیں۔ یہ تصویریں چارلس اور میری آندرے کے ہاتھوں سے بھی گزریں لیکن انہوں نے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے بعد جین سولومن کے بارے میں عدالت میں کچھ نہیں کہا گیا۔ نہ ہی یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ وہ ہندوستان کیوں آیا تھا اور کیا کرنا چاہتا تھا؟

” پھر کیا ہوا ؟ “ باربرا سے اگلا سوال کیا گیا۔

” ہم دونوں کو سولومن سے تعارف حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس کے فوراً ہی بعد ہم تینوں ہوٹل کے بار روم میں آ گئے۔ اس دوران میں ایلین اور جین ڈوسم بھی پہنچ گئے۔ وہ سولومن سے فرانسیسی زبان میں باتیں کرتے رہے۔ اس زبان سے نابلد ہونے کی وجہ سے میں ان کی گفتگو کا مفہوم نہیں سمجھ سکی تھی۔ پھر ایلین نے ڈنر کی تجویز پیش کی اور ہم سب ساڑھے سات بجے کے لگ بھگ یونائیٹڈ کافی ہاؤس چلے گئے تھے “ دلجیت سنگھ نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔ ابھی تک باربرا کا بیان اس کی مرضی کے عین مطابق تھا ” کھانے کے دوران ایلین نے پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی بوتل میز پر نکال کر رکھ دی۔ سولومن کے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ یہ پیٹ کے امراض کی دوا ہے “

” پھر۔ اس کے بعد کیا ہوا ؟ “ پراسیکیوٹر نے سوال کیا۔

باربرا جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ چارلس غیر محسوس انداز میں سرکتا ہوا اس کے اتنا قریب پہنچ گیا کہ اسکے سانس کی آواز بھی محسوس کی جا سکتی تھی۔ کمرۂ عدالت میں موجود اخباری نمائندوں نے محسوس کیا کہ چارلس نے باربرا سے کوئی سرگوشی کی تھی اور جیسے غالباً باربرا نے سن لیا تھا لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی ” ایلین نے شیشی میں موجود دوا کا کچھ حصہ سولومن کے سالن میں ملا دیا تھا “ باربرا نے سوال کا جواب دیا۔ قریب کھڑے ہوئے چارلس نے اس طرح نفی میں سر ہلا دیا جیسے اس کے بیان کی تردید کرنا چاہتا ہو۔ جج نے اسے ایسا کرتے دیکھ کر بھویں اچکائیں مگر کہا کچھ نہیں۔

” کیا تمہیں اس دوا کے اثرات کا علم تھا ؟ “ پراسیکیوٹر نے پوچھا۔

” ہاں۔ مجھے علم تھا کہ اس دوا کو استعمال کرنے والا سو جاتا ہے اور اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے “

جج نے باربرا کے بیان کا یہ جملہ ان الفاظ میں ریکارڈ میں شامل کرایا ” میں جانتی تھی کہ اس دوا کو استعمال کرنے والا سو جاتا ہے “۔ باربرا نے یہ بھی کہا تھا کہ ” اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے “ لیکن جج نے باربرا کے یہ آخری الفاظ غور سے نہیں سنے تھے اور نہ ہی ان کی تشریح چاہی تھی

” کھانے کے دوران باربرا بیان جاری رکھتے ہوئے بولی “

” ایلین نے باتوں ہی باتوں میں معلوم کر لیا تھا کہ سولومن اسی رات ٹرین کے ذریعے دہلی سے روانہ ہونے والا ہے۔ اس پر چارلس نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر وہ اپنی روانگی ملتوی کر دے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ اس رات جب وہ اور سولومن کمرے میں اکیلے تھے کہ یکایک چارلس بھی پہنچ گیا اور دونوں کو ایک ایک کیپسول دیتے ہوئے کہا کہ اس کے کھانے سے تکلیف دور ہو جائے گی۔ میں نے اپنا کیپسول نہیں کھایا کیونکہ میں اس کے اثرات سے واقف تھی لیکن سولومن کیپسول نگل گیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ وہ بہت تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ کھانے میں دی جانے والی دوا پہلے ہی اپنا اثر دکھانے لگی تھی “

اس موقع پر چارلس نے اپنے وکیل اوپندر سنگھ کو ٹھوکا دیتے ہوئے اسے اعتراض اٹھانے کا اشارہ کیا لیکن اوپندر سنگھ نے کوئی اعتراض نہیں اٹھایا اور نہ ہی میری آندرے کے وکیلوں میں سے کسی نے کچھ کہا۔ اس پر چارلس منہ بگاڑ کر رہ گیا۔ باربرا نے اپنا بیان جاری رکھا ” ایلین نے کہا تھا کہ وہ جا رہا ہے لیکن وہ کمرے سے ملحق بالکونی میں چھپا رہا۔ کچھ دیر بعد سولومن بستر سے اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چارلس نے سفید رنگ کی چند اور گولیاں میرے حوالے کر دیں اور کہا کہ میں کسی نہ کسی طرح یہ گولیاں سولومن کو کھلا دوں “

پراسیکیوٹر دلجیت سنگھ نے پسندیدگی کے انداز میں سر ہلا دیا۔ باربرا کا بیان ابھی تک اس کے حق میں تھا ” کیا تم نے وہ گولیاں سولومن کو کھلا دی تھیں ؟ “ اس نے پوچھا۔

” نہیں “ باربرا نے نفی میں سر ہلایا ” کیونکہ میں نے محسوس کیا تھا کہ سولومن پر پہلے ہی غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ وہ باتھ روم سے واپس آ کر بستر پر گر سا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں، کچھ دیر بعد ایلین نے بالکونی کے اندر آ کر سرگوشیانہ لہجے میں دریافت کیا کہ کیا میں نے اسے گولیاں کھلا دی ہیں یا نہیں۔ میں نے بتایا کہ گولیاں کھلا چکی ہوں۔ اسی دوران سولومن کی آنکھ کھل گئی۔ ایلین نے خود اسے چند اور گولیاں کھلا دیں جس کے بعد سولومن سو گیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ایلین اس کے سامان کی تلاشی لینے لگا۔ اس کے بیگ میں دو سو روپے اور چھ سو ڈالر مالیت کے ٹریولرز چیک تھے جو ایلین نے

اپنے قبضے میں کر لیے اور یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ صبح سویرے واپس آجائے گا۔ چارلس جلد سے جلد آگرہ جانا چاہتا تھا جہاں ساٹھ فرانسیسی سیاحوں کا گروپ پہنچا ہوا تھا۔ وہ دوسرے دن صبح جب ناشتے سے فارغ ہوکر کمرہ نمبر ایک سو پچیس میں پہنچی تو سولومن غائب تھا۔ اس نے فوراً ہی چارلس کو صورتِ حال سے مطلع کر دیا جو فوراً ہی سولومن کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اسے حیرت تھی کہ سولومن اپنے کمرے سے کس طرح غائب ہو گیا۔ تلاش کرنے پر سولومن ہمیں باتھ روم کے فرش پر پڑا ہوا مل گیا۔ اس پر نیم مدہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ ہم نے اسے اُٹھا کر پنکھے کی ہوا میں پلنگ پر ڈال دیا اور پانی کے چند گھونٹ پلانے کے بعد اس پر ایک بھیگی ہوئی چادر ڈال دی۔"

پراسیکیوٹر نے سوال کیا۔ "اس وقت مونیکا کہاں تھی؟"

پراسیکیوٹر کا یہ سوال سُن کر فرینک انتھونی اس طرح غراتا ہوا اُٹھ گیا جیسے شیر کو سوتے سے جگا دیا گیا ہو۔ "اس پورے قصّے میں مونیکا کا نام نہیں ہے۔" وہ ہولے سے غرّایا۔ "جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا اس معاملے سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔"

باربرا اس کی اس غراہٹ سے ذرا سی بھی متاثر نہیں ہوئی بلکہ اس نے اس شبہے کا اظہار کیا کہ اس نے مونیکا کو بھی کافی شاپ میں دیکھا تھا۔ فرینک انتھونی کو اعتراض کا ایک موقع مل گیا۔ اس نے لفظ "شبہے" پر زور دیتے ہوئے کہا کہ باربرا نے کسی اور کو دیکھا ہوگا لیکن استغاثہ اس سے مونیکا کا نام اُگلوانا چاہتا ہے تاکہ اسے اس کیس میں ملوّث کیا جا سکے۔ وکیلِ استغاثہ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا جس پر دونوں... وکیلوں میں اچھی خاصی بحث چھڑ گئی۔ جج جوگندر ناتھ نے انہیں خاموش کرایا اور باربرا کو اپنا بیان جاری رکھنے کا حکم دیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد باربرا نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ ان کا گروہ جس میں وہ خود، ایلن ایستھر، جین ڈوہم، مونیکا اور ایلین شامل تھے، ہوٹل کے سامنے جمع ہو گئے جہاں سیڈان کار موجود تھی۔ وہ آگرہ جانے والے تھے۔ ایلین سب سے آخر میں ہوٹل سے نکلا تھا۔ میرے پوچھنے پر مونیکا نے بتایا تھا کہ ایلین، سولومن کے کمرے میں گیا تھا۔ فرینک انتھونی ایک بار پھر اُچھل کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"اوبجیکشن سر!" وہ بولا۔ "یہ فرضی داستان اس اسٹیج پر پہنچ چکی ہے جہاں یہ گروہ آگرہ کے لیے روانہ ہونے والا ہے لیکن پراسیکیوٹر دوبارہ رنجیت ہوٹل کی تفصیلات دہرانا چاہتا ہے تاکہ کسی نہ کسی طرح میری مؤکلہ میری آندرے کو اس معاملے میں ملوّث کیا جا سکے۔"

جج جوگندر ناتھ نے اس اعتراض پر کوئی رولنگ نہیں دی لیکن اسے ریکارڈ میں شامل کر لیا۔ پراسیکیوٹر نے باربرا پر جرح جاری رکھی۔ وہ چند اہم باتیں پوچھنا چاہتا تھا۔ "کیا تم نے مونیکا یا بالفاظِ دیگر میری آندرے کو بھی رنجیت ہوٹل کے کمرہ نمبر تین سو پندرہ میں دیکھا تھا؟"

"ہاں، وہ ایلین کے ساتھ پلنگ پر بیٹھی مختلف قسم کی گولیاں الگ الگ کر رہی تھی۔" باربرا نے بتایا۔

فرینک انتھونی نے کاؤنٹر پر اتنی زور سے مُکّا مارا کہ جج جوگندر ناتھ کے سامنے رکھے ہوئے کاغذات بکھر گئے۔ وہ غرّاتے ہوئے بولا۔ "اب ہمیں اور کتنے جھوٹ سُننا پڑیں گے۔ اس گواہ نے پولیس کو جو بیان لکھوایا تھا اس میں گولیوں یا میری آندرے کا کوئی تذکرہ نہیں لیکن اب گواہ کا بیان بدل رہا ہے۔ یہ بیان اسے بعد میں رٹایا گیا ہے اور اسے مجبور کیا گیا ہے کہ وہ میری مؤکلہ میری آندرے کو پھنسانے کے لیے ایسا بیان دے۔"

چارلس اور میری آندرے ایک دوسرے کے قریب کھڑے توصیفی نگاہوں سے فرینک انتھونی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جج نے ہاتھ اُٹھا کر انتھونی کو پُرسکون رہنے کا اشارہ کیا اور باربرا کو مخاطب کرتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ "کیا تم پہلے بھی یہ بیان دے چکی ہو، جس پر اعتراض ہوا ہے؟"

"جی ہاں۔" باربرا نے جواب دیا۔ "میں پہلے پولیس اور پھر مجسٹریٹ کو یہ بیان دے چکی ہوں۔"

"تم نے پولیس اور مجسٹریٹ کو کوئی بیان ضرور دیا ہوگا۔" انتھونی اس کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔ "لیکن یاد رکھو تم ہر بیان میں ایک نیا جھوٹ بول رہی ہو اور کوئی جھوٹ کبھی زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوتا۔"

باربرا اسے محض گھور کر رہ گئی تھی۔ پراسیکیوٹر کے ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ اسے رات کے وقت ایک نائٹ کلب سے گرفتار کیا گیا تھا۔ پراسیکیوٹر کے اشارے پر ایک پولیس کانسٹبل نے ..... سفید رنگ کا ایک بیگ عدالت میں پیش کیا جس کے اندر ہرے رنگ کا ایک اور چھوٹا پلاسٹک بیگ موجود تھا جس میں لاتعداد رنگ برنگی گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ یہ گولیاں باربرا کی گرفتاری کے وقت اس کے قبضے سے برآمد کی گئی تھیں اور ان میں وہ گولیاں بھی شامل تھیں جو چارلس سوبھراج نے اسے سولومن کو کھِلانے کو دی تھیں۔ پراسیکیوٹر کے سوال پر باربرا نے اعتراف کیا کہ یہ وہی گولیاں تھیں جو گرفتاری کے وقت اس سے برآمد ہوئی تھیں۔ باربرا کے اس اعتراف پر چارلس کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ وہ صبح سے وقتاً فوقتاً ہولے ہولے غرّاتا رہا تھا۔ کئی بار وہ باربرا کے بیان میں مداخلت بھی کر چکا تھا مگر جج نے یا تو اس بات کو نوٹ ہی نہیں کیا تھا یا جان بوجھ کر اس پر توجّہ نہیں دی تھی لیکن اس وقت چارلس کی غراہٹ سُن کر جج جوگندر ناتھ نے اسے گھُور کر دیکھا تو جواب میں چارلس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

فرینک انتھونی نے باربرا پر جرح شروع کر دی۔ باربرا بڑے تحمل اور سکون سے اس کے ہر سوال کا جواب دیتی رہی۔ انتھونی نے عدالت کے سامنے ان چیزوں کی ایک فہرست پیش کی جو گرفتاری کے وقت باربرا کے قبضے سے برآمد ہوئی تھیں۔ ان چیزوں میں "چند گولیاں" شامل تھیں لیکن اس فہرست پر باربرا یا منیر کے دستخط نظر نہیں آرہے تھے۔ انتھونی نے پولیس پر الزام عائد کیا کہ انہوں نے بعد میں فہرست بدل دی تھی مگر جج کی ہدایت پر باربرا نے فہرست کے معائنے کے بعد بتایا کہ اگرچہ یہ اصل فہرست کی بہت ہلکی کاربن کاپی ہے مگر یہ فہرست وہی ہے جو اس کے سامنے تیار کی گئی تھی۔

٭٭

دوسرے دن فرینک انتھونی اس طرح کمرۂ عدالت میں داخل ہوا جیسے کوئی مہاراجہ میدانِ جنگ میں اُتر رہا ہو۔ لوگ اس کے راستے سے ہٹ رہے تھے

"آپ اس کیس کی پیروی کیوں کر رہے ہیں مسٹر انتھونی؟" ایک رپورٹر نے انتھونی کے قریب آکر سوال کیا۔

"میں نے کسی رقم کے لالچ میں یہ کیس نہیں لیا۔" انتھونی نے جواب دیا۔ "مجھے اپنے مؤکلوں سے ٹیکسی کا کرایہ تک ملنے کی توقع نہیں ہے اور میں عام طور پر اس نوعیت کے کیس لیتا بھی نہیں۔" وہ کہتے ہوئے بید کی کرسی پر بیٹھ گیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس قسم کے کیسز عام طور پر نوجوان وکیلوں کو نمٹانے چاہئیں لیکن یہاں معاملہ قدرے مختلف ہے۔ اس کیس کے ملزمان کو حکومت کی طرف سے موردِ الزام ٹھہرایا جا رہا ہے۔ انہیں اندرا گاندھی کے نافذ کردہ داخلی سیکیورٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا ہے جب کہ یہ لوگ کسی طرح بھی اس قانون کی زد میں نہیں آتے اور استغاثہ نے بھی ملزمان پر اس ایکٹ کے استعمال کے سلسلے میں بنیادی ضابطوں کا لحاظ نہیں رکھا۔ پولیس کا رویّہ انتہائی غیر دانشمندانہ اور نامناسب رہا ہے۔ اگر آپ لوگوں نے پولیس کی رپورٹ دیکھی ہو تو یاد ہوگا اس میں مختلف ممالک سے متعدد خطوط اور انٹرپول کے ٹیلیگرامز کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اگر چارلس سوبھراج ترکی یا کسی اور ملک کی پولیس کو مطلوب ہوسکتا ہے تو اس کیس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ استغاثہ نے غیر ممالک میں پیش آنے والے واقعات کا سہارا لے کر اپنے کیس کی بنیادیں استوار کی ہیں جو کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ ہندوستان کی حدود میں یہ لوگ کسی قانون کی زد میں آتے ہیں یا نہیں۔ اب میں آپ لوگوں سے معذرت چاہوں گا۔ مجھے ان لڑکیوں پر جرح کرنا ہے جنھوں نے سلطانی گواہ ہونے کے باوجود جیل میں خودکشی کی کوشش کی تھی۔"

تمام ملزمان کمرۂ عدالت میں آچکے تھے لیکن جج جوگندر ناتھ اس وقت اپنے ملحق دفتر میں کسی ضروری کام میں مصروف تھا اور اس کی آمد میں چند منٹ کی تاخیر تھی۔ چند منٹ کی یہ مہلت چارلس کے لیے غنیمت ثابت ہوئی۔ دہلی کی تہاڑ جیل میں رہتے ہوئے اس نے بنکاک کی ایک کمپنی سے اپنے سوانح کی اشاعت اور فلمبندی کے سلسلے میں معاہدہ کر لیا تھا اور ان دنوں وہ ایک انگریز مصنّف کو اپنی زندگی کے اہم واقعات نوٹ کروا رہا تھا جو اس وقت بھی کمرۂ عدالت میں موجود تھا اور بڑی پھُرتی اور مہارت سے اس کی بتائی ہوئی یادداشتوں کو ڈائری میں منتقل کر رہا تھا۔

کمرۂ عدالت میں سب کی توجہ میری ایلن ایستھر کی طرف مبذول ہو گئی۔ جج کے سامنے پہنچ کر اس نے قدرے خم ہوکر تعظیم دی اور تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر شگفتگی دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ چھ ہفتے پہلے اس لڑکی نے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کے لیے سو سے بھی زیادہ خواب آور گولیاں نگل لی تھیں۔ اس وقت اسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا جیسے وہ کسی فیشن میگزین کے لیے تصویر کھنچوانے آئی ہو۔ پراسیکیوٹر دلجیت سنگھ اس کے سامنے کھڑا گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کو شبہ تھا کہ ایلن ایستھر پولیس کو دیے جانے والے اپنے پہلے بیان کے بعض حصّوں سے منحرف ہوسکتی ہے لیکن وہ کسی بھی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ وہ اپنی فائل اُٹھا کر جرح کرنے کو تیار ہو گیا۔

"تم ہندوستان کب آئی تھیں؟" دلجیت سنگھ نے پہلا سوال کیا۔

"۵ جون ۱۹۷۶ء کو۔" ایلن نے جواب دیا۔

پراسیکیوٹر اس سے متعدد سوال کرتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی یہ کوشش بھی رہی تھی کہ ایلن اپنے ابتدائی بیان کی حدود میں رہے لیکن پراسیکیوٹر کی توقع کے برعکس وہ اپنے بیان میں تھوڑی بہت تبدیلیاں کرتی رہی۔ بالآخر وہ ناگوار سے لہجے میں بولی۔ "کیا میں اپنے طور پر اپنا بیان نہیں لکھوا سکتی حالانکہ یہ میری زندگی کا سوال ہے؟"

پراسیکیوٹر دلجیت سنگھ نے بے بسی سے اطراف میں دیکھا اور پھر اثبات میں گردن ہلا دی۔ ایک لمحے کو اس نے سوچا تھا کہ ایلن پر جرح ملتوی کر دے لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی کیونکہ فرینک انتھونی، ایلن سے جرح کے دوران ان چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کو بنیاد بنا کر اس کے بیان کی دھجیاں اُڑا سکتا تھا۔ ایلن نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ چارلس اور میری آندرے سے اس کی ملاقات کراچی کے ساحل پر ہوئی تھی۔ اس وقت چارلس نے ایلین کے نام سے اپنا تعارف کرایا تھا۔

"اس وقت ایلین نے تم سے کیا کہا تھا؟"

"اس نے کہا تھا کہ وہ ایک جعلی پاسپورٹ خریدنا چاہتا ہے۔ یہ میرے لیے حیرت کی بات نہیں تھی کیونکہ مشرقِ بعید کے لوگ اس قسم کا کاروبار کرتے رہتے ہیں۔" ایلن کے اس جواب پر پراسیکیوٹر نے جج کی طرف دیکھا جس نے کسی قسم کے تاثر کا اظہار کیے بغیر ایلن کا جواب ریکارڈ میں شامل کرادیا۔ دلجیت سنگھ کو قدرے اطمینان سا ہوا کہ ایلن کے بیان کے شروع ہی میں ایک ایسی بات سامنے آ گئی تھی جسے چارلس کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا

"مجھے یہ دونوں بہت معقول قسم کے لوگ نظر آئے تھے۔" ایلن نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس لیے میں نے انہیں اپنے ہٹ میں چائے پر مدعو کر لیا۔ چائے کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ چارلس جواہرات کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا ہے اور اس کا چمڑے کی مصنوعات کا جز وقتی بزنس بھی ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنے سامان کی فروخت کے سلسلے میں یورپ جا رہا ہے۔ اس نے اپنے جواہرات ایک جگہ سے دوسری جگہ لانے لے جانے کے سلسلے میں مجھے ملازمت کی پیش کش بھی کی تھی، جس پر میں نے سوچنے کے لیے کچھ مہلت مانگی تھی۔ ایک ماہ بعد وہ دوبارہ کراچی واپس آیا تو میں نے اس کی ملازمت والی پیش کش قبول کر لی۔"

پراسیکیوٹر دلجیت سنگھ بہت محتاط تھا۔ وہ اپنے سوالات کے ذریعے ایلن کو اس اسٹیج پر لے آیا جہاں انھوں نے دہلی کے رنجیت ہوٹل میں دو کمرے حاصل کیے تھے۔ ایلن نے اپنے ابتدائی بیان میں پولیس کو بتایا تھا کہ چارلس نے انہیں فرانسیسی سیاح سولومن سے بے تکلف ہونے کا حکم دیا تھا لیکن اب وہ بتا رہی تھی کہ سولومن سے اس کی ملاقات محض اتفاقیہ طور پر ہو گئی تھی۔ اس ملاقات کی تفصیل بتاتے ہوئے جذبات کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور یکایک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پراسیکیوٹر کو خدشہ ہوا کہ ایلن کی حالت کے پیشِ نظر اس پر جرح ملتوی نہ کر دی جائے جبکہ اس کے خیال میں یہی موقع تھا جب اس سے کوئی بات اگلوائی جا سکتی تھی۔ وہ جلدی سے بولا۔

"اس وقت چارلس سوبھراج یا ایلین نے تم سے کیا مطالبہ کیا تھا؟ میرا مطلب ہے اس نے تمھیں کیا کرنے کو کہا تھا؟"

"چارلس نے کہا تھا کہ ہم اس فرانسیسی نوجوان کو محبت اور اپنائیت کا احساس دلا کر اس کے قریب تر ہونے کی کوشش کریں۔" ایلن نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔ دلجیت سنگھ کے چہرے پر مایوسی کے ہلکے سے تاثرات ابھر آئے۔ ان لڑکیوں کے لیے چارلس کا یہ ہدایت نامہ کسی طرح بھی قابلِ گرفت نہیں تھا۔ قربت کا جھانسا دے کر پھنسانے اور چاہت کا احساس دلانے میں بڑا فرق تھا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ لوگ بڑے ملنسار تھے اور ان کے دلوں میں سولومن کے لیے اپنائیت کے جذبات تھے جب یونائیٹڈ کافی ہاؤس میں کھانے کی بات ہوئی تو ایلن نے بتایا کہ اس وقت کسی دوا وغیرہ کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس نے چارلس کے پاس کوئی شیشی دیکھی تھی۔

"عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ کھانے کے دوران کیا ہوا تھا؟" پراسیکیوٹر نے سوال کیا۔

"کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ ہم نے کھانا بڑے اطمینان سے ختم کیا تھا۔" ایلن نے جواب دیا۔ پوری عدالت میں چارلس واحد شخص تھا جس نے ایلن الیسنھر کے اس جواب پر اطمینان اور پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ اس کے برعکس پراسیکیوٹر کے چہرے کی رنگت بدل رہی تھی۔ اس نے ایلن پر الزام لگایا کہ وہ اپنے پولیس کو دیے جانے والے ابتدائی بیان سے منحرف ہو رہی ہے جس پر ایلن ہولے سے غرائی۔ "سچ یہی ہے جو میں اس وقت بتا رہی ہوں۔"

ایلن نے پولیس کو دیے جانے والے ابتدائی بیان میں چار پانچ ایسے واقعات کی بھی سختی سے تردید کی جو استغاثہ کے لیے بڑے اہم تھے۔ اس نے بتایا۔ "فرانسیسی سیاح سولومن کو نشہ آور یا کسی قسم کی کوئی دوا نہیں دی گئی تھی۔ باربرا نے مجھے کمرہ نمبر ۱۲۵ میں بلا کر بتایا کہ سولومن باتھ روم میں گر کر بے ہوش ہو گیا ہے۔ جب میں باتھ روم میں داخل ہوئی تو وہ دیوار کے قریب فرش پر پڑا ہوا تھا لیکن وہ نہ تو بے ہوش تھا اور نہ ہی پوری طرح ہوش میں تھا۔ میں نے بار بار اسے دریافت کیا کہ اس نے کوئی نشہ تو نہیں کیا۔۔۔۔ کیونکہ اس کی حالت سے یہی ظاہر ہو رہا تھا لیکن باربرا نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔"

فرینک انتھونی کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ اس نے عدالت کو یہ بات خاص طور سے یاد دلائی کہ اس سلطانی گواہ کے بیان کے مطابق باربرا نے سولومن کے حوالے سے کسی نشہ آور چیز کے استعمال کے سلسلے میں لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے قریب بیٹھا ہوا چارلس بھی ایلن کے اس بیان پر کھل اٹھا تھا۔ ایلن نے اپنا بیان جاری رکھا۔ "میں نے سولومن کا معائنہ کیا، اس کی آنکھیں چیک کیں، اس کی نبض دیکھی۔ میں نے اس کے منہ پر ہولے ہولے تھپڑ مارتے ہوئے اسے اٹھنے اور آنکھیں کھولنے کو کہا تھا۔ پھر ہم دونوں نے اسے گھسیٹ کر بستر پر لٹا دیا اور ایک بھیگی ہوئی چادر اس کے اوپر ڈال کر ہم دونوں کمرے سے نکل گئیں۔"

اس کے ساتھ ہی عدالت نے وقفے کا اعلان کر دیا۔ پراسیکیوٹر ایلن کے قریب پہنچ گیا اور اسے گھورتے ہوئے قدرے بلند آواز میں بولا۔ "تم جھوٹ کیوں بول رہی ہو؟ تمھارے بیان کا

ایک ایک لفظ جھوٹ پر مبنی ہے۔"

ایلن کے لیے اس کا یہ الزام ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ اونچی آواز میں بولی۔ "جھوٹ میں نے پہلے بولا تھا اور اب سچ بول رہی ہوں۔ میں اس وقت عدالت کو جو بیان دے رہی ہوں وہی حقیقی ہے۔"

پراسیکیوٹر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ وہ قسمت کی اس ستم ظریفی پر حیران تھا۔ ایلن کے انحراف نے اسے بری طرح بدحواس کر دیا تھا اور وہ اس کے خلاف جھوٹی گواہی کے الزام میں کیس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے برعکس فرینک انتھونی بڑے جوش و خروش کا اظہار کرتے ہوئے اخباری نمائندوں کو بتا رہا تھا۔ "میں یہ کہنے میں ذرا بھی شرم محسوس نہیں کرتا کہ ہماری پولیس کا کردار انتہائی شرمناک ہے۔ وہ گواہوں کو کسی قسم کا لالچ یا دھمکیاں دے کر اپنے حق میں بیان دلوانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر ان کی پول کھل ہی جاتی ہے۔ میں نے اب تک پولیس کے خلاف جتنے بھی کیس لڑے ہیں، ان میں استغاثہ کے نوّے فیصد گواہ منحرف ہوئے ہیں۔" انتھونی نے ایلن کے قریب پہنچ کر اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے اس صاف گوئی اور حقیقت بیانی پر شاباش دی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ایلن پر جرح کرتے ہوئے فرینک انتھونی اس سے ایک نیا بیان دلوانے میں کامیاب ہو گیا جو بقول شخصے استغاثہ کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔ ایلن نے عدالت کو بتایا۔ "پولیس نے مجھے ایک فرضی بیان لکھ کر دیا تھا اور حکم دیا تھا کہ میں یہی بیان دہراؤں لیکن میں نے اپنے نام سے جھوٹا بیان منسوب کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پولیس نے کہا تھا کہ میں اس کی حفاظت میں رہوں گی اور اگر میں نے ان کی مرضی کا بیان دیا تو مجھے عدالت میں معافی مل جائے گی لیکن اگر میں نے پولیس کی مرضی کا بیان نہ دیا تو مجھے ہندوستان کے داخلی سیکیورٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا جائے گا اور ایسی صورت میں مجھے کسی وکیل یا سفارت خانے سے رابطہ قائم کرنے کی اجازت بھی نہیں دی جائے گی۔"

فرینک انتھونی کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس نے باربرا کے بیان کے پرخچے اڑانے کے لیے ایلن سے چند اور سوالات کیے۔ "کیا باربرا اسمتھ نے تمہیں بتایا تھا کہ اس کیس میں سلطانی گواہ بننے کے لیے اس پر پولیس کی طرف سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے؟" اس سوال کا جواب بھی ہاں میں ملا تھا۔

باربرا اسمتھ دو خاتون محافظوں کی نگرانی میں کمرۂ عدالت کے باہر ایک بینچ پر بیٹھی تھی۔ اس کا نام پکارا گیا تو وہ محافظوں کی معیت میں کمرۂ عدالت میں داخل ہو گئی۔ وہ اس وقت تازہ دم نظر آ رہی تھی۔ فرینک انتھونی چند لمحے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر براہِ راست سوال کیا۔

"یونائیٹڈ کافی ہاؤس میں کھانے کے دوران تم نے ایلین کے پاس پلاسٹک کی کسی شیشی کا ذکر کیا تھا۔ شیشی پر لیبل کس قسم کا تھا؟"

"شیشی پر کوئی لیبل نہیں تھا۔" باربرا کے اس جواب پر انتھونی نے مطمئن انداز میں سر ہلایا جیسے سچائی کا اظہار ہونے والا ہو۔ "ایسی صورت میں۔" وہ باربرا کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا ——
"تم نے یہ کیسے سمجھ لیا تھا کہ اس شیشی میں موجود دوا کے استعمال سے نیند طاری ہو سکتی ہے؟"

"یہ بات مجھے ریسٹورنٹ میں جانے سے پہلے ایلین نے بتائی تھی۔" باربرا نے جواب دیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے منے قطرے چمکنے لگے تھے۔

"کھانے کے دوران ہر ایک کے سامنے پانی کا الگ الگ گلاس موجود تھا اور ایلین نے کہا تھا کہ اس شیشی میں موجود اس سیّال کے چند قطرے پانی کی آلودگی ختم کر دیتے ہیں۔" باربرا نے اثبات میں سر ہلایا تو فرینک انتھونی نے اگلا سوال کیا۔ "ایسی صورت میں ایلین نے یہ سیّال پانی کے بجائے سالن کی پلیٹ میں کیوں ڈالا تھا؟"

باربرا ایک لمحے کو گڑبڑا کر رہ گئی۔ اس نے رک رک کر کہا۔ "اس نے سیّال واقعی سالن میں ڈالا تھا لیکن کسی اور نے اس کی یہ حرکت نہیں دیکھی تھی۔"

فرینک انتھونی نے سوالات کی بوچھار کر دی لیکن باربرا اپنے بیان پر قائم رہی کہ ایلین کو سالن کی پلیٹ میں وہ بے رنگ سیّال انڈیلتے ہوئے اس کے سوا کسی اور نے نہیں دیکھا تھا۔ اس محاذ پر ناکامی کے بعد انتھونی نے ایک اور سوال کیا۔ "پولیس کی تفتیش کے دوران تم نے کس تاریخ کو سلطانی گواہ بننا منظور کیا تھا؟"

"مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ غالباً اگست ۱۹۷۶ء کی تین تاریخ تھی۔" باربرا نے جواب دیا۔ "پولیس نے مجھے سلطانی گواہ بننے کے لیے نہیں کہا تھا۔"

"کیا تم نے ایلین کو یہ نہیں بتایا تھا کہ پولیس تمھیں سلطانی گواہ بننے کے لیے مجبور کر رہی ہے؟"

"نہیں۔ میں نے اس سے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔" باربرا نے جواب دیا۔

"تم نے بتایا تھا کہ تم رنجیت ہوٹل کے کمرہ نمبر تین سو پندرہ میں بھی گئی تھیں اور اس وقت چارلس اور میری آندرے پلنگ پر بیٹھے کسی قسم کی گولیاں الگ الگ کر رہے تھے لیکن تمھارے بیان کا یہ حصہ اس بنیادی بیان میں شامل نہیں جو تم نے پولیس کو دیا تھا کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سب جھوٹ تھا؟"

"یہ جھوٹ نہیں۔ میں نے اپنے پہلے بیان میں بھی یہی کہا تھا اور میں نہیں جانتی کہ اسے بیان میں شامل کیوں نہیں کیا گیا۔"

اس موقع پر چارلس نے جھک کر انتھونی کے کان میں کوئی سرگوشی کی لیکن انتھونی نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور باربرا کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے اگلا سوال کیا۔ "جب تم ہندوستان میں آئی تھیں تو یقیناً کچھ نہ کچھ رقم بھی موجود ہوگی۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمھارے پاس رقم کب ختم ہوئی تھی؟"

"جون ۱۹۷۶ء میں بمبئی کے اپولو گیسٹ ہاؤس میں قیام کے دوران میری رقم چوری ہوگئی تھی۔" باربرا نے بتایا۔ "میں نے پولیس میں رپورٹ نہیں کرائی تھی کیونکہ میرے خیال میں اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ جون ۱۹۷۶ء کے بعد سے اخراجات کے معاملے میں تم ایلین کی محتاج تھیں؟"

"ہاں، یہ کہا جاسکتا ہے کیونکہ میں اس کے لیے کام کر رہی تھی۔" باربرا نے کہا اور اگلے سوال کے جواب میں بتایا کہ جون سے پہلے اس کے اخراجات اس کا پال نامی ایک دوست برداشت کرتا تھا۔

اس کے پوچھنے پر باربرا نے مزید بتایا کہ پال نامی وہ شخص اسے کھانے پینے کے اخراجات کے لیے پانچ چھ روپے روزانہ دیا کرتا تھا۔

"پانچ چھ روپے۔" فرینک انتھونی نے اسے گھورا۔ "اس رقم میں ایک وقت کا کھانا بھی بمشکل کھایا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے کچھ اور بھی کرتی تھیں۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" باربرا کی آنکھیں سُلگ اٹھیں۔

"ایلین نے تمھیں سولومن سے دوستی کرنے کو کہا تھا۔ کیا وہ اس دوستی کی آڑ میں سولومن کو قتل کرنا چاہتا تھا یا لوٹنا چاہتا تھا؟"

جج نے اس کا جواب اس طرح ریکارڈ کرایا۔ "چارلس کا مقصد اسے لوٹنا یا قتل کرنا نہیں تھا۔" باربرا نے مفہوم کی اس تبدیلی پر احتجاج کرنا چاہا۔ وہ بتانا چاہتی تھی کہ اس کے ذاتی خیال کے مطابق اس دوستی میں قتل کا مقصد شامل نہیں تھا لیکن چارلس کے بارے میں اس کا نظریہ یہ نہیں تھا۔ وہ چارلس کو کسی طرح بھی بچ نکلنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

"گرفتاری کے وقت پولیس نے تمھارے قبضے سے کچھ گولیاں برآمد کی تھیں جو تمھارے بیان کے مطابق چارلس نے تمھیں سولومن کو کھلانے کے لیے دی تھیں۔ تم نے بعد میں یہ گولیاں چارلس کو واپس کیوں نہیں لوٹائی تھیں؟"

"اس لیے کہ میں چارلس کو بتا چکی تھی کہ وہ گولیاں میں نے سولومن کو کھلادی ہیں۔ اگر واپس کردیتی تو وہ دوبارہ اسے کھلانے پر مجبور کرتا جب کہ میں ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ سولومن پہ پہلے ہی مدہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔"

"وہ گولیاں کس قسم کی تھیں؟ باربی چوریٹ؟ اور کیا تم مینڈرکس استعمال کرتی ہو؟" انتھونی نے پوچھا۔ پہلے سوال کے جواب میں باربرا نے لاعلمی کا اظہار کیا جبکہ اس کا دوسرا جواب نفی میں تھا۔ جج جوگندر ناتھ نے اس کا جو جواب ریکارڈ میں شامل کرایا۔ وہ یوں تھا۔ "یہ کہنا درست ہے کہ میں مینڈرکس کے استعمال کی عادی ہوں۔"

"ایشیائی ممالک کا رُخ کرنے والے بیشتر یورپین سیاح منشیات کے عادی ہوتے ہیں۔ تم نے سولومن کو دیکھا تھا کیا تمہیں اس کے بازوؤں یا جسم کے کسی اور حصّے پہ سوئیوں کے نشان نظر آئے تھے؟"

"نہیں۔" باربرا نے جواب دیا۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکی تھی کہ انتھونی اسے کس طرف لے جارہا تھا۔ "میں نہیں جانتی کہ وہ اس قسم کی منشیات کا بھی عادی تھا۔"

انتھونی کے چہرے پر اب تھکن کے آثار نظر آرہے تھے۔ باربرا اس کے لیے بڑی آہنی اعصاب کی مالک ثابت ہورہی تھی۔ اس نے ایک اور پینترا بدلا۔

"کیا یہ غلط ہے کہ تم جعلی پاسپورٹ پر سفر کررہی تھیں؟"

"میرے پاس جعلی پاسپورٹ نہیں تھا۔" باربرا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

فرینک انتھونی چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر جرح ختم کرنے کا اعلان کرکے کرسی پر ڈھیر ہوگیا لیکن ابھی باربرا کی گلوخلاصی نہیں ہوئی تھی۔ چارلس کا وکیل شرما باربرا پہ حملہ آور ہونے کے پر تول رہا تھا۔ چارلس نے اوپندر سنگھ کو زبردستی اس کی خدمات سے سبکدوش کرکے شرما کو اپنی پیروی کے لیے مقرر کیا تھا۔ شرما ایک خوبرو آدمی تھا۔ عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ باربرا پہ انتھونی کی طویل جرح کے دوران چارلس اپنے پاس موجود ایف آئی آر کی کاپی پر کچھ نشان لگاتا رہا تھا۔ اس نے جرح شروع کرنے سے پہلے شرما کو بھی وہ پوائنٹس بتا دیے جن پر جرح اس کے لیے مفید ثابت ہوسکتی تھی۔ کچھ دیر بعد باربرا کو دوبارہ طلب کرلیا گیا۔ اس مرتبہ وہ پہلے سے زیادہ تازہ دم نظر آرہی تھی۔

"مس باربرا!" شرما نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ درست ہے کہ مئی کے مہینے میں تم نے جیل میں خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی تھی؟"

"ہاں، یہ درست ہے۔" باربرا نے جواب دیا۔ "میں نے پچھتر یا اسّی گولیاں کھائی تھیں اور یہ گولیاں جیل کے اسپتال سے حاصل کی گئی تھیں۔ مجھے جیل میں ایک سال سے زائد عرصہ گزر چکا تھا اور میں صورتِ حال سے بُری طرح مایوس ہوچکی تھی۔ اس لیے میں نے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

"کیا یہ کہنا زیادہ درست نہیں کہ بات بات پر جھوٹ بولنے کے باعث تمھارا ضمیر تمھیں ملامت کررہا تھا جس کی وجہ سے تم نے خودکشی کا فیصلہ کیا تھا؟"

"نہیں، یہ غلط ہے۔" باربرا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نائٹ کلب سے گرفتاری کے بعد تمھیں تفتیش کے لیے کتنے دن تک پولیس کی تحویل میں رکھا گیا تھا؟"

"تقریباً ایک ہفتہ اور اس دوران متعدد پولیس افسروں نے مجھ سے پوچھ گچھ کی تھی لیکن کسی نے مجھے اپنی جان بچانے کے لیے سلطانی گواہ بننے کی ترغیب نہیں دی تھی۔"

شرما نے ایک اور پینترا بدلا۔ "کائی ہاؤس میں کھانے کے دوران چارلس اور سولومن فرانسیسی زبان میں باتیں کررہے تھے۔ تم فرانسیسی زبان نہیں جانتیں پھر وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو کہ ان دونوں میں کس موضوع پہ بات ہورہی تھی اور یہ کہ اگر تمہیں معلوم تھا کہ اس شیشی میں موجود دوا کے استعمال سے نیند طاری ہوسکتی ہے تو کیا تم نے سولومن کو خبردار کرنے کی کوشش کی تھی؟" باربرا کا جواب نفی میں تھا۔ "جب تم سولومن کے ساتھ کمرہ نمبر ایک سو پچیس میں گئی تھیں تو کیا اس نے تمہیں بتایا تھا کہ اس پر غنودگی طاری ہورہی ہے؟" باربرا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "لیکن تم نے اسے یہ نہیں بتایا کہ یہ غنودگی اس دوا کی وجہ سے طاری ہورہی ہے جو اس کے سالن میں ڈالی گئی تھی۔" شرما کو اس سوال کا جواب نفی میں ملا۔ "کیا سولومن اس کے فوراً بعد سوگیا تھا؟"

"ہاں۔" باربرا نے کہا پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "لیکن ایک منٹ..." باربرا کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر شرما نے اسے موقع دیے بغیر اگلا سوال کردیا۔ باربرا اس سوال کو نظر انداز کرتے ہوتے بولی۔ "میں نے ابھی تک تمھارے پہلے سوال کا جواب مکمل نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سولومن غنودگی کی کیفیت میں بستر پہ لیٹ گیا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر نہانے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔ اسی دوران چارلس کمرے میں آیا تھا۔ اس نے سولومن کو کچھ اور گولیاں دی تھیں جس کے بعد وہ سوگیا تھا۔"

چارلس کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے تھے۔ اس نے شرما کے کان میں سرگوشی کی اور شرما نے باربرا سے سوال کیا۔ "کیا تمھیں علم ہے کہ سولومن کے سامان سے بھی اسی قسم کی بعض ادویات برآمد ہوئی تھیں؟" باربرا کا جواب نفی میں تھا۔

"سولومن سے جب تمھاری پہلی ملاقات ہوئی تو تم میں کیا باتیں ہوئی تھیں؟" اس نے سوال کیا۔

"ہم ان ممالک کے بارے میں گفتگو کررہے تھے جہاں جہاں کی سیاحت کرکے آئے تھے۔" باربرا نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

دفاعی پوزیشن اب واضح طور پر کمزور ہوتی نظر آرہی تھی۔ فرینک انتھونی کی مہارت، شرما کی چیخم دھاڑ اور اس کے کان میں چارلس کی سرگوشیاں بھی باربرا کو اپنی جگہ سے نہیں ہلاسکی تھیں۔ وہ واقعی آہنی اعصاب کی مالک ثابت ہوئی تھی۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر چارلس نے شرما کے کان میں سرگوشی کی اور شرما نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"بس مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔" شرما پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے چہرے پر شکست خوردگی کے آثار نمایاں تھے۔

باربرا کمرۂ عدالت سے باہر گئی اور راہداری میں بینچ پر بیٹھ گئی پھر ایک محافظ عورت نے اسے کلائی سے پکڑ کر اٹھایا اور بس کی طرف لے چلی۔ باربرا نے مُڑ کر دیکھا۔ چند مسلح محافظ چارلس کو بھی گھیرے میں لیے ایک طرف جارہے تھے۔ چارلس نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"مجھے یقین ہے کہ اس شخص کو ہندوستان کے سب سے اونچے درخت سے لٹکا کر پھانسی دی جائے گی۔" باربرا نے بڑبڑاتے ہوئے نفرت سے منہ موڑلیا۔

☙☙

نائٹ ریسٹورنٹ کے ہال کی مدھم روشنی میں شیکر کو ٹیٹ کی میز تک پہنچنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ویت نامی نژاد ٹیٹ اس وقت چارلس کا سب سے بڑا حمایتی تھا۔ شیکر نے اس پر یہی ظاہر کیا جیسے یہ ملاقات محض اتفاقی ہو جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ بہت دیر سے اسے تلاش کررہی تھی۔ دہلی میں ان دنوں مختلف قسم کی افواہیں گشت کررہی تھیں۔ 'چارلس کے جیل سے فرار کے لیے اس کے حمایتی کمانڈو فورس تیار کررہے ہیں۔' 'چارلس کو آزاد کرانے کے لیے ایران سے ہتھیار اسمگل کیے جارہے ہیں۔' ایک افواہ یہ بھی تھی کہ چارلس کی رہائی کے لیے قانون سے تعلق رکھنے والے کیس سے متعلقہ افراد کو بہت بری رشوت دینے کے لیے رقم جمع کی جارہی تھی۔ شیکر نے یہ افواہیں سن کر ہی ٹیٹ کی تلاش شروع کردی تھی۔

"کیا یہ افواہیں درست ہیں؟" اس نے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد ٹیٹ سے دریافت کیا۔

ٹیٹ نے نہ تو اس کی تصدیق کی اور نہ ہی تردید۔ البتہ اس نے یہ بتایا کہ چارلس کے پاس تہاڑ جیل کے چھ مکمل نقشوں کے علاوہ تیس ہزاری کورٹ کا ایک نقشہ بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ بعض دوسری چیزوں پر بھی غور کیا جارہا ہے۔

"جب وقت آئے گا تو چارلس کو جیل سے باہر آنے میں دیر نہیں لگے گی۔" ٹیٹ نے بتایا۔ "جیل سے نکلتے ہی وہ ...

ایرپورٹ کا رُخ کرے گا لیکن ملک سے باہر جانے کی کوشش نہیں کرے گا کیونکہ تمام بین الاقوامی پروازوں کی نگرانی کی جا رہی ہوگی۔ فی الحال اس کی منزل ہندوستان ہی میں کوئی جگہ ہوگی۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔"

"اور اس کے بعد؟" شیکر نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "چارلس کا اگلا قدم کیا ہوگا؟"

"وہ چند ماہ تک ہندوستان ہی میں روپوش رہے گا۔" ٹیٹ نے بتایا۔ "وہ اپنا حُلیہ تبدیل کرلے گا۔ شاید وہ کسی پادری کا بھیس بدل لے، کسی مسلمان بزرگ یا کسی ہندو سادھو کا بہروپ اختیار کرلے۔ وہ کوئی بھی شکل اختیار کرسکتا ہے۔ جیل سے فرار کے بعد تلاش کا ہنگامہ سرد ہوتے ہی چارلس کو کسی کار کے ذریعے یا پیدل ہی ہندوستان کی سرحد پار کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ مغرب میں پاکستان کا رُخ بھی کرسکتا ہے اور مشرق میں برما کی سرحد بھی اس سے زیادہ دور نہیں ہوگی۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو، وہ آزاد ہوگا — میرا دعویٰ ہے کہ چارلس کو جیل اور پھر ہندوستان سے فرار ہونے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی اور پھر پوری دنیا کی پولیس اسے تلاش کرتی رہے گی لیکن وہ کسی کے ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"شاید چارلس بھی یہی چاہتا ہے کہ کوئی نہ کوئی اسے پکڑنے کی کوشش کرتا رہے۔" شیکر مسکرائی۔ "میری آندرے کے بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا چارلس کے اس منصوبے میں اسے بھی شامل کیا جائے گا؟"

"میری آندرے کی مدد کے لیے چارلس ہر وہ قدم اٹھائے گا جو اس کے بس میں ہوگا، لیکن۔۔۔" ٹیٹ نے جملہ ادھورا چھوڑ کر کندھے اُچکا دیے۔ اسے جملہ مکمل کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ شیکر سمجھ چکی تھی کہ چارلس کے اس منصوبے میں کسی اور کی گنجائش نہیں تھی۔ میری آندرے کے لیے بھی نہیں جس نے چارلس کے لیے اپنی زندگی برباد کر ڈالی تھی۔

☙❧

اگلے دو ہفتے چارلس سوبھراج اور اس کے ساتھیوں، میری آندرے اور جین ڈوسم کے لیے ملی جلی کیفیت کے حامل ثابت ہوئے۔ انھوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ سولومن نامی کسی شخص سے نہیں ملے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایلن اور باربرا کو موردِ الزام ٹھہرانے کی کوشش کی کہ چونکہ وہ دونوں طوائفیں ہیں اور منشیات کے استعمال کی عادی ہیں، اس لیے سولومن کی موت کی ذمہ دار بھی وہی ہوسکتی ہیں۔ یا یہ کہ چونکہ سولومن بھی منشیات کا عادی تھا، ممکن ہے اس نے کوئی نشہ آور چیز ضرورت سے زیادہ استعمال کرلی ہو جس سے اس کی موت واقع ہوگئی۔

اس کے ساتھ ہی ان میں آپس میں اختلافِ رائے پیدا ہوگیا۔ فرینک انتھونی، جو اپنے آپ کو راست پر سمجھتا تھا، دفاعی وکیلوں کے پینل کی لیڈرشپ سے علیحدہ ہوگیا۔ لیکن میری آندرے اس وقت اپنے آپ کو کسی حد تک محفوظ محسوس کر رہی تھی کیونکہ استغاثہ کا کیس اس کے خلاف زیادہ مضبوط نہیں تھا۔ استغاثہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا کہ میری آندرے فرانسیسی سیاح سولومن کو نشہ آور گولیاں کھلانے اسے لوٹنے یا اس قسم کی کسی اور کارروائی میں شریک تھی۔ پراسیکیوٹر اپنی ایک گواہ باربرا سے زیادہ سے زیادہ یہ کہلوانے میں کامیاب ہوسکا تھا کہ اس نے میری آندرے کو رنجیت ہوٹل کے کمرہ نمبر تین سو نیدرہ میں چارلس سوبھراج کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا۔ بہرحال، وکیلوں کے پینل کی سربراہی سے دستبردار ہونے کے باوجود گواہوں پر سب سے پہلے جرح فرینک انتھونی ہی کرتا تھا۔ اس کے بعد دوسرے وکیلوں کی باری آتی۔ عام تاثر یہی تھا کہ وہ میری آندرے کو بچالے گا لیکن غالباً چارلس سوبھراج سے اسے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اُدھر چارلس کا وکیل چودھری بھی فرینک انتھونی سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ اس سلسلے میں اخباری نمائندوں کے سوالات کا جواب دے رہا تھا کہ اس کی نظر۔۔۔ محافظوں کی طرف اٹھ گئی جو عدالتی کارروائی کے وقفے کے دوران چارلس کو کچھ دیر کے لیے باہر لے جارہے تھے — میری آندرے بھی اس کے پیچھے ہی تھی۔ وہ سہمے ہوئے لہجے میں فرانسیسی زبان میں چارلس سے سرگوشیاں کرتی جارہی تھی۔

عدالتی کارروائی کے دوران چارلس کو جب بھی موقع ملتا، اپنے مصنف کو یادداشتیں نوٹ کرانے لگتا۔ ایسے موقع پر اخباری نمائندے میری آندرے کو گھیر لیتے۔ اس نے ایک رپورٹر کو بتایا کہ اس کی اپنی کہانی بھی بڑی سنسنی خیز ہے۔ مناسب وقت آنے پر وہ اپنی کہانی خود لکھے گی۔ اخباری نمائندے اس کے بارے میں ایک ایک تفصیل نوٹ کرتے رہتے۔ اس نے لباس کس قسم کا پہنا تھا، بال کس طرح بنائے تھے اور چارلس کی طرف وہ کیسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ انھیں میری آندرے کی نگاہوں میں کبھی نفرت کی چنگاریاں پھوٹتی ہوئی نظر آتیں اور کبھی محبت کے دریا موجزن دکھائی دیتے۔

☙❧

موسمِ بہار میں یہ افواہ زور پکڑ گئی کہ عدالت میں پیشی کے دوران چارلس سوبھراج کو گوریلوں کے ذریعے آزاد کرالیا جائے گا۔ پولیس نے اس افواہ کو محض افواہ سمجھ کر نظرانداز نہیں کیا بلکہ چارلس کے محافظوں کی تعداد میں کئی گُنا اضافہ کردیا گیا۔ سادہ لباس میں بھی پولیس والے عدالت کے احاطے اور راہداریوں میں گھومتے رہتے۔ ہر شخص پر پولیس کی کڑی نگاہ تھی۔ کوئی بھی شخص پولیس کی نظروں میں آئے بغیر نہیں گزر سکتا تھا۔ چارلس کو آزاد کرانے کے لیے گوریلوں کے حملے والی افواہ میں اگر واقعی کوئی صداقت تھی تو پولیس نے ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کا پورا پورا انتظام کرلیا تھا۔ پولیس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ جس روز چارلس کی پیشی ہوتی اس روز عدالت کا منظر دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کسی نادیدہ طاقت کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا گیا ہو۔ اس روز جج جو گندر ناتھ کے کمرے کے سامنے رائفلوں سے مسلح جوانوں کا دستہ تعینات کردیا جاتا۔ ان کی رائفلوں پر باقاعدہ سنگینیں لگی ہوتیں۔ اس کے علاوہ جوڈو کراٹے کے ماہر نوجوانوں کا ایک دستہ بھی دروازے کے سامنے موجود رہتا۔ عدالت میں داخل ہونے والے ہر شخص کی باقاعدہ تلاشی لی جاتی۔ اس کے علاوہ چارلس کے حمایتیوں پر بھی عتاب نازل کیا جانے لگا۔ اس کے سوتیلے بھائی آندرے کو پاسپورٹ کی بعض خلاف ورزیوں کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا لیکن دوسرے ہی دن اس نے ضمانت پر رہائی حاصل کرلی۔ اس صورتِ حال نے میری آندرے کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسے چارلس سے ملنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ عدالت میں پیشی کے دوران مسلح محافظوں کی موجودگی میں البتہ اسے چند منٹ کیلیے اُسکے بھائی سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی۔ آندرے کے لیے صورتِ حال انتہائی مایوس کُن بلکہ خطرناک بھی تھی۔ اسے کسی بھی وقت دوبارہ گرفتار کیا جاسکتا تھا لیکن ایسا موقع آنے سے پہلے ہی وہ خاموشی سے ہندوستان چھوڑ کر پیرس واپس چلا گیا۔ اس کے چند روز بعد چارلس سوبھراج کے دو اور حمایتی غائب ہوگئے۔ ٹیٹ اس کا سب سے بڑا حمایتی تھا لیکن ایک روز اچانک ہی وہ بھی غائب ہوگیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ گرفتاری کے خوف سے بمبئی فرار ہوگیا تھا۔ چارلس کی حالت اس کپتان کی سی تھی جس کا جہاز ڈوب رہا ہو لیکن اس کے باوجود اس نے مایوسی کو قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ اس کے برعکس وہ عدالت میں ہنگامہ مچائے رکھتا۔

"یہ کیسا ملک ہے جہاں مجھے اپنے بھائی اور عزیزوں سے بھی ملنے کی اجازت نہیں۔" اس نے چیخ کر جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میرے بھائی کو بغیر کسی جرم کے گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا گیا۔ میں اپنے عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات نہیں کرسکتا یہاں تک کہ میرے وکیل کو بھی جیل میں محافظ کی موجودگی کے بغیر مجھ سے ملنے کی اجازت نہیں۔ اگر میں اپنے وکیل سے کوئی بات کرتا ہوں تو سر پر مسلط محافظ ہماری باتیں اپنے افسروں تک پہنچا دیتا ہے جو بالآخر پولیس پراسیکیوٹر تک پہنچ جاتی ہیں۔ میں انصاف چاہتا ہوں۔ مجھے وہ بنیادی انسانی حقوق ملنے چاہئیں جن پر میرا حق ہے۔"

چارلس نے چیخ چیخ کر اخباری نمائندوں کو اپنے گرد جمع کرلیا اور انھیں اپنی ٹانگیں دکھانے لگا جو بیڑیوں سے زخمی ہوچکی تھیں اور خون رِس رہا تھا۔

ستمبر ۱۹۷۷ء میں چارلس نے ہائی کورٹ میں درخواست دی کہ نہ صرف سولومن قتل کیس بلکہ اشوکا ہوٹل ڈکیتی اور اس کے خلاف دیگر جرائم کی عدالتی کارروائی کچھ عرصے کے لیے بند کردی جائے۔ یہ درخواست بڑے ماہرانہ انداز میں لکھی گئی تھی جس میں جگہ جگہ قانونی حوالے بھی دیے گئے تھے۔ اس نے ہائی کورٹ سے درخواست کی تھی کہ اسے تنہائی میں اپنے وکیل اور عزیزوں سے ملنے کی اجازت دی جائے، اپنے دفاع کی تیاری کے سلسلے میں اسے ایک ٹائپ رائیٹر اور ٹیپ ریکارڈر فراہم کیا جائے اور اسے بیڑیوں سے نجات دلائی جائے جو اسے مفلوج بنانے کا باعث بن رہی ہیں۔

اس کی درخواست کے فوراً ہی بعد پراسیکیوٹر نے بھی عدالت میں ایک درخواست پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ وہ اگلے چند روز میں اس کیس کو اختتام تک پہنچانے کا پروگرام بنا رہا ہے۔ اگر چارلس کیس کی سماعت ملتوی کرنے کی درخواست قبول کرلی گئی تو استغاثہ کو ناقابلِ تلافی نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے الزام لگایا تھا کہ ملزم بہت چالاک ہے۔ وہ اس مہلت سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا لیکن ہندوستان کی سپریم کورٹ نے چارلس کی پٹیشن کی سماعت کے حق میں ووٹ دیا۔ ہندوستانی قانون میں یہ پہلی مثال تھی کہ اس قسم کے کسی قیدی کو اپنا کیس سپریم کورٹ کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملا تھا۔

۶ ستمبر ۱۹۷۷ء کی صبح سپریم کورٹ کی عمارت کی راہداریاں ماہرینِ قانون اور قانون کے طالبعلموں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ یہ لوگ اس شخص کو دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے جس کی درخواست پر سپریم کورٹ نے سماعت کے حق میں ووٹ دیا تھا اور آج وہ شخص اپنا کیس لے کر سپریم کورٹ کے سامنے پیش ہو رہا تھا۔ بعض ماہرینِ قانون کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان کا کوئی بڑے سے بڑا قانون دان بھی ایسی متاثر کن درخواست نہیں

لکھ سکتا تھا۔ چارلس سوبھراج نے یہ درخواست لکھنے میں جس ذہانت کا ثبوت دیا تھا وہ اسی کا حق تھا۔

اس روز چارلس نہ صرف مسلح محافظوں کے نرغے میں تھا بلکہ حفاظتی انتظامات میں مزید اضافہ کر دیا گیا تھا۔ پولیس کا ایک جوان بزو کا گن سنبھالے ہوئے تھا جبکہ دو اور جوان دستی بموں سے لیس تھے۔ اس روز غالباً دہلی کی نصف آبادی سپریم کورٹ پر ٹوٹ پڑی تھی۔ لوگوں کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے پولیس کو کم از کم تین بار لاٹھی چارج کرنا پڑا تھا۔ مختلف سفارتخانوں کے کئی اعلیٰ افسران اور ان کی بیویاں بھی عدالت کے احاطے میں موجود تھیں۔ یہ لوگ چارلس سوبھراج کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ میری آندرے کا اگرچہ چارلس کی اس درخواست سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن اسے بھی سپریم کورٹ میں پیش ہونے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ جیسے ہی کمرۂ عدالت میں داخل ہوئی اُسے حیرت اور صدمے کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ چارلس کے ساتھ دوسری کرسی پر سوزی کو دیکھ کر میری آندرے کو اپنا دل سینے میں ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

اخباری نمائندوں نے قیمتی لباس میں ملبوس چارلس کی اس نئی خوبصورت دوست کا نام پوچھنا چاہا مگر وہ مسلسل انکار کرتا رہا۔ اس نے سوزی کے بارے میں صرف اتنا ہی بتانے پر اکتفا کیا کہ وہ اس کی قلمی دوست ہے۔ وہ رپورٹروں سے صرف اپنی اسی رٹ پٹیشن کے موضوع پر بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ سپریم کورٹ میں لانے سے پہلے جیل کے حکام نے اس کی بیڑیاں اتار دی تھیں۔ اس سلسلے میں اس نے اخباری نمائندوں کو بتاتے ہوئے کہا۔

"انھوں نے کل ہی میری بیڑیاں اتارنا چاہی تھیں مگر میں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ میں نے محافظوں کو بتا دیا تھا کہ اگر کسی نے میری بیڑیوں کو چھونے کی کوشش کی تو میں لڑنے مرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ دراصل میں سپریم کورٹ کے ججوں کو یہ سب کچھ دکھانا چاہتا ہوں لیکن آج صبح جب مجھے جیل کی بس کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو اچانک ہی لاتعداد محافظ مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے مجھے زمین پر گرا دیا اور تین محافظوں نے میری بیڑیاں کاٹ ڈالیں۔"

"کیا تم نے مزاحمت کی کوشش کی تھی؟" ایک رپورٹر نے سوال کیا۔

"ہاں" چارلس نے جواب دیا "لیکن انھوں نے مجھے اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ میری مزاحمت بے کار ثابت ہوئی۔ یہ دیکھو" چارلس نے پتلون کے پائنچے اوپر اٹھا دیے۔ ٹخنوں اور پنڈلیوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں جو خون سے سُرخ ہو چکی تھیں۔

ایک اور رپورٹر نے دریافت کیا کہ کیا یہ پٹیاں کسی ڈاکٹر نے باندھی تھیں تو چارلس نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا "نہیں۔ یہ ڈریسنگ میں نے خود کی تھی کیونکہ مجھے جیل کے ڈاکٹروں پر اعتماد نہیں۔ وہ بھی پولیس ہی کے آدمی ہیں۔ میری بیڑیاں کاٹنے کے لیے ان محافظوں نے پے در پے ہتھوڑے برسائے تھے اس سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ مجھے کس قدر اذیّت کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔ ہندوستان کی پولیس نے میرے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا ہے اسے دیکھتے ہوئے مجھے یہاں کسی انصاف کی بھی توقع نہیں ہے۔"

سپریم کورٹ کا یہ وسیع و عریض کمرہ تیس ہزاری کورٹ کے اس کمرے سے قطعی مختلف تھا جہاں سولومن قتل کیس چل رہا تھا۔ اس کمرے میں قانون کا احترام تھا۔ کسی شخص کو اونچی آواز میں بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ دیواروں پر ان ججوں کے پورٹریٹ آویزاں تھے جو کبھی نہ کبھی اس کمرے میں موجود انصاف کی کرسی پر بیٹھ چکے تھے۔ اس عدالت میں صرف ہندوستان کا اٹارنی جنرل ہی پراسیکیوٹر کے طور پر پیش ہو سکتا تھا۔ ایس۔ وی۔ گپتا ایک اُصول پرست آدمی تھا جس کی ساری زندگی ایک ڈسپلن کے تحت گزری تھی اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ ہندوستان کی حکومت چارلس سوبھراج کو سخت ترین حفاظتی شکنجے میں جکڑے رکھنا چاہتی ہے۔ اس نے بھی یہی مؤقف اختیار کیا کہ چارلس جیسے ملزم کو مستقل طور پر ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں رکھا جائے۔

چارلس کی اپنی لکھی ہوئی اس رٹ درخواست نے دہلی کے قانونی حلقوں میں ایک تہلکہ سا مچا رکھا تھا اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سپریم کورٹ میں وہ اپنی پیروی بھی خود ہی کرے گا لیکن عدالت نے اس کی اجازت نہیں دی اور اسے ایک نئے ایڈووکیٹ کا انتظام کرنا پڑا۔ ایڈووکیٹ گیٹے اپنے مؤکلوں کا دفاع کرنا جانتا تھا۔ اس نے چارلس سوبھراج کی پیروی کرتے ہوئے تین ججوں کے بینچ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مائی لارڈز! میرا مؤکل ان غیر انسانی بندشوں (بیڑیوں) کی وجہ سے بعض فطری تقاضے بھی خاطر خواہ طور پر پورے نہیں کر سکتا۔ وہ نہ تو حوائجِ ضروریہ کے لیے بیٹھ سکتا ہے اور نہ ہی سو سکتا ہے۔ ان بیڑیوں کی وجہ سے وہ سخت تکلیف میں مبتلا ہے۔ وہ جیل میں محافظ کی موجودگی کے بغیر اپنے وکیل سے کوئی مشورہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس طرح ان کی باتیں پولیس تک

پہنچ جاتی ہیں۔"

اٹارنی جنرل نے اپنی سیٹ چھوڑ دی۔ مخصوص انداز میں تعظیم کے بعد اس نے وکیلِ صفائی کے مؤقف کی مخالفت میں کہنا شروع کیا "مائی لارڈ! ملزم چارلس سوبھراج کا سابقہ ریکارڈ اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ یہ دنیا کے مختلف حصوں میں جب بھی پکڑا گیا نہایت پُراسرار طریقہ اختیار کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ نہایت کامیابی سے گرفتاریوں سے بھی بچتا رہا ہے، یہ شخص انتہائی چالاک اور پُراسرار وسائل کا مالک ہے۔" اٹارنی جنرل نے ایک دستاویز نکال کر چارلس کی گرفتاریوں، ان جیلوں کے نام جہاں سے وہ فرار ہوا تھا اور ہندوستان، تھائی لینڈ اور پاکستان میں اس کے خلاف قتل کے الزامات کی فہرست بتائی جن پر ابھی کارروائی ہونا باقی تھی۔

چیف جسٹس کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی "یہ واقعی سنگین الزامات ہیں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا "بہت سنگین۔"

"یہ شخص بہت سے لوگوں کی اموات کا ذمے دار ہے۔" اٹارنی جنرل نے بات جاری رکھی "اس کے لیے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بہت ضروری ہیں۔"

چارلس کے وکیل گیٹے نے فائل سے بیڑیوں کا ایک نقشہ نکال کر تفصیل بتاتے ہوئے نقشہ چیف جسٹس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ خاکہ کس نے بنایا ہے؟" چیف جسٹس نے نقشہ دیکھنے کے بعد کہا۔

"یہ خاکہ ہم نے تیار کیا تھا مائی لارڈز!" گیٹے کہتے ہوئے عدالت کو بتانے لگا کہ آج صبح جیل کے محافظوں نے کس طرح چارلس کی بیڑیاں اتاری تھیں جس کے نتیجے میں اسے بے پناہ کرب و اذیت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ چارلس نے اس امید پر اپنی پتلون کے پائنچے اوپر چڑھا لیے کہ شاید جج اس کے زخموں کو دیکھنا چاہیں گے لیکن اٹارنی جنرل نے فوراً ہی مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"ان زخموں کے بارے میں ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ بیڑیوں سے نہیں آئے بلکہ ملزم نے خود لگائے ہیں۔"

"کوئی شخص اپنے آپ کو اس طرح اذیت کیسے پہنچا سکتا ہے؟" چیف جسٹس نے کہا۔

"مائی لارڈز!" اٹارنی جنرل نے کہا "اس شخص سے کچھ بعید نہیں ہے۔ انٹرپول کی رپورٹوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ شخص دنیا کی مختلف جیلوں سے فرار ہو چکا ہے اور لاتعداد لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ اگر یہ ایک مرتبہ پھر فرار ہونے

میں کامیاب ہوگیا تو دنیا بھر کی پولیس مل کر بھی اسے تلاش نہیں کر پائے گی اس لیے اس کے لیے بیڑیاں بہت ضروری ہیں۔"

"مائی لارڈ نو!" گیٹے نے اٹارنی جنرل کے مؤقف سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ "بیڑیوں کے آہنی سرے اس طرح ویلڈ کیے گئے ہیں کہ وہ ایک لمحے کو بھی چین محسوس نہیں کر سکتا۔ کسی کو سزا دینے کا یہ طریقہ انتہائی وحشیانہ اور غیر انسانی ہے۔"

"اگر بیڑیاں ہٹا دی جائیں تو یہ کیا کر سکتا ہے؟" چیف جسٹس نے جھکتے ہوئے اٹارنی جنرل سے دریافت کیا۔

"وہ جیل کے محافظوں پر حملہ کر کے راہِ فرار اختیار کر سکتا ہے۔" اٹارنی جنرل نے جواب دیا۔

"وہ شخص کہاں ہے؟" چیف جسٹس کہتے ہوئے عدالت میں موجود لوگوں کے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔ چارلس بمشکل اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مخصوص انداز میں جھک کر عدالت کو تعظیم دی۔ اس کے چہرے پر اس وقت یتیمی برس رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے تاثر دینے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ یہ شخص جب پیدا ہوا تو اس کی کوئی قومیت اور کوئی شہریت نہیں تھی لیکن اب وہی ہندوستانی قانون کے اہم ترین آدمیوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا اور تاریخ میں اس کا نام رقم ہو چکا تھا۔

اس کی طرف دیکھ کر تینوں ججوں کے چہروں پر الجھن کے تاثرات ابھر آئے۔ انھیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ پستہ قامت اور معصوم صورت یہ شخص اتنے سنگین ترین جرائم کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ چیف جسٹس نے اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور چند لمحے دوسرے ججوں سے کچھ مشورہ کرنے کے بعد اس نے وکیلِ دفاع کو مخاطب کیا۔

"کیا آپ کا مؤکل اس بات کو پسند کرے گا کہ اسے بیڑیوں سے نجات دلا کر قیدِ تنہائی میں رکھا جائے؟"

چارلس سکتے میں آ گیا۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیسے کسی سے دریافت کیا جائے کہ اس کے بستر پر سانپ چھوڑ دیا جائے یا بچھو؟ گیٹے چارلس کی طرف جھک گیا۔ وہ چند لمحے سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے پھر گیٹے سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ "مائی لارڈ! میرا مؤکل بیڑیوں کو قیدِ تنہائی پر ترجیح دیتا ہے۔" کہتے ہوئے گیٹے کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔

کارروائی ختم ہو گئی۔ چارلس سوبھراج کو مسلح محافظوں کے پہرے میں کمرۂ عدالت سے باہر لے آیا گیا۔ اس کے ایک طرف سوزی تھی جو اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی اور دوسری طرف میری آندرے۔

تہاڑ جیل پہنچتے ہی چارلس سوبھراج کی ٹانگوں میں نئی بیڑیاں ویلڈ کر دی گئیں۔

❧

دس مہینوں تک کیس کی مسلسل سماعت کے بعد بالآخر جج جوگندر ناتھ فیصلہ مرتب کرنے کے لیے خلوت گزیں ہو گیا۔ سولومن قتل کے اس کیس سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ درحقیقت زندگی کے اسٹیج پر یہ ایک ایسا ڈراما تھا جس کا بظاہر کوئی اختتام نظر نہیں آتا تھا۔ اس ڈرامے کے کرداروں کے پر کتر دیے گئے تھے۔ اور یوں لگتا تھا کہ چارلس سوبھراج کی زنبیل کے تمام شعبدے ختم ہو چکے تھے۔

عدالتی کارروائی کو فیصلہ تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ اس دوران چارلس ایک بار پھر اہمیت اور توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کی زنبیل میں ابھی کچھ حربے باقی تھے جنھیں وہ استعمال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پچیس جولائی کی رات کو اس نے تہاڑ جیل میں اپنے آپ کو پھندے سے لٹکانے کی کوشش کی۔ کم از کم اس کا کہنا یہی تھا کہ وہ قانون کی ناانصافی کے خلاف احتجاجاً خودکشی کر رہا تھا جب کہ جیل کے محافظوں کا کہنا تھا کہ اس نے اپنے گلے میں کمبل کا جو پھندہ ڈالا تھا وہ اتنا موٹا تھا کہ اس سے دَم گھٹنے کا خدشہ نہیں تھا۔ اس کوشش میں ناکام ہونے کے بعد اس نے جیل کے عملے کی بدسلوکی اور غیر انسانی رویّے کے خلاف بھوک ہڑتال شروع کر دی۔

"میری یہ بھوک ہڑتال تا مرگ ہوگی۔" اس نے کسی نہ کسی طرح اخبارات کو یہ اطلاع بھجوا دی۔ "جیل میں ذہنی اذیت اور جسمانی تشدد میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکا ہے۔ اگر میں اس صورتِ حال میں چند روز اور زندہ رہا تو یقیناً پاگل ہو جاؤں گا۔ میں نے اپنے وکیل کو بھی ہدایت کر دی ہے کہ میرے مرنے کے بعد وہ فرانس میں میرے گھر والوں اور ہندوستان میں فرانسیسی سفارت خانے کو بھی مطلع کر دے۔ میرا خیال تھا کہ ہندوستان میں قانون کی حکمرانی ہوگی، انصاف ہوگا لیکن ان تجربات کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ دنیا کا وہ ملک ہے جس پر اندھیر نگری چوپٹ راج والی مثال صادق آتی ہے۔ یہاں قانون اور انصاف نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

آٹھ اگست ۱۹۷۸ء کو جب جج جوگندر ناتھ فیصلہ سنانے کے لیے عدالت میں آیا تو اسے ایک دلچسپ منظر دیکھنے کو ملا۔ چارلس سوبھراج کو اسٹریچر پر عدالت میں لایا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی کا دوسرا حصّہ ایک محافظ کے ہاتھ میں تھا۔ چارلس کا جسم ایک گندے اور پھٹے ہوئے کمبل میں لپٹا ہوا تھا، آنکھیں اور رخسار اندر کو دھنسے ہوئے تھے۔ مجموعی طور پر وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی بھوک ہڑتال کو تین ہفتے گزر چکے تھے اور یہ افواہ گشت کرنے لگی تھی کہ اگر بھوک ہڑتال جاری رہی تو دو چار دن میں وہ ختم ہو جائے گا۔ اس کی حالت دیکھ کر ایک شخص نے اس خدشے کا اظہار بھی کیا تھا کہ جج جوگندر ناتھ کے فیصلہ سنانے سے پہلے ہی چارلس سوبھراج اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔

"مجھے کوئی پروا نہیں کہ جج میرے لیے کیا فیصلہ سناتا ہے۔" چارلس نے قریب کھڑے ہوئے ایک اخباری رپورٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز قبر کی گہرائیوں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ گلے پر رکھ لیا اور کمزور سی آواز میں بولا۔ "اپنا جج میں خود ہوں اور میرے فیصلے کے مطابق... میں بے گناہ ہوں۔" اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ اسٹریچر سے نیچے جھول گیا اور گردن اس طرح ڈھلک گئی جیسے اب اس میں زندگی کی رمق نہ رہی ہو۔

دور کھڑی ہوئی میری آندرے والہانہ انداز میں دوڑ کر اسٹریچر کے قریب پہنچ گئی اور چارلس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے رونے لگی۔ وہ اس شخص کے لیے آنسو بہا رہی تھی جو اس کی زندگی کی بربادی کا باعث بنا تھا۔

جج جوگندر ناتھ اپنی کرسی سنبھال چکا تھا۔ قیدیوں میں سے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ دفعتاً چارلس ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کمبل کے اندر سے ہندوستان ٹائمز کا تازہ شمارہ نکال لیا اور جب جج جوگندر ناتھ چارلس سوبھراج کی قسمت کا فیصلہ سنا رہا تھا وہ بڑے انہماک سے اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔

❧

باربرا اسمتھ کو سولومن قتل کیس سے بری کر دیا گیا۔

ایلن الیستھر کو دوبارہ تہاڑ جیل پہنچانے کا حکم دیا گیا۔ اس پر وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہوٹل میں تین فرانسیسی سیّاحوں کو بے ہوش کر کے لوٹنے کا الزام ثابت ہو چکا تھا۔

جین ڈوسم کو اگرچہ سولومن کے قتل کے الزام سے بری کر دیا گیا تھا لیکن وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہوٹل کے جرائم میں اسے تین ماہ کی سزا سنا کر دوبارہ تہاڑ جیل بھیجنے کا حکم دیا گیا۔

میری آندرے پر سولومن کے قتل کا الزام ثابت نہیں ہو سکا تھا لیکن اسے آزادی نصیب نہیں ہو سکی۔ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کیس کے علاوہ اس پر کچھ اور الزامات بہرحال ثابت ہو چکے تھے۔ سولومن کے قتل سے میری آندرے کی بریّت پر انسپکٹر طولی بری طرح جھنجلا گیا۔ اس نے طے کر لیا کہ تہاڑ جیل میں سزا بھگتنے کے بعد میری آندرے کو تھائی لینڈ کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے گا جہاں پانچ افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے الزام میں اس پر کیس چلے گا اور اس کے بعد نیپال کی باری تھی۔ انسپکٹر طولی کو یقین تھا کہ میری آندرے اب کبھی اپنے قصبے کے قریب بہنے والے سینٹ لارنس دریا کے کنارے بیٹھنے کا خواب نہ دیکھ سکے گی۔

چارلس سوبھراج پر سولومن کے قتل کے سلسلے میں تین ضمنی الزامات ثابت ہو چکے تھے۔ نمبر ایک۔ اقدامِ قتل جبکہ اس میں ارادۂ قتل شامل نہیں تھا۔ نمبر دو۔ لوٹنے اور ڈکیتی کی نیّت سے بے ہوش کرنے والی نشہ آور ادویات کھلانا اور

www.allpdfstuff.blogspot.com
www.allpdfstuff.blogspot.com

نمبر تین۔ ڈکیتی کی نیّت سے جان بوجھ کر تکلیف میں مبتلا کرنا۔

چارلس کے وکیل گیٹے نے سزا میں نرمی کی اپیل کرتے ہوئے کہا۔ "میرا مؤکل جیل کے عملے کے وحشیانہ سلوک کی بدولت پہلے ہی بہت سزا بھگت چکا ہے۔ چارلس سوبھراج طویل عرصے سے اپنے اہلِ خانہ سے بچھڑا ہوا ہے اور یہاں کی آب و ہوا بھی اسے راس نہیں آئی۔ تہاڑ جیل میں دو سال کسی طرح بھی عمر قید سے کم ثابت نہیں ہوئے' اس لیے وہ کم سے کم اور نرم سزا کا مستحق ہے۔ فاضل عدالت اسے جرمانے اور جلا وطنی کا حکم دے سکتی ہے اس سے قانون کے تمام تقاضے بھی پورے ہو جائیں گے۔"

اس موقعے پر اسٹریچر پر لیٹے ہوئے چارلس نے اخبار سے سر اٹھایا اور چیخ کر بولا۔ "میں اپنی بھوک ہڑتال ختم نہیں کروں گا... میں موت سے نہیں ڈرتا..."

جج جوگندر ناتھ نے سب کچھ سننے کے بعد بڑے پُرسکون لہجے میں اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

"میرے سامنے کوئی ایسی شہادت پیش نہیں کی گئی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ جیل میں چارلس سوبھراج کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھا گیا تھا۔ محض جرمانے کی مجوزہ سزا سے قانون کے تقاضے کسی طور بھی پورے نہیں ہوتے۔ اس کے لیے ایسی سزا ضروری ہے جو اس کے جرائم سے مطابقت رکھتی ہو۔ اس کے نشہ آور دوا کھلانے کے قبیح عمل سے ایک بے گناہ غیر ملکی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اپنے عزیزوں سے بچھڑنے اور دور دراز کا سفر اختیار کرنے کا مقصد جرائم کے ذریعے دولت کمانا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے یہاں آیا تھا۔ اسے مجبور نہیں کیا گیا تھا۔ ان حقائق کے پیشِ نظر اس کے جرائم کی سزا میں نرمی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔"

جج جوگندر ناتھ چند لمحے خاموش رہا اور پھر چارلس سوبھراج کو سات سال قیدِ بامشقت کا فیصلہ سنا دیا۔ سزا کا حکم سُن کر عدالت میں موجود انسپکٹر طولی اور پراسیکیوٹر دلجیت سنگھ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ بالآخر ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔

اس ناانصافی کے خلاف چارلس نے ہنگامہ مچا دیا لیکن بہرحال وہ بتدریج اپنی اصلیت کی طرف لوٹنے لگا۔ ایک دو دن بعد اس نے بھوک ہڑتال بھی ختم کر دی اور ایک بار پھر جیل کے محافظوں کے وحشیانہ اور غیر انسانی سلوک کے خلاف درخواستیں لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس نے جیل کے زنانہ سیکشن میں میری آندرے کو پیغام بھیجا کہ وہ حوصلہ نہ ہارے اور اس پر اعتماد قائم رکھے۔ وہ نجات کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور تلاش کر لے گا۔

انسپکٹر طولی کو اپنی زندگی میں بڑے بڑے مجرموں سے سابقہ پڑا تھا لیکن چارلس سوبھراج اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ وہ اگرچہ چارلس کو سات سال کی سزا ہو جانے پر خوش تھا لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ جیل کی دیواریں اسے کب تک مقید رکھ سکیں گی۔

چارلس سوبھراج نے مایوسی کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیا تھا۔ وہ جیل کی کوٹھری میں بیٹھا مستقبل کے منصوبے بناتا رہتا۔ وہ دنیا کے نقشے پر کوئی ایسا ملک تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں کی پولیس کو اس کی تلاش نہ ہو اور جہاں کے لوگ اسے پہچانتے نہ ہوں۔

آخری اطلاعات کے مطابق چارلس سوبھراج کی سزا پوری ہونے والی ہے اور اسے یقین ہے کہ وہ دہلی کی تہاڑ جیل سے رہائی پاتے ہی امریکا کی طرف نکل جانے میں کامیاب ہو جائے گا جبکہ تھائی لینڈ، نیپال اور پاکستان کی پولیس اسے اپنے قبضے میں لینے کے لیے دہلی جیل سے اس کی رہائی کی منتظر ہے۔

www.allpdfstuff.blogspot.com

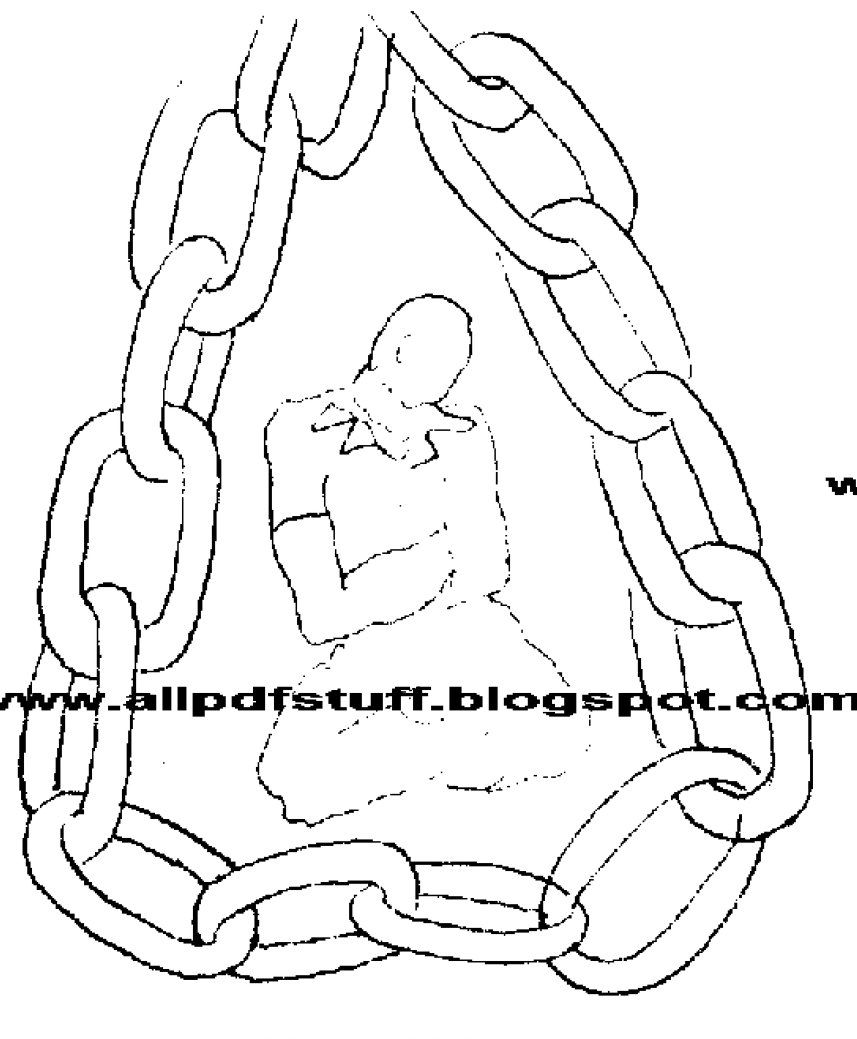

www.allpdfstuff.blogspot.com
www.allpdfstuff.blogspot.com
www.allpdfstuff.blogspot.com
www.allpdfstuff.blogspot.com

www.allpdfstuff.blogspot.com